برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگزشت

تحریک سید احمد شہیدؒ

جلد دوم

المعروف بہ ”سید احمد شہید“ حصہ دوم

تالیف

حضرت مولانا غلام رسول مہر رحمۃ اللہ علیہ

حسب ایماء

حضرت مولانا شمس الحق صاحب قاسمی، ممبئی

جملہ حقوق کتابت بحق ناشر محفوظ ہیں

تصریحات

نام کتاب	تحریک سید احمد شہیدؒ جلد دوم
مؤلف	مولانا غلام رسول مہر صاحبؒ
تصحیح	مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی
تعداد صفحات	۶۵۶
باہتمام	شمشیر احمد قاسمی (دیوبند)
کتابت	عمران کمپیوٹرس مظفر نگر (PH: 09219417735)
سن اشاعت	جنوری 2008

ملنے کے پتے

- ❖ دار الکتاب دیوبند ❖ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
- ❖ فیصل پبلی کیشنز دیوبند ❖ فردوس کتاب گھر بھنڈی بازار ممبئی
- ❖ نیو سلور بک ایجنسی بھنڈی بازار ممبئی ❖ کتب خانہ حسینیہ دیوبند
- ❖ زمزم بک ڈپو دیوبند ❖ توحید بک ڈپو پھول پور اعظم گڑھ
- ❖ مولانا عبد السلام خاں قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، بھنڈی بازار ممبئی

فہرست عنوانات

عنوان صفحہ
- سطورِ اولین ۲۱
- عرضِ ناشر ۲۳

پہلا باب

- ہزارہ کا محاذِ جہاد ۲۹
- ہزارہ کی سرگزشت ۲۹
- سکھوں کی آمد ۳۰
- ہری سنگھ نلوہ ۳۱
- سردارانِ ہزارہ سید صاحب کی خدمت میں ۳۲
- قبولِ دعوت کا شاندار دور ۳۳
- پکھلی کے لئے لشکر ۳۴

دوسرا باب

- شاہ اسماعیل کی تبلیغی سرگرمیاں ۳۶
- مجاہدین کا سفر ۳۶
- مولانا اسماعیل امب میں ۳۷
- عبورِ دریا اور پیش قدمی ۳۹
- مجاہدین اگرور میں ۴۱
- پریشانی در پریشانی ۴۲
- سربلند خاں سے ملاقات ۴۳

عنوان صفحہ
- مولانا کی رائے ۴۴
- خوانینِ ہزارہ کی حالت ۴۵
- ملا محمد اسماعیل اخوندزادہ ۴۶

تیسرا باب

- ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکے ۴۷
- ڈمگلہ پر یورش کی شہرت ۴۷
- شبخون کا فیصلہ ۴۸
- جنگ ۴۸
- مراجعت ۴۹
- جنگِ شنکیاری ۵۰
- مولانا کی عزیمت ۵۱
- ہزارہ سے واپسی ۵۱

چوتھا باب

- غازیوں کے قافلے ۵۳
- غازیوں کا انتظام ۵۳
- ابتدائی قافلوں کی آمد ۵۴
- مزید قافلے ۵۵
- سید طریق کی سرگزشت ۵۶
- سید صاحب کے انتظامات ۵۸
- درۂ پچھار میں استقبال ۵۹

عنوان	صفحہ
مولوی محبوب علی کا معاملہ	۶۰
فتنۂ تفرقہ	۶۱
مولوی محمد حسن کی گفتگو	۶۲
مراجعت کے اثرات	۶۳
آخری دورے کے قافلے	۶۴
ہنڈیاں	۶۵

پانچواں باب

عنوان	صفحہ
خہر میں قیام	۶۶
علاقہ سمہ میں دورے کی تجویز	۶۶
دورے کی کیفیت	۶۷
قیامِ خہر	۶۸
مولانا عبدالحیؒ کی وفات	۶۹
تجہیز و تکفین	۷۱
مولوی عبدالقیوم اور دوسرے اقرب	۷۲
متفرق واقعات	۷۳
سید محمد حیان	۷۵
تیسری شادی	۷۵
سیدہ کی تعلیم	۷۷

چھٹا باب

عنوان	صفحہ
جنگِ اوتمان زئی	۷۹
دُرّانی سرداروں کی کیفیت	۷۹
پشاور پر پیش قدمی کی تجویز	۸۰
خوانین و علمائے سرحد کا فیصلہ	۸۱
داعیانِ خیبر	۸۲
سید صاحب کی روانگی اور فیصلۂ شبخون	۸۳
غازیوں کی پریشانیاں	۸۴
جلالہ میں قیام	۸۵
کامیاب حملہ	۸۶
دن بھر لڑائی	۸۷
صورتِ حال میں تغیر	۸۸
مراجعت کی تدبیر	۸۹
واپسی	۹۰
تنخواہ دار فوج	۹۱

ساتواں باب

عنوان	صفحہ
بیعتِ شریعت	۹۳
بیعتِ اقامتِ شریعت کا فیصلہ	۹۳
مذموم مراسم کا نقشہ	۹۴
فتح خاں اور اشرف خاں کے خطوط	۹۵
پنجتار کے لئے روانگی	۹۶
دعوتِ عام	۹۷
اجتماعِ عظیم	۹۸
استفتا اور اس کا جواب	۹۹
اصلاحِ عام	۱۰۰
اشرف خاں، فتح خاں اور خادے خاں کا بیعت نامہ	۱۰۱
بیعتِ شریعت کی برکات	۱۰۲

عنوان	صفحہ
مجرموں کو سزائیں	۱۰۳
مانیری کا واقعہ	۱۰۳
خادے خاں کی برگشتگی	۱۰۴
ایک سوال	۱۰۵

آٹھواں باب

عنوان	صفحہ
مرکز پنجتار	۱۰۶
سرگزشت پنجتار	۱۰۶
نئے سرے سے آبادی	۱۰۷
تحقیق احوال کی مشکلات	۱۰۷
موقع اور محل	۱۰۸
عام حالات	۱۰۹
گردوپیش	۱۱۰
پرانی آبادی کی کیفیت	۱۱۱
ابتدائی سکونت کا نقشہ	۱۱۱
بیرونی آبادی	۱۱۳
نئی آبادی	۱۱۴
نظام رسد	۱۱۵
متفرق امور	۱۱۵
زندگی کا طریق	۱۱۶
سید صاحب کے ارشادات	۱۱۷
مولوی عبدالوہاب کا واقعہ	۱۱۸
سید محمد اسحاق گورکھپوری کا واقعہ	۱۱۹
فتح خاں پنجتاری کے اخلاق	۱۲۰

نواں باب

عنوان	صفحہ
خادے خاں کا انحراف	۱۲۱
خادے خاں کی غلط اندیشی	۱۲۱
سکھوں سے ساز باز	۱۲۲
لڑائی	۱۲۳
اشرف خاں کی وفات	۱۲۳
جانشینی کا فیصلہ اور خادے خاں	۱۲۴
سکھوں کی آمد	۱۲۴
دنتورا کا خط	۱۲۵
سید صاحب کا جواب	۱۲۶
دنتورا کی واپسی	۱۲۶

دسواں باب

عنوان	صفحہ
تسخیر اٹک کی تجویز	۱۲۸
بیعت شریعت کی برکات	۱۲۸
اٹک پر حملے کی تجویز	۱۲۸
غازیوں کا ارسال	۱۳۰
بھید کھل گیا	۱۳۱
سید عبدالجبار شاہ کا بیان	۱۳۲
مسلمہ حقائق	۱۳۳
مجلس شوریٰ	۱۳۳
اجتماع کا انتظام	۱۳۵
سید صاحب کا خطبہ	۱۳۶
مولانا شاہ اسماعیل کی تقریر	۱۳۸

عنوان	صفحہ
خادے خاں سے بات چیت	١٣٩

گیارھواں باب

عنوان	صفحہ
جنگِ پنجتار	١۴١
دنتورا کی دوبارہ آمد	١۴١
دفاعی انتظامات	١۴٢
دو دیواریں	١۴٣
دشمن کی آمد	١۴۴
موت کی بیعت	١۴۴
شانِ للّٰہیت	١۴٦
سید صاحب کا مقام	١۴٧
جنگی پوشاک	١۴٨
نشان	١۴٩
دنتورا کی نقل و حرکت	١٥٠
ادائے شکر	١٥١

بارھواں باب

عنوان	صفحہ
جنگی پر شبخون	١٥٢
خادے خاں کی اصلاح کیلئے ایک اور کوشش	١٥٢
ملاقات اور گفتگو	١٥٣
کمالِ مایوسی	١٥٣
خوانین میں مصالحت	١٥۴
اسماعیل زئی اور دولت زئی	١٥٥
اہلِ جنگی کا دعوت نامہ	١٥٦
رخنہ اندازی	١٥٧

تیرھواں باب

عنوان	صفحہ
جنگِ ہنڈ	١٥٨
دور کاوشیں	١٥٨
یار محمد خاں	١٥٨
خادے خاں	١٥٩
تین راستے	١٥٩
باطل کی دو صورتیں	١٦٠
ہنڈ پر حملے کی تیاری	١٦١
سفر کی صعوبتیں	١٦٢
حملے کی نئی اسکیم	١٦٣
قلعے کے دروازے پر قبضہ	١٦٥
خادے خاں کا قتل	١٦٦
قلعے میں غازیوں کا حسنِ انتظام	١٦٧
خان کی تدفین	١٦٨
اقربا کی دو دِلی	١٦٩

چودھواں باب

عنوان	صفحہ
از ہنڈ تا زیدہ	١٧٠
آتشِ فتنہ کا اشتعال	١٧٠
غازیوں پر اچانک حملہ	١٧١
مقرب کا فرار اور فتح خاں کی سرداری	١٧٣
سید صاحب کی خواہش	١٧٣
یار محمد خاں کے مقاصد	١٧٥

عنوان صفحہ
- غازیوں سے چپقلشیں ۱۷۵
- ہندوستانی غازیوں کی چابک دستی ۱۷۶
- ایک دردناک حادثہ ۱۷۷

پندرہواں باب

- جنگ زیدہ ۱۷۹
- یار محمد خاں کی تدبیریں ۱۷۹
- پیام مصالحت ۱۸۰
- قلندر کا واقعہ ۱۸۱
- لشکروں کی کیفیت ۱۸۲
- جنگ کے مشورے ۱۸۳
- آخری حکم ۱۸۴
- سواروں سے مڈبھیڑ ۱۸۵
- جنگ کی کیفیت ۱۸۶
- یار محمد کا انجام ۱۸۷
- کارنامے کی حیثیت ۱۸۸
- زیدہ کے حالات ۱۸۸
- سفر مراجعت ۱۹۰
- جنگ زیدہ کی تاریخ ۱۹۰
- اہم کاغذات ۱۹۱
- ملکیوں کو تفہیم ۱۹۲
- مال غنیمت کی تقسیم ۱۹۲
- سلطان محمد خاں کی پریشانیاں ۱۹۳
- جنگی فنون کی مشق ۱۹۴

عنوان صفحہ
- رسالداری کی تجویز ۱۹۴
- اہم تقرر ۱۹۵

سولہواں باب

- تربیلہ، ستھانہ اور امب ۱۹۷
- تربیلے پر حملے کی دعوت ۱۹۷
- سید صاحب کی روانگی ۱۹۸
- سکھوں کی آمد ۱۹۹
- متفرق چپقلشیں ۱۹۹
- سادات ستھانہ ۲۰۰
- ستھانہ کی سرگزشت ۲۰۲
- سید اکبر شاہ ۲۰۳
- ستھانہ میں مشورے ۲۰۳
- تنولیوں کی داستان ۲۰۴
- نواب خاں ۲۰۶
- پائندہ خاں ۲۰۶
- سید صاحب کا ارشاد ۲۰۷
- ملاقات کا فیصلہ ۲۰۸

سترھواں باب

- پائندہ خاں کی فرمانبرداری اور سرکشی ۲۰۹
- ملاقات ۲۱۱
- خان کی پریشانی ۲۱۲
- مراجعت ۲۱۳
- ہنڈ پر حملہ ۲۱۴

عنوان	صفحہ
غازیوں کی جوانمردی	۲۱۵
سید صاحب کے عزائم	۲۱۶
پائندہ خاں کی مزاحمت	۲۱۶
تسنیم کی مساعی	۲۱۷
سید صاحب چنئی میں	۲۱۹
مولانا کی روانگی	۲۲۰

اٹھارہواں باب

عنوان	صفحہ
عشرہ اور امب کی جنگیں	۲۲۱
مقامات کا نقشہ	۲۲۱
فریقین کی فوجیں	۲۲۲
جنگی اسکیمیں	۲۲۳
فریب صلح	۲۲۳
فریب کھل گیا	۲۲۵
کوہ کنیر ڑی پر حملہ	۲۲۵
جنگ	۲۲۶
غیبی امداد	۲۲۷
عشرہ اور کوٹلہ پر قبضہ	۲۲۸
ستھانہ کے غازی	۲۲۹
امب کی حوالگی	۲۳۰
چھتر بائی	۲۳۱
پنجتار سے توپیں منگائی گئیں	۲۳۱
ایک افسوسناک واقعہ	۲۳۲
غازیوں کی شانِ ایثار	۲۳۳
غازی کھیل بائی میں	۲۳۴
پائندہ خاں کی اطاعت	۲۳۵
شرائط صلح	۲۳۶

انیسواں باب

عنوان	صفحہ
جنگ پھولڑہ	۲۳۸
پیش قدمی کے مقدمات	۲۳۸
قادر آباد کا غیر مسلم قلعدار	۲۳۹
پھولڑہ پر یورش کا فیصلہ	۲۳۹
لشکر اسلام کی پیش قدمی	۲۴۱
پھولڑہ کا موقع	۲۴۲
پائندہ خاں کا اضطراب	۲۴۳
شبخون کی افواہ	۲۴۳
غازیوں کے ڈیروں کا مقام	۲۴۴
جنگ	۲۴۴
تاریخ تولیاں کا بیان	۲۴۵
شہداء	۲۴۷
سید احمد علی اور میر فیض علی	۲۴۷
مولوی محمد حسن، میرزا عبدالقدوس اور رحیم بخش جراح	۲۴۸
میر احمد علی، انام خاں اور برکت اللہ	۲۴۹
اڑدر اور محمد خاں	۲۵۰
غلط بیانات	۲۵۰
غم نامہ شہادت	۲۵۱

عنوان صفحہ
- پسماندگانِ شہدا کی دلداری ۲۵۲
- پائندہ خاں اور خوانین اگرور ۲۵۳

تیسواں باب

- امب میں قیام کے حالات ۲۵۴
- دینی احکام کا اجرا ۲۵۴
- اصلاحِ اخلاق ۲۵۵
- چھلیلہ ڈاکو ۲۵۵
- سید صاحب کی سعیِ مشکور ۲۵۶
- سکھوں کے قافلۂ رسد پر حملہ ۲۵۷
- کھیتی باڑی ۲۵۸
- آم ۲۵۸
- دو دھاڑے ۲۵۹
- دریا سے پانی لانے کا واقعہ ۲۶۰
- اطاعتِ امام ۲۶۱
- لاہوری سائیس اور عنایت اللہ کا معاملہ ۲۶۲
- مقدمہ قاضی کی عدالت میں ۲۶۳
- لاہوری کی شانِ اخوت ۲۶۴
- ایک لطیفہ ۲۶۴
- حقِ سیادت ۲۶۵
- پائندہ خاں کی زنبورکیں ۲۶۶
- مولوی جعفر علی نقوی کی عزیمت ۲۶۷
- غازیوں کی شانِ سبقت بالخیرات ۲۶۸

عنوان صفحہ
- شنو اسماعیل کا واقعہ ۲۶۸
- منشی مہتاب رائے کی حق گوئی ۲۶۹
- کاروبارِ جہاد اور ملا و سادات ۲۷۰
- ایک دلچسپ مناظرہ ۲۷۱
- تفسیر "صبر" ۲۷۲
- شیخ داراب کا واقعہ ۲۷۳
- حروفِ مقطعات اور مسئلۂ عشر ۲۷۳
- مسئلۂ عفو حقوق ۲۷۳

اکیسواں باب

- سکھوں کا پیغامِ مصالحت ۲۷۵
- پیغامِ مصالحت ۲۷۵
- وکیل بھیجنے کا فیصلہ ۲۷۶
- ملاقات ۲۷۷
- غلط فہمی کا ازالہ ۲۷۸
- ارکانِ اسلام ۲۷۸
- جہاد فی سبیل اللہ ۲۷۹
- سامان اور بے سامانی ۲۸۰
- تجویزِ مصالحت ۲۸۲
- گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے ۲۸۳
- ختمِ ملاقات ۲۸۳
- قصدِ حملہ اور مراجعت ۲۸۳

بائیسواں باب

- سمہ میں انتظامِ عشر ۲۸۵

عنوان	صفحہ
قاضی سید محمد حبان کی تجویز	۲۸۵
قاضی صاحب کی روانگی	۲۸۵
خوانین کا اتفاق	۲۸۶
ملاؤں سے گفتگو	۲۸۷
دورہ شروع ہو گیا	۲۸۸
صلح و اطاعت	۲۸۹
رسالدار کی تجویز	۲۹۰
ہنڈ پر قبضہ	۲۹۱
قلعہ ڈھانے کی تجویز	۲۹۱
توسیع حلقہ اطاعت	۲۹۳
ایک لطیفہ	۲۹۳
احمد خاں کمال زئی کا انحراف	۲۹۴
ناظموں کا تقرر	۲۹۴
رسالدار کی حق شناسی	۲۹۶
تیئیسواں باب	
جنگ مردان	۲۹۸
مردان کی جانب پیش قدمی	۲۹۸
حملے کی اسکیم	۲۹۹
مولوی مظہر علی کی شان صبر و ہمت	۲۹۹
ہوتی پر حملہ	۳۰۰
مردان پر ہجوم	۳۰۰
قاضی حبان کی شہادت	۳۰۱
سرحد کا مخلص ترین عالم	۳۰۲
مردان کی روانگی	۳۰۲
مولانا کے انتظامات	۳۰۳
امان زئی، پنجتار اور اسب	۳۰۴
چوبیسواں باب	
سرداران پشاور کا نیا فتنہ	۳۰۵
سلطان محمد خاں	۳۰۵
احمد خاں کمال زئی کی حرکت	۳۰۵
سید صاحب کے انتظامات	۳۰۶
مخالفوں کے ہنگامے	۳۰۷
سید صاحب کا فرمان	۳۰۸
دو تصریحات	۳۱۰
سلطان محمد خاں کو خط	۳۱۱
مزید نامہ و پیام	۳۱۱
ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ	۳۱۲
اسلامی ہند کی تاریخ کا دردناک ترین منظر	۳۱۳
مولانا کی تشریف آوری	۳۱۴
غازیوں کے درجات	۳۱۴
ایک انوکھا واقعہ	۳۱۵
انتباہ اور معافی	۳۱۶
پچیسواں باب	
جنگ مایار (۱)	۳۱۷
میدان جنگ	۳۱۷

عنوان	صفحہ
پہلی جھڑپ	٣١٧
صبح جنگ	٣١٨
فریقین کی جنگی قوت	٣١٩
کالے خاں شمس آبادی	٣٢٠
پیادوں اور سواروں میں ادل بدل	٣٢١
سید صاحب کا لباس	٣٢١
جنگ کا آغاز	٣٢٢
رجز خوانی	٣٢٣
"منظورہ" کا بیان	٣٢٣
"وقائع" کا بیان	٣٢٥
سواروں کا انتشار	٣٢٥
توپوں پر یورش	٣٢٦
درانیوں کا دوسرا حملہ	٣٢٦
تیسرا حملہ	٣٢٧
مولانا خطرے میں	٣٢٧
جنگ کا خاتمہ	٣٢٨
زخمیوں اور شہیدوں کے متعلق ہدایات	٣٢٩
بقیہ لاشیں	٣٢٩
تورو میں تدفین	٣٣٠
دعاء	٣٣١

چھبیسواں باب

عنوان	صفحہ
جنگ مایار (٢)	٣٣٢
غازیوں کی شجاعت کے چند مناظر	٣٣٢
کالے خاں شمس آبادی	٣٣٣
سید ابو محمد نصیر آبادی	٣٣٤
شہادت	٣٣٤
عبد الرحمٰن ونئی	٣٣٥
شیخ محمد اسحاق گورکھپوری	٣٣٦
ارشادِ نبویؐ کی تصدیق	٣٣٦
شیخ امیر اللہ تھانوی	٣٣٧
رسالدار عبد الحمید خاں	٣٣٧
سید موسیٰ	٣٣٨
خادے خاں کا بیان	٣٣٩
سید صاحب کے ارشادات	٣٣٩
سید موسیٰ کی شانِ صبر	٣٤٠
ایک ملکی غازی	٣٤١
لذیت	٣٤٢
مرہم پٹی	٣٤٢

﴿ضمیمہ﴾

عنوان	صفحہ
رسالہ جہادیہ	٣٤٣

ستائیسواں باب

عنوان	صفحہ
پشاور کی جانب اقدام	٣٤٧
مردان جانے کا حکم	٣٤٧
مردان کے حالات	٣٤٨
مصالحت	٣٤٨
سید صاحب کی روانگی	٣٤٩

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
غازیوں کا پاسِ عہد	۳۵۰	**انتیسواں باب**	
سید صاحب اور مولانا	۳۵۱	پشاور میں مشغولیتیں	۳۷۰
پیش قدمی	۳۵۲	سرداروں کا پیغام	۳۷۰
منزلیں	۳۵۳	مولانا سے ملاقات	۳۷۰
کھانے کی تنگی	۳۵۳	سید صاحب سے ملاقات	۳۷۲
اٹھائیسواں باب		عشر کا مسئلہ	۳۷۳
درانیوں سے مصالحت	۳۵۵	متفرق واقعات	۳۷۵
پیغامِ مصالحت	۳۵۵	مراجعت	۳۷۷
سید صاحب کا جواب	۳۵۶	مسئلہ انتظام عشر	۳۷۷
آخری فیصلہ	۳۵۶	اصلاحِ معاشرت	۳۷۸
پشاور میں داخلہ	۳۵۷	مولانا کا واقعہ	۳۷۹
سید صاحبؒ کی قیام گاہ	۳۵۸	قاضی القضاۃ کا تقرر	۳۸۰
غازیوں کی حق شناسی	۳۵۹	سفارت باجوڑ	۳۸۰
گفتگوئیں اور مشورے	۳۶۰	حافظ سے علمی گفتگو	۳۸۱
مسئلہ حوالگی پشاور	۳۶۱	رکاوٹ	۳۸۲
سید صاحب کا ارشاد	۳۶۲	مراجعت	۳۸۳
ارباب کی پیشکش	۳۶۳	**تیسواں باب**	
ایک سیٹھ کا معروضہ	۳۶۴	خوفناک سازش کا جال	۳۸۴
زمان شاہ درانی کی رائے	۳۶۴	روشن امیدیں	۳۸۴
معاملے کی حقیقت	۳۶۵	حسرت و افسوس	۳۸۴
صحیح راہِ عمل	۳۶۷	سرداروں اور ملاؤں کی سازش	۳۸۵
مولانا عبیداللہ مرحوم کا اعتراض	۳۶۸	دینی تجربہ	۳۸۶
		حقیر اغراض کیلئے اسلام دشمنی	۳۸۷

عنوان	صفحہ
فتنے کی ابتدا	۳۸۸
غلط بیانیاں	۳۸۹
مولانا شاہ اسماعیل کا مکتوب	۳۹۰
مسئلہ نفاق	۳۹۱
مخلصین کی اطلاعات	۳۹۲
آتشِ بغاوت کے ابتدائی شعلے	۳۹۳
غازیوں کی کیفیت	۳۹۴
طلبی کا فرمان	۳۹۵
فیصلۂ قضا و قدر	۳۹۶

اکتیسواں باب

عنوان	صفحہ
مشہدِ اکبر (۱)	۳۹۸
اسماعیلہ	۳۹۹
"شندروس کوپی"	۳۹۹
موضع شیوہ	۴۰۰
گاؤں کا محاصرہ	۴۰۱
شیخ گلاب کا بیان	۴۰۱
حافظ عبد العلی	۴۰۲
ترلانڈی	۴۰۲
لکھمیر خاں کی صاف گوئی	۴۰۳
میلئی	۴۰۳
پنجتار میں ورود	۴۰۴
گودام اور اس کے نگہبان	۴۰۵
اقدام اور حملہ	۴۰۵
گودام کے غازیوں کی کیفیت	۴۰۶
ملا کی نیک دلی	۴۰۷
یوسف علی خاں	۴۰۷
مسجد پر یورش	۴۰۸
کربلا زار	۴۰۹
حبیب خاں بونیر وال	۴۰۹
ظلم کی تیرگی میں نیکی کی کرنیں	۴۱۰
غازیوں کا داعیۂ قربانی	۴۱۰
سید صاحب کی سعیٔ جہاد	۴۱۱

بتیسواں باب

عنوان	صفحہ
مشہدِ اکبر (۲)	۴۱۲
مولوی خیر الدین شیرکوٹی	۴۱۲
حادثۂ پشاور کی اطلاع	۴۱۳
رفیقوں سے مشورہ اور ہدایات	۴۱۳
ملکوں کی آمد	۴۱۴
انتظامات	۴۱۵
روانگی اور منزلِ مقصود	۴۱۶
سفر کے شدائد	۴۱۶
پڑان غار میں قیام	۴۱۷
سفرِ پنجتار	۴۱۸
سدم کے حالات	۴۱۹
سنگ دلی کی حد ہوگئی	۴۲۰
حافظ الٰہی بخش کی سرگزشت	۴۲۱

عنوان صفحہ
- سید صاحب کے پاس پہنچنے کی تدبیر ۴۲۱
- سید صاحب کی تربیت ۴۲۲
- موقع عبرت ۴۲۳
- شہدا کی تعداد ۴۲۴

تینتیسواں باب

- عزم ہجرت ثانیہ ۴۲۵
- اہلِ سمہ سے بیزاری ۴۲۵
- فتح خاں پنجتاری ۴۲۶
- مخلصین کا اجتماع ۴۲۷
- بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلُوْا ۴۲۷
- سید میاں کا دورہ برائے تحقیق ۴۲۸
- مجرموں کے بیانات ۴۲۹
- قصد ہجرت ۴۲۹
- ملا شیر اور مولوی خیر الدین ۴۳۰
- سید صاحب کا ارشاد ۴۳۱
- فتح خاں پنجتاری کو جواب ۴۳۲
- راستے کا مسئلہ ۴۳۳
- سید صاحب کا خطبہ ۴۳۳
- ارباب بہرام خاں ۴۳۴
- احباب سندھ کو ہدایت ۴۳۵
- ازواج کو وصیت ۴۳۶
- مسلمان کا موقف ۴۳۷
- نئی بیعت ۴۳۸

چونتیسواں باب

- پنجتار سے راج دواری ۴۳۹
- روانگی ۴۳۹
- زائرین کا ہجوم ۴۴۰
- حرم محترم اور سید موسیٰ ۴۴۰
- سید صاحب کا سفر ۴۴۱
- امب اور چھتر بائی کے مجاہدین ۴۴۲
- پائندہ خاں کے حملے کا اندیشہ ۴۴۳
- سکھوں کا پیغام ۴۴۴
- گڑھی کا تخلیہ ۴۴۵
- چھتر بائی کے حالات ۴۴۵
- عشرہ سے بڑھیری ۴۴۶
- شہزادہ خاں رئیس ڈگر ۴۴۷
- فتح خاں کی گزارش ۴۴۷
- اگلی منزلیں ۴۴۸
- مدت مسافت ۴۴۹
- شاہ اسماعیل کا واقعہ ۴۴۹
- راج دواری کی تجویز کے وجوہ ۴۵۰
- بھوگڑ منگ روکنے کا فیصلہ ۴۵۰
- مولانا اسماعیل اور مولوی خیر الدین ۴۵۱
- بیعت اہل صفہ ۴۵۲
- شیخ محمد اسحاق گورکھپوری ۴۵۳
- خدائی انتقام ۴۵۳

پینتیسواں باب

عنوان	صفحہ
● بالاکوٹ اور پچوں	۴۵۵
● امداد کی درخواستیں	۴۵۵
● مولوی خیر الدین بالاکوٹ میں	۴۵۶
● خوانین کی تجویز	۴۵۷
● مولانا کا سفر بالاکوٹ	۴۵۷
● مولانا کی بے بسی	۴۵۸
● لشکر مظفر آباد بھیجنے کا فیصلہ	۴۵۹
● بالاکوٹ میں دینی مشغولیتیں	۴۶۰
● سید صاحب پچوں پہنچ گئے	۴۶۰
● خطبہ	۴۶۱
● ضامن شاہ کا غانی	۴۶۲
● تجویز شبخون	۴۶۳
● سید صاحب کا فرمان	۴۶۴
● مولانا کی رائے	۴۶۵
● اہل کشمیر کا وفد	۴۶۵
● غربا پر شفقت	۴۶۶
● درس مشکوٰۃ	۴۶۷
● مقصد و نصب العین	۴۶۸
● دعائیں	۴۷۰

چھتیسواں باب

عنوان	صفحہ
● جنگ مظفر آباد	۴۷۱
● زبردست خاں کی عہد شکنی	۴۷۱
● اچانک یورش	۴۷۱
● گوگو کی حالت	۴۷۲
● دشمن کی آمد	۴۷۳
● فرار	۴۷۳
● سفر مراجعت	۴۷۴
● وقت گذر گیا	۴۷۶
● سید صاحب کے حالات	۴۷۶
● بی بی صاحبہ کو آخری پیغام	۴۷۷
● معیت کا اضطراب	۴۷۷
● پچوں سے روانگی	۴۷۸
● مولانا کا وعظ	۴۷۸
● پہاڑ پر مقام	۴۷۹
● یاد خدا	۴۷۹
● طبیعت میں تغیر	۴۸۰
● سہائی کا خدا ساز بندوبست	۴۸۱

سینتیسواں باب

عنوان	صفحہ
● رزمگاہ بالاکوٹ کا نقشہ	۴۸۲
● بالاکوٹ	۴۸۲
● راستے کی کیفیت	۴۸۳
● گڑھی سے بالاکوٹ تک	۴۸۴
● بالاکوٹ کا حلقہ	۴۸۶
● قصبہ	۴۸۷
● مساجد	۴۸۸

عنوان صفحہ

- مسجد بالا سید صاحب کے زمانے میں ۴۸۹
- مکانات ۴۹۰
- نالے ۴۹۱
- گردوپیش ۴۹۱
- مشاہد ۴۹۲
- پل ۴۹۳

اڑتیسواں باب

- دفاعی انتظامات ۴۹۴
- شیر سنگھ کی نقل وحرکت ۴۹۴
- دفاعی مورچے ۴۹۴
- سکھ لشکرگاہ ۴۹۵
- پہاڑی پگڈنڈی ۴۹۶
- ضروری تصریحات ۴۹۸
- سید صاحبؒ کا آخری خط ۴۹۹
- پہاڑی مورچے ۴۹۹
- میرزا کے لئے کمک ۵۰۱
- نجف خاں کا خط ۵۰۲
- پل توڑ دیا ۵۰۳
- ارباب بہرام خاں ۵۰۳
- لاہور یا جنت الفردوس ۵۰۳
- بچاؤ کے وسائل ۵۰۵
- شجاعت وتدبیر میں تصادم ۵۰۶
- موازنۂ مضار ومنافع ۵۰۶

عنوان صفحہ

انتالیسواں باب

- زندگی کی آخری رات اور آخری صبح ۵۰۸
- لڑائی کی اسکیم ۵۰۸
- مورچہ بندی ۵۰۹
- لباس اور استراحت ۵۱۰
- صبح شہادت ۵۱۰
- دندانہ دار کنگڑاے ۵۱۱
- مولوی احمد اللہ ناگپوری کی دعوت ۵۱۲
- توشہ خانہ اور مہریں ۵۱۳
- سکھوں کا ظہور ۵۱۴
- یوم بالاکوٹ کا پہلا شہید ۵۱۴
- صرف رضائے خدا ۵۱۵
- نجف خاں کو جواب ۵۱۶
- اجتماعی حملے کا فیصلہ ۵۱۶
- مسجد بالا کے پاس کا مورچہ ۵۱۸
- مسجد بالا سے مسجد زیریں میں ۵۱۹

چالیسواں باب

- آغاز جنگ ۵۲۰
- مسجد زیریں سے حملہ ۵۲۰
- ”منظورہ“ کا بیان ۵۲۱
- ضروری تصریحات ۵۲۳
- لعل محمد جگدیش پوری ۵۲۳
- کریم اللہ خاں میواتی ۵۲۳

عنوان صفحہ

- حافظ وجیہ الدین باغپتی ۵۲۵
- شیخ حفیظ اللہ دیوبندی ۵۲۶
- شیر محمد خاں رام پوری ۵۲۷
- رحیم بخش بناری ۵۲۷
- میاں لکھمیر ۵۲۸
- میاں عبدالقیوم اور محمد امیر خاں قصوری ۵۳۰
- مولوی سید جعفر علی ۵۳۱
- بیانات کا خلاصہ ۵۳۲

اکتالیسواں باب

- شہادت ۵۳۳
- روایات میں اضطراب کی وجہ ۵۳۴
- "منظورہ" کا بیان ۵۳۵
- متفرق بیانات ۵۳۶
- کریم اللہ خاں سیواتی اور نجم الدین شکارپوری ۵۳۷
- رحیم بخش بناری اور میاں لکھمیر ۵۳۸
- روایات کی کیفیت ۵۳۸
- الٰہی بخش رام پوری ۵۳۹
- میدان میں سید صاحب کا مقام ۵۴۰
- شیخ حفیظ اللہ دیوبندی ۵۴۱
- حافظ وجیہ الدین باغپتی ۵۴۲

عنوان صفحہ

- بابا بہرام خاں تنولی اور سید جعفر علی نقوی ۵۴۳
- خلاصہ مطالب ۵۴۴
- کیفیت شہادت ۵۴۵
- فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ؟ ۵۴۶

بیالیسواں باب

- مشہد بالاکوٹ ۵۴۸
- غازیوں کی بے قراری ۵۴۸
- تدبیر دفاع ۵۴۹
- پن چکیوں میں مورچے کا قصد ۵۴۹
- میاں عبدالقیوم ۵۵۰
- دوسری روایات ۵۵۲
- آواز کس نے دی؟ ۵۵۳
- ابتدائی اسکیم کے ترک کا مسئلہ ۵۵۳
- مولانا شاہ اسماعیل ۵۵۴
- شہادت کہاں ہوئی؟ ۵۵۵
- ارباب بہرام خاں ۵۵۶
- علاؤ الدین، محمدی اور بلند بخت ۵۵۶
- نور احمد نگرامی ۵۵۷
- حفیظ اللہ دیوبندی ۵۵۷
- الٰہی بخش رام پوری ۵۵۸
- امام الدین بڑھانوی ۵۵۸
- محمود خاں لکھنوی ۵۵۸

عنوان — صفحہ
- کریم اللہ خاں میواتی ۵۵۹
- مہربان خاں ۵۵۹
- جماعت خاص ۵۶۰
- ایک پانی پتی نوجوان ۵۶۰
- شیخ محمد اسحاق گورکھپوری ۵۶۱
- کریم بخش کا بیان ۵۶۱
- متفرق اصحاب ۵۶۲
- غازیوں کا نقصانِ جان ۵۶۲
- غازیوں کی تدفین ۵۶۳
- شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں ۵۶۳
- بیش بہا چیزیں ۵۶۵

ضمیمہ

- شہدا کی فہرست ۵۶۷

تینتالیسواں باب

- سید صاحب کا مدفن ۵۷۰
- غازیوں کا رنج و غم ۵۷۰
- ایک غلط اطلاع ۵۷۱
- شیخ وزیر کے صاحبزادے کا بیان ۵۷۱
- تحقیق کا نتیجہ ۵۷۲
- مدفن ۵۷۳
- اختلاف ۵۷۳
- اکالیوں کی وحشت ۵۷۴
- وحشت کا سبب ۵۷۵

عنوان — صفحہ
- سر اور تن کی جدائی ۵۷۵
- موجودہ قبر ۵۷۶
- سید صاحب کی پیشگوئیاں ۵۷۷
- سید صاحب کی تصویر ۵۷۸

چوالیسواں باب

- عقیدۂ غیبوبت ۵۸۰
- شہادت کے متعلق اشتباہ ۵۸۰
- امید حیات کے اسباب ۵۸۱
- زندگی اور اس کا نصب العین ۵۸۱
- سید صاحب کا ارشاد ۵۸۲
- اکابر صادق پور کا عقیدہ ۵۸۴
- دو سوال ۵۸۵
- قائلین غیبت کی رائیں ۵۸۵
- مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان ۵۸۷
- شہادت کے حق میں شہادتیں ۵۸۹
- مزید شہادتیں ۵۹۱
- دعوتِ غور و فکر ۵۹۵
- مولوی محمد جعفر کا آخری بیان ۵۹۶

پینتالیسواں باب

- ازواج و اولاد ۵۹۷
- سیدہ زہرہ ۵۹۷
- سیدہ ولیہ ۵۹۸
- سیدہ فاطمہ ۶۰۰

عنوان — صفحہ
دختری اولاد ۲۰۰
اولادِ سیدہ سارہ ۲۰۱
اولاد سیدہ ہاجرہ ۲۰۲

چھیالیسواں باب

اخلاق و عادات ۲۰۳
ضروری گزارش ۲۰۳
نواب وزیر الدولہ کا بیان ۲۰۴
نواب صدیق حسن خاں ۲۰۴
حکیم مہدی علی ۲۰۵
جسمانی قوت ۲۰۶
فنونِ حرب ۲۰۷
مقصود و نصب العین ۲۰۸
خدمتِ خلق ۲۰۸
اپنے ہاتھ سے کام ۲۰۹
اتباعِ سنت ۲۱۰
مساوات ۲۱۱
عبادت و ریاضت ۲۱۲
رضا بہ قضا ۲۱۲
عفو و درگذر ۲۱۳
حلم و حیا اور مروت ۲۱۳
عفت ۲۱۴
شجاعت ۲۱۴
عنوان — صفحہ
فراست ۲۱۵
سخاوت ۲۱۵
صبر و استقامت ۲۱۶
توکل ۲۱۶
غازیوں پر شفقت ۲۱۸
جانوروں پر رحم ۲۱۹
دعائے ہدایت ۲۱۹
صحبت کی تاثیر ۲۲۰
طریق نصیحت ۲۲۰
طریق خطاب ۲۲۱
پاسِ شریعت کا ایک عجیب واقعہ ۲۲۱
اعترافِ خطا ۲۲۲
کارگیری اور احترام ۲۲۲
مہر اور تاکید کی علامات ۲۲۳
عادات ۲۲۳
مرغوب کھانا ۲۲۳
معمولات ۲۲۴
اشعار ۲۲۵
تصانیف ۲۲۵
شخصیت ۲۲۷

عنوان — صفحہ

﴿ضمیمہ﴾

سینتالیسواں باب

- جنگ بالاکوٹ پر نئی روشنی (۱) ۶۲۸
- تمہید ۶۲۸
- مصنف اور وجہ تصنیف ۶۲۹
- پائندہ خاں تنولی اور سید صاحبؒ ۶۳۰
- شیر سنگھ کا تقرر ۶۳۱
- مشورہ اور فیصلہ ۶۳۱
- مظفرآباد کا محاصرہ ۶۳۲
- سید صاحبؒ سے مقابلے کی تدبیریں ۶۳۳
- شبخون کی اطلاع ۶۳۴
- شیر سنگھ کی نقل و حرکت ۶۳۶
- جاسوسوں کا انجام ۶۳۶

﴿ضمیمہ﴾

اڑتالیسواں باب

- جنگ بالاکوٹ پر نئی روشنی (۲) ۶۳۸
- بالاکوٹ پہنچنے کا فیصلہ ۶۳۸
- اختیار کردہ راستہ ۶۳۹
- پانی کا مسئلہ ۶۴۰
- سکھوں کی مجلس شوریٰ ۶۴۱
- جنگ ۶۴۳
- ایک عقدے کا حل ۶۴۳
- سراسیمگی کا روشن ثبوت ۶۴۴
- شہادت گاہ بالاکوٹ ۶۴۵
- ضروری تصریحات ۶۴۶
- سکھوں کی آخری افسوسناک حرکت ۶۴۷

﴿ضمیمہ﴾

انچاسواں باب

- مدفن اور بعد کی کیفیت ۶۴۸
- شہادت یا غیوبت ۶۴۸
- معائنۂ میدانِ جنگ اور میت سیدؒ ۶۴۹
- سر کی تلاش ۶۵۰
- سرمۂ بصیرت ۶۵۱
- تجہیز و تدفین ۶۵۲
- میت کا اخراج ۶۵۲
- دو نئی باتیں ۶۵۳
- جنگ بالاکوٹ کی تاریخ ۶۵۳

* * *

سطورِ اولین

بسم اللّٰہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ الیٰ یوم القیامۃ۔

مجاہد کبیر حضرت مولانا ومقتدانا سید احمد شہید رحمہ اللہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ آفتاب نیم روز اور مینارۂ نور ہیں جن کی مثال گزشتہ کئی صدیوں میں نہیں ملتی۔ اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور پرچم اسلام کی بلندی کے لئے آپ کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں اور مشعلِ راہ ہیں۔

مجھے آپ کی زندگی کے قیمتی لمحات اور مجاہدات پر روشنی ڈالنا مقصد نہیں، کہ یہ کام ضخیم مجلدات کا متقاضی ہے اور الحمد للہ اب تک ہزاروں صفحات اس حکایتِ لذیذ اور روح پرور داستان میں مرقوم ہو کر تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی مرتب کردہ دو ضخیم جلدیں "سیرت سید احمد شہیدؒ" گذشتہ تقریباً نصف صدی سے اہل علم وفدا کارانِ اسلامیت سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "سید احمد شہیدؒ" حضرت مولانا غلام رسول مہرؔ کے اعجاز رقم قلم کا شاہکار ہے۔ یہ دراصل مولانا مہر کے اس "زریں سلسلہ" کی پہلی کڑی ہے جو انھوں نے حضرت سید احمد شہید، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کے حالات ومجاہدانہ کارناموں کے بیان میں مرتب کی ہے۔

حضرت مولانا غلام رسول مہر کی تحریر فرمودہ کتابوں (سید احمد شہید اول-دوم، جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین) تقریباً ایک صدی کی تاریخ ہے جو مجاہد کبیر، ان کی تحریک اور ان کے جانباز رفقاء کے حالات ومجاہدات اور خدمات کو منظر عام پر لانے میں نمایاں اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ یہ ایسی تاریخ ہے جس میں تاریخ نویس خود اس تاریخ کا ایک حصہ اور مشاہد محسوس

ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا مہر نے ان کتابوں کو صرف داستان برائے داستان اور حکایات و روایات اور کتابوں کی مدد سے مرتب نہیں کیا بلکہ بذاتِ خود ان تمام مواضعات، متعلقہ منازل، مقامات جنگ و جہاد، مشاہد اور رہ گذروں کا مشاہدہ کیا، برسوں ان علاقوں کی دشت نوردی اور پیما سرائی کی جہاں ان مبارک نفوس کے قدم پڑے، جہاں انھوں نے اس بلند مقصد کے لئے لیل و نہار گزارے، جہاں انھوں نے جہادِ آزادی اور سربلندیٔ اسلام کے لئے اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی تمام صلاحیتیں صرف کیں اور حد یہ ہے کہ بیشتر نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی یعنی جامِ شہادت نوش کرکے اُس حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہوئے جو عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ کے پروانۂ خاص کا حقدار بناتی ہے۔

مولانا مہر کا اسلوب و بیان ادبیت و دلکشی اور جاذبیت و محویت سے ایسا پُر ہے جس سے مطالعہ کنندہ نہ صرف اپنے آپ کو ان مقامات میں موجود محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے اندر اعلائے کلمۃ اللہ اور سربلندیٔ اسلام کیلئے ایک جذبہ جوش مارتا ہوا پاتا ہے۔ انھوں نے اس تاریخ کو برسہا برس کی محنت سے لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید کے اس مشن اور تحریک میں خود ڈوب کر اور اس میں خود کو محو کرکے لکھا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ وہ ان فدایانِ اسلام کی خدماتِ عالیہ اور جذبۂ مقدس کو سلام عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ کتابیں (سید احمد شہید، جماعتِ مجاہدین، سرگزشتِ مجاہدین) پچھلے کافی عرصہ سے ہندوستان میں نایاب ہو چکی تھیں، میری ایک عرصہ سے خواہش تھی یہ سیریز شائع ہو کر اہل علم اور شائقین حضرات کے لئے دستیاب ہونی چاہئے۔ کیونکہ بقول مولانا غلام رسول مہر، اگر اس عظیم تحریک کو تاریخ ہند سے نکال دیا جائے تو پھر اسلامی جدوجہد کے حوالہ سے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟ ہمیں اپنے اسلاف کرام کے ان مجاہدانہ کارناموں کی سرگزشت کو ہمیشہ اپنے سینوں سے لگا کر رکھنے اور مواقع و حالات کے مطابق ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ عزیز محترم مولانا شمشیر احمد قاسمی نے میری خواہش و اصرار پر اس کام کا

بیڑا اٹھایا۔ پرانے ایڈیشنوں میں اغلاط بھی تھیں، ساتھ ہی کتابت میں یکسانیت اور جاذبیت بھی نہ تھی، اس لئے بہتر یہ معلوم ہوا کہ از سر نو کتابت کرا کر اس سیریز کو نئی آب و تاب کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جائے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اب اس سیریز کو ایک نیا نام دیا گیا ہے یعنی ''تحریکِ سید احمد شہیدؒ'' جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگی، ٹائٹل اور اندر صفحات کے بالائی حصہ پر اس نئے نام کے ساتھ ساتھ پرانے ناموں کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔

میں جناب مولانا شمشیر احمد قاسمی کو مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ میں مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کی تصحیح کی خدمت کو سراہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ رب کریم ہمیں بھی ان پاک نفوس کے جذبۂ اسلامیت اور عشقِ الٰہی کا کوئی حبہ اور حصہ نصیب عطا کر کے اپنی راہ رضا پر چلنے توفیق ارزانی کرے اور اس فرشتہ صفت جماعت کی معیت نصیب فرمائے، آمین

الراقم
شمس الحق قاسمی
مکتبہ الحق (ممبئی)

عرضِ ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ الطیبین الطاھرین وصحبہ اجمعین۔

مقامِ مسرت ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وخدمات، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کی سرگزشت پر مشتمل یہ عظیم سیریز کتب (سید احمد شہید ہر دو جلد، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین) جدید عنوان "تحریک سید احمد شہید" کے ساتھ شائع کرنے کی مجھے ایسے موقع پر سعادت حاصل ہو رہی ہے جب کہ ملک میں جدوجہد آزادی ہند کی ڈیڑھ سو سالہ سالگرہ حکومتی سطح پر بڑے جوش وخروش سے منائی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں ہمارے اسلاف کرام کی قربانیوں کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف افسوسناک اور قابل مذمت ہے بلکہ ملت کے رہنماؤں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ایک تازیانہ بھی ہے۔ جو زمانہ کے جدید تقاضوں کی تفہیم، ان سے حصولِ مقصد کے امکانات اور مقابل ومخالف طاقتوں کے خلاف صف آرا اور متحد ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اشعیں بتا رہا ہے ۔

اٹھو کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

حقیقت تو یہ ہے ہمیں پیش قدمی کرتے ہوئے خود اپنے اسلاف کرام کی خدمات اور قربانیوں کو منظر عام لانے کیلئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں اور اپنے اسٹیج سے ان لوگوں کو اپنے بزرگوں کی مدح سرائی کے لئے مجبور کرنا چاہئے تھا، جن کے تغافل کا ہم آج رونا رو رہے ہیں۔

آزادئ ملک وملت اور سربلندئ اسلام کے لئے سرفروشانہ جدوجہد اور اہالیانِ اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی کوشش میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے جانباز رفقاء کا جو حصہ ہے، ان کی جو روشن خدمات ہیں، یہی اس سیریز کا موضوع ہے۔

اس سیریز کی چار ضخیم جلدیں جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، ان کی کمپیوٹر

کتابت میں ایک اہم مسئلہ تصحیح کا تھا، چونکہ کمپیوٹر کتابت میں اغلاط رہ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ وہ عجیب وغریب شکل اور الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہیں۔

اس مشکل کا حل رب کریم نے اس طرح نکالا کہ جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس اہم اور تاریخی سلسلہ کی کتابت وتصحیح کی ذمہ داری لے کر ایک طرح سے ہمارے لئے اس اہم مرحلہ کو آسان بنادیا۔ مولانا موصوف تصنیف تالیف اور تصحیح وترجمہ میں اپنی ایک شناخت قائم کرچکے ہیں، فرید بک ڈپو دہلی سے ان کی تصحیح کردہ وترتیب دادہ متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

گذشتہ سال حکیم الاسلام عالمی سیمینار کے موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تالیفات ومضامین کا حسین مرقع سات جلدوں میں ان کا مرتب کردہ شائع ہوکر اہل علم وقدرداں حضرات سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے، ان کتابوں کا اجراء متعدد علمائے کرام کے ہاتھوں مذکورہ سیمینار میں ہوا تھا۔

ایک قابل لحاظ کام یہ کیا گیا ہے کہ سابق ایڈیشنوں میں فہرست نامکمل تھی، صرف ابواب کے صفحات کی نشاندہی کی گئی تھی، موجودہ ایڈیشن میں تفصیلی فہرست مرتب کی گئی ہے، یہ یقیناً بڑی محنت کا کام ہے۔ جس سے ایک ہی نظر میں کتاب کے تمام مندرجات پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔

بہرحال مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس سلسلہ کتب کی کتابت وتصحیح کی خدمت انجام دے کر ہمارے لئے اس سلسلہ کی اشاعت کو کافی حد تک آسان بنادیا۔

اس کتاب کو مولانا غلام رسول مہر نے جس جانفشانی سے مرتب کیا تصنیف وتالیف کی دنیا میں وہ کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ اللہ رب العزت کا شکرواحسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسی اہم کتابوں کی سیریز کی اشاعت کی توفیق سے نوازا۔ وماتوفیقی الا باللہ

شمشیر احمد قاسمی
سنائل کتاب گھر دیوبند

برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگذشت

سید احمد شہیدؒ

حصہ دوم

مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ کے مفصل سوانح حیات اور ان کی
تحریکِ احیائے دین کی مکمل سرگزشت

مولانا غلام رسول مہرؔ

پہلا باب:

ہزارہ کا محاذِ جہاد

ہزارہ کی سرگزشت

اگرچہ ہزارہ ابدالیوں کے عہد اوج وعروج میں افغان سلطنت کا ایک جز تھا اور کشمیر کے راستے پر واقع ہونے کے باعث اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی، لیکن افغان حکرانوں نے مقامی خوانین ورؤسائے ہزارہ کے انتظامی معاملات میں کبھی مداخلت نہ کی، بلکہ اس علاقے کے لئے کبھی گورنر بھی مقرر نہ کیا، صرف تھوڑے سے میدانی علاقے سے انھیں براہ راست مالیہ وصول ہوتا تھا، جو عاملِ اٹک کی تحویل میں تھا۔ باقی تمام مقامات میں متفرق رؤسا عملاً خودمختار رہتے۔

ابدالیوں کی مصلحت صرف یہ تھی کہ امن قائم رہے اور کشمیر کا راستہ مخدوش نہ ہو۔ اس مصلحت کی حفاظت میں رؤسائے ہزارہ نے کبھی تامل نہ کیا، بڑے بڑے سردار کشمیر جاتے یا وہاں سے لوٹتے تو مختلف رؤسا اپنے اپنے علاقوں میں ان کے لئے مہمانداری کا انتظام کر دیتے۔ دریا سے گذرنے کے لئے کشتیاں بہم پہنچا دیتے، کبھی کبھی تحائف کی صورت میں نذریں بھی پیش کر دیتے۔ ابدالی اس صورت حال پر بالکل مطمئن تھے، رؤسا میں کشمکش کا کوئی واقعہ پیش آ جاتا تو ابدالی اس کا تصفیہ کر دیتے، ضرورت کے وقت اپنی فوج کے لئے تنخواہ دار آدمی لے لیتے۔

جب سدوزئیوں اور بارک زئیوں کی باہمی خونریزیوں کے باعث افغان سلطنت کا پرچم اقبال سرنگوں ہو گیا تو رؤسائے ہزارہ نے رسمی تابعیت سے بھی آہستہ آہستہ بے پروائی اختیار کر لی اور تمام گروہوں نے اپنی مستقل سرداریوں کی داغ بیل ڈال دی،

ان میں زیادہ ممتاز یہ تھے: نجیب اللہ خاں ترین، جعفر خاں گکھڑ، گلشیر خاں تنولی، ہاشم خاں ترک، سعادت خاں سواتی اور اس کا بیٹا حبیب اللہ خاں۔

سکھوں کی آمد

اچانک ایک واقعہ پیش آ گیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے آزاد سرحدی علاقے میں انوکھا نہ تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے ہزارہ میں ایک نئی قوت کیلئے قبض و تصرف کے دروازے کھل گئے، پھر اہل ہزارہ پر ہولناک مصیبتیں آئیں اور تیس پینتیس برس تک ان کا خون پانی کی طرح بہتا رہا، یہ داستان حد درجہ درد انگیز ہے اور اس کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

مانک رائے (۱) کے ترک رئیس ہاشم خاں نے کمال خاں ترک کو قتل کر دیا، محمد خاں ترین مقتول کے وارثوں کا مددگار بن گیا اور ہاشم خاں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے تشویش و اضطرار کے عالم میں راولپنڈی کے سکھ گورنر مکھن سنگھ سے مدد مانگی، وہ فی الفور پانسو سوار لے کر ہزارہ پہنچ گیا، اور سرائے صالح میں قلعہ تعمیر کر کے میدانی علاقے سے بالجبر خراج وصول کرنے لگا۔

اس بلائے ناگہانی نے خوانین ہزارہ کی آنکھیں کھول دیں، انہوں نے چپکے چپکے ایکے کا بندوبست کیا۔ دوڑ ندی کے کنارے شاہ محمد کے مقام پر مکھن سنگھ کو شکست دی اور وہ مارا گیا، سکھ فوج سرائے صالح کو چھوڑ کر اٹک کے سکھ گورنر حکما سنگھ چمنی کے پاس پہنچ گئی، حکما سنگھ نے اہل ہزارہ کی تادیب کے لئے لاہور سے کمک منگائی، جس کا سالار دیوان رام دیال تھا۔ ترینوں، اوتمان زئیوں اور مشوانیوں نے متحد ہو کر اس فوج کو کوہ گنگر کے دامن میں ناڑا نام مقام پر شکست دی، رام دیال اس لڑائی میں مارا گیا۔

اس کے بعد امر سنگھ مجیٹھہ کو ہزارہ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے نرمی اور ملائمت کی پالیسی اختیار کی۔ ایک کش مکش میں وہ بھی مارا گیا، پھر کنور شیر سنگھ اور اس کی نانی مائی سدا

---

(۱) دوڑ ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے، ترک پہلے پورے ہزارہ کے سردار تھے، رفتہ رفتہ ان کی قوت گھٹتی گئی اور صرف چند دیہات میں ان کی ذمہ داریاں رہ گئیں۔ ان میں سے ایک مانک رائے بھی تھا۔

کور ہزارہ پہنچے، سدا کور نے محمد خاں ترین کو منہ بولا بیٹا بنا کر ساتھ ملا لیا اور تربیلہ میں ایک گڑھی کی بنیاد رکھی۔

ہری سنگھ نلوہ

سدا کور کی پالیسی کامیاب ہو رہی تھی کہ اچانک ہری سنگھ نلوہ ہزارہ کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ یہ شخص معمولی حیثیت سے اُٹھ کر سکھ فوج میں جرنیل بنا تھا، ظلم وتشدد اور سنگ دلی کی وجہ سے سکھوں میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اسے کشمیر کا گورنر بنا دیا، پھر شکایتیں پہنچیں کہ ہری سنگھ نے روپے میں بہت تغلب کیا ہے، رنجیت سنگھ نے حساب کتاب کی غرض سے لاہور بلایا تو اُسے خیال ہوا کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیے بغیر محاسبے اور باز پرس سے بچنا محال ہے۔ چنانچہ اس نے ہزارہ کو مسخر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ سات ہزار منظم فوج کے ساتھ مظفر آباد اور گڑھی حبیب اللہ خاں کے راستے ہزارہ میں داخل ہوا۔ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے درمیان درۂ مانگل میں پہنچا تو جدون اور تنولی راستہ روکے کھڑے تھے۔ خونریز جنگ ہوئی۔ ہزارہ کے بے قاعدہ لشکر سکھوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ہری سنگھ نے اپنی عادت کے مطابق ایک ایک جدون کے گھر سے چار چار پانچ پانچ روپے تاوان وصول کیا۔ چونکہ کئی مرتبہ کی شکستوں کے بعد سکھوں کو فتح حاصل ہوئی تھی، اس لئے رنجیت سنگھ، ہری سنگھ کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوا، نہ محض محاسبہ چھوڑ دیا، بلکہ اسے ہزارہ کا گورنر بنا دیا۔

محمد خاں ترین مائی سدا کور کا بیٹا بن کر لاہور پہنچ گیا تھا، ہری سنگھ نلوہ نے پچیس ہزار روپے دے کر اسے رنجیت سنگھ سے لیا، پھر اس غریب کو قید خانے میں کھار کی روٹی کھلا کھلا کر مار ڈالا، رنجیت سنگھ کو جو رقم دی تھی وہ بھی تاوان لگا کر گھر گھر سے وصول کر لی۔ اگرور، کونش اور نیکری کی وادیوں پر بھی حملے کیے اور گاؤں جلائے، خصوصاً سر بلند خاں پلال

تنولی کے مرکز شنگڑی کو توراکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اسکے فرزند شیر خاں کو پھانسی دیدی، سکندر پور کے قریب ہرکشن گڑھ کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کے آس پاس نئی بستی آباد ہوگئی، اسی بستی کو بعد میں ہری پور کہنے لگے اور یہی تحصیل ہری پور کا صدر مقام ہے۔

سردارانِ ہزارہ سید صاحب کی خدمت میں

یہ حالات تھے، جب سید صاحب یوسف زئی پہنچے اور ان کی جہاد آرائی کی بدولت سرحدی علاقوں کی یاس افزا تاریکی میں امید کی ایک نئی کرن چمکی، ان تمام تباہ حال خوانین ور ؤسا سید صاحب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ سرحد میں تشریف فرمائی کے بعد دو تین مہینوں میں مندرجہ ذیل رؤسا نے آپ سے رابطہ عقیدت استوار کر لیا۔

۱۔ سر بلند خاں پلال تنولی، ہری سنگھ کی دراز دستیوں کے باعث جلا وطن ہو چکا تھا، اس نے امداد کے لئے ایک عریضہ لکھا اور قاصد کے ساتھ ایک سبز رنگ گھوڑا بطور نذر بھیجا، سید صاحب نے یہ گھوڑا شیخ امجد علی غازی پوری کو دے دیا، جن کا گھوڑا مر چکا تھا۔

۲۔ حبیب اللہ خاں سواتی گڑھی والا، اس کا باپ سعادت خاں اپنے وقت میں اس درجہ معزز و محترم تھا کہ تمام اہل ہزارہ اپنے تنازعات میں اسی کو حکم بناتے تھے۔ حبیب اللہ خاں کے بیٹے کو سکھوں نے اسی کی گڑھی میں محصور کر رکھا تھا، اس نے سید صاحب کے پاس درخواست بھیجی کہ میرے بیٹے کو محصوری سے نجات دلانے کا بندوبست فرمائیں۔

۳۔ مظفر آباد کے سلطان زبردست خاں اور سلطان نجف خاں کا وکیل اطاعت کے معروضے لایا، ان میں یہ بھی مرقوم تھا کہ اگر حضرت ہمارے وطن میں قدم رنجہ فرمائیں تو جہاد فی سبیل اللہ کا کام احسن طریق پر انجام پائے گا۔

۴۔ اگرور کے خان عبدالغفور خاں نے اپنے بھائی کمال خاں کے ہاتھ اطاعت نامہ بھیجا، کمال خاں نے خود اصالۃً اور اپنے بھائی کی طرف سے وکالۃً بیعت کی۔

۵۔ امان اللہ خاں، خان خیل اور اس کا بیٹا عنایت اللہ خاں سکھوں کی دراز دستیوں سے تنگ ہو کر عشرہ (علاقہ امب) میں پناہ گزیں تھے، وہ سید صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

۶۔ ناصر خاں بھٹ گرامی (علاقہ نندھیاڑ) نے پہلے عریضۂ فرمانبرداری بھیجا، پھر خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔

۷۔ سردار پائندہ خاں تنولی والئ امب کے کئی علاقے ہری سنگھ نے دبا لئے تھے، اس نے بھی اطاعت نامہ بھیجا۔ سردار موصوف کے تفصیلی حالات سید صاحب کو ملا شاہ سید ساکن چیڑ سنگ (علاقہ نندھیاڑ) سے معلوم ہوئے تھے، چونکہ وہ قلتِ وسائل کے باوجود سکھوں سے برابر لڑ رہا تھا، اس لئے سید صاحب کے دل میں اس کے متعلق بہت اچھا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جب ایک مجلس میں بعض لوگوں نے پائندہ خاں کو ناقابل اعتماد قرار دیا تو سید صاحب نے فرمایا: وہ بڑا نامی بہادر اور شجاع سردار ہے، اس کے خلاف بری بات نہ کہنی چاہئے۔ ہدایت وضلالت اللہ کے اختیار میں ہے۔

علاقہ ہزارہ کے بڑے بڑے سردار یہی تھے، ان کو منظم ومتحد کر کے اول ہزارہ میں سکھوں کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جا سکتا تھا، دوسرے کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ صاف ہوتا تھا اور سلیمان شاہ والئ چترال لکھ ہی چکا تھا کہ اگر سید صاحب کشمیر کا رُخ کریں تو میں فوج لے کر گلگت کے راستے اعانت کیلئے پہنچ جاؤں گا۔ (۱) ان مقاصد ومصالح کے پیش نظر سید صاحب پکھلی (ہزارہ) کی طرف انتظام جہاد کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لئے معاً تیار ہو گئے۔

---

(۱) سلیمان شاہ کے مکتوب کا متعلقہ حصہ یہ تھا کہ اگر کشمیر کی طرف توجہ فرمائیں تو ''انشاء اللہ تعالیٰ ایں خادم سادات وعلماء وفقراء ہر وقتے کہ اعلام فرمانید در مقدمہ ملک مذکور (کشمیر) شریک می شوم کہ بہ مایاں قریب است، راہ ولسپ بہ حدود کشمیر بہ مایاں میسر است، ہر خدمتے کہ بہ طرف کشمیر بودہ باشد، آمادہ ایم۔'' (مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۲۴۰)

قبولِ دعوت کا شاندار دور

سید صاحب کی دعوت جہاد کے قبول و پذیرائی کا یہ نہایت شاندار دور تھا، ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے پہنچنے لگے تھے، چملہ، بونیر اور سوات کے قبائل رفاقت کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ خلیل، خٹک، آفریدی، شنواری، ہنگر ہاری، مہمند وغیرہ قبائل کو اٹھانے کا پورا بندوبست ہو چکا تھا، اور ان میں سے بعض ممتاز اصحاب سید صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ افغانستان کے غلزئی رؤسا صرف اس بات کے منتظر تھے کہ سید صاحب کوئی ایسا مقام تجویز فرما دیں، جہاں سے معرکہ آرائی شروع کر کے آپ کے ساتھ جلد سے جلد اتصال پیدا کیا جا سکے۔ یار محمد خاں کی غداری کے باعث اگرچہ خود سمہ کے اندر کاروبارِ جہاد میں رخنہ پیدا ہو چکا تھا، اور اس کی اصلاح و درستی کے امکانات بہت کم نظر آتے تھے، لیکن اس کے بھائی سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں برابر اطاعت کا اظہار کر رہے تھے، وہ یار محمد خاں کی حرکت پر رنجیدہ بھی معلوم ہوتے تھے، باقی خوانین سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ہزارہ کے علاوہ راہ کشمیر کے دوسرے اکابر بھی سراپا عقیدت و اشتیاق بنے ہوئے تھے۔

سید صاحب ہندوستان سے چلے تھے تو اگرچہ خاصی دلکشا امیدوں سے ان کا قلب صافی معتقد تھا لیکن سازگار ترین حالات میں بھی انہیں تھوڑی مدت کے اندر ایسے ممکنات کامیابی کے پیدا ہونے کا خیال نہ تھا، افغانستان سے انتہائے کشمیر تک پورے علاقے میں حیات تازہ کی لہریں جوشاں ہو گئی تھیں۔

سید صاحب نے تمام رؤسائے پکھلی کو لکھ بھیجا کہ مجاہدین کے جیش جلد پہنچیں گے، آپ لوگ تیار رہیں۔ ان سرداروں کی عملداری میں سے مجاہدین کو گذرنا ہے، وہ ضرورت کی چیزیں مہیا کر دینے کا خیال رکھیں۔

پکھلی کے لئے لشکر

جب پکھلی کی جانب لشکر بھیجنے کی تجویز پختہ ہو گئی تو سید محمد مقیم رام پوری نے اپنی

خدمات پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم یہاں آرام کی غرض سے نہیں آئے، یہ آرزو لے کر آئے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کریں اور ہر قسم کی مشقتیں اٹھائیں۔ میرا قافلہ ضروری ساز و سامان سے لیس ہے، تمام مجاہدین آزمودہ کار ہیں، لہٰذا ہمیں اس مہم پر ضرور بھیجا جائے۔ (۱)

سید محمد مقیم کے قافلے میں چالیس پچاس غازی تھے، سید صاحب نے ایک سو مجاہد دوسری جماعتوں سے منتخب کیے، ڈیڑھ سو آدمیوں کے اس لشکر کا سالار شاہ اسماعیل کو بنایا، مولوی خیر الدین شیرکوٹی (۲) اور ملا شاہ سید چیڑ منگی بھی اس میں شامل تھے، بلکہ شاہ اسماعیل کے مراسلوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد مقیم اور ملا شاہ سید کو اس لشکر میں نیابت کا درجہ حاصل تھا۔ (۳) فتح خاں پنجتاری رہنما کی حیثیت میں ساتھ گیا امب کے قریب اس کا بھی ایک گاؤں تھا۔

اس لشکر کیلئے گولی بارود کے علاوہ بانس کے پانچ سات سو نل بھی دیدیے گئے تھے، جو ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے تھے، ان میں بارود بھری ہوئی تھی، ان نلوں کو آگ دے کر دشمن پر پھینکتے تھے، انہیں اس زمانے کے ہینڈ گرینیڈ سمجھنا چاہیے۔ جس مقام کو آگ لگانی منظور ہوتی، وہاں یہ نل بہت کام دیتے تھے۔ رخصت کے وقت سید صاحب نے عادت شریفہ کے مطابق ننگے سر ہو کر دعا فرمائی اور سب کے ساتھ مصافحہ کیا۔

---

(۱) منظورہ ص: ۲۶۳

(۲) مولوی خیر الدین شیرکوٹی سید صاحب کے معتمد علیہ رفیق تھے، جنگ و سیاست دونوں میں ان کا پایہ بہت بلند تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس قافلے کے ساتھ سرحد پہنچے تھے، ان کا ذکر پہلی مرتبہ ہزارہ کی جنگ زنگلہ میں آیا ہے۔

(۳) شاہ اسماعیل کی تحریرات میں مہم ہزارہ کے متعلق مجھے پانچ مراسلے ملے۔ ابتدائی دو مراسلے خود شاہ صاحب، سید محمد مقیم اور ملا شاہ سید تینوں کی طرف سے ہیں۔ (مکاتیب شاہ صاحب ص: ۲۰۸ و ص: ۲۱۲) تیسرا مراسلہ شاہ صاحب اور سید مقیم کی طرف سے ہے۔ (مکاتیب ص: ۲۱۳) اس وقت ملا شاہ سید دعوت جہاد کے سلسلے میں کہیں گئے ہوئے تھے، باقی دو مراسلے صرف شاہ صاحب کی طرف سے ہیں۔ (مکاتیب ۲۱۶، ۲۱۷) اس وقت سید محمد مقیم کو بھی مولانا نے ایک مقام پر بھیج دیا تھا۔

دوسرا باب:

شاہ اسماعیل کی تنظیمی سرگرمیاں

مجاہدین کا سفر

مولانا شاہ اسماعیل نے پنجتار سے نکل کر پہلی رات ٹوپی میں گزاری اور دوسری رات کھنتل میں بسر فرمائی۔ کھنتل سے لشکر کو سید صاحب بھیج دیا، خود ملا شاہ سید اور چند ساتھیوں کے ہمراہ ستھانہ چلے گئے، جو راستے سے کسی قدر ہٹا ہوا تھا۔ ستھانہ میں اس وقت کھمل اور اخون خیل کے اکابر جمع تھے، سید اعظم شاہ اور سید اکبر شاہ والیان ستھانہ نے پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ وہاں پورے مجمع کے سامنے مولانا نے وعظ کہا، جس کا موضوع جہاد تھا، اور سید صاحب کی طرف سے بیعت لی۔ آپ کی خواہش تھی کہ تمام لوگ اب چلے چلیں، انہوں نے عذر کیا اور کہا کہ اب جانا مشکل ہے، پھر جب آپ بلائیں گے تو ہم حاضر ہو جائیں گے۔ اخوندزادہ اسماعیل البتہ ساتھ ہو گئے، جو مولانا کے بیان کے مطابق سب میں ''مشارالیہ'' تھے۔

سید اکبر شاہ پکھلی کے تمام رئیسوں اور سرداروں کے حالات سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے خلوت میں مولانا کو بتایا کہ ان میں سے اکثر نفاق پیشہ ہیں، مقابلہ ہوگا تو آپ کو لڑائی میں تنہا چھوڑ کر تماشا دیکھیں گے، فتح حاصل ہوگی تو چیلوں اور گدھوں کی طرف مال غنیمت پر گریں گے، شکست ہوگی تو بالا بالا گھروں کو بھاگ جائیں گے، ممکن ہے عنایت اللہ خاں (خان خیل)، عبدالغفور خاں (اگروری)، کمال خاں (اگروری) اور ناصر خاں (بھٹ گرامی) وفادار رہیں۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ رائے حرفاً

حرفاً درست تھی، لیکن جو فدا کارانِ حق تمام مسلمانوں کو منظم کر کے میدانِ عمل میں لا کھڑا کرنے کیلئے مضطرب تھے، وہ اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ ہر ایک کے پاس پہنچیں، ہر ایک کے کان میں خدا و رسول کی آواز پہنچائیں اور ہر ایک کو دین کی خدمت پر متوجہ کریں۔ وہ دعوت اشتراک و تعاون میں تفریق کیوں کر گوارا کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو خود اپنے مقصد و نصب العین کی راہ میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ٹھہرتے۔ ان کے لئے صحیح راستہ یہی تھا کہ ہر ایک کے پاس پہنچتے، ہر ایک کو ساتھ ملانے کی کوشش کرتے اور صاف صاف بات یہ ہے کہ مذبذبین کا تذبذب اس وقت تک ختم نہیں ہوتا، جب تک معاملہ یک سو نہ ہو جائے۔ اہل حق ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں، جن لوگوں کی حمیت کمزور ہوتی ہے وہ عموماً اس وقت تک میدانِ عمل میں آنے سے کتراتے ہیں، جب تک کامیابی کے امکانات بالکل واضح اور روشن نہ ہو جائیں۔ عالم انسانیت کی جو سرگزشت ہمارے سامنے کھلی پڑی ہے، اس سے ہمیں ہر قدم پر یہی سبق ملتا ہے۔

مولانا اسماعیل امب میں

بہر حال مولانا شاہ اسماعیل تھانہ سے فارغ ہو کر رات کے وقت امب پہنچے، سردار پائندہ خاں نے بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا اور اپنے مکان سے دور مجاہدین کیلئے فرودگاہ مقرر کی۔ (۱) صبح اٹھ کر شاہ صاحب نے گرد و پیش کے نقشے کا جائزہ لیا فرماتے ہیں:

---

(۱) منظورہ میں ہے: "تا عشرہ استقبال نمودہ در مسجد فرود کش کنانید"۔ ممکن ہے مجاہدین کے پہنچنے پر پائندہ خاں استقبال کے لئے عشرہ پہنچ گیا ہو اور جب معلوم ہوا کہ مولانا شاہ اسماعیل تھانہ میں رک گئے تو واپس چلا گیا ہو، خود مولانا اسماعیل کا استقبال امب سے باہر نکل کر ہوا، جیسا کہ خود مولانا کے بیان سے ظاہر ہے۔ مولانا تفنن کے طور پر فرماتے ہیں کہ "الحزم سوء الظن" کے قول ماثور کی بنا پر مجاہدین کو اپنے مکان سے دور ٹھہرایا۔ پرانا امب ۱۸۴۱ء کی طغیانی سندھ میں بالکل برباد ہو گیا تھا اور اس کی جگہ یا اس سے قریب دوبارہ ایک گاؤں آباد ہوا۔ پائندہ خاں نے اپنے لئے اس سے تین میل شمال میں ایک نیا امب بنا لیا، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ امب قدیم میں مولانا پہنچے تھے، تو اس میں پائندہ خاں کا مکان کہاں تھا اور مجاہدین کی فرودگاہ کس جگہ تھی، یا اگر مجاہدین کو مسجد میں ٹھہرایا گیا تو وہ کس مقام پر تھی۔

> دریائے سندھ کے ایک کنارے پر (مغربی کنارے پر) امب واقع ہے، دوسرے کنارے (مشرقی کنارے) پر سکھوں کے چھوٹے چھوٹے قلعے بنے ہوئے ہیں اور (سلسلۂ کوہ میں) یکے بعد دیگرے تنگ و دشوار گزار گلیاں ہیں، خود ہم فدائیوں کی پناہ گاہ کے سامنے بھی تقریباً ایک گولی کے فاصلے پر گڑھی نظر آتی ہے۔ (۱)

ہزارہ پہنچ کر جس اسکیم پر کار بند ہونا منظور تھا، وہ غالباً پنجتار ہی میں سید صاحب کے سامنے مکمل کر لی گئی تھی۔ اس میں یہ بھی طے کر لیا گیا ہوگا کہ پائندہ خاں کو ساتھ لے کر دریا کے مشرقی کنارے پر پیش قدمی کی جائے گی اور جو علاقے سکھوں کے اثر اقتدار سے محفوظ تھے، ان میں مسلمانوں کو منظم کر کے سکھ عملداروں کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جائے گا۔ امب پہنچ کر پائندہ خاں کے ساتھ مولانا نے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ دریا کے مشرقی کنارے پر جانے اور مجاہدین کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں، معلوم نہ ہو سکا کہ خان نے مساعدت سے احتراز کے لئے کیا وجوہ پیش کئے، ممکن ہے وہ اس وجہ سے توقف میں پڑا ہو کہ مولانا کے ساتھ مجاہدین بہت کم تھے، پائندہ خاں ہی نہیں بلکہ اس عہد کے تمام رؤسا کی نظریں صرف ظواہر پر تھیں، جب وہ دیکھتے تھے کہ سید صاحب کے پاس آدمی کم ہیں اور ساز و سامان نہ ہونے کے برابر ہے، تو اس وہم میں پڑ جاتے کہ یہ معمولی سی قوت سکھوں کے مقابلے سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکے گی، اس لئے کھل کر بے باکانہ مخالفت میں مشاغل ہو جاتے۔ حالانکہ صحیح راہِ عمل یہ تھی کہ اصل نصب العین کو پیش نظر رکھ کر جانبازانہ مساعدت کرتے اور جن چیزوں کی کمی محسوس کرتے تھے، ان کی تلافی میں ساعی ہو جاتے۔

---

(۱) یہ غالباً قادر آباد کی طرف اشارہ ہے، جو پہلے اہم مقام تھا اور اب موجود نہیں۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ مجاہدین کی فرودگاہ امب کے مشرقی کنارے پر دریا کی سمت میں تھی، اور پائندہ خاں کا مکان یقیناً بستی کے متعلق مغربی کنارے پر ہوگا۔

پائندہ خاں کی افسردگی دیکھ کر شاہ صاحب نے ارادۂ اقدام ترک نہ کیا، سید صاحب کا حکم بھی یہی تھا کہ اگر پائندہ خاں موافقت میں متوقف ہو تو اس حالت میں بھی قدم جلد سے جلد آگے بڑھایا جائے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ جس جگہ پہنچنا تھا وہ دریا کے مشرقی کنارے سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی، اگر امب ہی سے دریا کو عبور کیا جاتا تو دشمن کے ساتھ جھڑپ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا آغازِ جنگ سے پیشتر باحمیت مسلمانوں کی تنظیم ضروری سمجھتے تھے، لہٰذا امب سے اس گھاٹ کا رُخ کر لیا جو تین کوس شمال میں تھا۔(۱) یہ چھتر بائی کا گھاٹ تھا۔

روانگی سے پیشتر مولانا نے عیسیٰ زئی، جدون، امان زئی، اوتمان زئی اور چج بہار کی طرف داعی بھیج دیے۔ اپنے خطوط کے علاوہ سید صاحب کے مہری اعلام نامے بھی ان کو دیے۔

عبورِ دریا اور پیش قدمی

چھتر بائی میں صرف ایک جالہ تھا، جس میں صرف تھوڑے سے آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ امید نہ تھی کہ دن بھر میں پورے مجاہدین دوسرے کنارے پر پہنچ سکیں گے اور مولانا کو یہ منظور نہ تھا کہ رات اس حالت میں آجائے جب نصف مجاہدین ایک کنارے پر اور نصف دوسرے کنارے پر ہوں، اس لئے مجاہدین کی ایک جماعت کو چھتر بائی سے بھی اُوپر کے ایک گھاٹ پر بھیج دیا جہاں دو جالے تھے، دونوں جماعتوں نے رات مغربی کنارے پر بسر کی، صبح دریا سے گذر کر اکٹھے ہوئے اور بروٹی ہوتے ہوئے نکا پانی پہنچ گئے۔ پائندہ خاں نے اپنے بھائی امیر خاں کو اس غرض سے ساتھ کر دیا تھا کہ غازیوں کی مہمانداری میں کوتاہی نہ ہو۔

---

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۲۱۴۔

نکا پانی سے بھی مولانا شاہ اسماعیل نے گرد و پیش کے تمام مقامات پر جہاد کے دعوت نامے بھیج دیے۔ مختلف علماء نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر ابھی جہاد شروع کرنے کا ارادہ ہو تو سات آٹھ سو آدمی تیار ہیں، مولانا نے فرمایا: ابھی ضرورت نہیں، وقت آئے گا تو بلالیں گے، ہاں مجاہدین کو تیار کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔

نکا پانی سے شیر گڑھ پہنچے۔(۱) مولانا کی دقیقہ سنجی اور امعانِ نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ایک ایک چیز اور ایک ایک مصلحت پر گہری نظر تھی۔ چونکہ راستہ سنگلاخ پہاڑیوں میں سے تھا اور میدانی علاقے کے باشندے اُسے بہ آسانی طے نہیں کر سکتے تھے، اس لئے سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ اس طرف صرف آزمودہ کار غازی بھیجے جائیں، جو طیِ مسافت میں ہر قسم کی مشقتیں ضبط و صبر کے ساتھ برداشت کر سکیں، سواری کے عادی یا محتاج نہ ہوں اور انہیں امام کی نسبت انقیادِ کلی اور اذعانِ جبلی کا مرتبہ حاصل ہو۔ ساتھ ہی گزارش کی کہ غازیوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک ایک دو دو تین تین روز کے وقفے سے بھیجا جائے۔

اس میں کئی مصلحتیں تھیں، مثلاً: چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے لئے دریا سے پار اترنا آسان تھا، کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے میں دقت پیش نہ آسکتی تھی، تھوڑے تھوڑے وقفے سے جیش آتے رہتے تو عام مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب ہوتی اور ان پر یہ اثر پڑتا کہ پیچھے بہت بڑا لشکر ہوگا جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر آرہا ہے، اس لئے حوصلہ مندی سے ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے، دشمن ہر دوسرے تیسرے روز لشکروں کی آمد کا ذکر سنتے رہتے تو ان پر دہشت اور ہیبت طاری ہوتی۔

---

(۱) بروئی، نکا پانی اور شیر گڑھ سابق ریاست امب کے مقامات ہیں، یہ سب دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آباد۔

مجاہدین اگرور میں

شیر گڑھ میں پائندہ خاں کے جمعدار، جانو نام نے مجاہدین کی مدارات پورے اہتمام سے کی، لیکن وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا گیا، اور مولانا اگرور کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبدالغفور خاں رئیس اگرور کو پہلے سے خبر بھیج دی گئی تھی، اس کا بھائی کمال خاں راستے میں استقبال کے لئے موجود تھا، خود عبدالغفور خاں اس وجہ سے نہ آسکا کہ بیمار ہو گیا تھا۔ مولانا نے رات کلکئی میں بسر کی اور اگلے روز عبدالغفور خاں کی جائے اقامت پر پہنچے، جہاں احمد خاں پکھلی والا، حیدر شاہ ابن عم سید محمد علی شاہ (جسے پکھلی کے تمام خوانین کا سرخیل سمجھا جاتا تھا) اور ارسلان خاں برادر زادۂ عبدالغفور خاں بھی بہ سلسلہ زیارت آئے ہوئے تھے، ان سب نے مولانا کے ہاتھ پر سید صاحب کی امامت کی بیعت کی۔

اب مولانا صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ غازیوں کے قیام کے لئے کوئی مناسب گڑھی تجویز کر دی جائے۔ عبدالغفور خاں کی تین گڑھیاں تھیں: چھتر گڑھی، جسی کوٹ شمد زد۔ چھتر گڑھی اس کے قبضے میں نہ تھی، گڑھی جسی کوٹ محاذِ جنگ سے دور تھی، گڑھی شمد زہ کو موزوں سمجھ کر تجویز کر دیا گیا۔ مولانا یہ وعدہ لے کر کلکئی چلے آئے کہ کمال خاں اگلی صبح کو خود کلکئی پہنچ کر غازیوں کو شمد زہ میں بٹھا دے گا، ملا شاہ سید کو ان قبیلوں میں ترغیب جہاد کے لئے بھی بھیج دیا گیا جو اگرچہ والیٔ اگرور کی برادری میں تھے، لیکن اس کے تابع نہیں تھے۔

اخوند زادہ ملا محمد اسماعیل کو اطراف میں دعوتِ جہاد کی غرض سے بھیجا گیا تھا، کلکئی میں ان کی طرف سے پیغام پہنچا کہ جب تک اور لشکر نہیں آئے گا، یہاں کے لوگ جہاد میں رفاقت کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ پھر سید محمد نصیر بیچ بہاری کی طرف سے بھی جواب

آیا کہ مزید غازی بلائے جائیں، خصوصاً بوتیر والوں کو کمک پر آمادہ کیا جائے، اس صورت میں یہاں بہت آدمی جمع ہو جائیں گے، جب تک یہ نہ ہوگا، پکھلی سے قابل ذکر امداد کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

سید محمد علی شاہ اور ناصر خاں کے خط آئے تو ان میں لکھا تھا کہ غازی فی الحال اگرور میں ٹھہرے رہیں، بظاہر ان کی غرض یہ تھی کہ جب تک انہیں کامیابی کا قطعی یقین نہ ہو جائے دشمنوں سے پیوند کے انقطاع کیلئے قدم نہ اٹھایا جائے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل نے پھر عبدالغفور خاں اور بعض دوسرے رئیسوں مثلاً ارسلان خاں، احمد خاں، سید حیدر شاہ وغیرہ سے مفصل گفتگو فرمائی اور یہ اثر لے کر اُٹھے کہ ان لوگوں کی ساری مدارات محض زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔ ایمانی غیرت، اسلامی حمیت، اخلاص اور فرمانبرداریٔ احکامِ خداوندی کا ایک ذرّہ بھی ان کے دل میں موجود نہیں، وہ صرف حطامِ دنیوی کے خواہاں ہیں۔

پریشانی در پریشانی

مولانا کلکی واپس پہنچے تو ایک نئی پریشانی رونما ہوئی۔ لشکر مجاہدین کے خزینہ دار نے جو رقم ساتھ لی تھی، اس میں روپے بھی تھے، اشرفیاں بھی تھیں۔ روپے خرچ ہو گئے تو اشرفیوں کو بھنانے کی کوشش کی۔ اہل اگرور کو ان کا نرخ معلوم نہ تھا اس لئے اشرفیاں لے کر غلہ دینے سے انکار کر دیا۔ اشرفیوں کے روپے باہر ہی سے منگائے جا سکتے تھے، لیکن اس وقت تک ادھار غلہ اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ رؤسا میں سے کوئی ایک بنیوں کو اشارہ کر دیتا، ان لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مجاہدین حبیب اللہ خاں کی تائید پر آمادہ ہوں تو ان کے لئے ہر سہولت کا بندوبست کر دیا جائے، اگر آمادہ نہ ہوں تو کچھ نہ کیا جائے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل مجاہدین کو صرف حبیب اللہ خاں کی تائید کے لئے استعمال نہیں کر سکتے

تھے، اس بات کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ حبیب اللہ خاں کا مقصد پورا ہو جائے تو معطل ہو کر بیٹھ جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کاروبارِ جہاد کا سروسامان ہو جائے، اس غرض کے لئے مستقل تنظیمات کے خواہاں تھے۔

اس پریشانی میں دو روز تک رزق و معیشت کی اتنی تنگی رہی کہ لشکرِ اسلام میں سے اکثر آدمی خصوصاً اہلِ رام پور مضطرب ہو گئے۔ بعض نے واپسی کا مشورہ دیا، سید محمد مقیم اپنی جبلی شجاعت کی بنا پر اصرار کرنے لگے کہ فوراً لڑائی چھیڑ دینی چاہئے، مولانا نے حسنِ تدبیر سے انہیں روکے رکھا اور خواجہ محمد (حسن پوری) کو اشرفیاں دے کر سربلند خاں کے پاس بھیج دیا کہ ان کے ذریعے سے روپے لے آؤ۔

سربلند خاں سے ملاقات

یہ حالت تھی جب ارسلان خاں اہلِ اگرور کی ایک جمعیت لے کر آیا اور اس نے کہا کہ میں تو حبیب اللہ خاں کی امداد کے لئے جاتا ہوں، اگر آپ لوگوں میں سے بھی کسی کو جہاد کا شوق اور ایک مظلوم مسلمان کی اعانت کا خیال ہو تو تیار ہو جائے۔ اس کا خرچ میں برداشت کروں گا۔ سید محمد مقیم اور کئی لوگ تیار ہو گئے اور مولانا سے اجازت مانگی، اگرچہ انہیں اجازت دینا مولانا کے نزدیک مصلحتِ وقت کے خلاف تھا، لیکن سید صاحب نے روانگی کے وقت تاکید فرما دی تھی کہ ان کی دلداری میں کوتاہی نہ ہو، لہٰذا مولانا نے اجازت دے دی۔ خود ان کے پاس صرف چالیس غازی رہ گئے، باقی سب ارسلان خاں کے ساتھ چلے گئے۔ مولانا ان غازیوں کو لے کر جسی کوٹ تشریف لے گئے، جو ارسلان خاں کی جائے اقامت تھی۔

اب مولانا نے سربلند خاں تنولی سے ملنے کا ارادہ فرمایا چنانچہ اخوندزادہ محمد اسمٰعیل، ملا شاہ سید چیڑمنگی اور چند غازیوں کو ساتھ لے کر سربلند خاں کے پاس پہنچ گئے، جو سکھوں

کی چیرہ دستیوں کے باعث اپنا وطن چھوڑ کر شاہی خان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ملا شاہ سید کے بھائی ملا رحمت اللہ بھی موجود تھے، مولانا نے دو دن اور دو راتیں سربلند خاں کے پاس گزاریں۔ اس کے علاوہ شاہی خاں اور اسکے بھائیوں سے مفصل باتیں کیں اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سربلند خاں کا اصل مقصود پائندہ خاں تنولی کی بیخ کنی ہے، اگر مجاہدین کو سکھوں پر غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ تمام لوگ ساتھ ہو جائیں گے، ورنہ کوئی قدم نہ اٹھائیں گے، البتہ محمد علی شاہ ساتھ دینے کیلئے تیار ہو جائے تو یہ بھی معیت اختیار کر لیں گے۔

مولانا کی رائے

پائندہ خاں اور سربلند خاں میں پشتوں سے خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی، اس لئے سربلند خاں کے نزدیک اصل شئے یہی تھی کہ اس کے دیرینہ دشمن کو ختم کیا جائے، مولانا کے پیش نظر یہ امر تھا کہ تمام مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلے کیلئے متحد کریں، وہ مختلف خوانین کی ذاتی دشمنیوں کا آلۂ کار کیوں کر بن سکتے تھے؟ انہوں نے سید صاحب کو لکھا:

> ۱- دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر پائندہ خاں کی حکومت ہے۔ گھاٹ اسکے قبضہ میں ہیں، اگرور اسکے تابع ہے، اگر اس سے رشتہ منقطع کر لیا جائے تو غازیوں کے لئے آمد و رفت میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔
>
> ۲- پائندہ خاں تمام خوانین ہزارہ سے حشمت و شوکت میں بڑھا ہوا ہے۔ اسے مخالف بنا کر بعض دوسرے خوانین کی موافقت حاصل کرنا بالکل غلط ہوگا۔
>
> ۳- پائندہ خاں، حبیب اللہ خاں او خوانین اگرور کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم ہے اور ہمارے غازی حبیب اللہ خاں کی امداد کے لئے گئے ہوئے ہیں اگر ان لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے اور پائندہ خاں کے درمیان رابطۂ اتحاد منقطع ہو چکا ہے تو غازیوں کو مضرت پہنچانے کے درپے ہو جائیں یا کم از کم

ان کی موافقت سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔

۴- زبردست خاں حوالی کشمیر کے بڑے رؤسا میں سے ہے، وہ حبیب اللہ خاں کا قدیمی دوست ہے، ممکن ہے حبیب اللہ خاں کے ذریعے سے زبردست خاں کے ساتھ ربط وضبط پیدا ہو جائے۔

غرض پائندہ خاں کے ساتھ دوستی کا رشتہ منقطع کرنا اصولاً بھی غیر مناسب تھا اور مختلف مصالح وقت کے بھی خلاف تھا، اس لئے مولانا اس پر راضی نہ ہوئے۔

خوانین ہزارہ کی حالت

خوانین ہزارہ میں سے بعض کی کیفیت اوپر پیش کی جا چکی ہے، مولانا نے سربلند خاں، سعادت خاں، احمد شاہ خاں، احمد خاں، شاہی خاں وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ ناصر خاں، حسن علی خاں اور محمد علی شاہ سے نہ مل سکے، لیکن سب کے متعلق اپنا تاثر یہ بیان فرمایا کہ بحالت موجودہ ان سے لشکرِ اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، یہ اس وقت تک مجاہدانہ اقدام کے لئے تیار نہ ہوں گے جب تک اہلِ اسلام کا غلبہ نمایاں نہ ہو جائے۔

بالآخر مولانا ضلع ٹیکری کے ایک مقام "جویاں مستور" میں ٹھہر گئے۔ سید محمد خاں علی شاہ اور ناصر خاں کو ایک ایک خط سربلند خاں سے لکھوایا، خود بھی انہیں اور ان کے اعزہ کو اپنے آدمی کے ہاتھ خطوط ارسال کئے۔ ملا عصمت اللہ کو دیشی قوم کے پاس دعوت جہاد کے لئے بھیجا، ایک شخص کو سادات کوائی (کاغان) کی طرف روانہ کیا۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ خدا کے فضل سے حصول مقصود کی امید ہے، لیکن ان اضلاع میں لشکر بھیجنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، یہ قدم وقت سے پہلے اٹھا لیا گیا، بہتر یہ تھا کہ میں چند ساتھیوں کو لے کر آتا، تمام دیہات میں پھر پھر کر جہراً اور سراً دعوتِ جہاد دیتا، جب رؤسا تیار ہو جاتے تو لشکر کی جگہ متعین کر کے غازیوں کو یہاں بلاتا۔ یا یہ مناسب تھا کہ زبردست لشکر بھیج کر تمام

خوانین ورؤسا کی موافقت سے قطع نظر کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کی جاتی۔ خیر جو کچھ واقع ہوا، اسی کو باعث خیر سمجھنا چاہیے۔ اگر سید محمد مقیم کامیاب واپس آئے تو امید ہے کہ حصولِ مقصد کی صورت جلد پیدا ہو جائیگی، ورنہ کچھ دیر لگے گی۔ اس موقع پر واپس آجانا بھی مضر ہے اور تامل وتدبیر کے بغیر کام میں ہاتھ ڈالنا خلاف مصلحت ہے۔(۱)

ملا محمد اسماعیل اخوند زادہ

مولانا نے اپنے مراسلات میں اخوند زادہ ملا محمد اسماعیل کو بار بار سراہا ہے۔ ان کے علم وفضل، اخلاص وتقویٰ، عقل ودانش، حسن تدبیر اور اصابت رائے کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں:

> ملا اسماعیل اخوند زادہ نہایت ہوشیار ودیانت دار ہیں اور مشاورت ومصالحت میں پختہ کار، وہ ان اطراف کے تمام فضلا کے پیشکار ہیں اور جملہ خوانین کے معتمد۔ دین کے کام میں بجان مصروف ہیں اور تالیف وترغیب میں بدل مشغول۔ ان کے نام تحسین وآفرین کا ایک شقہ بھیجا جائے۔

یہ شقہ یقیناً بھیجا گیا ہوگا، لیکن سید صاحب کے مکاتیب کا جو مجموعہ محفوظ رہ سکا، اس میں شامل نہ ہو سکا دوسری سیکڑوں تحریروں کی طرح وہ بھی ضائع ہو گیا۔

---

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۲۲۱-۲۲۳

تیسرا باب:

ڈُمگلہ اور شنکیاری کے معرکے

ڈُمگلہ پر یورش کی شہرت

مولانا شاہ اسماعیل نے مقدمات جہاد کی ترتیب کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ گزشتہ باب میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے، اس کے بعد معلومات کے ذخائر میں دفعۃً ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ ڈمگلہ اور شنکیاری کی لڑائیاں کس بنا پر پیش آئیں، قیاس سے کام لئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

پچھلے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ غازیوں کی ایک جماعت ارسلان خاں کے ساتھ روانہ ہو گئی تھی، جو حبیب اللہ خاں کے بیٹے کو سکھوں کے محاصرے سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ مولانا کے پاس صرف چالیس غازی رہ گئے تھے، یہ لوگ گڑھی جسی کوٹ میں مقیم تھے، خود مولانا چند آدمیوں کے ساتھ علاقہ پکھلی کے مقام "جوریاں مستور" میں چلے گئے تھے اور عبداللہ خاں کو غازیوں کا سر عسکر مقرر کر گئے تھے۔

اس اثناء میں مشہور ہو گیا کہ غازی ڈُمگلہ پر حملہ کرنے والے ہیں، جو میدان پکھلی سے مشرق مائل بہ شمال واقع ہے۔ اسکے فتح ہو جانے سے مظفر آباد و کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل سکتا تھا، ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ نے پھول سنگھ کو تین ہزار آدمیوں کے ساتھ ڈمگلہ کی حفاظت کیلئے بھیج دیا، پھر آس پاس کی گڑھیوں سے مزید تین ہزار سکھ پھول سنگھ کی کمک کیلئے روانہ کر دیے، اس افرا تفری میں اس گڑھی کا محاصرہ بھی اٹھا لیا گیا، جس میں حبیب اللہ خاں کا بیٹا محصور تھا۔ اس طرح خوانین ہزارہ کا فوری مقصد پورا ہو گیا۔

شبخون کا فیصلہ

ڈمگلہ میں سکھوں کے اجتماع کی خبر سن کر مولانا نے مناسب نہ سمجھا کہ ان پر ضرب لگائے بغیر پیچھے ہٹ جائیں۔ انہیں یہ امید بھی ہوگی کہ ممکن ہے، اس سربازانہ اقدام سے خوانین ورؤسائے ہزارہ کا سویا ہوا جذبۂ غیرت بیدار ہو جائے اور وہ قلت وسائل کی بنا پر تذبذب کی جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے باہر نکل کر بے باکی کے ساتھ اعانت کے لئے تیار ہو جائیں۔ دعوت جہاد کو عوام تک پہنچانے کا بھی یہ ایک نہایت مؤثر طریقہ تھا۔ لیکن سکھوں کی فوج بہت زیادہ تھی، اس لئے شبخون مارنے کا فیصلہ کیا، خود مولانا شنکیاری کے قریب ٹھہر گئے، جو ڈمگلہ سے تین میل پر درۂ بھوگڑ منگ کے سامنے ایک مشہور مقام ہے، وہاں کی گڑھی میں سکھوں کا ایک جیش رہتا تھا، سید محمد مقیم رام پوری کو ایک سو غازیوں کا سالار بنا کر ڈمگلہ پر یورش کے لئے بھیج دیا۔ چودہ پندرہ سو ملکی بھی ان غازیوں کے ساتھ شامل ہو گئے، مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو سید محمد مقیم کا مشیر و نائب بنا دیا، گولی بارود کے علاوہ بھرے ہوئے تل بھی غازیوں کو دیدیے۔ فرما دیا کہ سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچ کر پہلے تل اندر پھینک کر انھیں منتشر کیا جائے۔ کچھ چار پائیاں بھی ساتھ لے لیں تا کہ لشکر گاہ کی خار بندی کے ساتھ کھڑی کر کے بہ آسانی اندر پہنچ سکیں۔

جنگ

سید محمد مقیم منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے، ڈمگلہ اگر چہ دور نہ تھا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے صرف تین چار سو ملکی رہ گئے، باقی سب ادھر اُدھر چھپ گئے۔ سید موصوف صاحب عزم وہمت تھے، اپنے رفیقوں کی اس خلاف توقع تقلیل سے بالکل پریشان نہ ہوئے، لشکر گاہ کے پاس پہنچ کر پہلے بارود بھرے تل پھینکے، پھر چار پائیاں خار بندی سے لگا دی گئیں اور سب سے پہلے جس شخص نے لشکر گاہ میں قدم رکھا وہ ان غازیوں کا

بہادر رسالدار محمد مقیم تھا۔ پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر حملہ کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ سکھ غول غول بن کر کئی جگہ جمع ہو گئے، ہم لوگ نل داغ داغ کر پھینکتے تو بکھر جاتے، پھر ہم قرابینیں مارتے ہوئے ان پر ہلّہ کرتے، سید محمد مقیم اور ان کے ساتھیوں نے جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ منظورہ کے بیان کے مطابق رستم واسفندیار کی داستانیں فراموش ہو گئیں۔

> وہ لوگ اس طرح سکھوں کے ہجوم میں گھستے تھے جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے، تین چار ہلوں میں انہیں (سکھوں کو) لشکر سے باہر نکال دیا۔ (۱)

جو ملکی اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، اب وہ بھی آ پہنچے، لیکن انہوں نے لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا اور مال واسباب اُٹھا کر بھاگنے لگے۔ سکھوں نے پھونس کے چند چھپروں کو آگ لگا دی، آگ بھڑکی تو ماحول دور دور تک روشن ہو گیا اور لشکر گاہ کے اندر کی ایک ایک چیز نظر آنے لگی۔ اس وقت سکھوں کو معلوم ہوا کہ لڑنے والے غازی بہت کم ہیں اور ملکی لوگ صرف مال اُٹھا اُٹھا کر بے ترتیبی سے نکلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پھر منظم ہو ہو کر مقابلے کے لئے آنے لگے۔

مراجعت

مولوی خیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ اب نکل جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب خود ایک جماعت کو لے کر سکھوں کا مقابلہ کرنے لگے، باقی غازیوں کو حکم دیا کہ اطمینان سے باہر نکل جاؤ اور زخمیوں کو اٹھا لو، چھ سات زخمیوں کو اُٹھا لیا گیا، دو کی حالت نازک تھی، اول عبد الخالق محمد آبادی، دوم سید لطف علی۔ ان دونوں نے خود کہا کہ ہمارے ہتھیار لے لو اور اُٹھانے کی تکلیف گوارا نہ کرو، ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔

---

(۱) منظورہ ص: ۴۴۸

جب سارے غازی نکل گئے تو مولوی خیر الدین بھی قدم بہ قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے باہر نکل گئے، سکھوں پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ کسی کو سنگھر سے باہر نکل کر تعاقب کی ہمت نہ ہوئی۔ اس شبخون میں چند غازی شہید ہوئے، جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے، یعنی وہی دو جنہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔ چند زخمی ہوئے، ان میں سے ایک سالار لشکر سید مقیم تھے، جن کی ٹانگ پر تلوار لگی تھی۔ سکھ مقتولین کی تعداد ایک روایت کے مطابق دو سو اور ایک روایت کے مطابق تین سو تھی۔ ''وقائع'' میں یہ تعداد ''قریب تین سو کے'' بتائی گئی ہے۔

جنگِ شنکیاری

اِدھر غازیوں کی بڑی جماعت شبخون کے لئے ڈمگلہ آئی ہوئی تھی، اُدھر مولانا کو شنکیاری کے پاس اچانک جنگ پیش آگئی۔ مولانا کے ساتھی دو فاقے کاٹ چکے تھے، کسی قدر غلہ ملا تو وہ کھانے کے انتظام میں لگ گئے۔ بعض کھا چکے تھے، بعض کھا رہے تھے اور بعض ابھی پکانے ہی میں مصروف تھے کہ اچانک سکھوں کا ایک گروہ گڑھی شنکیاری سے باہر نکلا۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوار کاٹنے کی غرض سے نکلے تھے، مولانا نے دُور سے دیکھا تو سمجھے کہ جنگ کی غرض سے آئے ہیں، فوراً غازیوں کو حکم دے دیا کہ مورچے پکڑ کر بیٹھ جاؤ، شاہینیں اور بندوقیں چلنے لگیں، سکھ نزدیک پہنچ گئے تو غازی قرابینیں مارنے لگے، بالکل پاس آگئے تو تلواریں نکال لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھ بھاگ نکلے۔ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ ایک بولا: ''یہ تو بہت تھوڑے آدمی ہیں بھاگے کیوں جا رہے ہو؟'' چنانچہ وہ پھر پلٹے۔ اس وقت مولانا کے ساتھ صرف بارہ آدمی تھے، لیکن ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ ''وقائع'' کا بیان ہے کہ مارے تلواروں کے لاش پر لاش بچھا دی، کئی سکھ مولانا کے ہاتھ سے قتل ہوئے، وہ پھر بھاگے تو گڑھی میں پہنچ کر دم

لیا، اس لڑائی میں دو اڑھائی سو سکھ مارے گئے۔ (۱) غازیوں میں سے چھ سات شہید اور نو دس زخمی ہوئے۔

مولانا کی عزیمت

سکھوں کی گولیاں مینہ کی طرح برستی رہیں، مولانا کی قبا چھلنی ہوگئی، لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے، نہ مورچے کی پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔ امجد خاں نے خود مولانا کی زبان سے سنا کہ شنکیاری کی جنگ میں سکھ ہم سے بہت قریب آگئے تھے۔ ایک سکھ تلوار لے کر میری طرف بڑھا، میں نے گولی سے اُسے ٹھنڈا کر دیا، پھر بندوق بھرنے لگا۔ اس اثناء میں دوسرا سکھ آگیا، اسے بھی مار دیا۔ تیسری مرتبہ بندوق بھر رہا تھا تو میری انگلی پر گولی لگی اور ہاتھ بندوق کے پیالے سے ہٹ گیا، میں نے اس حالت میں بھی بندوق چلادی، ایک اور سکھ مارا گیا۔ چوتھی مرتبہ بندوق بھرنے کا ارادہ کیا تو بارود لہو سے تر ہوگئی، چوتھا سکھ مجھ پر حملے کی غرض سے بڑھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اب زندہ بچنے کی کوئی صورت نہیں، میں نے خالی بندوق کا منہ اس کی طرف پھیر دیا، وہ گھبرا کر بھاگ گیا۔

مولانا اپنی زخمی انگلی کو (جو چھنگلی تھی) دکھا کر مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری ''انگشتِ شہادت'' ہے۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ بہترین انگشتِ شہادت ہے۔ فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ قبول کرے، ورنہ بہت سی ضربیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

ہزارہ سے واپسی

ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں نے سکھوں پر سخت سراسیمگی طاری کردی تھی۔ کمال خاں اور ناصر خاں نے مولانا سے کہا کہ اب آپ اگرور تشریف لے چلیں تاکہ وہاں اطمینان

---

(۱) منظورہ ص: ۳۳۸

سے مزید اقدامات کی تجویزیں سوچی جائیں۔ چنانچہ مولانا شنکیاری، بفہ، خاکی، بیر کھنڈ، ملک پورہ وغیرہ کے پاس سے گذرے۔ جب سکھوں کی گڑھی قریب آتی تو حکم دیتے کہ زور زور سے نقارہ بجاؤ تا کہ اگر کوئی مقابلہ کرنا چاہے تو باہر نکل کر حوصلہ نکال لے۔

اوگی پہنچ کر مولانا آٹھ روز ٹھہرے رہے، ارادہ یہ تھا کہ مناسب موقعوں پر غازیوں کو بٹھا کر سکھوں کی گڑھیوں پر شبخونوں کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیں۔ اس اثناء میں سید صاحب کا فرمان آ گیا کہ ہندوستان سے غازیوں کے بہت سے قافلے پہنچ گئے ہیں، آپ تشریف لے آئیں، چنانچہ مولانا کلکئی، شیر گڑھ، نکا پانی اور برونی ہوتے ہوئے دریا پر پہنچ گئے۔ دربند برونی سے قریب تھا، جہاں سکھوں کی گڑھی تھی، کچھ غازی جنگل سے لکڑی لائے، پن چکیوں پر آٹا پسوایا، سکھ انہیں دیکھتے ہی اونچے ٹیلوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے گولیاں چلانے لگے۔ عبورِ دریا کے بعد مولانا امب، ستھانہ، کھبل اور نوپلی ٹھہرتے ہوئے، پنجتار پہنچ گئے۔ ماہ ستمبر ۱۸۲۷ء میں مولانا ہزارہ گئے تھے، اسی مہینے یا اکتوبر میں ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکے پیش آئے۔(۱)

---

(۱) ”وقائع“ میں ہے کہ مولانا نوپلی پہنچے تو اردگرد کے خوانین اور مرد زادوں کے علاوہ اخوند سید میر (ملا صاحب کوٹھا) بھی چند مسائل کی تحقیق کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے تمام مسائل اخوند ممدوح کے اطمینان کے مطابق حل کر دیے۔ رات اخوند صاحب نے مولانا ہی کے پاس گزاری، پھر مولانا نوپلی سے جھنڈا بوکا گئے، جو فتح خاں پنجتاری کی عملداری میں تھا۔ توتالی وارد ہوئے تو پنجتار سے پچاس ساٹھ آدمی پیشوائی کیلئے آئے ہوئے تھے، سید صاحب پنجتار سے نکل کر بیر کے باغ تک پہنچ چکے تھے، جو توتالی سے ذرا آگے تھا۔ (ص: ۵۰۰)

چوتھا باب:

غازیوں کے قافلے

غازیوں کا انتظام

سید صاحب ہجرت فرما کر نکلے تو آپ کے ساتھ صرف پانچ چھ سو غازی تھے، لیکن یہ وسوسہ نہ پیدا ہونا چاہئے کہ صرف اسی مختصر سی جماعت کے بل پر پنجاب کی تسخیر اور ہندوستان کی تطہیر کو پایۂ تکمیل پر پہنچادینے کا خیال تھا۔ آپ نے روانگی سے پیشتر ہندوستان کے مختلف حصوں میں غازیوں کی جماعتیں تیار کرلی تھیں، ان سب کو ساتھ لے کر نکلنا خلافِ مصلحت تھا، اس لئے کہ اول یہ معلوم نہ تھا، جہاں مرکز بنا کر بیٹھنا ہے، اس کے حالات کیا ہیں، دوسرے ہزاروں آدمیوں کو ساتھ لے جانے میں قوی اندیشہ تھا کہ راستے کی تمام حکومتوں کے دل میں گوناگوں شبہات پیدا ہوجائیں گے۔ مزاحمت کی صورت پیدا ہوجانا غیر اغلب نہ تھا۔ تیسرے راستہ ایسا اختیار کیا تھا، جہاں کوسوں تک پانی بہت کمیاب تھا اور غلہ ملنا بھی سخت مشکل تھا، اور پریشان کن حالات کے پیشِ نظر آپ نے تھوڑے آدمی ساتھ لئے، باقی اصحاب سے فرمایا کہ بلاوے کا انتظار کریں، جب سرحد میں امامت کی بیعت ہوگئی اور سید صاحب کو قائد و پیشوائے جہاد مان لیا گیا تو تمام مقامات پر اطلاع بھیج دی گئی کہ اب بے تکلف چلے آؤ، سید صاحب نے مختلف حصوں میں داعی بھی بھیج دیے کہ غازیوں کی ترتیب وارسال اور وسائل جہاد کی فراہمی کا کام انجام دیتے رہیں، ان داعیوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ابتدائی قافلوں کی آمد

سید صاحب اضلاع سوات کا دورہ فرما رہے تھے، جب غازیوں کے قافلے سرحد پہنچنے لگے۔ ان کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ مولوی قلندر کا قافلہ، جو کوٹ گرام میں سید صاحب کے پاس پہنچا تھا، اس میں غالباً اسی غازی تھے۔

۲۔ قاضی احمد اللہ میرٹھی کا قافلہ، اس میں ستر غازی تھے اور یہ اس زمانے میں پہنچا تھا جب سید صاحب اوچ (سوات) میں تھے۔

۳۔ رسالدار عبد الحمید خاں کا قافلہ، عبد الحمید خاں نواب امیر الدولہ والی ٹونک کے پاس ملازم تھے، من چلے آدمی تھے، اس عہد کے عام فارغ البال لوگوں کی طرح زندگی رنگینیوں میں گذر رہی تھی۔ سید صاحب کو دیکھا تو فطری سعادت کا جذبہ بیدار ہوا، بیعت کی اور اسی وقت سے پورا نقشۂ حیات بدل گیا۔ ملازمت چھوڑ کر ہجرت پر آمادہ ہوئے، جو رفیق مساعدت پر آمادہ ہوئے انہیں ساتھ لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے رفیقوں میں سے پانچ کے نام معلوم ہیں، شیر خاں، رستم خاں، مستقیم، شیخ رمضان، شیخ مکھو۔ اس قافلے کے ساتھ صاحبزادہ محمد وزیر خاں ولی عہد ریاست ٹونک نے ایک گھوڑا بھی سید صاحب کے لئے بھیجا تھا جس کے لئے زریں زین پوش تیار کرایا تھا۔

۴۔ مولوی محمد رمضان رڑکی والے کا قافلہ، اس میں ایک سو غازی تھے اور یہ بھانڈہ (سوات) میں سید صاحب سے ملا تھا۔

۵۔ مولانا عبد الحیٔ کا قافلہ، یہ چار باغ میں سید صاحب سے ملاقی ہوا، اس کے افراد کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔

۶۔ سید محمد مقیم رام پوری کا قافلہ، اس میں چالیس غازی تھے، تمام جوان شجاع اور

حد درجہ پرہیزگار۔ تمام قافلوں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس راستے سے سرحد پہنچے، اور کن کن مقامات سے گذرتے ہوئے سوات گئے۔ مولانا عبدالحیٔ کا قافلہ بہاول پور، سندھ، بلوچستان اور افغانستان کے راستے گیا تھا، ان قافلوں کے ساتھ روپیہ اور ساز وسامانِ جنگ بھی پہنچتا رہا۔ محمد مقیم کے قافلے کے متعلق تو تصریحاً مذکور ہے کہ نقد روپے کے علاوہ اس کے ساتھ قرابینیں اور حرب وضرب کی دوسری چیزیں بھی تھیں۔

مزید قافلے

سید صاحب دورۂ سوات سے فارغ ہو کر پنجتار پہنچ گئے تو مزید قافلے آئے، جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام مجھے مختلف روایتوں سے معلوم ہو سکے۔

۱۔ سید احمد علی بریلوی خواہرزادۂ سید صاحب کا قافلہ۔
۲۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی، برادر مولانا ولایت علی کا قافلہ۔
۳۔ مولوی قمرالدین عظیم آبادی کا قافلہ۔
۴۔ مولوی عثمان علی کا قافلہ۔
۵۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی کا قافلہ۔
۶۔ مولوی خرم علی بلہوری (ناظم جہادیہ فارسی واُردو و مصنف کتب عدیدہ) کا قافلہ۔
۷۔ مولوی عبدالقدوس کان پوری کا قافلہ۔
۸۔ مولانا سید محمد علی رام پوری کا قافلہ۔
۹۔ مولوی باقر علی کا قافلہ۔
۱۰۔ مولوی عبداللہ امروہہ والے کا قافلہ۔
۱۱۔ حافظ قطب الدین پھلتی کا قافلہ۔

۱۲۔ مولوی عبدالحق (نیوتنی) کا قافلہ۔

۱۳۔ مولوی محبوب علی دہلوی کا قافلہ۔

۱۴۔ حکیم محمد اشرف دہلوی کا قافلہ۔

۱۵۔ میرن شاہ نارنولی کا قافلہ۔

ان میں سے کسی کے افراد کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہندوستان کے کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اکٹھے چلے یا یکے بعد دیگرے الگ الگ نکلتے رہے۔ سکھر کے پاس انہوں نے دریائے سندھ کو عبور کیا، پھر ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور کالا باغ ہوتے ہوئے علاقہ خٹک میں پہنچے تو درانیوں نے روک دیا اور دو مہینے تک کنڈو میں پڑے رہے۔

سدِ طریق کی سرگزشت

درانیوں میں سے یار محمد خاں اسی وقت سے سید صاحب کا دشمن بن گیا تھا، جب سے شیدو کی جنگ میں اس نے غداری کا ارتکاب کیا تھا، لیکن سلطان محمد خاں نے مکاتبت کا سلسلہ جاری رکھا اور برابر عقیدت و نیاز کے دعوے کرتا رہا۔ سید صاحب نے اسے لکھا کہ غازیوں کے قافلے کیوں روکے گئے تو جواب آیا کہ سکھ جنگِ شیدو کے بعد یار محمد خاں کے فرزند محمد حسن خاں کو ناظر مراد علی کے ساتھ بطور یرغمال لاہور لے گئے تھے، مہینوں کی کوشش کے بعد رنجیت سنگھ ان کی رہائی پر رضا مندی ہوا، عین اس اثناء میں لاہور خبر پہنچ گئی کہ غازیوں کے قافلے پشاور کے اطراف سے گذر کر سید صاحب کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ یہ سنتے ہی بگڑ بیٹھا اور محمد حسن خاں کو بلا کر دھمکی دی کہ اپنے باپ اور چچا کو لکھو، اگر غازیوں کو فوراً نہ روک دیا گیا تو تمہیں عذاب کے شکنجے میں کس دوں گا۔ محمد حسن نے یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کو لکھا کہ جب تک غازیوں کے قافلے نہ روکے

جائیں گے میرے لئے مخلصی کی کوئی شکل نہ بنے گی۔ یار محمد خاں نے پریشان ہو کر تیس سواروں کو ظاہرداری کے طور پر حد اجا خیل (۱) تک دیکھ بھال کا حکم دے کر رنجیت سنگھ کو اس انتظام کی اطلاع دے دی، ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اب تک غازیوں کا کوئی گروہ نظر نہیں آیا۔

گویا سلطان محمد خاں کے نزدیک روک تھام کے انتظامات کا مدعا محض یہ تھا کہ رنجیت سنگھ مطمئن ہو کر محمد حسن خاں اور ناظر مراد علی کو رہا کر دے۔ آخر میں اس نے یہ بھی لکھا کہ میرے اور یار محمد کے تعلقات اچھے نہیں رہے، میں نے اس کے مقرر کئے ہوئے سواروں کو واپس بلا لیا ہے اور اپنے آدمی مقرر کر کے خفیہ طریق پر تاکید کر دی ہے کہ سید صاحب کے غازیوں کو سلامتی سے گذر جانے میں حتی الامکان امداد دیں۔ (۲)

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا میں غازیوں کو روکنے کا کوئی انتظام نہ تھا، اور جو قافلے سوات میں سید صاحب کے پاس پہنچے تھے، انہیں رکنا نہیں پڑا تھا۔ اغلب ہے محمد حسن خاں کی طرف سے اطلاع آنے پر سد طریق مناسب سمجھا گیا ہو۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سلطان محمد خاں نے اپنے آدمیوں کو غازیوں کی اعانت کا حکم دے دیا تھا، اس لئے کہ ۱۴/محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۷/اگست ۱۸۲۷ء) تک قافلے کنڈوہ ہی میں رکے بیٹھے تھے۔ اسی شدید رکاوٹ کی بنا پر مولوی محبوب علی نے سید صاحب کو لکھا تھا کہ کافروں کو چھوڑ کر پہلے ان "کلمہ گو کافروں" (یعنی درانی سرداروں) کا فیصلہ کیجئے۔ (۳)

---

(۱) اجا خیل پشاور سے نو کوس ہے، بظاہر یہ بیان درست بھی ہو تو قافلوں کو روکنے کا مطلب یہ تھا کہ سکھوں کے خلاف جو بھی سعی و جہد شروع ہوئی ہے اسے برباد کر دیا جائے۔

(۲) مکتوبات شاہ اسماعیل ص: ۱۱۵۔ سلطان محمد خاں کا یہ خط ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کا مرقومہ ہے (۱۸/جولائی ۱۸۲۷ء)۔

(۳) مکتوبات شاہ اسماعیل ص: ۱۹۸، ۱۹۹

سید صاحب کے انتظامات

آخر سید صاحب نے ملا قطب الدین ننگر ہاری، مرزا احمد گل بیگ اور ارباب بہرام خاں کو ان قافلوں کے لانے پر مامور فرمایا۔ ارباب کے پاؤں میں چھالے نکل آئے تھے اور وہ چلنے سے بالکل معذور تھے، اس لئے خود نہ جا سکے اور اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔

"وقائع" میں ہے کہ میاں دین محمد کو اس کام پر مقرر فرما کر حکم دے دیا تھا کہ جسے چاہو اپنے ساتھ لے لو۔ چنانچہ انہوں نے شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ نصر اللہ خورجوی، ملا قطب الدین ننگر ہاری، ملا علی خاں اور چند ولایتیوں کو ساتھ لے لیا، جو غالباً ارباب بہرام خاں کے آدمی تھے۔

غرض یہ لوگ دریائے لنڈے پر پہنچے، کشتی والوں سے مل کر قافلوں کو گزارنے کا معاملہ طے کیا۔ نشانی یہ بتادی کہ جو شخص تمہارا ہاتھ پکڑ لے، سمجھ لینا کہ ہمارا آدمی ہے، اور اس کے ساتھ جتنے لوگ ہوں انہیں پار اتار دینا۔

ان انتظامات کی اطلاع سید صاحب کو بھیج کر منتظمین لنکار بابا(۱) کی زیارت گاہ پر پہنچے، جہاں مولوی عنایت علی عظیم آبادی، سید احمد علی بریلوی اور حافظ قطب الدین پھلتی ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولوی عنایت علی فوراً ایک رفیق کے ہمراہ پنجتار روانہ ہو گئے، باقی قافلوں کی روانگی کا انتظام تدریجاً عمل میں آیا، سب کو تاکید کر دی گئی تھی کہ نوشہر میں قیام نہ کیا جائے۔

---

(۱) حضرت لنکار باباؒ سرحد کے عالی منزلت اولیا میں سے تھے، عام طور پر حضرت کا کا صاحبؒ کے لقب سے مشہور ہیں، ان کی زیارت نوشہرہ سے قریب ہے اور زیارت کا کا صاحب کہلاتی ہے۔ ان کی اولاد کو کا کا خیل کہتے ہیں۔ وقائع میں مرقوم ہے کہ قافلوں کو پار اتارنے کے لئے حضرت کا کا صاحبؒ کے اخلاف سے بھی مدد مانگی گئی تھی، لیکن انہوں نے درانیوں کے خوف کی وجہ سے تامل کیا، پاس کی بستی والوں نے بڑے جوشِ عقیدت سے امداد کا پورا انتظام کر دیا۔ (ص: ۵۰۲)

درۂ پنجتار میں اِستقبال

دوسرے یا تیسرے دن تمام قافلے درۂ پنجتار میں پہنچ گئے، سید صاحب استقبال کے لئے درے میں پہنچنے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے، آپ کی سواری کے لئے وہ سبزہ رنگ گھوڑا تیار کیا گیا، جو سید محمد خاں دُرّانی نے نذر کیا تھا اور غالباً سید صاحب کی اجازت کے بغیر نیاز مندوں نے اس پر مخمل کا وہ زین پوش ڈال دیا تھا جو صاحبزادہ محمد وزیر خاں نے رسالدار عبدالحمید خاں کے ہاتھ بھیجا تھا، اس پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔

سید صاحب پیادہ نکل پڑے اور پگڈنڈی سے درے میں پہنچ گئے۔ گھوڑا عام راستے سے کوتل آیا، مولوی محبوب علی نے گھوڑے پر زرّیں زین پوش دیکھا تو راستے میں دو مہینے رکے رہنے کے باعث غصے اور تلخی کی جو آگ دل میں سلگ رہی تھی وہ ایک دم بھڑک اٹھی معاً طعن آمیز انداز میں بولے: سبحان اللہ! گھوڑے پر زرّیں زین پوش ہے، جہاں ایسا امیرانہ ٹھاٹھ ہو، وہاں دیکھا چاہئے انجام کیسا ہو۔ (۱)

یہ اس غلط فہمی کی ابتدا تھی، جو بڑھتے بڑھتے اس حد پر پہنچ گئی کہ مولوی صاحب تیز بعض دوسرے اصحاب سید صاحب کی معیت چھوڑ کر واپس چلے گئے اور طویل و صبر آزما سفر کے بعد مقامِ جہاد پر پہنچ کر اس عظیم الشان کارِ حق کے ثمرات و برکات سے محروم رہ گئے۔

سید صاحب نے تمام غازیوں سے مصافحہ و معانقہ فرمایا، بڑے اعزاز و اکرام سے انہیں پنجتار لے گئے۔ اطمینان و مسرت کا اس سے بڑھ کر کیا موقع ہوسکتا تھا کہ چند برس کی محنت و جانکاہی سے وہ انتظامات بار آور ہونے لگے، جو ملک کی آزادی اور تطہیر کے لئے بے سروسامانی کی حالت میں شروع کئے گئے تھے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد جو کام وقت کے سلاطین و امراء بہ استثناء چند انجام نہیں دے سکے تھے، حالانکہ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود تھے، اس کام کے سرانجام کا بندوبست ایک بے نوا سید نے اپنے وطن

---

(۱) وقائع ص: ۵۰۲

سے اڑھائی ہزار میل کے فاصلے پر اجنبی سرزمین میں بیٹھ کر کرلیا۔ جگہ جگہ سے راہِ حق کے سرفروش علمِ جہاد کے نیچے جمع ہونے لگے، لیکن مسلمانوں کی قسمت میں امتحان و ابتلا کے کئی مرحلے ابھی باقی تھے اور یہ تدبیر بھی فائز المرامی کا ناصیۂ جمال دکھا کر توقف کے نقاب میں مستور ہوگئی۔

مولوی محبوب علی کا معاملہ

مولوی محبوب علی نے پنجتار پہنچ کر اپنا خیمہ الگ نصب کیا، پھر سید صاحب کے پاس پہنچے تو ظاہر ہوا کہ ہر چیز سے غیر مطمئن ہیں۔ انہیں پہلا اعتراض یہ تھا کہ درانی سرداروں کے ساتھ مصالحانہ روش اختیار کرنا غیر مناسب ہے۔ سید صاحب نے صلح حدیبیہ کی مثال دے کر وسیع مصلحتیں واضح فرمائیں۔ پھر مولوی صاحب نے یہ اعتراض کر دیا کہ سید صاحب امام ہو کر امتیاز پیدا کر رہے ہیں۔ نفیس لباس پہنتے ہیں، لذیذ کھانے کھاتے ہیں، اس کے برعکس مجاہدین چکیاں چلاتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں اور پاؤ پاؤ بھر غلہ پاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بے جا تھے، اس لئے کہ سب کو معلوم تھا سید صاحب وہی معمولی لباس پہنتے ہیں جو ہندوستان میں پہنتے تھے، اور اس لباس پر بھی بیت المال کے روپے سے کبھی ایک حبہ صرف نہ ہوا۔ سید صاحب کے بعض ہندوستانی عقیدت مند جماعت کے لئے تحائف بھیجنے کے علاوہ آپ کے لئے کپڑے سلا کر بھیجتے رہتے تھے، ان میں سے وقتاً فوقتاً ضرورت مند غازیوں کو بھی کپڑے دیے جاتے تھے۔ امرا نے جو بیش قیمت عبائیں سید صاحب کی نذر کی تھیں، وہ آپ نے کبھی نہ پہنیں اور سرحدی سرداروں مثلاً سلطان محمد خاں، سید محمد خاں وغیرہ کو دے دیں۔ غلہ بھی سید صاحب کو عام غازیوں کے برابر ملتا تھا، البتہ مہمانوں کیلئے الگ غلہ ضرورت کے مطابق لے لیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان مہمانوں کے اکرام کی خاطر اچھا کھانا بھی پکوانا پڑتا تھا اور سید صاحب ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔

سید صاحب نے تمام اعتراضات کو تحمل سے سُنا۔ مولوی صاحب کی دل جوئی اور رفع شبہات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آخر میں فرمایا کہ غلے کا انتظام آپ خود سنبھال لیں اور مہمانوں کے ساتھ آپ ہی کھانا کھایا کریں۔(۱)

"منظورہ" سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے سید صاحب کی امامت میں بھی قدح شروع کر دی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ بارِ گراں رکھ دیا گیا، اگر آپ کے نزدیک میں اس کے قابل نہیں تو آپ عالم ہیں، سید ہیں، مہاجر ہیں، یہ کام خود سنبھال لیں، مجھے سرداری کی خواہش نہیں، صرف اس کام کا انصرام مطلوب ہے، خواہ مجھے کوئی حیثیت دی جائے۔

فتنہ تفرقہ

غرض مولوی صاحب کی روش نے تفرقے کی ایک عجیب وغریب فضا پیدا کر دی۔ وہ سید صاحب پر معترض تھے۔ ان کے جو ساتھی مولانا اسماعیل کے معتقد تھے انہوں نے خود مولوی محبوب علی پر اعتراضات شروع کر دیے کہ آپ جہاد کا وعظ کہہ کہہ کر ہم سب کو یہاں لائے، اب کون سی بات خلافِ شرع وسنت دیکھی کہ اعتراض کے تیروں کا ترکش بن گئے؟ جو لوگ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ مولوی

---

(۱) وقائع میں ہے کہ مہمانوں کو کھلانے کی کئی صورتیں تھیں مثلاً اگر مہمان سویرے آ جاتے تو سید صاحب ایک ایک دو دو چار چار آدمیوں کو مختلف جماعتوں میں بھیج دیتے اور وہ جماعتوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اگر بڑے مولوی یا خان آ جاتے تو سید صاحب کے لئے تحائف میں وقتاً فوقتاً جو مرغ، ماش، چاول وغیرہ آتے، وہ سب ان معزز مہمانوں کے صرف میں لائے جاتے۔ کھانا پک چکنے کے بعد مہمان آ جاتے تو ان کی تعداد کے مطابق غازیوں کے کھانے کی مقدار فی کس گھٹا دی جاتی، مثلاً آدھ سیر کھانا فی کس پکا تو تقسیم میں سب کو پاؤ پاؤ بھر ملا، ایسا بھی ہوتا کہ سید صاحب خود کچھ نہ کھاتے۔ مہمانوں کو کھلانے کے بعد بچ رہتا تو چند نوالے کھا لیتے، ورنہ کسی جماعت کے ساتھ بیٹھ کر جو کچھ ہوتا نوش فرما لیتے۔ سید صاحب نے مولوی محبوب علی صاحب کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا تھا، لیکن جب مولوی صاحب نے سید صاحب کے کھانے کی کیفیت معلوم کر لی تو کہا کہ ہم سے ہر روز بھوکا نہیں رہا جاتا۔ (ص: ۵۰۳، ۵۰۴)

صاحب سید صاحب کے شریکِ طعام ہونے سے بھی گریزاں ہیں تو کہنے لگے کہ پہلے سید صاحب پر نفیس کھانے کا الزام تھا، اب دو ہی دن میں گھبرا کیوں گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں آباد کے تر لقمے یاد آتے ہیں۔

مولوی محمد حسن کی گفتگو

مولوی صاحب نے ایک قدم آگے بڑھا کر غازیوں سے کہنا شروع کیا کہ گھر واپس چلو اور اقارب کے جو حقوق تم پر ہیں انہیں بجالاؤ، یہاں رہ کر ان کے اتلاف کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لو۔ غازیوں نے عرض کیا کہ ہم تو یہاں جہاد کی غرض سے بیٹھے ہیں، مولوی صاحب نے کہا: جہاد کہاں ہے؟ تم نے کون سے دن کسی کافر کو مارا ہے؟ کون سے ملک میں تمہارا دخل ہوا ہے؟ یہاں صرف کھانا پکانے کی فکر میں رہتے ہو۔

آخر ایک روز مولوی محمد حسن نے پوچھا کہ حضرت! آپ کس دلیل سے غازیوں کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں؟ مولوی محبوب علی نے کہا کہ آخر یہاں کس کافر سے جنگ درپیش ہے؟ مولوی حسن نے جواب دیا کہ جنگ کو قتال کہتے ہیں، اور اس کا موقع گاہے گاہے آتا ہے، جہاد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سعی کی جائے، یہاں لوگ اس کام میں مصروف ہیں، آپ ان کے فعل کو عبث قرار دیتے ہیں؟ اگر کسی روز کفار سے مقابلہ پیش آجائے اور آپ دہلی میں ہوں تو کونسی کرامت سے راہِ دور و دراز طے کرتے ہوئے، اس میں شریک ہوسکیں گے؟ مولوی صاحب یہ سن کر لاجواب ہوگئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگ مزاج بزرگ تھے، سفر کی صعوبتوں اور راہِ حق کی مشقتوں کا پورا اندازہ نہ تھا۔ کنڈوہ میں رُکے رہنے سے جو ملال و کبیدگی پیدا ہوچکی تھی، وہ ان کے تمام افکار وعقائد کو بے طرح متاثر کرگئی۔ نہ حالات پر صبر کے ساتھ غور وفکر کی صلاحیت باقی رہی اور نہ کسی نیک دل بزرگ کی نصیحت ان پر اثر انداز ہوسکی۔ مولانا شاہ اسماعیل اس زمانے میں پکھلی گئے ہوئے تھے، انہیں یہ حالات معلوم ہوئے تو متواتر خط لکھے

رہے کہ مولوی صاحب کو میری واپسی تک روکا جائے، لیکن شاہ صاحب کی تشریف آوری سے تین روز قبل مولوی محبوب علی صاحب کسی کو اطلاع دیے بغیر رات کے وقت اچانک پشاور روانہ ہو گئے۔

مراجعت کے اثرات

ان قافلوں میں سے میرن شاہ نارنولی تیسرے ہی دن واپس چلے گئے، چکنی پہنچ کر بیمار پڑے اور وہیں وفات پائی۔ یہ واقعہ یقیناً تعجب انگیز ہے کہ ہزاروں میل کی دشوار گزار مسافت قطع کر کے جہاد کی نیت سے پنجتار پہنچے، لیکن اس کے ثواب عظیم سے محرومی گوارا کرتے ہوئے، مرکزِ جہاد سے تھوڑے فاصلے پر بہ عالمِ غربت جاں بحق ہوئے، اجتہادی غلطی کی یہ کتنی افسوس ناک اور عبرت خیز مثال ہے۔

کچھ دن بعد مولوی محبوب علی صاحب بھی چلے گئے اور بخیر و عافیت دہلی پہنچے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک زندہ تھے۔ "ارواحِ ثلاثہ" میں ہے کہ جن علماء نے اس ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا، مولوی صاحب نے ان سے اختلاف کیا تھا اور فتوے پر مُہر ثبت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انگریزوں نے انہیں گیارہ گاؤں بطور انعام معافی دینے چاہے، مولوی صاحب نے پروانۂ معافی لے کر چاک کر ڈالا اور کہا کہ میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا تھا، میرے نزدیک مسئلہ یونہی تھا۔ (۱)

حکیم محمد اشرف دہلوی بھی واپس چلے گئے، ان لوگوں کی واپسی کا اثر ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا تھا، خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی واپسی کو حق بہ جانب ثابت کرنے کیلئے یہ بزرگ انتظاماتِ جہاد کے بارے میں کوئی مستحسن کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے مختلف حلقوں میں بددلی اور افسردگی پیدا ہوئی اور دیر تک قافلوں کی آمد رُکی رہی،

---

(۱) "ارواحِ ثلاثہ" ص: ۳۱۶۔ بعض اصحاب نے اس انعام کو میدانِ جہاد سے مراجعت کا صلہ ظاہر کیا ہے، یہ صحیح نہیں۔ یہ انعام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فتوائے جہاد پر دستخط نہ کرنے کا صلہ تھا، مدعیانِ جہاد سے مراجعت کا صلہ دینے کی انگریزوں کو کیا ضرورت تھی؟

یہاں تک کہ سید صاحب نے بہ حالت مجبوری بعض رفقاء کے مشورے کے مطابق تنخواہ دار سپاہی بھرتی کیے۔ تنخواہ دار سپاہیوں کی بھرتی یقیناً غیر مناسب نہ تھی، لیکن اس کے لئے بقدر ضرورت وسائل موجود نہ تھے۔ اس لئے نہ وسیع پیمانے پر سپاہی بھرتی کیے جا سکے، نہ تنخواہ دار سپاہ کا سلسلہ زیادہ دیر تک باقی رہ سکا۔ خاصی مدت کے بعد سید صاحب کے نیاز مندوں خصوصاً شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کی کوششوں سے غلط فہمیوں کے بادل چھٹے تو پھر قافلے پہنچنے لگے۔

آخری دَور کے قافلے

آخری دور کے تمام قافلوں کا حال معلوم نہ ہو سکا، صرف مندرجہ ذیل کا سراغ مختلف روایتوں میں مل سکا۔

۱۔ مولوی محمد اسحاق گورکھپوری کا قافلہ، اس میں صرف پانچ آدمی تھے، خود شیخ صاحب، شیخ برکت اللہ، پیر محمد، امام خاں سہسرامی اور شرف الدین شاہ جہان آبادی۔ چونکہ یہ بہت تھوڑے آدمی تھے اور کوئی خاص سامان بھی ساتھ نہیں لے گئے تھے، اس لئے سکھوں کی حکومت سے گذرتے ہوئے سرحد پہنچے۔

۲۔ مولوی جعفر علی نقوی کا قافلہ، اس میں اُنیس آدمی تھے، یہ قافلہ گورکھپور سے چلا اور سارے یوپی کو طے کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ پھر انبالہ، پٹیالہ، ممدوٹ، بہاول پور، تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خاں) اور کالا باغ ہوتا ہوا پہلے پنجتار گیا، بعد ازاں امب میں سید صاحب کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے سفر کی تفصیل مولوی سید جعفر علی نقوی کے ذاتی حالات میں ملے گی۔ مولوی صاحب سید صاحب کے منشی خانے میں بطور محرر کام کرتے رہے، واقعہ بالاکوٹ کے بعد گھر پہنچے، پھر نواب وزیر الدولہ کے کہنے پر سید صاحب کے حالات میں تاریخ احمدی لکھی، جس کا نام ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں اس کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔

۳۔ حاجی وزیر خاں پانی پتی کا قافلہ، اس میں مندرجہ ذیل اصحاب شریک تھے: غلام رسول خاں ملتانی، محمد بخش گولہ انداز، احمد خاں قاصد اور علیم الدین برادر مولوی امام الدین بنگالی۔ کالا باغ میں یہ قافلہ سید جعفر علی نقوی کے قافلے سے ملحق ہو گیا تھا۔

۴۔ مولوی محمد رمضان کا قافلہ، یہ اس زمانے میں پہنچا تھا جب سید صاحب امب میں مقیم تھے۔ اس میں تقریباً پچاس آدمی تھے۔

ہنڈیاں

بالکل ابتداء میں ہندوستان سے بے واسطۂ قاصد روپیہ منگانے کا کوئی انتظام نہ تھا، جو غازی جہاد کی نیت سے آتے تھے وہ روپیہ لے آتے تھے۔ سرحد پہنچنے کے بعد سید صاحب نے ہنڈیوں کے ذریعے سے روپیہ منگانے کا انتظام فرما لیا، اور اس بارے میں ہندوستان اطلاعات بھیج دیں۔ پہلے پہل ہنڈیاں پشاور کے ساہوکاروں سے بھنائی جاتی تھیں۔ پشاور چونکہ بڑا تجارتی مقام تھا، اس لئے وہاں کے ساہوکاروں نے ہندوستان کے ہر حصے سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ جب درانیوں کے ساتھ تعلقات بہت بگڑ گئے اور انہوں نے پشاور کے ساہوکاروں کو سید صاحب کے ساتھ روابط داد و ستد رکھنے سے منع کر دیا تو منارہ کے ساہوکاروں سے رابطہ پیدا کر لیا گیا۔

منارہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہنڈ سے قریب واقع تھا، سید صاحب کے زمانے میں خاصہ بڑا تجارتی مرکز ہوگا۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانیٔ سندھ میں تباہ ہو گیا۔ اس مقام کے دو ساہوکاروں کا نام سید صاحب کے تذکروں میں آیا ہے، ایک کا نام موتی تھا، دوسرے کا سنتو۔ یہ غالباً بھائی تھے، اور بارہ روپے فی صدی لیتے تھے، یعنی ایک سو روپے کی ہنڈی کے اٹھاسی روپے دیتے تھے۔ یہ لوگ حضرو کے ساہوکاروں کے ذریعے سے ہنڈیوں کا روپیہ وصول کرتے تھے۔

پانچواں باب:

خہر میں قیام

علاقہ سمہ میں دورے کی تجویز

سید صاحب بونیر اور سوات کا دورہ فرما چکے تھے، مولانا اسماعیل ہزارہ کے مختلف حصوں میں جہاد کا پیغام پہنچا چکے تھے، ارباب بہرام خاں تہکالی سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تو عرض کیا: پنجتار میں کوئی خاص مشغولیت تو ہے نہیں، اگر مناسب سمجھیں تو گرد ونواح کے علاقے کا دورہ فرمائیں۔ لوگوں میں گروہ بندیاں اور پٹہ داریاں ہیں، نیز ان میں جاہلیت کی رسمیں پھیلی ہوئی ہیں، آپ کے وعظ و نصیحت سے سچی اسلامیت کی روح بیدار ہوگی اور عداوتیں مٹ جائیں گی۔

سید صاحب کو یہ مشورہ بہت پسند آیا، چنانچہ آپ نے بیماروں اور معذوروں کو پنجتار میں چھوڑا، باقی غازیوں کو ساتھ لے کر دورہ شروع کر دیا۔

ارباب بہرام خاں اپنی حق پسندی اور دین داری کی وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ پنجتار کے قریب موضع مہر علی میں رہتے تھے، وہیں سے بیس پچیس سواروں کے ساتھ سید صاحب کے پاس پہنچے تھے، ایک سبزہ رنگ گھوڑا بطور نذر پیش کیا، جس کا نام اژدر تھا۔ سید صاحب کے سرحدی رفقاء میں ارباب موصوف کا رتبہ بہت بلند ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سید اکبر شاہ ستھانوی کے سوا اکابر سرحد میں سے کوئی بھی اخلاص، تدبر، وفا کیشی اور ایثار وحق کوشی میں ارباب مرحوم کے برابر نہ تھا۔ جب سے سید صاحب کا دامن پکڑا، تادمِ مرگ نہ چھوڑا اور سید صاحب کے ساتھ ہی بالاکوٹ میں

شہادت پائی۔

دَورے کی کیفیت

سید صاحب پنجتار سے نکلے تو پہلے شیوہ پہنچے، جہاں کے رئیس آنند خاں نے خلوص کے ساتھ استقبال کیا، سید صاحب کو اپنے مکان میں ٹھہرایا، غازیوں کو مسجدوں اور حجروں میں اُتارا۔ پھر علاقہ سرحد کے عام شیوے کے مطابق اہل شیوہ دو دو چار چار غازیوں کو مہمان بنا کر لے گئے، اس مقام میں سید صاحب دو روز ٹھہرے، لوگوں کو آپ کے مواعظ سے بڑا فائدہ پہنچا اور اکثر بیعت سے مشرف ہوئے۔

وہیں چارگلئی کا رئیس منصور خاں پہنچ گیا اور سید صاحب کو غازیوں سمیت اپنے گاؤں لے گیا۔ راستے میں موضع مہر علی سے گذرے، ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال وہیں تھے، انہوں نے تمام اصحاب کے لئے ناشتے کا انتظام کیا۔ آگے بڑھے تو موضع مچئی کے لوگ راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور ایک رات اپنے ہاں ٹھہرایا۔ چارگلئی میں عام باشندوں کے علاوہ محمود خاں رئیس تنگی نے بھی بیعت کی، اسے درانیوں نے جلا وطن کر رکھا تھا، اور وہ منصور خاں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ چارگلئی میں سید صاحب تین روز ٹھہرے۔

بعد کے دَورے کی سرسری کیفیت یہ ہے۔

مقام	مدتِ قیام
امان زئی	چار دن
اسماعیلہ	ایک شب
کالو خاں	ایک شب
تلانڈی	ایک شب
شیخ جانا	ایک شب

پندرہ سولہ روز دورے میں گزار کر سید صاحب پنجتار واپس ہوئے۔ دوسری مرتبہ نکلے تو شیوہ، مینی، چارگلئی ہوتے ہوئے کاٹ لنگ اور لوند خوڑ کے راستے شاہ کوٹ تشریف لے گئے، وہیں سے سید حمید الدین (خواہر زادۂ سید صاحب)، سید ابوالقاسم (ابن سید احمد علی خواہر زادۂ سید صاحب) اور شادی خاں گنج پوری کو ہندوستان بھیجا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کوٹ میں کئی دن گزارے، الا ڈنڈ کا رئیس عنایت اللہ خاں خود شاہ کوٹ پہنچا اور ساتھ لے جانے پر مصر ہوا، چنانچہ سید صاحب ملاکنڈ کی گھاٹی سے گذر کر پہلے درگئی پہنچے، جو شمال مغرب میں علاقہ سمہ کا آخری مقام ہے، پھر دو سو غازیوں کے ساتھ خمر تشریف لے گئے۔ بعد میں عنایت اللہ خاں کے مشورے سے باقی غازیوں کو بھی خمر (۱) میں بلا لیا۔ صرف پیر خاں مورانوی درگئی میں رہ گئے، اس لئے کہ لشکر اسلام کے اونٹ وہیں تھے اور درگئی میں اونٹوں کے چرانے کا انتظام بہت اچھا تھا۔

قیامِ خمر

خمر میں سید صاحب پہلے بڑی مسجد میں اترے اور باقی مجاہدین کو دوسری مساجد یا ان کے ملحقہ حجروں میں اتارا گیا۔ چند روز کے بعد ملا کلیم اخوند زادہ، سید صاحب کو مسجد سے اٹھا کر اپنے مکان پر لے گئے۔

صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ سید صاحب جمادی الاخریٰ ۱۲۴۳ھ (دسمبر ۱۸۲۷ء) میں خمر پہنچے تھے اور جمادی الاخریٰ ۱۲۴۴ھ (دسمبر ۱۸۲۷ء، وجنوری ۱۸۲۹ء) تک وہیں قیام فرما رہے۔ منظورہ میں ہے: "زائد از یک سال قیام داشتند۔"

---

(۱) خمر اصل میں فارسی کے لفظ شہر کی پشتو شکل ہے۔ اس کا ایک تلفظ "خار" بھی ہے، یہ دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر سوات زیریں کا مشہور مقام ہے، موجودہ سڑک سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ سید صاحب کے سوانح میں اس مقام کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ یہ تقریباً ایک برس مجاہدین کا مرکز رہا اور مولانا عبدالحئی نے اسی مقام پر وفات پائی۔

گویا ۱۲۴۳ھ کا ماہِ رمضان اور دونوں عیدیں خمر ہی میں گزاریں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنجتار کو چھوڑ کر خمر میں کیوں اتنی دیر تک قیام کیا، یہاں تک کہ وہ مقام نظر بہ ظاہر مستقل مرکز بن گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب درانیوں کا خرخشہ ختم کرنے کا فیصلہ فرما چکے تھے، اور اس کی بہترین تدبیر یہی تھی کہ پشاور کے آس پاس کے خوانین وعوام کو راہِ راست پر لاتے۔ اس غرض کے لئے خمر موزوں ترین مقام تھا، درانی کاروبارِ جہاد میں بے طرح رکاوٹ کا باعث بن گئے تھے اور ہر وقت خوانین کو سید صاحب کے خلاف ابھارتے رہتے تھے۔ سکھ انہیں کی وجہ سے بے تکلف علاقہ سرحد میں داخل ہو کر مسلمانوں کو ظلموں کا ہدف بنانے میں سرگرم تھے، ہندوستان سے غازیوں کی آمد کا راستہ بھی انہیں نے روک رکھا تھا۔

خمر اگرچہ مستقل قیام گاہ بن گیا تھا، لیکن سید صاحب کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام میں دعوتِ جہاد اور تنظیم کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اس غرض کیلئے آپ نے دورے شروع کر دیے۔ کئی بستیوں میں گئے، ایک ایک دو دو دن قیام کیا۔ روایتوں میں صرف دو مقامات کے نام تصریحاً آئے ہیں، ایک ڈھیری جو خمر سے دو اڑھائی کوس کے فاصلے پر ہے، دوم برم گولہ (۱) جہاں سید صاحب چار روز مقیم رہے۔

مولانا عبدالحئی کی وفات

قیامِ خمر کا ایک نہایت رنجیدہ واقعہ مولانا عبدالحئی کی وفات ہے، مولانا بہت بوڑھے تھے، بواسیر کا مرض پہلے سے تھا۔ قیامِ خمر کے زمانے میں شدید دورہ ہوا، علاج میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی لیکن جو دوا دی جاتی، مفید نہ پڑتی۔ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک

---

(۱) اس نام کے دو مقام ہیں، ایک "کیا برم گولہ" دوسرا "بٹ برم گولہ"۔ یہ دونوں خمر کے سامنے دریائے سوات کے مغربی کنارے سے کسی قدر ہٹے ہوئے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔

کہ وقتاً فوقتاً بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ سید صاحب روزانہ عیادت کے لئے مولانا کی قیام گاہ پر جاتے، ایک روز آپ گئے تو بے ہوشی سے افاقہ ہوتے ہی مولانا نے آنکھیں کھولیں اور سید صاحب کو پہچان لیا۔ آپ نے مزاج پوچھا تو بولے: ''نہایت تکلیف ہے، آپ میرے لئے دعا فرمائیں اور میرے سینے پر پاؤں رکھ دیں، شاید اس کی برکت سے میری مشکل آسان ہو جائے اور اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ سید صاحب نے فرمایا: ''مولانا! آپ کا سینہ علومِ کتاب وسنت کا گنجینہ ہے، میں اس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔'' پھر پاس بیٹھ گئے اور سینے پر ہاتھ رکھا، جس سے کسی قدر تسکین ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد چند بار ''اللہ رفیق الاعلیٰ'' ''اللہ رفیق الاعلیٰ'' کہا اور روح جسدِ عنصری کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئی۔

اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ میں پہنچے تھے اور چار باغ (سوات) میں سید صاحب سے ملے تھے۔ ۸؍شعبان (۱) ۱۲۴۳ھ (۲۴؍فروری ۱۸۲۸ء) کو رحلت فرمائی۔ مولوی محمد یوسف پھلتی قطب لشکرِ اسلام کی وفات کے بعد مولانا عبدالحئی کا انتقال غازیانِ اسلام کے لئے دوسرا نہایت غم انگیز حادثہ تھا، مولانا کے اکلوتے فرزند مولوی عبدالقیوم ساتھ تھے، سید صاحب نے ازروئے فرطِ شفقت انہیں سینے سے لگا لیا اور بہت تسلی دی۔

---

(۱) منظورہ میں ہے: ''در آخر عشرۂ رجب رحلت فرمودند''۔ ''وقائع'' میں مولوی فتح علی کی روایت بھی اسی مضمون کی ہے، لیکن سید احمد علی نے نواب وزیر الدولہ کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دیتے ہوئے تعین کے ساتھ تاریخ وصال ۸؍شعبان لکھی ہے۔ مولانا کے وصیت نامے کی تمہیدی عبارت یوں ہے: جناب ہدایت مآب، زبدۂ اسلاف، قدوۂ اخلاف، پیشوائے اصحاب شریعت رہنمائے ارباب طریقت، عالم ربانی، واصل حقانی، مقبول بارگاہ رب قوی، مولانا عبد الحئی بتاریخ ہشتم شہر شعبان سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و سہ در قریہ ''خاز'' ضلع سوات یوسف زئی، بہ تقدیر ربانی ..... ازیں جہان فانی بہ دار البقاء جاودانی شتافتند۔ گویا اس میں بھی تاریخ وفات ۸؍شعبان ہی بتائی گئی ہے۔ بہر حال دونوں تاریخوں میں صرف نو دس دن کا فرق ہے اور یہ فرق چنداں اہم نہیں، میرے نزدیک ۸؍شعبان ہی مستند ہے۔

تجہیز و تکفین

مولانا شاہ اسماعیل، مولوی محمد حسن، قاضی علاؤ الدین بگھروی، میاں جی چشتی اور میاں جی محی الدین میت کے غسل میں لگ گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل ومحاسن بیان فرماتے رہے۔ ''وقائع'' کے بیان کے مطابق اس قسم کے الفاظ فرمائے: ''مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، جو مرضی مالک کی۔'' آنکھوں سے برابر آنسو بہہ رہے تھے۔

جنازہ اٹھانے والوں میں خود سید صاحب بھی تھے، آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اہل خہر کے علاوہ سات سو غازیانِ اسلام اس نماز میں شریک تھے۔ اس رتبۂ اختصاص پر کسے رشک نہ آئے گا کہ وقت کا امامِ جہاد نمازِ جنازہ میں پیش امام تھا اور دوسرے اصحاب کے علاوہ سات سو غازی شریک نماز ودعا تھے۔ جن میں سے ہر فرد اپنی جان راہِ خدا میں نذر کیے بیٹھا تھا۔ خہر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کی زد پر قبرستان تھا، جہاں لشکر مجاہدین کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو آغوشِ لحد میں سلایا گیا۔ بڑھانہ (ضلع مظفرنگر) میں پیدا ہوئے، دہلی میں فضل وکمال کی منزلیں طے کیں، ہندوستان کو از سرِ نو اسلام کے زیرِ نگیں لانے کی شیفتگی میں سرحد پہنچے، سوات میں آخری آرام گاہ پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وفات سے پیشتر مولانا نے سید صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کی موجودگی میں، جن میں سے مولانا شاہ اسماعیل، حکیم محمد اشرف خاں دہلوی، شیخ نظام الدین بڑھانوی، قاضی علاؤ الدین بگھروی اور حافظ محمد صابر تھانوی کے اسمائے گرامی مذکور ہوئے، ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا، جس کے مطابق تمام مملوک اشیاء اور ولایت بنات وابنا میں اپنے تمام حقوق تصرف اپنی اہلیہ یعنی والدۂ مولوی عبدالقیوم کے حوالے کر دیے تھے۔ (۱)

---

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۱۲۸-۱۳۰

مولوی عبدالقیوم اور دوسرے اقربا

مولانا عبدالحیٔ کے صاحبزادے، مولوی عبدالقیوم، سید صاحب کے ساتھ سرحد پہنچے تھے۔ مولانا کے انتقال کے وقت سے سید صاحب مولوی عبدالقیوم کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے، ان کے دو ماموں بھی لشکر اسلام میں تھے: ایک شیخ جلال الدین، دوسرے شیخ صلاح الدین۔ مولانا کی وفات سے آٹھ روز بعد شیخ جلال الدین نے عرض کیا کہ مولانا کے انتقال کی خبر والدۂ عبدالقیوم کو ملے گی تو بہت رنج ہوگا، بہتر یہ ہے کہ میں عبدالقیوم کو وطن پہنچا دوں۔ سید صاحب کو یہ تجویز پسند نہ تھی لیکن شیخ جلال الدین کا اصرار وابرام دیکھ کر اجازت دے دی۔

سید احمد علی نے مولانا کے انتقال کی اطلاع صاحبزادہ محمد وزیر خاں ولی عہد ریاست ٹونک کو بھیجی تو بالکل بجا لکھا کہ مولانا کا غم منفرد اور ایسا نہیں جو ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو۔ یہ عام ماتم ہے، چاہیے کہ ہر مسلمان بھائی دوسرے سے تعزیت کرے۔ ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ مولانا کی دو اہلیہ ہیں (۱) ایک دہلی میں (ہمشیر مولانا شاہ اسمٰعیل) دوسری بڑھانہ میں، دونوں جگہ خدمت کا بندوبست کر دیا جائے۔

مولانا کے ایک عم زاد بھائی مولوی احمد اللہ ناگپوری (۲) تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔

خط و کتابت جاری تھی، جب مولانا سرحد چلے آئے تو مولوی احمد اللہ کمر ہمت باندھ کر زیارت کی نیت سے ٹونک ہوتے ہوئے سرحد پہنچ گئے۔ چند آدمی بھی آپ کے ساتھ

---

(۱) اس سے ظاہر ہے کہ مولانا کی تین شادیاں ہوئی تھیں، پہلی شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے، جس کے انتقال پر دوسری شادی بڑھانہ پھلت میں کی، ان بی بی کے بطن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ تیسری شادی اس وقت شاہ اسمٰعیل کی بہن بی بی رقیہ سے ہوئی، جب نکاح بیوگان کی تحریک چلی تھی۔

(۲) "وقائع" میں انہیں مولانا کا علاتی بھائی لکھا ہے یعنی والد ایک اور والدہ دو۔

تھے، لیکن مولانا کی وفات سے تین چار روز بعد خمر میں وارد ہوئے، درگئی میں یہ جانگزا خبر سن چکے تھے، ان کے رنج وقلق کا اندازہ کون کرسکتا ہے جنہوں نے صرف اشتیاقِ دیدار میں اتنا لمبا اور کٹھن سفر اختیار کیا تھا۔ خمر پہنچے تو کہا: مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ بھائی صاحب سے ملوں گا، لیکن مرضی الٰہی یہ ہوئی کہ عالم ناسوت میں ملاقات نہ ہو۔ علاوہ بریں تیراندازی، چابک سواری اور کشتی کے فنون میں اُستادِ کامل تھے۔ جانوروں کے علاج میں بڑا کمال حاصل تھا۔ دعوتِ اسماء میں بھی خاص دسترس تھی، بیعت کے بعد سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا اور بالاکوٹ کے معرکے میں شہید ہوئے۔

متفرق واقعات

قیامِ خمر کے زمانے میں ایک مرتبہ غازیوں کو سخت عسرت سے سابقہ پڑا، گنّے کا موسم تھا، زمیندار مزدوری دے کر گنّے چھلواتے تھے۔ غازی بھی سید صاحب سے اجازت لے کر اس کام میں لگ گئے، انہیں نقد اجرت کے علاوہ فی کس آٹھ آٹھ دس دس گنّے مل جاتے تھے۔ چونکہ وہ بڑے دیانت کیش اور پاک باز تھے، اس لئے سارا کام خلوص ومحنت سے انجام دیتے تھے اور ذرا سا نقصان بھی انہیں گوارا نہ تھا، اس طرح زمینداروں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

اسی زمانہ کا واقعہ ہے، ایک روز سرکاری خزانے میں اتنا ہی غلہ تھا کہ صرف سید صاحب کے لئے کھچڑی تیار ہوسکتی، آپ نے تناول فرمانے سے انکار کردیا اور کہا کہ جب تک غازیوں کے لئے انتظام نہ ہو میں خود کیوں کر کھا سکتا ہوں؟ آخر ایک پیش قبض کی کفالت پر بنئے سے چاول خریدے گئے، سب کے لئے کھچڑی تیار ہوگئی تو سید صاحب نے بھی کھائی۔

ہندوستان سے ہنڈیاں آنے لگی تھیں اور انہیں منارہ کے ساہوکاروں سے بھنایا

جاتا تھا، سید صاحب نے معاش کی تنگی دیکھ کر اپنے بھانجے سید احمد علی کو پچیس سواروں کے ساتھ منارہ بھیج دیا کہ ضرورت کی چیزیں ساہوکاروں سے قرض لے آئیں، چنانچہ وہ پانسو روپے کا کپڑا اور پانسو نقد لے آئے دو روز بعد ہنڈیاں آ گئیں تو قرض ادا کر دیا گیا۔

غازیوں کے زہد و تقویٰ سے ہر شخص متاثر تھا، ایک مرتبہ ملا کلیم اخوند زادہ نے خودگاؤں کی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ سید بادشاہ کے ساتھی یا تو خلقاً خواہشات نفس سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ یہ ان چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں، لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی غازی کی نگاہ عورت کی طرف اُٹھی ہو۔ ملا کلیم نے کہا وہ واقعی اولیاء ہیں اور یہ سید صاحب کی صحبت و تربیت کا اثر ہے کہ خلافِ شرع بات ان کے دل میں خطور ہی نہیں کرتی۔

ایک مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ غازیوں سے قواعد اور چاند ماری کرائی جائے۔ چنانچہ میر عبد الرحمٰن جھالوی(۱) حافظ امام الدین سلام پوری اور بعض دوسرے حضرات ان غازیوں سے نشانے کی مشق کرانے لگے، جن کے پاس توڑے والی بندوقیں تھیں۔ حاجی عبداللہ رام پوری، مولوی امام علی عظیم آبادی، شیخ خواہش علی غازی پوری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ نصر اللہ خورجوی اور اکبر خاں نے ان غازیوں کی تربیت کا کام سنبھال لیا، جن کے پاس چقماقی بندوقیں یا قرابینیں تھیں۔ اڑھائی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا، سید صاحب نے مشاقی کے کمالات دیکھ کر بڑی تحسین فرمائی، لیکن ساتھ ہی کہا کہ اپنی مشاقی پر نازاں نہ ہونا، فتح صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔

اس زمانے میں ایک دستور یہ تھا کہ لوگ چھرّے منہ میں بھر لیتے تھے اور بندوق بھرتے وقت تھوڑے تھوڑے منہ سے نکال نکال کر ڈالتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا اس میں بڑی مضرتیں ہیں، مثلاً یہ کہ بندوق گرم ہو جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ بارود

---

(۱) جھالو ضلع بجنور میں ہے۔

بھرتے وقت آگ نہ پکڑ لے، ایسی حالت میں منہ سے چھرّے نالی میں ڈالنا خالی از خطرہ نہیں۔ بارود جل اٹھے تو جان کا نقصان ہو۔ دوسرے اگر چھرّے منہ میں ڈالے جائیں تو میدان میں تکبیر نہیں کہی جا سکے گی، چنانچہ لشکر اسلام میں یہ طریقہ بالکل بند کر دیا۔

سید محمد حبان

قیامِ خمر ہی کے دوران میں مولوی سید محمد حبان، سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تھے، یہ کاڑا غور بند کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، غیور اور خوش تقریر تھے۔ غالباً ہندوستان میں رہ کر علم حاصل کیا تھا اور کچھ مدت کلکتہ میں بھی گزار چکے تھے، سید صاحب سے عرض کیا کہ میں آسودہ حال ہوں، روپیہ پیسہ خدا نے دے رکھا ہے، کسی چیز کی احتیاج نہیں، صرف خدا کے لئے آیا ہوں۔ اگر اپنے دل کو متاثر دیکھوں گا تو بیعت کروں گا، ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے فرمایا بیعت کیجئے اللہ برکت دے گا، بیعت کے بعد سید محمد حبان گویا ہوئے کہ میں اندھا تھا بصیر ہو گیا، کافر تھا مسلمان ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا: یوں کہیے کہ پہلے ہی مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔ سید حبان نے کہا کہ میں اب نئے سرے سے مسلمان ہوا ہوں، اگلی عمر یونہی برباد ہوئی۔

سید اکبر شاہ اور ارباب بہرام خاں کے بعد سرحدیوں میں سے یہ تیسرے بلند پایہ بزرگ تھے، جو سید صاحب سے وابستہ ہوئے۔ بیعت کے بعد اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین کے لئے وقف فرما دیا اور دمِ واپسیں تک سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بیعتِ اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب نے انہیں قاضی القضاۃ مقرر کر دیا تھا، اس لئے انہیں عام طور پر قاضی سید محمد حبان کہتے تھے، مردان کی جنگ میں شہید ہوئے۔

تیسری شادی

جنگِ شیدو کے موقع پر سید صاحب کو زہر دیا گیا تھا، اس سے بہ فضلِ ایزدی جان تو

بچ گئی لیکن آپ کے جسم پر اس کا اثر قائم رہا۔ آخر سارا جسم بثور سے بھر گیا، بہت علاج کیا، افاقے کی صورت پیدا ہوئی۔ اطباء نے یہ تجویز کیا کہ آپ نکاح کر لیں، سید صاحب کو نکاح میں تامل تھا، اس لئے کہ دو بیبیاں موجود تھیں، جو انتظامات کے مطابق آپ کے بعد رائے بریلی سے ٹونک اور وہاں سے پیر کوٹ (سندھ) پہنچ گئی تھیں۔ جب دیکھا کہ بیبیوں کو لانے کی کوئی صورت مستقبل قریب میں بن نہیں سکتی اور مضرت بڑھ رہی ہے تو نکاح کی اجازت طلب کی۔(۱) وہاں سے اجازت آ گئی تو پہلے کن گھی کی ایک سیدہ سے نکاح کا خیال ہوا جو سید علی غوث بونیر کے خاندان سے تھیں، پھر رفیقوں نے یہ مشورہ دیا کہ سلیمان شاہ والی چترال نے جو لڑکی آپ کی خدمت میں بھیجی تھی، اس سے نکاح کر لیا جائے۔ اس لڑکی کے حالات دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی سادات میں سے ہے، والد کا نام نواب شاہ اور والدہ کا نام خدیجہ ہے۔ دو بھائی بھی ہیں، جن میں سے ایک کا نام نجف علی شاہ اور دوسرے کا احمد علی شاہ ہے۔ (۲)

پورا اطمینان ہو گیا تو ان سیدہ سے، جن کا نام فاطمہ تھا، سید صاحب نے نکاح

---

(۱) روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب نے سیدہ ولیہ ام اسماعیل سے نکاح کرتے وقت عہد کیا تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر اور نکاح نہ کروں گا، اس وجہ سے اجازت ضروری تھی۔ یہ درست ہوگا، لیکن میرا خیال ہے کہ ازدواج کی دلداری کے لئے دونوں سے اجازت منگوائی ہوگی۔

(۲) سید صاحب کے ایک نسب نامے میں مرقوم ہے کہ سیدہ فاطمہ کا ایک بھائی ان سے ملنے کے لئے ٹونک آیا تھا اور اس کا نام قربان علی تھا۔ ممکن ہے یہ تیسرا بھائی ہو اور سیدہ کے چلے آنے کے بعد پیدا ہوا ہو۔ میرے عزیز دوست سید غلام حسن شاہ صاحب کاظمی نے اس سلسلے میں بہت چھان بین کی، معلوم ہوا کہ فاطمہ یقیناً سیدہ تھیں، اور حضرت امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھیں، مگر ان کا خاندان عقائد کے لحاظ سے اسماعیلی مولائی تھا، ایک جنگ میں جو مہتر محترم شاہ والی چترال اور مہتر سلیمان شاہ والی یاسین و مستوج کے مابین ہوئی تھی، سیدہ گرفتار ہو کر مہتر سلیمان شاہ کے پاس پہنچیں۔ مہتر سلیمان شاہ نے انہیں سید صاحب کے پاس بھیج دیا۔ سیدہ کا خاندان بلاشبہ اسماعیلی تھا، لیکن وہ خود نہ ابتداء میں تعلیم یافتہ تھیں نہ غالباً انہیں دین کے متعلق چنداں آگاہی تھی۔ سید صاحب کے پاس پہنچ جانے کے بعد آپ ہی کے مقرر کئے ہوئے اساتذہ سے علم دین حاصل کیا اور آپ ہی کی بابرکت صحبت میں دینی تربیت پائی۔

کرلیا۔ سید احمد علی بریلوی، مولانا شاہ اسماعیل اور شیخ ولی محمد کے روبرو، میاں جی چشتی نے خطبۂ نکاح پڑھا اور ایجاب وقبول کرایا۔

خمر میں ایک بڑی بی رہتی تھی، شوہر فوت ہو چکا تھا، اس نے جو مال واسباب چھوڑا تھا وہ اس کے بھائی اور بھتیجے اٹھا لے گئے۔ بڑی بی کے اولاد نہ تھی، محنت کر کے گزارہ کرتی تھی، وہ ایک روز سید صاحب کے لئے کھانا پکالائی اور اپنا حال سنا کر زاروقطار رونے لگی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اماں! میں تیرے لئے بہت دعاء کروں گا، اپنے دل میں غمگین نہ ہو، صبر کر، اگر تیرے کوئی بیٹا نہیں تو مجھے اپنے بیٹے کی جگہ سمجھ لے، میں تجھے ماں کے برابر سمجھتا ہوں، ہر ممکن خدمت کرتا رہوں گا۔

پشتو میں ماں کو ''ابئی'' کہتے ہیں۔ بڑی بی اتنی خوش ہوئی کہ ہر شخص سے فخریہ کہتی: سید بادشاہ نے مجھے ''ابئی'' کہا ہے۔ غازی بھی اسے ابئی کہتے تھے۔ نکاح کے بعد سید صاحب نے ابئی کو بی بی صاحبہ کی رفاقت کے لئے اپنے گھر میں بلالیا۔ واقعہ بالاکوٹ کے کئی برس بعد بی بی صاحبہ سرحد سے پیر کوٹ اور وہاں سے ٹونک پہنچیں تو ''ابئی'' ان کے ساتھ تھی۔ ۱۲۷۴ھ (۵۸-۱۸۵۷ء) میں وقائع زیر ترتیب تھی تو اس وقت تک ''ابئی'' زندہ تھی۔ غالباً ٹونک میں فوت ہوئی۔

سیدہ کی تعلیم

سید صاحب نے نکاح کے بعد سیدہ فاطمہ کی تعلیم کا انتظام فرمایا تاکہ وہ دینی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کام کے لیے میاں غلام محمد سہارنپوری کو مقرر کیا۔ یہ بہت بوڑھے تھے۔ اپنے فرزند مولوی سعادت علی کو، جو لشکر اسلام میں شریک تھے، دیکھنے اور ساتھ لیجانے کیلئے سرحد پہنچے تھے۔ سید صاحب کی صحبت میں بیٹھے تو خود بھی واپس جانے کا خیال دل سے نکل گیا۔ بڑھاپے کے

باعث جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے، اس لئے سید صاحب نے انھیں سیدہ فاطمہ کی تعلیم پر لگا دیا۔

قاضی علاؤالدین بگھردی مولانا عبدالحئی کے شاگرد تھے، وہ شعر بھی کہتے تھے۔ سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ ضروری دینی مسائل سادہ اور سلیس اُردو میں نظم کر دیجئے تاکہ لوگ انہیں آسانی سے یاد کرلیا کریں۔ انہوں نے یہ کام شروع کر دیا، لیکن تکمیل سے پہلے شہید ہو گئے۔ قاضی صاحب نے جو نظم شروع کی تھی، اس کے ابتدائی اشعار یہ تھے۔

کروں حمد اس ذاتِ بے عیب کی   غنی و صمد عالم الغیب کی
جو محتاج ہرگز کسی کا نہیں   اسی کے ہیں محتاج سب ہر کہیں

خدمت دین میں سید صاحب کے اختصاص و امتیاز کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے پاس جس علم و فن کا کوئی آدمی آیا، اس کے ذمے مناسب حال دینی کام لگا دیا۔ مولوی خرم علی بلہوری نے فارسی اور اُردو میں فضائل جہاد نظم کر دیے، یہ نظمیں جنگوں میں اراجیز کے طور پر پڑھی جاتی تھیں۔

چھٹا باب:

جنگِ اوتمان زئی

دُرّانی سرداروں کی کیفیت

آپ دیکھ چکے ہیں کہ دُرانی سرداروں کی عداوت روز بہ روز زیادہ تیز و شدید ہوتی گئی، ان سے تعلق کا آغاز حسنِ عقیدت اور بیعتِ امامت سے ہوا تھا، جنگِ شیدو میں وہ سکھوں کے آلۂ کار بن گئے اور انہیں کی غیر شایاں حرکات کے باعث فتح شکست میں بدلی۔ اس وقت یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید سکھوں کی تہدیدات نے انہیں ہراساں کر دیا ہوگا، جو لوگ یقین و ایمان کی پختگی سے بہرہ مند نہ ہوں اور ان کے قلب و روح میں کسی بلند نصب العین کی حرارت موجزن نہ ہو، ان سے ایسی لغزشیں سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ترکِ رفاقت کو اپنے لئے مفید سمجھا، لیکن وہ اس منزل پر رُکے نہیں، بلکہ ہندوستان سے سرحد پہنچنے والے غازیوں کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، اور پشاور کے تمام ساہوکاروں کو ہدایت کر دی کہ سید صاحب سے کوئی سروکار نہ رکھیں، یہاں تک کہ ان کی ہنڈیوں کا روپیہ بھی نہ دیں، حالانکہ یہ کاروبار وہ اپنے نفع کے خیال سے کرتے تھے۔ تیسرا قدم یہ اٹھایا کہ ان تمام رئیسوں اور سرداروں کے وہ دشمن بن گئے جو سید صاحب سے عقیدت رکھتے تھے، اور ناحق کوشی میں درانیوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان سرداروں اور رئیسوں کو اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر باہر پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مثلاً ارباب بہرام خاں تہکالی، ان کا بھائی جمعہ خاں، عالم خاں رئیس اوتمان زئی، رسول خاں رئیس جلالہ اور محمود خاں رئیس تنگی، اکا دکا غازیوں اور سید صاحب

کے قاصدوں کو بھی تنگ کرنے کی شکایتیں بار بار پہنچیں۔

برائی کے تین ہی درجے ہیں چوتھا کوئی نہیں۔ اول برائی کو برائی سمجھنا، لیکن کیے جانا۔ دوم برائی کرنا اور اس کا احساس نہ رکھنا۔ سوم برائی کو اس رنگ میں اختیار کر لینا گویا وہ بڑی ہی نیکی اور کار خیر ہے۔ درانی سردار یہ تینوں منزلیں طے کر چکے تھے، سید صاحب خمر کی طرف جا رہے تھے تو اس موقع پر درانیوں نے ایک لشکر مقابلے کے لئے بھیج دیا تھا، لیکن سید صاحب طرح دے کر نکل گئے۔

پشاور پر پیش قدمی کی تجویز

ایک روز عالم خاں، رسول خاں، ارباب بہرام خاں اور جمعہ خاں کے آدمی یہ خبر لائے کہ درانیوں کا لشکر دریائے لنڈے کو عبور کر کے اوتمان زئی پہنچ چکا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ مناسب موقع پائے تو سید صاحب سے جنگ کرے۔ سب نے عرض کیا کہ یہ خبر مصدقہ ہے، اس لشکر کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود اوتمان زئی پر پیش قدمی کریں، پھر پشاور پہنچیں۔

سید صاحب کو یہ تجویز قبول کرنے میں توقف تھا۔ توقف کیوں نہ ہوتا؟ وہ اس غرض سے سرحد نہیں پہنچے تھے کہ اصل کام چھوڑ کر مقامی خوانین و رؤسا کے جھگڑوں میں الجھ جائیں۔ یہ غرض لے کر پہنچے تھے کہ سب کو غفلت و سرگشتگی کے خواب سنگین سے بیدار کر کے اسلامیت کا حق ادا کرنے پر آمادہ کریں، اسی پر ملت کی عمومی بہتری اور ہندوستان کی تطہیر موقوف تھی۔ اسی کے ساتھ خود ان خوانین و رؤسا اور ان جیسے تمام ہندوستانیوں کی دنیوی مصلحتیں وابستہ تھیں، اس سلسلے میں ترک رفاقت کو ایک حد تک گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن مخالفت کیوں کر برداشت کی جا سکتی تھی؟ ایک مسلمان فرائض دین کی بجا آوری میں قاصر رہے تو اسے یقیناً اچھا نہ سمجھا جائے گا، لیکن جو شخص یہ فرائض بجالانے والوں کا دشمن

بن جائے اور ان کی پوری سرگرمیوں کو بے اثر بنا دینے کے درپے ہو جائے، اسے اپنا سمجھنے کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

تاہم سید صاحب آخری قدم اٹھانے سے پیشتر ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کر لینا چاہتے تھے، انہوں نے تمام خوانین وعلماء کو جمع کر کے سردارانِ پشاور کی فتنہ انگیزیاں بے کم وکاست بیان فرما دیں اور فیصلہ انہیں پر چھوڑ دیا۔

خوانین وعلمائے سرحد کا فیصلہ

فیصلہ کرنے والوں میں سے جن اصحاب کے اسماء کا علم ہوسکا، وہ یہ ہیں: بہرام خاں، جمعہ خاں (تہکالی)، عنایت اللہ خاں (الاڈنڈ) زید اللہ خاں (خہر) محمود خاں (گھڑیالی) منصور خاں (چارگلئی) مولوی سید محمد حبان (کانزاغور بند)، مولوی عبدالرحمٰن (تورو)، ملا کلیم اخوندزادہ (خہر) ان اصحاب نے غور وفکر اور بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ سردارانِ پشاور نے امامت قبول کر لینے کے بعد بغاوت کا راستہ اختیار کیا، ان کا خون مباح ہے اور ان کے ساتھ جنگ ناگزیر ہوگئی ہے۔ علماء نے پشاور پر لشکر کشی کو اس وجہ سے بھی جائز قرار دیا کہ جو علاقے سردارانِ پشاور کے تصرف میں ہیں، وہاں ظلم وفسق کی گرم بازاری ہے اور رسومِ جاہلیت کا زور ہے۔ ان علاقوں کی پیشانی پر اسلامیت کا نقش بٹھانے کی یہی تدبیر ہے کہ حملہ کیا جائے۔

اس فیصلے کے بعد نقشۂ عمل تیار کیا گیا، مقصود حقیقی وہ فوج نہ تھی جو اوتمان زئی پہنچی ہوئی تھی، غرض یہ تھی کہ پشاور کو لے لیا جائے تا کہ وہ سرچشمہ بند ہو جائے، جس سے نفاق وعداوت کی سوتیں بار بار پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں۔ اس کے بغیر سرحد میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مستحکم محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک جماعت کو خیبر کی سمت بھیجا جائے، یہ جماعت وعظ وتبلیغ سے ادھر کے قبائل کو اٹھا کر

پشاور پہنچنے اور پشاور و کابل کے درمیان اتصال و تعلق کا رشتہ کاٹ دے، دوسری جماعت شمالی سمت سے اوتمان زئی کے راستے اقدام کرے۔

داعیانِ خیبر

سید صاحب نے خیبر کی سمت ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی جمعہ خاں کو بھیجا اس لئے کہ انہیں قبائل خیبر میں خاص اثر ورسوخ حاصل تھا۔ پچاس ساٹھ آدمی ان کے ساتھ کر دیے، ان میں سے اکثر ارباب ہی کے آدمی ہوں گے۔ ہندوستانیوں میں سے سید احمد علی (خواہرزادہ سید صاحب) مولوی مظہر علی عظیم آبادی، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ علی محمد دیوبندی، مولوی محمد حسن رام پوری اور مولوی نصیر الدین منگلوری کے اسمائے گرامی کا ہمیں علم ہے، سید احمد علی کو اس جماعت کا امیر اور مولوی محمد حسن کو نائب امیر و مشیر مقرر کیا گیا۔ اہل خیبر کے نام ایک اعلام نامہ بھی تیار کر کے دے دیا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مجاہدین کی اعانت و رفاقت ایمان و انقیاد کی علامت ہے، ان سے الگ رہنا نفاق و فساد کا نشان ہے۔ بغی و طغیان کا دائرہ اتنا پھیل چکا ہے کہ انہیں ختم کیے بغیر جہاد ممکن نہیں رہا، لہٰذا منافقوں کے مقابلے کیلئے کھڑے ہو جاؤ اور اسے جہاد کا اعلیٰ مرتبہ سمجھو۔

سید صاحب نے عادتِ شریفہ کے مطابق ان اصحاب کو رخصت کرتے وقت بڑے عجز و الحاح سے بارگاہِ الٰہی میں دعاء کی۔ چند روز کے بعد اطلاع آ گئی کہ حالات سازگار ہیں، مہمند اور خلیل نے دعوت قبول کر لی ہے اور سعادت خاں لال پوری مجاہدین کی رفاقت کیلئے تیار ہو گیا ہے۔ یہ شخص درۂ خیبر کے مغربی کنارے پر رہتا تھا۔ سید صاحب جب کابل سے پشاور آ رہے تھے تو اس نے عقیدت کے ساتھ بیعت کی تھی اور اپنے عہد پر پکا تھا۔

سید صاحب کی روانگی اور فیصلہ شبخون

یہ اطلاع مل جانے کے بعد سید صاحب بھی تیار ہو گئے، جو لوگ کمزور تھے انہیں خمر میں بی بی صاحبہ کے پاس چھوڑا۔ میاں جی غلام محمد سہارن پوری کو وہاں کے تمام امور کا منصرم بنایا، خود باقی غازیوں کو لے کر نکلے۔ عنایت اللہ خاں، زید اللہ خاں، رسول خاں اور عالم خاں ساتھ تھے، درگئی اور موسیٰ گڑھی ہوتے ہوئے ٹوٹئی پہنچ گئے۔ (۱)

خانِ ٹوٹئی نے سید صاحب اور غازیوں کے لئے مناسب قیام گاہیں تجویز کر دیں، وہاں تقریباً ایک مہینہ قیام رہا۔ اس اثناء میں سوات وسمہ کے تمام خوانین کو اطلاع بھیج دی گئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون کون سید صاحب کی اعانت کے لئے آیا، صرف انبالی خاں رئیس سوات بالا کا نام معلوم ہو سکا۔

ٹوٹئی ہی میں یہ فیصلہ ہوا کہ اوتمام زئی پر شبخون مارا جائے، چنانچہ ضرورت کے مطابق لشکر میں ساز و سامانِ جنگ تقسیم کر دیا گیا۔ ہر غازی کو ایک ایک سیر آٹا، ایک ایک پاؤ گھی اور ایک ایک پاؤ گڑ دے دیا گیا تاکہ سب روغنی روٹیاں تیار کر لیں جو تین چار وقت کام دیں۔

اس وقت سید صاحب کے خزانے میں تیں پینتیس ہزار روپے نقد جمع تھے، سارا روپیہ ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا، پانچ ہزار روپے الگ کر کے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بھر لئے گئے اور یہ تھیلیاں مختلف غازیوں کی کمروں میں باندھ دی گئیں۔ سب کو تاکید کر دی کہ اگر کسی بھائی کو حادثہ پیش آئے تو دوسرا بھائی اس کی کمر سے تھیلی کھول کر اپنی کمر میں باندھ لے، باقی سارا روپیہ ایک محفوظ مقام پر دفن کر دیا گیا۔

---

(۱) تمام روایتوں میں درگئی کے بعد موسیٰ گڑھی کا ذکر ہے۔ خان غلام محمد خاں رئیس لوندخوڑ نے بتایا کہ موسیٰ گڑھی کوئی مقام نہیں جس مقام کا نام موسیٰ میانہ ہے، اس کے پاس ایک گڑھی تھی جسے گڑھی عثمان خیل کہتے تھے، اب وہ موجود نہیں۔ موسیٰ میانہ درگئی سے چار میل ہے اور ٹوٹئی وہاں سے سات آٹھ میل ہے۔

ابتدا ہی میں طے کر لیا گیا تھا کہ ایک جماعت آگے جائے، اس کے امیر مولانا شاہ اسماعیل ہوں، دوسری جماعت سید صاحب کی معیت میں پیچھے پیچھے چلے۔

غازیوں کی پریشانیاں

''منظورہ'' میں ہے کہ عصر کے وقت ٹوٹی سے نکلے، باہر نالے پر پہنچ کر سید صاحب نے نماز عصر پڑھائی۔ دعاء کے بعد مولانا اسماعیل کی جماعت کو رخصت کیا اور ایک ایک غازی سے مصافحہ فرمایا۔ ''وقائع'' میں ہے کہ ٹوٹی سے اڑھائی تین کوس پر ایک گھاٹی ہے، جہاں غازیوں کا چور پہرہ رہتا تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل مغرب کے وقت وہاں پہنچے، پھر سید صاحب بھی پہنچ گئے اور نالے پر وضو کر کے مغرب و عشاء کی نمازیں ادا کی گئیں۔ مولانا پہلے روانہ ہوئے رہبر ساتھ تھا، سید صاحب کچھ دیر رُکے رہے اور بعد میں روانہ ہوئے۔ چلتے وقت نالے سے پانی مشکیزوں میں بھر لیا گیا۔

آگے میدانی علاقہ تھا، رات کے اندھیرے میں رہبر راستہ بھول گیا اور ساری رات لشکر کو دائیں بائیں لیے پھرا، یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور دھوپ تیز ہوگئی۔ جو پانی ساتھ تھا وہ رات رات میں ختم ہو چکا تھا، دن کی روشنی ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوسوں تک آبادی یا پانی کا نشان نہیں اور نہ یہ معلوم کہ منزل مقصود کتنی دُور ہے۔ ابتدا میں لوگوں کو شبہ ہوا کہ رہبر نے دھوکا دیا۔ دراصل اس کا کوئی قصور نہ تھا، اس نے بڑی دانش مندی اور دُور اندیشی سے کام لے کر اپنا اعتماد بھی بحال رکھا اور لشکر کو بھی ایک خوفناک مصیبت سے بچا لیا۔ روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک جگہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا جو دو اڑھائی کوس پر تھا، اور بولا کہ وہاں پانی ملے گا، اس ٹیلے پر پہنچے تو نہ پانی ملا، نہ کوئی آبادی تھی۔ پھر اس نے دوسرے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا، وہاں پہنچے تو رہبر نے صاف صاف بتا دیا کہ میں نے آپ لوگوں کا دل رکھنے کے لئے یہ

تدبیر کی تھی، اب دو میل پر جو ٹیلہ ہے وہاں پانی بھی ملے گا، دودھ اور چھاچھ بھی ملے گی۔ اگر پہلے ہی چھ سات کوس کا فاصلہ بتا دیتا تو اکثر لوگ ہمت ہار بیٹھتے، میں تھوڑا تھوڑا فاصلہ بتا کر آپ کو چار پانچ کوس لے آیا، اب ذرا ہمت کر کے باقی دو میل بھی طے کر لیجیے۔

جو غازی زیادہ قوی تھے وہ رہبر کو لے کر جلد پہاڑ پر پہنچے، وہاں سے پاکھال پانی سے بھر کر بیلوں اور گدھوں پر لاد کر لے آئے، پس ماندہ اور کمزور غازیوں نے پانی پی لیا تو تازہ دم ہو گئے۔ پہاڑ پر پہنچے تو وہاں گوجروں نے دودھ اور چھاچھ سے سب کی تواضع کی۔ اس رات میں جن غازیوں کو نہایت سخت مصیبتوں سے سابقہ پڑا، ان میں شیخ حسن علی، پیر مبارک علی جھنجھانوی، رحم علی اور خدا بخش لکھنوی کے نام خاص طور پر مذکور ہوئے ہیں۔

جالالہ میں قیام

پہاڑ پر پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو چکی تھی، مولانا وہیں ٹھہر گئے۔ عصر اور مغرب کے درمیان سید صاحب دو اڑھائی سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ غازیوں کی تکلیف کا حال سنا تو سب کو تسلی دی اور فرمایا کہ یہ بھی الٰہی امتحانوں میں سے ایک امتحان تھا، اسے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے والوں کے لئے رحمت و مغفرت کی بشارت ہے۔ پھر اس پر تاثیر انداز میں دعاء کی کہ غازیوں کے آنسو نکل آئے اور آلام و مصائب کی ساری کوفت ڈھل گئی۔ (۱)

جوشِ حمیت میں سب نے درخواست کی کہ اوتمان زئی پر پیش قدمی کی اجازت دی جائے، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ آج رات یہیں آرام کرو۔ اگلے روز وہاں سے روانہ ہو کر جالالہ میں قیام کیا، جو ٹوپئی سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے پانی

---

(۱) وقائع میں ہے: دفعۃً دریائے محبت الٰہی نے جوش مارا اور آپ برہنہ سر ہو کر جناب الٰہی میں دعاء کرنے لگے اور طرح طرح سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے اور گوہر اشک سے دامن بھرنے لگے، اور وہ وہ الفاظ تعریف میں اللہ تعالیٰ کی اپنی زبان گوہر افشاں پر لاتے تھے کہ خامہ بریدہ زبان تحریر کیفیت ان کی سے عاجز ہے۔ (ص: ۵۴۱)

کے لئے بطلیں لے لیں اور سب غازیوں میں تقسیم کر دیں۔ دو جاسوس بھیج دیے کہ اوتمان زئی کے حالات معلوم کر آئیں، انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ درانیوں کی چار ہزار فوج اوتمان زئی میں موجود ہے اور اس کے ساتھ دو توپیں ہیں۔ راستے میں بھی پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن رکھوا دیے۔ لمبا اور کٹھن سفر تھا، اس لئے قوی غازیوں کو چن نیا گیا، وہ دو وقت کی روٹی تیار کر کے عصر سے پہلے تیار ہو گئے۔ سید صاحب نے ظہر کی نماز کے ساتھ ہی حکم دے دیا تھا کہ غازی عصر سے پہلے پہلے جلالہ کے باہر ندی پر پہنچ جائیں، نماز وہیں ادا کی جائے گی، چنانچہ ندی پر خود نماز پڑھائی اور دعاء کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔

کامیاب حملہ

سفر چونکہ لمبا تھا لہٰذا مغرب وعشاء کی نمازیں ادا کرنے کیلئے تو ٹھہرے، لیکن کھانا کھانے کیلئے ٹھہرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ غازیوں نے چلتے چلتے کھانا کھایا اور بطلوں سے پانی پی لیا۔ جب بطلیں خالی ہوتی تھیں تو راستے کے برتنوں سے پانی لے کر بھر لیتے تھے۔ اوتمان زئی کے قریب پہنچ کر لشکر کے دو حصے کئے، ایک جماعت کو مولانا کی سرکردگی میں لشکر پر شبخون مارنے کا حکم دے دیا گیا، دوسرے حصے کو سید صاحب نے اپنی کمان میں رکھا، اس کا وظیفہ یہ ٹھہرا کہ اگر درانی سپاہی لشکر گاہ سے بھاگ کر بستی میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو انہیں روکا جائے۔ سید صاحب نے تمام غازیوں کو تاکید فرما دی کہ جو لڑے اس سے لڑو، جو پناہ مانگے اسے بے توقف پناہ دو۔

مولانا منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ درانی لشکر گاہ ایک گولی کے فاصلے پر رہ گئی تو اپنے ساتھیوں کو تاکید فرما دی کہ جب تک میں گولی نہ چلاؤں کوئی نہ چلائے۔ درانی لشکر کے چوکیدار نے دُور سے دیکھ کر آواز دی کہ کون ہے؟ مولانا خاموش رہے، پھر آواز

دی، مولانا نہ بولے۔ جب تیسری آواز پر بھی جواب نہ ملا تو اس نے گولی چلا دی اور شور مچاتا ہوا لشکر گاہ کی طرف بھاگا کہ سید بادشاہ کے غازی آگئے۔

مولانا نے بلند آواز سے تکبیر کہہ کر حملے کا حکم دیا، خود سب سے آگے تھے۔ درانی گولہ انداز نے توپ داغنی چاہی، مولانا ساتھیوں سمیت زمین پر بیٹھ گئے۔ توپ چلی اور گولہ غازیوں کے سروں کے اوپر سے نکل گیا۔ پھر مولانا نے اس تیزی سے حملہ کیا کہ دوسری مرتبہ گولہ چلنے سے پہلے پہلے توپچیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اور توپ پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں سارے درانی بھاگ نکلے اور لشکر گاہ کو چھوڑ کر ایک ٹیلے پر پناہ گزیں ہو گئے۔

دن بھر لڑائی

سید صاحب کو اطلاع ملی تو اس فتح پر بارگاہِ الٰہی میں دوگانۂ شکر ادا کیا۔ توپیں اس ٹیلے کے سامنے نصب کرا دیں، جن پر درانی جمع ہو گئے تھے۔ غازیوں کو دو حصوں میں بانٹ کر صبح کی نماز ادا فرمائی۔ خیال تھا کہ درانی جمع ہو کر حملہ کریں گے۔ سید صاحب نے جابجا چار مورچے بنوا کر غازیوں کو ان میں بٹھا دیا اور اس تواتر سے باڑھیں مارنے کی تاکید کر دی کہ درانیوں کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ پھر خود توپ کھنچوا کر ایک اونچی جگہ لائے، بھروائی، خود شست باندھی اور میرزا حسین بیگ کو حکم دیا کہ اب گولے پھینکو، پہلے ہی گولے سے دو سوار اُڑ گئے۔ درانی ٹیلے سے اُتر کر پیچھے کی طرف جا بیٹھے۔

دن بھر لڑائی جاری رہی، خدا کے فضل سے کسی غازی کے خراش تک نہ آئی، پاس تالاب تھا، غازی اسی پر وضو کرتے اور دو جماعتوں میں بٹ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ مغرب کے وقت درانیوں کی طرف سے گولیوں کی شدید بارش شروع ہو گئی، اس وقت

تک شائنیں بھی انہوں نے فراہم کر لی تھیں۔ اب یہ تجویز پیش ہوئی کہ دشمن پر بائیں جانب سے حملہ کیا جائے۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ میرزا حسین بیگ نے توپ سے گولے پھینکنے شروع کیے۔ درانیوں کے نقصانِ جانی کا حال تو معلوم نہ ہو سکا لیکن پھر ان کی شاہینوں سے کوئی گولہ نہ آیا۔

صورتِ حال میں تغیر

یہ حالات تھے جب اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر تکمیلِ فتح میں رکاوٹ کے اسباب پیدا ہو گئے۔ سید عبد الرؤف باہڑے والے نے عصر کے وقت سید صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ مجھے عالم خاں رئیس اوتمان زئی کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔ سید صاحب نے سمجھا کہ شاید عبد الرؤف کو غلط فہمی ہوئی، لیکن تھوڑی دیر بعد عالم خاں خود آیا اور پگڑی اُتار کر سید صاحب کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا: میرا لڑکا قابو میں نہیں رہا اور میرے آدمیوں کو لے کر درانیوں سے جا ملا ہے۔

یہ شخص پشاور پر پیش قدمی کی تحریک میں پیش پیش تھا، خود سید صاحب کو اوتمان زئی لایا تھا، جب معاملہ یکسوئی کے قریب پہنچا تو وہ بدا میں پڑ گیا۔ حقیقتِ حال کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے درانیوں نے دھمکیاں دے کر بیٹے کو ساتھ ملا لیا ہو یا کہہ دیا ہو کہ عالم خاں کو چھوڑ دو اور خود مسندِ خانی سنبھال لو۔ مان لیجیے کہ عالم خاں کو بیٹے پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا، لیکن خود اس کیلئے تو فرض کا راستہ بالکل صاف و ہموار تھا، افسوس کہ وہ بھی استقامت سے محروم ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ خان بھائی! مجھے آپ کے بیٹے یا کسی دوسرے شخص کی پروا نہیں، میرے لئے خدا کافی ہے۔

عین اسی وقت مولوی نصیر الدین منگلوری، ارباب بہرام خاں اور سید احمد علی کی طرف سے یہ پیغام لائے کہ ابتدا میں سمت خیبر کے قبائل مجاہدین کی اعانت پر متفق ہو گئے

تھے، پھر ان میں تفرقہ پڑ گیا اور وہ درانیوں کے طرف دار بن گئے۔ گویا پشاور پر پیش قدمی کی دونوں تدبیریں کامیابی کے قریب پہنچ کر ناکام ہو گئیں۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنا بالکل عبث تھا، احسن صورت یہی تھی کہ مجاہدین کو لے کر سید صاحب واپس چلے جائیں اور کسی دوسری مہلت کا انتظار فرمائیں۔

مراجعت کی تدبیر

عین میدانِ جنگ سے غازیوں کو بحفاظت ہٹا کر لے جانا سہل نہ تھا۔ آپ نے تھوڑے سے غازیوں کو مورچوں میں بٹھا دیا، باقی سب کو حکم دیدیا کہ وہ درختوں کے اس جھنڈ میں جمع ہو جائیں جو اوتمان زئی سے پاؤ کوس کے فاصلے پر تھا۔ بستی والوں نے سمجھا کہ سید صاحب درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر دشمن پر شبخون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس اثناء میں خبر ملی کہ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کا بھائی سید محمد خاں کمک لے کر اوتمان زئی پہنچ رہا ہے، یہ خبر غالباً عالم خاں نے پہنچائی تھی، ممکن ہے اس نے خیر خواہی کی ہو، ممکن ہے اسے خیال ہو کہ سید صاحب درانیوں کی کمک کا حال سنیں گے تو جلد واپس جانے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ سید صاحب نے یہ سنا تو فرمایا: خان بھائی! آپ باطمینان اپنے مکان پر بیٹھے رہیں، ہم سید محمد خاں کی فوج پر بھی شبخون ماریں گے۔ عالم خاں نے فوراً درانیوں سے کہا یا کہلا بھیجا کہ ہوشیار ہو جاؤ، سید بادشاہ کا چھاپا تمہاری کمکی فوج پر آتا ہے، عجب نہیں تم پر بھی آپڑے۔(۱)

---

(۱) راویوں نے اسے عالم خاں کی بے وفائی کا ثبوت بنا کر پیش کیا ہے۔ بلاشبہ سید صاحب کی کسی بات کو دشمن تک پہنچانے اور اسے قبل از وقت ہوشیار کر دینے کو وفاداری نہیں، بے وفائی ہی کہنا چاہیے۔ لیکن معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سید صاحب یہی چاہتے تھے، عالم خاں نے درانیوں کو آگاہ کر دیا تو وہ سید صاحب کے تعاقب کی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے اپنے حفظ و دفاع میں لگ گئے۔ اس طرح سید صاحب کو اطمینان کے ساتھ دور نکل جانے کی مہلت مل گئی۔ مجھے یقین ہے سید صاحب نے شبخون کا عزم اسی خیال سے بے تکلف عالم خاں کے سامنے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اسے درانیوں تک پہنچا دے، ورنہ اصلاً وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اسے اپنی جنگی تدبیروں سے آگاہ کیا جاتا۔

واپسی

اکثر غازی درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے تو سید صاحب نے پچاس آدمی روک لیے باقی سب کو مولانا شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں جلالہ بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مورچوں والے غازیوں کو بھی سید ابو محمد کے ذریعے سے بلوالیا۔ وہ سب آگئے تو خود سید صاحب واپس ہوئے۔ چار پانچ کوس کا فاصلہ طے کرکے ایک مناسب مقام پر تین چار گھڑی ٹھہرے رہے تاکہ اگر درانی تعاقب میں آرہے ہوں تو ان کو روکا جائے، صبح صادق نمودار ہوئی تو آپ رہگرائے جلالہ ہوئے۔

انتہائی احتیاط کے باوجود بعض غازی پیچھے رہ گئے۔ رات کی تاریکی میں انہیں سید صاحب کا پیغام نہ مل سکا اور وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ میں نہ پہنچے۔ یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ رحیم بخش الہ آبادی اور حافظ عبداللطیف نیوتنوی (برادر مولوی عبدالحق) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو راجا رام نام بھی تھا، جو بیسواڑہ (نزد سلون) کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں مورچے میں سو گیا تھا، آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا، بستی میں جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ تمام غازی اس فوج پر شبخون مارنے کے لئے گئے ہیں، جو دوآبہ کی طرف سے کمک کے طور پر آرہی تھی۔

میں یہ سن کر توپوں کے پاس پہنچا، اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا دشمن توپیں لے جائیں۔ ان میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا، اسی حالت میں صبح ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اگر شبخون مارا جاتا تو بندوقوں کی آواز آتی، پھر بستی میں گیا تو وہاں شیخ امجد علی اور حافظ رحیم بخش مل گئے، وہ بھی چھاپے کی خبر سن کر بہ اطمینان بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دن نکل آیا ہے، یہاں سے چل دینا ہی بہتر ہے، چنانچہ ہم نکلے، راستے میں جو آدمی ملے انہیں ساتھ لیتے آئے۔

سید صاحب نے راجا رام کی بہادری اور حسنِ تدبیر کی ستائش فرمائی۔ شیخ امجد علی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ شیخ بھائی ہمارے ''زندہ شہید'' ہیں، جس نے شہید کو نہ دیکھا ہو انہیں دیکھ لے۔ اسی وقت سے شیخ امجد علی ''زندہ شہید'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

درانی رات بھر شبخون کے خوف سے کانپتے رہے، دن نکل آیا تو بستی والوں نے بتایا کہ غازی چلے گئے، تاہم انہیں پہر دن چڑھے تک بستی کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی، یہی سمجھتے رہے کہ غازی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔

سید صاحب عصر کے وقت جلالہ سے رخصت ہوئے اور نوٹمئی کا راستہ چھوڑ کر ایک رات درگئی میں بسر فرماتے ہوئے خمر پہنچ گئے۔ آٹھ دس روز بعد غازیوں کی ایک جماعت کو نوٹمئی بھیج کر دفن کیا ہوا روپیہ منگالیا، ان غازیوں کے نام یہ ہیں: سید رستم علی چلگانوی، کریم بخش سہارن پوری، حاجی عبداللہ، خدا بخش منجھانوی، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ علی محمد دیوبندی، شیخ حفیظ اللہ دیوبندی، کریم بخش پنجابی، نظام الدین اولیا، شیخ نصرت بانس بریلوی چراغ علی پٹیالوی، پیر خاں موراتوی، سلو خاں، فتح خاں، مراد خاں، بخش اللہ خاں، ولی داد خاں، اللہ داد خاں، شیخ نصر اللہ، میاں الٰہی بخش رام پوری اور ارباب جمعہ خاں، مولانا شاہ اسماعیل اس جماعت کے امیر تھے۔

تنخواہ دار فوج

قیامِ خمر میں سید صاحب خوانین کے تنازعات کو ختم کر کے ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتے رہے، مولوی محبوب علی کی واپسی کے بعد ہندوستان سے قافلوں کی آمد رک گئی تھی، اس لئے سید احمد علی، منشی خواجہ محمد، شیخ بلند بخت، اخوند عصمت اللہ، اخوند ظہور اللہ، شیخ علی محمد، اخوند گل پشاوری، مولوی سید حبان وغیرہ کے مشورے سے تنخواہ دار فوج بھرتی

کرنے کا فیصلہ کیا۔ اخوند ظہور اللہ دو سو آدمی بھرتی کر کے کاٹ لنگ پہنچ گئے، دو ماہ بعد یہ طے ہوا کہ ابھی تنخواہ دار فوج رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ سید صاحب اس وقت پنجتار جانے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور بی بی صاحبہ کو بونیر کے راستے پنجتار بھیج دیا تھا۔ آپ نے ملازموں کو دو ماہ کی تنخواہ دے دی، پھر ان کے روبرو فضائل جہاد پر وعظ کہا، ان میں سے چالیس آدمی غازیوں میں شامل ہو گئے، ان کے سرخیل میرزا احمد بیگ پنجابی تھے۔ (۱)

خیبر سے سید احمد علی اور ارباب بہرام خاں جلالہ میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے، **تفصیلی** حالات سن کر آپ نے فرمایا:

> اس ملک کے رئیسوں کا یہی حال ہے کہ اپنے عہد و پیمان کے پکے نہیں ہیں، کبھی کسی کی طرف کبھی کسی کی طرف۔

---

(۱) منظورہ میں ہے کہ دین محمد ہندوستان سے خطوط اور ہنڈیاں لے کر آیا تو اس نے سید صاحب سے عرض کیا کہ کوئی ملک ابھی تک آپ کے ہاتھ نہیں آیا، اس لئے تنخواہ دار سپاہ رکھنا مناسب نہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، قاضی احمد اللہ میرٹھی، مولوی محمد حسن اور منشی خواجہ محمد نے میاں دین محمد کی رائے سے اتفاق کیا۔ سید صاحب نے منشی محمدی انصاری میر منشی کو حکم دیا کہ سب کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ پھر ان سے پوچھا: آپ لوگوں نے اپنا حق لے لیا؟ اس کے بعد فضائل جہاد پر یوں وعظ فرمایا:

جو شخص ملازم ہو کر جہاد کرتا ہے، اسے بھی ثواب ملتا ہے، لیکن جو خوش نصیب خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرتے ہیں ان کے درجے کو کوئی نہیں پہنچتا۔ جو غازی ہمارے ساتھ ہیں وہ سب اپنے گھروں میں کھاتے پیتے اور خوش حال تھے، کئی بیش قرار ملازمتیں چھوڑ کر آئے۔ کئی جاگیروں، زراعتوں اور تجارتوں کو ترک کر کے آئے۔ یہاں ہمارے پاس صرف اللہ کے لئے رہتے ہیں۔ فقر و فاقہ سہتے ہیں اور خوش و خرم راضی بہ رضا صابر ہیں، اگر اسی طرح تم بھی رہو تو ہم حاضر ہیں۔

یہ وعظ سن کر میرزا احمد بیگ اور ان کے چالیس ساتھی غازیوں میں شامل ہو گئے۔ روایت سے یہ بھی واضح ہوا کہ سید صاحب کے لشکر میں ہر فرد رائے دینے کا مجاز تھا، حتیٰ کہ قاصد بھی۔

ساتواں باب:

بیعتِ شریعت

بیعتِ اقامتِ شریعت کا فیصلہ

سید صاحب جب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فداکاری میں اہل سرحد، مسلمانانِ ہند سے فائق و برتر ہیں، لیکن یہاں پہنچ کر تقریباً دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال و مراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی رسمی ہے۔ یقیناً اہل سرحد بھی اس وقت محض نام کے مسلمان رہ گئے تھے (الا ماشاء اللہ)، عملاً ان کی پوری زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ سروسامانِ جہاد کے ساتھ ساتھ انہیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے، اس کے بغیر وہ اہم دین مقاصد کیلئے کیا کام کر سکتے تھے؟ چنانچہ قیامِ خمرعی کے دوران میں فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ امامت جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامت شریعت کی بیعت بھی لی جائے۔ پٹھانوں کی اصلاح و تنظیم کے سلسلے میں یہ دوسرا قدم تھا۔ سید صاحب نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ جو لوگ کمال اخلاص سے خدائے ذوالجلال کی اطاعت میں جان و مال فدا کرنے پر آمادہ ہوں اور اسی کو دارین میں سرخروئی کا باعث سمجھیں، وہ کم ہوں یا زیادہ، انہیں کو مجاہدین ابرار کا درجہ حاصل ہوگا، اور انہیں سے نصرت دین کا کارِ اہم سرانجام کو پہنچے گا۔

مذموم مراسم کا نقشہ

افغانوں میں جو برائیاں عام ہو چکی تھیں ان سب کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے، جن مذمومات کا ذکر مختلف مقامات پر سید صاحب کی سیرت کے مآخذ میں آیا ہے، ان کی سرسری کیفیت ذیل میں درج ہے۔

۱۔ لوگ احکامِ شریعت کی پیروی سے بالعموم بے پروا تھے، ان کے تمام معاملات کی باگ ڈور ملاؤں کے ہاتھ میں تھی اور ملاؤں کی اعتقادی و عملی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ پھر بعض بڑے بڑے رئیس ملاؤں کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے صواب دید کی بنا پر جو قدم اٹھا لیتے، ملا لوگ از روئے شریعت اسی کو حق بہ جانب ثابت کر دیتے۔

۲۔ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کے گناہوں کا کفارہ یوں ادا کیا جاتا کہ ملاؤں کی جماعت بیٹھ جاتی، قرآن شریف کا نسخہ اور کچھ رقم دست بہ دست پھرائی جاتی اور آخر میں دونوں چیزیں پوری جماعت کے حوالے کر دی جاتیں، اس عمل کو سرحد کی اصطلاح میں ''اسقاط'' کہتے تھے، یعنی متوفی کے گناہوں کو ختم کرنے کا عمل۔

۳۔ لڑکیوں کے نکاح کیلئے گراں قدر رقمیں لینے کا دستور تھا، کئی مرد روپیہ فراہم نہ کر سکنے کے باعث نکاح سے محروم رہ جاتے اور لڑکیاں والدین کے ہاں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔

۴۔ ایک دستور یہ تھا کہ نکاح کے وقت اگر کچھ روپیہ دولھا کے ذمے رہ جاتا تو اس کے ادا نہ ہونے تک دلھن کو رخصت نہ کیا جاتا۔ ہزاروں لوگ صرف اس روپے کی فکر میں محنت مزدوری کے لئے دور دور نکل جاتے اور سالہا سال باہر گزار دیتے، لڑکیاں بیچاری والدین کے گھروں میں بیٹھی رہتیں۔

۵۔ گروہ بندی اور پر جنبہ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ کسی کو حق و ناحق کی

تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ ہر شخص صرف اپنے گروہ اور اپنے جتھے کی طرفداری کو زندگی کا نصب العین بنالیتا، اگرچہ اس کی کارروائیاں کتنی ہی ناواجب و ناجائز ہوتیں۔

۶۔ ازواجِ میت بھی عام ترکے کی طرح متوفی کے بھائی بندوں میں تقسیم ہو جاتیں۔

۷۔ پاسِ قول اور ایفائے عہد سے وہ لوگ یک قلم بے پروا ہو چکے تھے، آج وعدہ کرتے، کل انتہائی بے تکلفی سے اُسے توڑ ڈالتے۔ اسکی کئی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔

۸۔ حقیر دنیوی فوائد کے لئے دینی اور قومی مصالح کو قربان کردینے میں انہیں کوئی باک نہ تھا۔

۹۔ چار سے زیادہ نکاحوں کا رواج تھا۔

۱۰۔ لڑکیاں حق وراثت سے محروم تھیں۔

۱۱۔ حریر پوشی، شراب نوشی اور بعض دوسرے مناہی کے ارتکاب میں وہ اتنے بے باک تھے کہ علانیہ اس قسم کی حرکتوں پر فخر کیا کرتے تھے۔

۱۲۔ بلوائیوں، ڈاکوؤں اور چوروں کی حیثیت میں لوگوں کا مال واسباب لوٹنے اور شرعی جہاد کرنے میں ان کے نزدیک کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ ہر اس فعل کو جہاد سمجھ لیتے تھے جس سے انہیں فائدہ پہنچے، اگرچہ وہ کتنا ہی ناجائز ہو۔

فتح خاں اور اشرف خاں کے خطوط

''منظورہ'' میں ہے کہ سید صاحب اُوتمان زئی کی جنگ سے خہر واپس پہنچے تو فیصلہ فرمالیا کہ اہل سرحد میں ہر گروہ کو شرع ربانی کے احکام قبول کرلینے اور افغانی رسوم ترک کردینے پر آمادہ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ جہاد اسی صورت میں تائید آسمانی کے نزول کا باعث بن سکتا ہے کہ سب لوگ حقیقی معنی میں مسلمان بن جائیں، جو کچھ کریں خدا کی رضا کیلئے کریں، اسی صورت میں اطاعت امام کی حقیقت سے وہ آگاہ ہو سکتے ہیں، اسی

صورت میں بدعات و منکرات اور معصیتِ عامہ سے پاک ہو کر خدا اور رسولؐ اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا حق ادا کر سکتے ہیں، اسی صورت میں کاروبارِ جہاد مستحکم و استوار ہو کر مطلوب نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ (۱)

منفرداً ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کر لیا تھا اور ان آدمیوں میں مخلصوں کی تعداد بھی کم نہ تھی، لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پذیرائی سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے، اس مقصد کے لئے علماء و اکابر کا اجتماع ضروری تھا۔ سید صاحب نے دعوتِ عام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ اس امر پر بھی غور فرما رہے تھے کہ اجتماع کیلئے کون سی جگہ زیادہ موزوں ہو گی۔ اس اثناء میں فتح خاں رئیس پنجتار اور اشرف خاں رئیس زیدہ کی طرف سے خطوط پہنچے کہ آپ نے خہر میں خاصا وقت گزارا اور بظاہر کوئی فائدہ مترتب نہ ہوا، سوات کے عوام یقیناً بہت مخلص و مستعد ہیں، لیکن خوانین مرضِ نفاق میں مبتلا ہیں، بہتر یہ ہے کہ ہمارے ہاں تشریف لائیں، ہم جان و مال سے اطاعت کا اقرار کرتے ہیں اور عام لوگوں کی آواز بھی یہی ہے کہ آپ آئیں تو آپ کی قیادت میں اسلامی و قومی فرائض کی بجا آوری کا سر و سامان کریں۔ اشرف خاں کے خطوط میں خادے خاں رئیس ہنڈ کیساتھ منازعت کا ذکر بھی تھا اور سید صاحب ہی کے ذریعے سے اس نزاع کے ختم ہونے کی امید تھی۔

پنجتار کے لئے روانگی

چنانچہ سید صاحب نے پنجتار کے ارادے سے رختِ سفر باندھ لیا، خہر میں ٹھہرے رہنا اس وجہ سے چنداں ضروری نہیں رہا تھا کہ سردارانِ پشاور کے خلاف مستقبل قریب میں اقدام کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا، اور بیعتِ اقامتِ شریعت کو عام اہلِ سرحد خوانین

---

(۱) منظورہ ص۔ ۴۳۳

وعلماء کے اتفاق سے قبول کر لیتے تو نتیجہ خیز اقدامات کا بہتر سے بہتر سامان مہیا ہو جانے کی امید تھی۔ اس صورت میں سردارانِ پشاور یا دوسرے مذبذبین ومخالفین کا فیصلہ بھی سہل معلوم ہوتا تھا۔ بی بی صاحبہ کو بونیر کے راستے پنجتار بھیج چکے تھے، خودخمر سے نکلے تو درگئی کے ٹیلے سے گذر کر ایک تالاب پر ٹھہرے، وہاں شیر علی (ساکن شیر پور ضلع پٹنہ) نے وفات پائی۔ دوسرا مقام لوندخوڑ میں اور تیسرا کاٹ لنگ میں ہوا۔ پھر آپ چارگلئی کو جانب چپ چھوڑتے ہوئے مچنی پہنچے، بعد ازاں شیوہ میں ٹھہرے، آنند خاں اور اس کے بھائی مشکار خاں نے سید صاحب کو بستی میں ٹھہرایا، غازیوں کیلئے بستی سے سوا سو قدم کے فاصلے پر زیتون کے جنگل میں قیام کا انتظام کیا۔ شیوہ سے بہت تڑکے روانہ ہوئے، نماز فجر سلیم خاں میں ادا کی، پھر پنجتار چلے گئے۔ فتح خاں نے بستی سے باہر نکل کر باہر کے باغ کے پاس استقبال کیا۔ (۱)

دعوتِ عام

سید صاحب نے پنجتار پہنچتے ہی بیعتِ شریعت کے لئے دعوتِ عام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علماء واکابر کو جمع کر کے پابندیٔ احکامِ اسلام کی ہدایت کرتے۔ مثلاً ایک مرتبہ ڈاگئی گئے، جو مندن قبیلے کی ایک شاخ کا بڑا مرکز تھا، وہاں کم وبیش دوسو عالم جمع تھے۔ ان میں سے مولانا نیاز محمد ممتاز ترین تھے۔ پھر مندن قوم کی دوسری شاخ کے مرکز باجا بام خیل میں گئے، وہاں بھی ارد گرد کے عوام اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان دوروں کے ذریعے سے فضا سازگار بن گئی، فتح خاں پنجتاری سے بھی صاف صاف فرما دیا کہ اگر نظامِ شریعت کو بہ انشراحِ خاطر قبول نہ کیا تو میں پنجتار

---

(۱) سید صاحب کی شہادت کے بعد پنجتار پر خوفناک آفتیں نازل ہوئیں، جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہاں تک کہ نہ وہ بستی باقی رہی، نہ اس کے باغات یا دوسرے مفصلات کا کوئی نشان باقی رہا، ساٹھ برس تک اس مقام پر نہ کوئی مکان تھا، نہ کوئی شخص وہاں رہتا تھا۔ اب نہیں پتہ پایا جا سکتا کہ یہ باغ کس جگہ تھا۔

میں نہ رہ سکوں گا۔ اگر مجھے ٹھہرانا منظور ہے تو تمام غیر شرعی رسوم سے دست کش ہو جایئے اور شریعت کے احکام منظور کر لیجئے۔ جو مال غیر مشروع طریق پر آپ کو ملتا ہے، اسے بھی ٹھکرا دیجئے اور معاش کیلئے صرف رازقِ مطلق کے فضل وکفالت پر بھروسہ کیجئے۔ (۱)

اجتماعِ عظیم

دوروں اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ سے قبولِ عام کا جذبہ بیدار ہو گیا تو فیصلہ ہوا کہ پنجتار میں اجتماعِ عظیم منعقد کیا جائے، جس میں سرحد کے ہر حصے سے علماء وخوانین شریک ہوں۔ یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶ رفروری ۱۸۲۹ء) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کے لئے تجویز ہوا، خوانین واکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علماء اس موقع پر آئے، اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے۔ (۲) اشرف خاں رئیس زیدہ اور خادے خاں رئیس ہنڈ بھی اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ سب کے لئے کھانے کا انتظام سید صاحب نے فرمایا۔

پیشِ نظر معاملہ پہلے ہی ہر ایک پر واضح تھا، اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی۔ پھر فتح خاں پنجتاری سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجئے، ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا اور ہمیں یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔

آپ نے بڑے اخلاص کے ساتھ ہمیں سوات سے بلایا، میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں، میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب لوگ احکامِ الٰہی کے فرمانبردار بن جائیں۔

> اگر شمارا فی الحقیقت خدمتِ دین منظور است، پس احکامِ شرعی بے کم وکاست قبول نمائید۔

---

(۱) منظورہ ص: ۴۲۷

(۲) منظورہ ص: ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ بعض مکاتیب میں ہے: قریب ہزار علماء وطلبہ۔

ترجمہ : اگر آپ کو واقعی دین کی خدمت منظور ہے تو پہلے خود شرعی احکام بے کم و کاست قبول کرلیجئے۔

فتح خاں نے تھوڑا تامل کیا پھر کہا کہ اگر چہ یہ امر نہایت مشکل ہے، مال و جاہ کا ترک لازم ہوگا، ذرائع معاش جاتے رہیں گے، صد ہا برس کے مراسم ترک کرنے کے باعث افغانوں کے ساتھ اختلافات بھی رونما ہو جائیں گے، لیکن میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کی کفالت پر تکیہ کرتے ہوئے، اس حکم کو بہ دل و جان قبول کرتا ہوں۔

سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے، علماء آپس میں مشورے کرتے رہے، آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ نظامِ شرعی کا قیام لازم ہے۔ نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر اقامت شریعت کیلئے بیعت کی اور سب نے مہری بیعت نامے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ علماء کے بیعت نامے عربی میں تھے اور خوانین کے فارسی میں۔ (۱)

استفتاء اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کرلینے کے بعد خدمتِ دین اور اجرائے شرع مبین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کر دے اور مخالفت پر کمربستہ ہو جائے، بلکہ جدال و قتال میں بھی متامل نہ ہو تو اس کے متعلق اور اس کے

---

(۱) پنجتار اونچی جگہ واقع ہے، اس کے مغرب میں ایک نالہ بہتا ہے، جس کا بہاؤ بہت گہرائی میں ہے۔ اس نالے کے مغربی کنارے پر شیشم کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا، وہیں سید صاحب اور غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے تھے۔ اسی مقام پر اجتماع ہوا تھا اور اسی جگہ بیعت لی گئی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں پنجتار کو انگریزوں نے تباہ کیا تو درختوں کا یہ جھنڈ بھی باقی نہ رہا، اب اس مقام پر ببول اور پھلاہی کے درخت اُگ آئے ہیں اور آس پاس ریت ہی ریت ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ نالے میں کئی مرتبہ طغیانی آئی، اس میں وہ زمین بھی بہہ گئی جہاں سید صاحب اور ان کے غازیوں کے زمانے میں نماز ہوتی تھی۔

ساتھیوں کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟ علماء نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا، اس کے مطالب کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ اثباتِ امامت کے بعد حکمِ امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے۔

۲۔ مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لئے تلواریں نکالیں اور امام کے حکم بزور مخالفوں پر نافذ کریں۔

۳۔ اس معرکے میں لشکرِ امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید و نجات یافتہ سمجھا جائے گا، اور لشکرِ مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔ ان کی حالت اکثر فاسقوں مثلاً زانیوں اور سارقوں سے بھی بدتر ہوگی۔ اس لئے کہ فاسقوں کے جنازے کی نماز واجب ہے، لیکن ان مخالفوں کے جنازے کی نماز بھی جائز نہیں۔ اس فتوے پر علمائے سرحد میں سے مندرجہ ذیل پچیس اصحاب کے دستخط تھے: ملا نیاز محمد، ملا ولی محمد، ملا محمد اسماعیل، اخوندزادہ سعد اللہ، ملا ستار خاں، سید علی، اخوند شاہ ولی خاں، اخوند محمد غلام، ملا محمد عظیم، اخوند مکرم، ملا عباد، ملا سید احمد، ملا محمد عرفان، ملا عبداللہ، ملا پیر محمد، اخوند محمد زعفران، اخوند اکبر شاہ، اخوند محمد وصال، ملا عبدالرحمٰن، اخوند ولی محمد، اخوند عبدالغفور، اخوندزادہ محمد گل، اخوند صفی اللہ۔

اصلاحِ عام

غالباً ۱۵؍شعبان ۱۲۴۴ھ کو جمعہ کے دن (۲۰؍فروری ۱۸۲۹ء) پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعتِ شریعت کی ترغیب دی اور انہوں نے بہ طیبِ خاطر نظامِ اسلامی کی پابندی قبول کر لی۔ پھر مختلف علاقوں کے لئے سید صاحب نے قاضی مقرر فرما دیے۔ مولوی سید محمد حبان کو قاضی القضاۃ بنایا

گیا۔ (۱) ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر ہو گئے، وہ قریہ قریہ اور دیہ بہ دیہ دورہ کرتے رہتے، جہاں کوئی امر خلاف شرع پاتے، اس کا انسداد کرتے۔

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی۔ چندہ داریاں ٹوٹ گئیں، مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے، اگر ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام سے بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نماز نہیں رہا۔

اشرف خاں، فتح خاں اور خادے خاں کا بیعت نامہ

اشرف خاں، خادے خاں اور فتح خاں نے مشترکہ بیعت نامہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس کے اہم اجزا یہ تھے۔

۱۔ ہمارے قبائل میں جو مراسم خلاف شریعت رائج ہیں، ہم ان سب سے دست بردار ہو کر احکامِ شرعی قبول کرتے ہیں۔

۲۔ ہم نے نظامِ شرع کے اجرا کے لئے سید صاحب کو بہ رضا و رغبت اپنا امام بنایا ہے اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے۔

۳۔ ہم پہلے بھی بیعت کر چکے تھے، اب علماء کے رو برو اس کی تجدید کی ہے۔

حضرت سے درخواست ہے کہ ہمارے لئے دعائے استقامت فرماتے رہیں تا کہ ہمارا

---

(۱) بعض اصحاب نے لکھا کہ ملا سید امیر (ملا صاحب کوٹھا) کو قاضی القضاۃ بنایا گیا تھا، یہ صحیح نہیں۔ ملا صاحب ممدوح کے نام ۱۵ رشعبان ۱۲۴۴ھ کو جو قضا نامہ صادر ہوا تھا، اس میں صاف مرقوم ہے کہ صاحب موصوف کو "قریہ کوٹھا ضلع لوتمان زئی کے لئے منصبِ قضا پر مقرر کیا گیا" اسی طرح ملا مفتی اللہ شیوہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، قاضی القضاۃ ملا سید محمد حبان تھے، جو اپنی شہادت تک اس عہدے پر مامور رہے۔

جینا اور مرنا قانونِ اسلام اور سنتِ سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

بیعتِ شریعت کی برکات

بیعتِ اقامتِ شریعت کے برکات وحسنات کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے آج ہمارے سامنے پورے واقعات کا نقشہ نہیں، صرف متفرق روایتیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیعت سے تین ماہ بعد فتح خاں پنجتاری کے سوار گردوپیش کے علاقے کا دورہ کر رہے تھے، گڈھ اور پنج پیر میں انہیں تقریباً ایک سو مویشی ادھر اُدھر پھرتے نظر آئے اور انہیں ہانک کر پنجتار لے گئے۔ جاتے ہی خان کو اس واقعے کی اطلاع دی، اس نے فوراً گڑھ اور پنج پیر کے باشندوں کو خط لکھا کہ میرے سواروں سے غلط فہمی کی بنا پر یہ حرکت سرزد ہوئی، ہم لوگ قدیم افغانی مراسم اور جاہلیت کے معمولات سے تائب ہو چکے ہیں۔ آپ لوگوں سے عرض ہے کہ بے تکلف آئیں اور اپنے جانور لے جائیں۔

> از ضمان مال خود بہ زودی گردن ایں جانب را خلاص کنید کہ وقت موت کسے را معلوم نیست، مبادا ایں جانب را ساعت موت برسد و دریں مظلمہ گرفتار ماندہ۔(۱)
>
> **ترجمہ** : مجھے اس مال کے بارِ ضمانت سے جلد از جلد سبک دوش فرمایئے، موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں، مبادا میرے چل چلاؤ کا وقت آجائے اور اس ظلم میں گرفتار رہوں۔

یہی افغان تھے جو بیعتِ شریعت سے پہلے اس قسم کے تصرفات کو اپنا قومی حق سمجھتے تھے، اور پورے علاقہ سرحد میں اخذ وسلب کے ایسے واقعات کا بازار گرم تھا۔

---

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۴۴

مجرموں کو سزائیں

افغانوں کا عام شیوہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ارتکاب جرم کے بعد بھاگ کر دوسرے گاؤں میں چلا جاتا تو وہاں کے لوگ اس کی حفاظت کے ذمہ دار بن جاتے۔ پھر حاکم بھی لشکر لے کر چڑھائی کر دیتا تو اسے حوالے نہ کرتے اور مجرم کی ناواجب طرف داری میں صرف اموال ونفوس کو مقتضائے غیرت وحمیت سمجھتے۔ اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آچکے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ مظلوموں کے طرفدار، مجرموں کو پناہ دینے والوں کی ایذا میں کوشاں رہتے، اس طرح تمام آبادیوں میں رزم وپیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوگیا تھا۔ سید صاحب نے تمام دیہات میں آدمی بھیج کر اس نوع کے پناہ گیر مجرموں کی فہرستیں تیار کرائیں۔ پھر جگہ جگہ اپنے آدمی بھیج کر مجرموں کو پکڑوا بلایا اور سب کو شرعی سزائیں دے کر تمام متنازعات ختم کر دیے۔ چونکہ پناہ گیری کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی، اس لئے جگہ جگہ سے جرائم کا استیصال ہوگیا۔

مانیری کا واقعہ

اس سلسلے میں مانیری کا واقعہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ مانیری درۂ پنجتار سے باہر صوابی کے قریب ایک بڑی بستی ہے۔ ''منظورہ'' کے بیان کے مطابق سید صاحب کے زمانے میں تنہا اس بستی کے ایک ہزار تفنگچی تھے اور ان کے جو ہم قوم آس پاس کے دیہات میں آباد تھے، ان میں سے بھی لڑنے والوں کی تعداد چھ ہزار سے کم نہ ہوگی۔

سید صاحب سے نوے برس پیشتر اس بستی کے مختلف افراد میں کشمکش بپا ہوئی اور اس میں بعض مالکان اراضی نکل کر دوسرے مواضع میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، ان کی زمینیں غصب کر لی گئیں، مخرجین نے باہر سے کمک کا بندوبست کر کے بستی پر حملہ کیا، لیکن شکست کھا گئے، اس وقت سے کشت وخون کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا۔ مخرجین جب موقع

پاتے چڑھائی کر دیتے۔ اہلِ مانیری کو حالات سازگار ملتے تو وہ بھی جوابی یورشوں میں تامل نہ کرتے۔ نوے برس کے ہنگامۂ حرب و ضرب میں کم و بیش چار ہزار آدمی مارے گئے، مالی نقصان کا حساب ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بیعتِ اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب نے مانیری اور آس پاس کے تمام خوانین کو بلا کر پورے حالات دریافت کئے۔ جب معلوم ہو گیا کہ مخروجین مظلوم ہیں تو آپ نے حکم دیدیا کہ زمینیں ان کے حوالے کر دی جائیں، اہلِ ماتیری خود بھی بڑے سرکش تھے اور خادے خاں رئیس ہنڈ ان کا طرفدار تھا، جو خوانین سمہ میں بڑا جابر اور طاقتور سردار مانا جاتا تھا۔ انہوں نے سید صاحب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ افغانوں کا مسلمہ دستور اس کے خلاف ہے۔ دستور یہ ہے کہ جب کسی مغصوبہ مال کے سلسلے میں کشت و خون تک نوبت پہنچ جائے تو اصل مالک کا حقِ بازیافت زائل ہو جاتا ہے، اور ہمارے تصرف کے بعد تو چار ہزار آدمیوں کا خون بہہ چکا ہے، پھر ہم زمینیں اصل مالکوں کو کیوں کر دے سکتے ہیں؟

سید صاحب نے مجبور ہو کر علماء سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے فتویٰ دیا کہ اہلِ مانیری کا خون مباح ہے۔ سید صاحب نے لڑائی کا حکم دے دیا۔ جو فوج مانیری پہنچی، اس میں ہندوستانیوں کے علاوہ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں رئیس زیدہ اور قوم مندن کے جوان بھی شریک تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اہلِ مانیری پریشان ہو گئے اور پوری زمینیں اصل مالکوں کو دے دیں، اس طرح نوے برس کا سلسلۂ کشت و خون منقطع ہوا۔

خادے خاں کی برگشتگی

یہ بڑی مبارک ساعت تھی، جس میں اہلِ سرحد کے تمام منازعات کا استیصال شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اسی وقت سے خادے خاں اور سید صاحب کے درمیان ملال

وکدورت کا ایک پردہ حائل ہو گیا، جس نے انجام کار خادے خاں کو سید صاحب کی تحریکِ خدمتِ دین کا جانی دشمن بنا دیا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ خادے خاں کے جذباتِ عقیدت میں جنگِ شیدو کے بعد ہی افسردگی پیدا ہونے لگی تھی، شاید اس لئے کہ سید صاحب ہنڈ کے بجائے پنجتار کو مرکز بنانے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور خادے خاں کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کا رقیب فتح خاں سید صاحب کی نظروں میں مدارِ اعتماد بنے، یا شاید اس لئے کہ سید صاحب للہیت کے جس مسلک پر گامزن تھے، وہ خادے خاں کی فہم سے بالا تھا۔

جب سید صاحب خمر میں تھے تو فتح خاں اور اشرف خاں کی طرف سے برابر عقیدت کے معروضے پہنچتے رہے، خادے خاں کی جانب سے کوئی عقیدت نامہ نہ بھیجا گیا، بایں ہمہ سید صاحب نے اس کے ساتھ تعلق منقطع نہ کیا۔ بیعتِ اقامتِ شریعت میں بھی اسے بلایا، تمام مشوروں میں شریک رکھا اور اظہارِ اطاعت میں وہ فتح خاں کا شریک رہا۔ واقعہ مانیری کے بعد وہ سید صاحب سے بگڑ بیٹھا، یعنی احکامِ شریعت کی پیروی کا اقرار کر لینے کے باوجود افغانیت اور اس کے جاہلانہ مراسم پر وہ بدستور قائم رہا۔

ایک سوال

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ آیا بیعتِ اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیاراتِ فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعتِ امامت نے سید صاحب کو نظمِ قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا، بیعتِ اقامتِ شریعت کے رو سے وہ احکامِ شرعی کا مرکز بن گئے، رؤسا و خوانین کے اختیارات پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں، جواز روئے شریعتِ حقہ ضروری تھیں، لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں۔

آٹھواں باب:

مرکز پنجتار

سرگزشت پنجتار

پنجتار خدو خیل کا مرکزی مقام ہے، جو ضلع مردان کے شمالی و مغربی گوشے سے متصل ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ سید صاحب پہلے پہل جنگ شیدو کے بعد اس علاقے میں پہنچے تھے اور دورۂ سوات کے بعد انہوں نے پنجتار میں سکونت اختیار کی تھی، پھر خمر چلے گئے اور دیر تک مقیم رہے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو پنجتار کو مستقل مرکز بنا لیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرکز کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔

ابتداء ہی میں عرض کر دینا چاہیے کہ جس پنجتار نے سید صاحب کے ساتھ شرف انتساب سے شہرت کے ایوانوں میں جگہ پائی، جس کے در و بام میں اس پاک نفس داعیٔ حق کی حیات مہاجرت کے بیشتر اوقات صرف ہوئے، وہ مدت ہوئی مٹ چکا ہے۔ فتح خاں کی وفات پر اس کا بیٹا مقرب خاں خدو خیل کا سردار بنا، اگرچہ پنجتار کو مجاہدین برسوں پیشتر چھوڑ چکے تھے، لیکن سرحد میں جا بجا ان کی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے ان تمام مقامات کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا جو مجاہدین کے مامن رہ چکے تھے، یا بن سکتے تھے۔ اس سلسلے میں پنجتار پر بھی چڑھائی ہوئی، تو تالی کے باشندے مقرب خاں سے بگڑے بیٹھے تھے وہ انگریزی فوج کے ہراول بن گئے۔ مقرب خاں چنگئی چلا گیا، پنجتار کو خالی کر دیا گیا، تو تالی کے باشندوں نے انگریزوں کی ہدایت کے مطابق خالی مکانوں کو آگ لگا دی، دیواریں باقی رہ گئی تھیں، انگریزوں نے پاس کے

ایک ٹیلے پر جس کا نام برہ مند (یا برہ مان) ہے، توپیں لگا کر دیواروں کو بھی تہس نہس کر ڈالا اور پنجتار کی جگہ ملبے کے ڈھیر رہ گئے۔ باغ ویران ہو گئے، درخت جلا دیے یا کاٹ ڈالے اور حکم دیدیا کہ وہاں دوبارہ کوئی مکان نہ بنے۔ توتالی کے بعض لوگوں نے مختلف زمینوں پر قبضہ کرلیا، وہ کھیتی باڑی کرتے تھے، لیکن انکی سکونت توتالی ہی میں تھی۔

نئے سرے سے آبادی

ساٹھ برس گذر گئے اور پنجتار کے مقام پر ایک جھونپڑی بھی نہ بن سکی۔ ۱۹۱۸ء میں سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے، جو اس زمانے میں ریاست امب کے وزیر تھے، احیائے اسلامیت کے اس مرکز کو نئے سرے سے آباد کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وہ خود امب کی فوج کے ساتھ پنجتار پہنچے، اس وقت توتالی کا ایک شخص عبدالرحمٰن، زمینوں پر قابض تھا، سید عبدالجبار شاہ نے اس سے زمینیں واگزار کرائیں اور فتح خاں کے دوسرے اخلاف بھی آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئے اور پرانے مکانوں کے ملبے پر پھر ایک مختصر سی آبادی صورت پذیر ہوئی۔ میں نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں اسے دیکھا تھا، یہ آبادی قدیم کے صرف شمالی و مغربی گوشے تک محدود ہے اور شکست و ریخت کے آثار گرد و پیش واضح نمایاں ہیں کہ پنجتار فی الجملہ کھنڈروں کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔

تحقیق احوال کی مشکلات

ان حالات میں پرانی آبادی کی وسعت و کیفیت کا سراغ ٹھیک ٹھیک لگا لینا سہل نہیں، پنجتار کے مکانوں کی حیثیت عہد قدیم کے تاریخی شہروں جیسی نہ تھی، جن کے نقشے آثار کی کھدائی سے تیار کر لئے گئے۔ معمولی حیثیت کے مکان تھے، انہدام کے بعد ساٹھ برس تک وہاں کسی کو جھونپڑی تک بنانے کی اجازت نہ دی گئی تو اصل آبادی کی سطح پر ملبہ خاصی دبیز تہ کی شکل میں جم گیا۔ اس وجہ سے یقینی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب

کے زمانے کا پنجتار کیسا تھا، تاہم مجھے جو معلومات مختلف روایتوں سے مل سکیں، انہیں اپنے خیال کے مطابق بہ صورتِ مرتب پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

ممکن ہے یہ معلومات آئندہ کے لئے اربابِ تحقیق کو ایک مشعل کا کام دے سکیں اور ان کی روشنی میں مزید تفصیلات کا کھوج لگایا جا سکے۔ اگر کوئی نئی بات معلوم نہ بھی ہو سکے تو یہ نقشہ تو بہرحال محفوظ ہو جانا چاہئے، جو اگرچہ ایک حد تک قیاس کے موقلم سے تیار ہوا ہے، تاہم اس کے متعلق بنیادی معلومات مستند روایات سے حاصل کی گئی ہیں اور احیاءِ اسلامیت کی سرگزشت میں اس مقام کو جو بلند حیثیت حاصل ہے، اس کا مقابلہ پاکستان و ہند کے اکثر شہر نہیں کر سکتے، جن کی عظمت کے افسانے عام تاریخوں کے صفحات کی زینت ہیں۔

موقع اور محل

پنجتار پہاڑوں کے بیچ میں خاصا محفوظ مقام ہے۔ یہ ایک نالے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، جو شمالی سمت سے بہتا ہوا آیا ہے اور تو تالی کے پاس پہاڑوں سے باہر نکلا ہے۔ پھر صوابی، بیچ پیر اور زیدہ ہوتا ہوا ہنڈ سے ذرا آگے بڑھ کر دریائے سندھ میں مل گیا ہے۔ عام لوگ اسے نالہ کہتے ہیں، اہل علم "درۂ خدوخیل" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، میدانی علاقے میں اس کا نام "بدرگی" ہے۔(۱)

عام پہاڑی نالوں کی طرح بدرگی میں بھی اطراف سے نالے آ آ کر ملے ہیں، مثلاً ایک نالہ پنجتار کے مشرق سے آیا ہے اور آبادی کے شمالی و مغربی گوشے میں بدرگی میں گرا ہے، اسی کی ایک شاخ پنجتار کی زمینوں کے جنوبی حصے سے گزرتی ہوئی نیچے آ کر بدرگی

---

(۱) پشتو میں نالے کو "درہ" بھی کہتے ہیں اور "خوڑ" بھی (بروزن گہر)۔ تو تالی کے ایک عالم سے معلوم ہوا کہ علاقہ خدوخیل سے متصل کی میدانی آبادیوں کی زبان میں "بدرگی" کے معنی بھی نالے کے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو "بدرگی" کو معرفہ نہیں بلکہ نکرہ سمجھنا چاہئے۔

میں شامل ہوئی ہے، اس طرح پنجتار ایک مثلث جزیرہ بن گیا ہے۔

آبادی کا مقام اور اس سے متصل زمینیں، اطراف کے مقامات سے ڈیڑھ دو سو فٹ بلند ہوں گی، مواقع اور محل کی اس توضیح کو سامنے رکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں جن وسائل تحفظ کو خاص اہمیت حاصل تھی چونکہ وہ پنجتار میں بوجہ اتم مہیا ہے، شاید اسی لئے یہ مقام خدو خیل کا مرکز بنا۔

عام حالات

وجہ تسمیہ کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، مختلف اصحاب نے بتایا کہ اس مقام کو چونکہ آس پاس کی پانچ آبادیوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس وجہ سے پنجتار کہنے لگے۔ (۱) پنجتار سے میل ڈیڑھ میل شمال میں قاسم خیل بدرئی کے مشرقی کنارے پر، جنوب مغرب میں بدرئی کے غربی کنارے پر غورغشتی، اس کے قریب جنوب مغرب میں سنگ ٹبئی، مزید جنوب میں خلی کلی۔ سنگ ٹبئی اب باقی نہیں رہا صرف اس کا نشان رہ گیا ہے۔

پنجتار کے مشرق اور جنوب میں ہموار کھیت ہیں، جنوبی و مغربی حصے میں پہلے ایک باغ تھا جسے دیوان شاہ کا باغ کہتے تھے، اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اس کے قریب ہی پنجتار کا قبرستان تھا۔ جو غازی زمانۂ قیام پنجتار میں فوت ہوتے رہے، وہ سب اسی قبرستان میں دفن ہوئے، اب اس مقام پر توت کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا ہے۔

پنجتار کے شمال میں کوئی آدھ میل کے فاصلے پر نالے کے مشرقی کنارے پر ایک ٹیلہ ہے جو اوپر سے ہموار ہے۔ یہاں سید صاحب نے توپیں رکھوائی تھیں، پاس ہی ایک مکان توپچیوں کے رہنے کیلئے، نیز ایک میگزین بنوا دیا تھا، آبادی کے مغرب میں نالے

---

(۱) ضلع ہزارہ میں ایک مقام "ستار" بھی ہے اور ایک "دو تار" بھی۔

سے گذر کر ایک جگہ آتی ہے، جہاں پہلے شیشم کے درخت تھے، یہیں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں، اسی جگہ بیعت شریعت کے لئے اجتماع منعقد ہوا تھا۔

میں سرسری طور پر بتا چکا ہوں کہ اب شیشم کے درخت باقی نہیں رہے، ببول وغیرہ کے درخت اُگ آئے ہیں، اور آس پاس کی زمین میں سا ریت ہی ریت نظر آتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ نالے میں ایک مرتبہ سخت طغیانی آئی تھی، جس میں زمین بہہ گئی۔ پانی کم ہوا تو ریت رہ گئی، اس جگہ سے پہاڑ کی مغربی دیوار تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ہوگی، مقابل کے ٹیلے کو مقامی لوگ "مسلے" کہتے ہیں، اسی میدان میں گھوڑ دوڑ ہوتی تھی، اسی جگہ غازی نیزہ بازی، چاند ماری اور قواعد کرتے تھے۔

گردوپیش

درے کے دہانے سے پنجتار کا فاصلہ چار میل ہوگا، آنے جانے کا عام راستہ نالے کے ساتھ ساتھ ہے، لوگ پہلے پیدل یا گھوڑوں پر جاتے تھے، اب پنجتار کے سامنے تک موٹر بھی چلی جاتی ہے، لیکن موضع چونکہ بلندی پر واقع ہے، اس لئے بدرئی کے مغربی کنارے پر موٹر سے اُتر کر باقی فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔

پنجتار کے جنوب میں خلی کلی کے سامنے ایک ٹیلہ آس پاس کے پہاڑی علاقے سے چند سو فٹ بلند ہو گیا ہے، اس کا مقامی نام برہ مند (برہ مان یا بہرہ مان) کی ڈھیری ہے۔ اسی پر انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں توپیں نصب کر کے پنجتار کو تباہ کیا تھا، اس سے تھوڑے فاصلے پر مشرق میں ایک اور پہاڑ ہے، جو آس پاس کی سطح سے بلند ہے، اسے رانی کوٹ کا ٹیلہ کہتے ہیں۔ برہ مند کے جانب جنوب دہانہ درہ کے مشرقی گوشے میں توتالی ہے۔ رانی کوٹ اور برہ مند کے بیچ میں سے ایک پگڈنڈی بھی توتالی سے پنجتار جاتی ہے، لیکن اس سے صرف پیدل جا آسکتے ہیں، توتالی کے قریب بھی ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے، اس پر چڑھ

کر دیکھیں تو پنجتار کا ایک ایک مکان صاف نظر آتا ہے۔ تو تالی سے جنوب میں مانیر اور جنوب مشرق میں ڈاگئی ہے۔ نقشہ سامنے رکھ کر ان مقامات کو بہ غور دیکھ لینا چاہئے تاکہ اس سلسلے کے تمام حالات کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔

پرانی آبادی کی کیفیت

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، پرانی آبادی "جزیرۂ پنجتار" کے شمالی و مغربی گوشے میں تھی۔ مجاہدین جب پہلے پہل پنجتار پہنچے تو فتح خاں نے ان کیلئے کئی مکان خالی کرادیے تھے، کچھ غازی اپنے سیلوں سمیت ان مکانوں میں ٹھہر گئے، جنہیں مکان نہ مل سکے، انہیں مختلف آبادیوں میں ٹھہرایا گیا یا وہ خیموں اور چھپروں میں رہتے تھے۔ بعد میں سید صاحب نے پنجتار کی آبادی کے جنوب میں مجاہدین کے لئے ایک نئی آبادی کا انتظام کرلیا، وہاں ایک مسجد بھی بنالی، اس آبادی، مسجد اور ساتھ کے کنوئیں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ فتح خاں نے اپنے لئے پنجتار میں ایک مکان محفوظ رکھا تھا، لیکن وہ زیادہ تر باہر رہتا تھا۔

پوری آبادی کے اردگرد سنگین فصیل تھی، جسکے چاروں کونوں پر چار برج تھے، فصیل کے طول و عرض کی نسبت مجھے کچھ معلوم نہ ہوسکا، اس کا دروازہ مشرقی دیوار میں تھا۔

ابتدائی سکونت کا نقشہ

ابتدا میں سید صاحب شمالی و مشرقی برج میں مقیم ہوئے، اس کے قریب ہی آپ کی جماعت کے افراد رہتے تھے، جس کا نام جماعتِ خاص تھا۔ برج کے سامنے جو میدان تھا، اس میں ایک چھپر ڈال لیا گیا تھا، اس میں سید صاحب کا پلنگ بچھا رہتا تھا۔ اس کے آس پاس سید اسماعیل بریلوی اور شیخ عبدالحکیم پھلتی کے ڈیرے تھے، جو جماعت خاص کے آدمی تھے۔ غالبًا اسی چھپر میں سید صاحب ملاقاتیں کرتے تھے اور اسی میں مجالس

شوریٰ منعقد ہوتی تھیں۔ شمالی و مغربی برج میں سید صاحب کا باورچی خانہ اور اس کے پاس ہی غلے کا گودام تھا۔

دونوں برجوں کے درمیان مکانوں کی ایک قطار تھی، جن میں مشرقی سمت سے مغربی سمت تک مندرجہ ذیل اصحاب رہتے تھے۔

۱۔ مولوی وارث علی بنگالی، جو بڑے جید عالم اور پرہیزگار بزرگ تھے۔
۲۔ مولوی امام الدین بنگالی، جو باعمل عالم اور بے مثال صوفی تھے۔
۳۔ سید احمد علی بریلوی، جو سید صاحب کے خواہر زادہ تھے۔
۴۔ سید ابو محمد نصیر آبادی، جو سید صاحب کے اقربا میں سے تھے۔
۵۔ دادا سید ابو الحسن نصیر آبادی، علمدار لشکر اسلام، یہ بھی سید صاحب کے اقربا میں سے تھے۔
۶۔ سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ، ابن سید احمد علی۔

سید احمد علی کے مکان کے جنوب میں امان اللہ خاں لکھنوی کا مکان تھا۔ اس سے جنوبی اور مشرقی سمت میں جو مکان تھے ان میں حافظ جانی، حافظ مانی، قاضی حمایت اللہ، قاضی برہان الدین اور شیخ عبد الوہاب رہتے تھے۔ مشرقی دروازے کے ساتھ ہی جنوبی سمت میں مسجد تھی، اس کے پاس قاضی احمد اللہ ناگپوری کا مکان تھا، جنوبی و مشرقی بُرج میں مولانا شاہ اسماعیل رہتے تھے اور جنوبی و مغربی بُرج میں مولوی مظہر علی۔ باورچی خانے کے جنوب میں فصیل کی مغربی دیوار سے ملا ہوا فتح خاں کا مکان تھا، اس کے قریب مشرق میں مسجد تھی، جو اب تک موجود ہے۔ فتح خاں کے مکان اور مسجد کے جنوب میں پیر خاں مورائیں کی قیامگاہ اور خشی خانہ تھے، اسی جگہ قاضی احمد اللہ میرٹھی مقیم تھے۔ گودام کے پاس فتح خاں کے مکان میں شیخ ولی محمد پھلتی مع جماعت رہتے تھے، وہی توشہ خانے کے ناظم تھے۔

بیرونی آبادی

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، مشرقی دیوار کے باہر شتر خانہ اور اصطبل تھا۔ سید صاحب کی فرودگاہ کے سامنے مشرقی سمت میں فصیل سے باہر ابراہیم خاں خیرآبادی اور ان کے بھائی امام خاں اپنے اپنے بہلوں سمیت رہتے تھے۔ ان سے متصل شیخ حسن علی اپنے بیٹے اور بھائیوں سمیت مقیم تھے، یہ دونوں خاندان ایسے تھے، جن میں کے ہر فرد نے اس دنیا کی ہر چیز راہِ حق میں قربان کر دی تھی۔ تفصیل اس کتاب کی تیسری جلد میں ملے گی۔ انکے قریب ہی صوفی نور محمد بنگالی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور شیخ صلاح الدین پھلتی کے ڈیرے تھے۔

باقی غازیوں کی فرودگاہوں کا نقشہ یہ تھا۔

۱۔ میرزا احمد بیگ پنجابی اپنے ہمراہیوں سمیت درختوں کے اس جھنڈ میں رہتے تھے، جہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں۔

۲۔ ارباب بہرام خاں، ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں اور بھتیجا محمد خاں اہل وعیال سمیت شہتوت کے اس باغ میں مقیم تھے، جو پنجتار کے جنوب مغرب میں ایک تیر کی زد پر تھا۔

۳۔ حاجی زین العابدین خاں اپنے ہمراہیوں اور چند قندھاریوں سمیت قاسم خیل میں تھے۔ بعد ازاں مولوی احمد اللہ ناگپوری اور مولوی خیر الدین شیرکوٹی نے سید صاحب کے ارشاد کے مطابق قاسم خیل میں گولے ڈھالنے کا ایک کارخانہ بنالیا تھا، جس میں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے ڈھلتے تھے۔

۴۔ حاجی حمزہ علی خاں ساکن لوہاری کے رفقاء غورغشتی میں تھے، اسی گاؤں کے جنوبی حصے میں مولوی نصیر الدین منگلوری مع جماعت رہتے تھے۔

۵۔ قندھاری جماعت سنگ بٹی میں تھی، اس جماعت کے چار بڑے سردار تھے: ملا لعل محمد، ملا قطب الدین، ملا نور محمد اور ملا عزت۔

۶۔ متفرق قندھاری خلی گلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

۷۔ متفرق ہندوستانی پنجتار کے اندر مکانوں میں یا باہر چھپر ڈال کر جابجا مقیم ہو گئے تھے۔

نئی آبادی

جو اصحاب باہر چھپروں یا خیموں میں رہتے تھے، انہیں دھوپ اور بارش میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وجہ سے سید صاحب نے آہستہ آہستہ سب کیلئے مکان بنا دینے کا فیصلہ فرما لیا۔ آپ ایک روز نالے سے واپس ہوتے وقت دو پتھر اٹھا لائے، غازیوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جو شخص باہر جاتا وہ کم سے کم دو پتھر ضرور لے آتا۔ تھوڑے دنوں میں ایک بڑا انبار جمع ہو گیا۔ سب سے پہلے سید صاحب کیلئے گارے سے دس ہاتھ لمبا دالان بنایا گیا، جس میں قبلہ رخ تین دروازے تھے، یہ مکان غالباً آبادی کے جنوب میں تھا، اس کے سامنے چھپر کا سائبان بنا دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے غازیوں کے لئے مکان بن گئے۔ اس نئی آبادی میں بھی ایک مسجد بنالی گئی اور ایک کنواں کھود لیا گیا، مسجد اور کنوئیں کے نشانات اب تک پنجتار کی موجودہ آبادی کے جنوب میں موجود ہیں۔ ان مکانوں میں وہ لوگ منتقل ہو گئے جو پہلے چھپروں اور ڈیروں میں رہتے تھے، یا جن کے لئے آبادی کے اندر جگہ ناکافی تھی۔ فصیل کے شمالی و مشرقی برج میں بھی سید صاحب وقتاً فوقتاً استراحت فرمایا کرتے تھے بستی سے خاصے فاصلے پر مشرق میں بارود کا میگزین بنا دیا تھا، پاس ہی بارود سازی کا کارخانہ تھا۔

نظامِ رسد

جب تک **عشر** کی باقاعدہ تحصیل کا انتظام نہیں ہوا تھا، غازی یا تو اپنے ہاتھ سے غلہ پیستے تھے یا اُجرت دے کر پسوا لیتے تھے۔ بعد میں غلے کی فراوانی ہو گئی تو موضع مینئی میں پانچ پن چکیاں سید صاحب نے اپنے انتظام میں لے لیں اور سید حامد علی جھنجھانوی کو پچیس تیس غازیوں کا سردار بنا کر مینئی میں بھیج دیا۔ وہاں کے خان نے ان کیلئے تین مکان خالی کرا دیے، ایک میں غلہ جمع رہتا، دوسرے میں آٹا اور تیسرے میں غازی رہتے تھے۔ گندم کی پسوائی ایک سیر دس چھٹانک فی من اور مکی کی پسوائی اڑھائی سیر فی من مقرر ہو گئی۔ پنجتار سے غلہ اونٹوں اور خچروں پر لاد کر مینئی بھیج دیا جاتا اور وہاں سے آٹا پس کر آ جاتا۔

ابتداء میں ہر غازی کی مقررہ رسد روزانہ تین پاؤ آٹا اور مٹھی بھر دال تھی، اوقاتِ عسرت میں تناسب سے مقدار گھٹا دی جاتی۔ جب عشر کا غلہ باقاعدہ وصول ہونے لگا تو یومیہ رسد ایک سیر کر دی گئی۔ سید صاحب اپنے لئے بھی عام غازیوں کے برابر رسد لیتے تھے، لیکن چونکہ آپ کے پاس مہمان آتے تھے، اس لئے کھانے کا انتظام الگ کرنا پڑا، جتنے مہمان آتے فی کس کے حساب سے اتنی ہی زائد رسد لے لیتے۔

متفرق اُمور

جماعت متعدد بھیلوں میں منقسم تھی، ہر بھیلے میں کم سے کم بیس اور زیادہ سے زیادہ پچیس آدمی ہوتے تھے۔ پورے بھیلے کے آدمیوں کا کھانا ایک جگہ پکتا، جب تک مینئی میں آٹا پسوانے کا انتظام نہیں ہوا تھا، بھیلے کے چار آدمی روزانہ باری باری آٹا پیستے، چار آدمی باری باری کھانا پکاتے۔ باقی ندی سے پانی لا دیتے، لکڑیاں جنگل سے لائی جاتی تھیں۔ عام دستور یہ تھا کہ بھیلہ دار فارغ آدمیوں کو لے کر جنگل میں چلا جاتا، سب کلہاڑیوں سے لکڑی کاٹتے اور پشتارے بنا کر لے آتے، ایک ایک وقت میں بارہ بارہ

چودہ چودہ پشتارے آ جاتے، جو کئی دن کے لئے کفایت کرتے۔

سید صاحب کے باورچی خانے کا انتظام قادر بخش کنج پوری کے حوالے تھا۔ جب اس باورچی خانے کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو سید صاحب صبح کی نماز کے بعد لشکر کے ان تمام آدمیوں کو ساتھ لے لیتے جو کام کاج سے فارغ ہوتے۔ خود بھی برابر لکڑیاں کاٹتے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی تھک کر تھوڑی دیر کیلئے ستانے لگتے، لیکن سید صاحب متواتر لکڑیاں کاٹنے میں لگے رہتے۔ اس طرح ایک وقت میں کئی روز کے لئے ایندھن آ جاتا، اگر کسی دن کھانا پک چکنے کے بعد مہمان آ جاتے تو سید صاحب مختلف بہیلوں سے تھوڑا تھوڑا کھانا منگا لیتے۔ بعض اوقات خود کچھ نہ کھاتے یا کسی بہیلے میں چلے جاتے اور جو پکا ہوتا نوش فرما لیتے۔

تقسیم لباس کا یہ دستور تھا کہ سال بھر میں ہر غازی کو دو جوڑے جوتے اور تین جوڑے کھادی کے موٹے کپڑے ضرور ملتے تھے، اگر کسی کے کپڑے جلد پھٹ جاتے یا گم ہو جاتے تو اُسے نئے کپڑے دیدیے جاتے۔ سردیوں کیلئے ہر ایک کو ایک دگلہ یا میرزئی اور ایک ایک دوہری جاتی تھی۔ ہر جمعرات کو کپڑے دھونے کے لئے سر اسم دو دو چکیاں صابن کی دی جاتیں۔

زندگی کا طریق

غازیوں کی زندگی حد درجہ سادی تھی، وہ ہر کام کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ سید صاحب کی صحبت سے ان کے اخلاق میں اسلامیت کی پکی جلا پیدا ہو چکی تھی، ہر غازی کے نزدیک اپنے بھائیوں کی خدمت مقتضائے اسلامیت تھی، چنانچہ جو غازی کپڑے دھونے کیلئے جاتا، وہ اپنے ایک دو ساتھیوں کے کپڑے بھی ساتھ لے جاتا۔ سید صاحب سبقت بالخیر کے سلسلے میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے رہتے، مثلاً کئی مرتبہ فرمایا

کہ جب ہم نواب امیر الدولہ کے لشکر میں تھے تو کپڑے دھونے کے وقت اپنے پانچ سات ساتھیوں کے میلے کپڑوں کا بھی گٹھا باندھ کر لے جاتے، ساتھی ہر چند نہیں نہیں کرتے، لیکن ہم ایک نہ سنتے۔

کسی چھوٹے یا بڑے کو کسی کام سے عار نہ تھی، میاں جی نظام الدین چشتی لشکر کے بزرگ آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک موقع پر غازی کھانا کھا رہے تھے کہ اندھیرا ہوگیا، میاں جی فوراً مشعل روشن کر کے کھڑے ہوگئے، غازیوں نے ان کی بزرگی کے پیش نظر عرض کیا کہ تکلیف نہ اٹھائیں، میاں جی بولے: اگر یہ خدمت موجب ثواب ہے تو مجھے اس سے محروم کیوں رکھنا چاہتے ہو؟

سید صاحب کے ارشادات

سید صاحب اکثر فرماتے:

> ہمارے جو بھائی محض خدا کے واسطے نیت خالص سے چکی پیستے ہیں، کھانا پکاتے ہیں، لکڑی لاتے ہیں، گھاس کھودتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں، اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے ہیں اور اسی طور کے سب کام کرتے ہیں، تو یہ سب عبادت میں داخل ہیں اور یہ کام کرنے حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں، اور سب اولیاء اللہ ایسے ہی کام کرتے آئے ہیں۔ جتنے موافق شرع کام ہیں، کسی کے کرنے میں عار نہیں ہونی چاہئے اور ان سب کا اجر خدائے تعالیٰ کے ہاں سے ملنا یقینی ہے...... یہ ہمارے بھائی مسلمان باایمان اپنے گھر بار، خویش وتبار، عیش وآرام کو ترک کر کے محض واسطے خوشنودی پروردگار کے اور اتباع رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے آئے اور یہ سب ہمارے نزدیک گوہر نایاب اور لعل بے بہا کے ٹکڑے ہیں کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے چھنٹ کر آئے ہیں، ان کی قدر ومنزلت ہم جانتے ہیں، ہر کوئی نہیں

پہچاننا۔(۱)

اس قسم کے کلمات فرمانے کے بعد عجز والحاح سے دعا کرتے کہ خداوند! ہمیں اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو اپنے صراط مستقیم پر حضرت خیر الانامؐ اور صحابہ کرامؓ کے قدم بہ قدم ثابت وقائم رکھ۔

مولوی عبدالوہاب کا واقعہ

مولوی عبدالوہاب لکھنوی کمزور ونحیف آدمی تھی اور مختلف عوارض میں مبتلا تھے۔ سید صاحب نے پنجتار میں انہیں قاسم رسد مقرر فرمادیا، قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، تقسیم رسد کے ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھتے جاتے۔ مولوی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جو پہلے آتا، اسے پہلے دیتے، جو بعد میں آتا بعد میں دیتے۔ بڑے چھوٹے کا امتیاز ہرگز روا نہ رکھتے۔

ایک روز مولوی امام علی عظیم آبادی، جو نو وارد تھے، رسد لینے کے لئے آئے، وہ قوی اور جسیم آدمی تھے۔ چونکہ جماعت کے طریقے سے ناواقف تھے اس لئے اصرار کیا کہ پہلے مجھے رسد دیجئے۔ مولوی عبدالوہاب نے فرمایا کہ باری سے ملے گی، انہوں نے غصے میں مولوی صاحب کو دھکا دے دیا اور وہ آٹے پر گر پڑے۔ کچھ قندھاری بھی وہاں موجود تھے، وہ امام علی کو مارنے کے لئے تیار ہوگئے۔ مولوی عبدالوہاب نے انہیں روک دیا اور کہا: امام علی میرا بھائی ہے، دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ لوگ کیوں جوش میں آگئے؟

شدہ شدہ یہ بات سید صاحب تک پہنچی، آپ نے مولوی عبدالوہاب کو بلا کر پوچھا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ امام علی نیک بخت آدمی ہیں، وہ رسد لینے آئے تھے، باری ان کی نہ تھی، انہوں نے جلدی کی اور مجھے دھکا لگ گیا، کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

جب لوگوں نے مولوی صاحب کے عفو وتحمل کی یہ داستان امام علی کو سنائی تو وہ بہت پشیمان ہوئے، خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی زیادتی کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ

---

(۱) وقائع ص: ۹۱۷-۹۱۸

مولوی صاحب سے میرا جرم معاف کرا دیجئے۔

سچی اسلامی اخوت کے یہ دلکش مناظر جماعت مجاہدین میں عام تھے۔ انہیں سے سید صاحب کی شانِ تربیت کا نقشہ معلوم ہو سکتا ہے۔

سید محمد اسحاق گورکھپوری کا واقعہ

غازیوں کی للّٰہیت و اخلاص کا اندازہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کے واقعہ سے ہوگا۔ شیخ صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، ان کے لئے معاش کا کوئی انتظام نہ تھا، لیکن حمیت دین کے جوش میں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ مولانا شاہ اسماعیل نے وعظ میں "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" کی تفسیر بیان فرمائی۔ شیخ محمد اسحاق مجلس وعظ کے بعد اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے لیٹ گئے، کھانے میں بھی شریک نہ ہوئے، سید صاحب نے پاس بٹھا کر کیفیت پوچھی تو صرف اتنا عرض کیا: "میری کم نصیبی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا۔" پھر سید صاحب نے مولانا سے وعظ کا موضوع دریافت کر کے شیخ اسحاق سے بات چیت فرمائی، اس وقت شیخ نے عرض کیا کہ مولانا کے وعظ سے حقیقت منکشف ہوئی کہ جس دل میں خدا کی محبت ماسوا پر غالب نہ ہو، وہ ایمان کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال جدا نہیں ہوتا، کئی تدبیریں کر چکا ہوں لیکن ناکام رہا۔ اگر ہو سکے تو یہ خیال دل سے نکال دیجئے۔

مولانا نے پوچھا: آیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں لشکر اسلام کو چھوڑ کر وطن چلے جاؤ؟ شیخ نے کہا یہ ممکن نہیں۔ مولانا نے فرمایا: پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں خدا اور رسولؐ کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے۔ اس کے بعد شیخ نے کھانا کھایا۔ (۱)

---

(۱) منظورہ ص: ۱۱۰۶، ۱۱۰۷

فتح خاں پنجتاری کے اخلاف

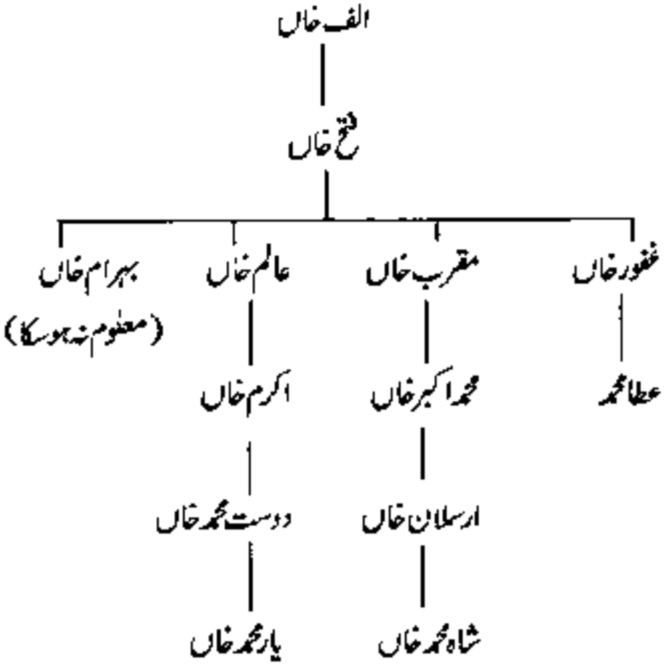
الف خاں
فتح خاں
غفور خاں
مقرب خاں
عالم خاں
بہرام خاں
(معلوم نہ ہوسکا)
عطا محمد
محمد اکبر خاں
اکرم خاں
ارسلان خاں
دوست محمد خاں
شاہ محمد خاں
یار محمد خاں

(ان میں سے عطا محمد خاں ابن غفور خاں، دوست محمد خاں ابن اکرم خاں اور یار محمد خاں ابن دوست محمد خاں سے میں پنجتار میں ملا تھا۔)

نواں باب:

خادے خاں کا انحراف

خادے خاں کی غلط اندیشی

خادے خاں علاقہ سرحد کا غیور و جسور رئیس تھا، سید صاحب کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں سبقت کا شرف حاصل کیا، آپ کو مہمان بنا کر اپنے ہاں لے گیا اور وہیں امامتِ جہاد کی بیعت ہوئی، لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ سید صاحب کی مخالفت میں بھی پہل اسی سے ہوئی، اس انحراف کے مندرجہ ذیل وجوہ ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ اس کی طبیعت ضدی اور خود پسند تھی، افغانی مراسم کو وہ اسلامی تقاضوں پر ترجیح دیتا تھا۔

۲۔ فتح خاں پنجتاری اور اشرف خاں رئیس زیدہ کو وہ رقیب سمجھتا تھا، سید صاحب چونکہ اول الذکر دونوں رئیسوں کو بہت اچھا سمجھتے تھے، اس وجہ سے خادے خاں کے دل میں اک گونہ برگشتگی پیدا ہوگئی جو برابر بڑھتی رہی۔

۳۔ ہنڈ کو چھوڑ کر پنجتار کو مرکز مجاہدین بنا لینے کے باعث فتح خاں پنجتاری کا اعزاز بہت بڑھ گیا، خادے خاں کو یہ اعزاز قطعاً پسند نہ تھا۔

۴۔ سب سے آخر میں مانیری کے واقعہ نے اسکی آتشِ غیظ کو ہوا دے کر بھڑکا دیا۔ مانیری کی زمینوں کو بیعتِ شریعت کے بعد جن لوگوں کے قبضے سے نکال کر اصل مالکوں کے حوالے کیا گیا تھا، وہ خادے خاں کے طرفدار اور ہم نوا تھے، اور خان اپنے طرفداروں کی سبکی اور بے عزتی کو اپنی سبکی اور بے عزتی سمجھتا تھا۔ یہ حق شناسی کی ذہنیت نہ تھی بلکہ طریق

جاہلیت کی پیروی تھی، غرض وہ آہستہ آہستہ مخالفت میں زیادہ جری اور دلیر ہوتا گیا۔

سکھوں سے ساز باز

ابتدا میں وہ ہندوستان سے آنے والے اکا دکا غازیوں کو تنگ کرنے لگا، غازی بھیس بدل کر پنجاب میں سے گذرتے اور ہنڈ کے گھاٹ سے دریا عبور کر کے سرحد پہنچتے تھے۔ خادے خاں کے آدمی انہیں گرفتار کر لیتے، ان کے پاس جو کچھ ہوتا چھین لیتے، پھر دریا میں غوطے دے کر دوسرے کنارے پر پہنچا تے۔ بعض غازیوں کو اس شرط پر چھوڑ دیا گیا کہ جو مال خادے خاں کے آدمی لے چکے تھے، اسے بحل کر دیا جائے۔ سید صاحب کے پاس پے در پے شکایتیں پہنچیں لیکن آپ صبر کیے بیٹھے رہے، مظلوم غازیوں سے بھی فرماتے کہ صبر کرو اور اپنی تمام شکایتیں اللہ کے حوالے کر دو۔

پھر مانیری اور آس پاس کے مقامات سے رپورٹیں آئیں کہ خادے خاں کے سوار مویشی ہانک کر لے جاتے ہیں اور پکی فصلیں کاٹ لیتے ہیں۔ سید صاحب نے ان رپورٹوں پر بھی برابر صبر کیا اور یہی کوشش فرماتے رہے کہ خادے خاں کو مخالفت میں آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے۔

جس زمانے میں سید صاحب خمر میں تھے، خادے خاں نے اشرف خاں رئیس زیدہ سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، بلکہ رئیس زیدہ کی بعض زمینوں پر زبردستی قبضہ کر لیا حالانکہ دونوں ہم خاندان تھے اور ان میں گہری رشتہ داری تھی۔ یعنی اشرف خاں کی صاحبزادی خادے خاں کی بیوی تھی اور خادے خاں کی ہمشیر اشرف خاں کے بیٹے مقرب خاں سے بیاہی ہوئی تھی، سید صاحب پنجتار پہنچے تو اشرف خاں کے بھائی لطف اللہ خاں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ ہمارے امام ہیں، اس ظلم و چیرہ دستی کا ازالہ فرمائیں۔

لڑائی

سید صاحب ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا تدبیر اختیار فرمائیں، اس اثناء میں اطلاع ملی کہ خادے خان لڑائی کا پورا بندوبست کر چکا ہے اور اشرف خاں پر حملہ ہونے والا ہے۔ سید صاحب نے شاہ اسماعیل کو پونے دو سو غازیوں کے ساتھ بھیج دیا کہ بیچ میں پڑ کر لڑائی رکوا دیں، پھر مستقل مصالحت کا انتظام فرمائیں۔ شاہ صاحب سلیم خاں ٹھہرتے ہوئے مانیری پہنچے، تو شاہ منصور کی طرف سے گولیوں کی آواز آئی، آپ جلد سے جلد آواز کے نشان پر گئے تو دیکھا کہ اشرف خاں لشکر سمیت زیدہ واپس جا رہا ہے۔ پوچھا: ''خان بھائی! یہ لڑائی کیسی؟ ہم تو حضرت کے مطابق مصالحت کی غرض سے آئے تھے۔'' اشرف خاں نے بتایا کہ ہم تو سید بادشاہ کے حکم کے مطابق اپنی گڑھی میں بیٹھے تھے، سورج نکلتے ہی خادے خاں کا لشکر میدان میں آ گیا، مجبوراً ہمیں بھی دفاع کی غرض سے نکلنا پڑا، ہم اپنی حد پر نہیں پہنچے تھے کہ خادے خاں کے آدمی بندوقیں چلانے لگے، ہمیں بھی جواب دینا پڑا، تھوڑی دیر لڑائی جاری رہی پھر خادے خاں کے آدمی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور ہم واپس آ گئے۔ خدا کے فضل سے ہمارا کوئی بھی آدمی زخمی نہیں ہوا۔

اشرف خاں کی وفات

اشرف خاں گھوڑے پر سوار تھا اور بشاشت و شادمانی کی فراوانی میں گھوڑے کو کداتا ہوا جا رہا تھا، شاہ منصور کے قریب پہنچا تو گھوڑا اچانک سیخ پا ہو گیا۔ پھر اس طرح گرا کہ اشرف خاں نیچے تھا اور گھوڑا اوپر۔ زین کا ہرنا خان کے سینے میں گڑ گیا، گھوڑے کے نیچے سے اسے نکالا گیا تو بے ہوش تھا تھوڑی دیر میں واصل بہ حق ہو گیا۔ اس ناگہانی حادثے نے سب کو حزن و ملال کا پیکر بنا دیا، وہ بہت نیک بخت، سخی اور خوش اخلاق رئیس تھا، سید صاحب کے ساتھ اسے دلی محبت و عقیدت تھی۔

میت کو چارپائی پر ڈال کر زیدہ لے گئے۔ خادے خاں بھی یہ خبر سن کر زیدہ پہنچا اور نماز جنازہ میں شریک ہوا۔ تدفین سے فارغ ہو کر تعزیت و دعاء کیلئے مسجد میں جمع ہوئے، شاہ اسماعیل نے مرحوم کے محامد و فضائل بیان فرمائے، پھر مغفرت کے لئے دعاء مانگی۔

جانشینی کا فیصلہ اور خادے خاں

مولانا ایک رات زیدہ میں گزار کر پنجتار گئے، تیسرے روز فتح خاں پنجتاری زیدہ پہنچا، جہاں خان مرحوم کی جانشینی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اشرف خاں کے تین بیٹے تھے: مقرب خاں، فتح خاں اور ارسلان خاں۔ ان میں سے فتح خاں سب سے لائق، دانش مند اور دیندار تھا، اور اشرف خاں نے اسی کو جانشینی کے لئے نامزد کیا تھا، تمام خوانین نے اسی کو خانی و سرداری کی دستار بندھوائی، خادے خاں کو اس فیصلے سے بھی اختلاف تھا، وہ چاہتا تھا کہ مقرب خاں کو سردار بنایا جائے جو اس کا بہنوئی تھا۔ یہ واقعہ خادے خاں کے لئے رنجش کا تازہ سبب بن گیا۔ سرحد میں اسے کہیں سے دوستی اور اعانت کی امید نظر نہ آئی تو خفیہ خفیہ سکھوں سے رشتہ موافقت پیدا کر لیا۔ اس کے دل میں مدت سے اجتماعیت و انفرادیت یا اسلامیت و افغانیت کی کشاکش جاری تھی، اب وہ فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی۔ خادے خاں خاصی دیر تک لڑکھڑاتا رہا، آخر سنبھلنے کے بجائے گر گیا اور ایسی جگہ گرا جہاں اسلامیت کے کسی منتسب کے لئے اطمینان و مسرت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

سکھوں کی آمد

سکھ وقتاً فوقتاً لشکر لے کر علاقہ سرحد میں پہنچ جاتے تھے، وہ مسکین دیہاتیوں پر سخت ظلم کرتے، خوانین و رؤسا سے گھوڑے، باز اور شکاری کتے خراج میں لیتے، اب کے جنرل دنتورا حضرو پہنچا تو خادے خاں نے خود حضرو حاضر ہو کر ایک گھوڑا، ایک باز اور ایک شکاری کتا بطور نذر پیش کر کے سکھ حکومت کا طوق فرمانبرداری اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر

دنتورا کو ترغیب دی کہ دریا کو عبور کر کے سمہ میں پہنچو گے تو باقی روسا بھی خراج ادا کر دیں گے۔ مانیری پر مجھے قبضہ دلا دو گے تو خاصی رقم معاوضے میں دوں گا۔

دنتورا محتاط آدمی تھا، اس نے خادے خاں کے بھائی امیر خاں کو یرغمال میں لے کر پیش قدمی کی۔ خادے خاں نے مقرب خاں ابن اشرف خاں کی طرف سے بھی گھوڑا اور باز پیش کر کے اسے زیدہ کا رئیس تسلیم کرالیا۔ مقرب خاں دل سے سید صاحب کا عقیدت مند تھا، فوراً قاصد بھیج کر پورے حالات سید صاحب کے گوش گزار کر دیے۔ یہ بھی عرض کیا کہ میں نے جو کچھ کیا، مجبوری کی حالت میں کیا۔ مقرب کے اخلاص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دم بہ دم سکھ لشکر کے بارے میں صحیح اطلاعات سید صاحب کو پہنچاتا رہا۔

دنتورا کا خط

خادے خاں نے دنتورا سے کہہ کر ایک پروانہ فتح خاں پنجتاری کے نام بھی بھجوایا جو خراج کے مطالبے پر مشتمل تھا۔ فتح خاں نے جواب دیا کہ ہم نے نہ کبھی خراج دیا اور نہ دیں گے، تمہیں اپنی فوج پر اعتماد ہے تو جو چاہو کرو۔

خادے خاں تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا، دنتورا سے کہا کہ خان پنجتار کا یہ جوش وخروش اور دم خم سید بادشاہ کے بل پر ہے۔ دنتورا نے خود سید صاحب کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ عالی خاندان، سید، حاجی حرمین، غازی اور ولی ہیں، آپ کی برکت سے اس ملک میں شر وفساد کم ہو رہا ہے لیکن یہ ملک راجہ رنجیت سنگھ کے قلمرو میں داخل ہے، خوانین باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے، آپ کی تشریف آوری کے بعد باغی ہو گئے، آپ انہیں مہاراجا کی اطاعت کا حکم دیں، نیز لکھیں کہ کس غرض سے اس ملک میں آئے ہیں، جواب وکیل کی معرفت روانہ کریں۔

سید صاحب کا جواب

سید صاحب نے جواب میں لکھا ہے کہ جس طرح آپ اپنے حاکم کے تابع فرمان ہیں، اسی طرح ہم اپنے خدا کے فرمانبردار ہیں، جو زمین و آسمان کا مالک برحق ہے۔ اس احکم الحاکمین نے جو احکام بھیجے ہیں، انہیں بجالاتا ہوں، سب کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، جو اسے قبول کرلے وہ میرا بھائی ہے۔ آپ اہل کتاب ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ جو دعوت آپ کو دے رہا ہوں وہ آپ کے آقا کے لئے بھی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ملک خالصہ جی کا ہے، یہ دعویٰ محض بے دلیل ہے۔ حقیقتاً مشرق سے مغرب تک سارا ملک خدا کا ہے، پھر ملکیت کے اعتبار سے یہ ملک مسلمانوں کا ہے، میرا ارادہ بھی آپ سے مخفی نہیں، یہاں سمجھ بوجھ کر ہی آیا ہوں، آپ مسلمانوں کو تباہ کررہے ہیں، اگر اسلام قبول کرلیں تو ملک آپ کے پاس رہے گا، ورنہ میں آپ سے جہاد جاری رکھوں گا۔

''وقائع'' کا بیان ہے کہ مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو وکیل بنا کر سید صاحب نے دنتورا کے پاس بھیجا۔ مولوی صاحب نے مکتوب کے تمام مطالب کو تفصیل سے دہرایا اور ہر اعتراض کا شافی جواب دیا۔ دنتورا تلخ ہوکر بولا تو مولوی صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ آخر میں کہہ دیا کہ آپ کو اپنے لشکر پر ناز ہے تو ہمارا بھروسا اللہ پر ہے۔ اس کا لشکر سب سے زیادہ قوی ہے اور ہمیشہ سب پر غالب رہا ہے۔

دنتورا کی واپسی

مولوی صاحب دنتورا سے مل کر پنجتار پہنچے اور ساری گفتگو تفصیلاً سید صاحب کو سنادی۔ چونکہ پنجتار پر حملے کا اندیشہ تھا اس لئے سید صاحب نے مولوی خیر الدین کو تین سو

غازیوں کے ساتھ درے کی حفاظت کے لئے بھیج دیا، وہ درے سے باہر نکل کر خیمہ زن ہوئے، دھتورا کی فوج مغربی جانب کے میدان میں اُتری ہوئی تھی، دونوں فوجوں میں دو اڑھائی کوس کا فاصلہ تھا۔

غازیوں کے شبخون کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مانیری اور صوابی کے باشندے سکھ لشکر کی وجہ سے پریشان تھے، غازیوں کا لشکر آ گیا تو اطمینان کے ساتھ اردگرد کے مواضع میں پھرنے لگے، سکھ لشکریوں نے سمجھا کہ شاید شبخون کے لئے پخت وپز ہو رہی ہے، ان پر سراسیمگی طاری ہو گئی، دھتورا نے یہ حالت دیکھ کر فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، وہ لوگ اس افراتفری میں واپس گئے کہ خاصا سامان بھی پیچھے چھوڑ گئے۔(۱)

---

(۱) عام سوانح نگار پنجتار پر صرف ایک حملے کا ذکر کرتے ہیں، میری تحقیق یہ ہے کہ دھتورا دو مرتبہ حملے کے لئے آیا۔ تمام روایات کو سلجھانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، افسوس کہ سکھ لشکر کی ہر نقل وحرکت کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے، نہ قطعی فیصلے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اسے پیش کر دیا ہے، حقیقت حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔

دسواں باب:

تسخیر اٹک کی تجویز

بیعتِ شریعت کی برکات

بیعتِ شریعت نے پورے علاقے میں دینی فضا پیدا کرنے کا سروسامان کر دیا تھا، ملا قطب الدین ننگرہاری بہ سلسلہ وظائف احتساب دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے، خود سید صاحب بھی خوانین ورؤسا کی دعوت پر مختلف مقامات میں تشریف لے جاتے تھے، پٹھانوں کا ایک بہت بڑا مرض تفرقہ تھا، جس نے ان کی جماعتی زندگی کی بنیاد متزلزل کر رکھی تھی۔ معمولی باتوں پر وہ لڑ پڑتے، پھر ہر فریق کی کوشش یہ ہوتی کہ گاؤں یا اقوام کے زیادہ سے زیادہ افراد اپنے ساتھ ملا لے، اس طرح معمولی مناقشتوں کی بنا پر جگہ جگہ مستقل جنگی محاذ بن گئے تھے۔

سید صاحب جہاں تشریف لے جاتے، پرانی مناقشتوں کی تحقیقات کر کے شرعی فیصلے صادر فرما دیتے، خدو خیل کے علاقے میں فتح خاں پنجتاری اور اس کے بھائی ناصر خاں کے درمیان شدید عداوت پیدا ہو چکی تھی، اور ناصر خاں نے چنگلئی میں بیٹھ کر اردگرد کے خوانین کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، یہاں تک کہ فتح خاں کے لئے پنجتار سے قدم باہر رکھنا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب نے ان دونوں بھائیوں میں بھی صلح کرا دی۔

اٹک پر حملے کی تجویز

اس زمانے میں اٹک سے خیر الدین نام ایک شخص بار بار پنجتار آیا، وہ دو تین دن

ٹھہرتا، تخلیہ میں سید صاحب سے بات چیت کرتا اور واپس چلا جاتا۔ اس وقت کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اٹک کا قلعہ سید صاحب کے حوالے کر دینے کی ایک اسکیم سوچی تھی اور اس سلسلے میں تفصیلات طے کرنے کی غرض سے آتا تھا۔

اٹک کا قلعدار خزانہ مل نام ایک شخص تھا، خیر الدین وہاں کے معززین میں سے تھا آہستہ آہستہ اس نے تمام اندرونی معاملات کی کیفیت معلوم کر لی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ قلعے پر قبضہ کر لینا مشکل نہیں تو شہر اٹک کے ان مسلمانوں سے بات چیت کی، جن کی اسلامی حمیت پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ سب نے خیر الدین کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن کہا کہ باہر سے کمک حاصل کئے بغیر اس کام کا سرانجام کو پہنچنا مشکل ہے، باہر سے سید صاحب کے سوا کون مدد دے سکتا تھا؟ جوانمرد خیر الدین نے اس خفیہ سفارت کی خدمت اپنے ذمے لے لی۔

اٹک اس زمانے میں نہایت اہم مقام تھا، اسے قبضے میں لے لینے کے بعد پنجاب میں پیش قدمی کے لئے ایک نہایت موزوں مرکز مل جاتا، یہ بھی یقین تھا کہ اٹک لے لینے کے بعد ایک طرف اہل سرحد زیادہ سرگرمی سے کاروبارِ جہاد میں اعانت کے لئے تیار ہو جائیں گے، دوسری طرف مسلمانانِ پنجاب کے حوصلے بڑھ جائیں گے، اور سکھ حکومت میں تزلزل کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن معاملہ ایسا نہ تھا کہ تنہا ایک فرد کی روایت پر بھروسہ کر کے آخر اقدام کا فیصلہ کر لیا جاتا، چنانچہ سید صاحب نے مولوی امام الدین بمبئی والے کو دو غازیوں کے ساتھ بہ تبدیلِ لباس اٹک بھیج دیا، دس روز میں انہوں نے پورے حالات تحقیق کئے اور پنجتار پہنچ کر خیر الدین کی ایک ایک بات کی تصدیق فرما دی۔ (۱)

---

(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ مولوی امام الدین کو زیادہ مرتبہ اٹک بھیجا گیا اور وہ ہر مرتبہ دس دس بیس بیس روز وہاں گزارتے رہے، میرے نزدیک یہ روایتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں، اس لئے کہ اٹک کا واقعہ بیعت و شریعت سے تھوڑی دیر بعد پیش آیا اور محض تحقیق احوال میں دو تین مہینے کی مدت بسر کر دینا قرین قیاس نہیں۔

سید صاحب نے اسی وقت پانسو روپے کی رقم خیر الدین کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ ضروری سامان اور ہتھیار خرید لیجئے، سب سامان مکمل ہو جائے تو ہمیں اطلاع بھجوا دیجئے۔

غازیوں کا ارسال

سید صاحب اس کے بعد خود دورے پر روانہ ہو گئے اور جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے گڑھی امان زئی پہنچے، وہیں خیر الدین نے خود یہ اطلاع پہنچائی کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، مسلمانانِ اٹک میں سے پانسو آدمی ساتھ دینے کیلئے تیار ہیں، جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے، انہیں ہتھیار لے دیئے ہیں، قلعے پر حملے کے لئے سیڑھیاں اور رسے درکار تھے، یہ چیزیں بھی مہیا کر لی گئی ہیں۔ میں اپنے بھائی کے علاوہ سید جمیل شاہ، ان کے بہنوئی سید محبوب شاہ، فتح شیر خاں اور ان کے بھائی منگا خاں، محمود، قادر بخش، محمد بخش وغیرہ سے کہہ آیا ہوں کہ فلاں رات برات کے استقبال کے بہانے دریا کے کنارے فلاں مقام پر پہنچ جائیں، وہیں غازیوں کو لے آؤں گا۔ گویا تجویز یہ تھی کہ غازی باہر سے برات کی شکل میں اٹک میں داخل ہوں اور اندر پہنچ کر مسلمانانِ اٹک کی امداد سے قلعے پر قبضہ کر لیں۔

سید صاحب نے تقریباً ستر چست و چالاک غازی منتخب کئے، ارباب بہرام خاں کو ان کا امیر بنا کر اٹک بھیج دیا اور فرمایا کہ اگر خدانخواستہ ارباب کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو حاجی بہادر شاہ خاں کو اور ان کے بعد امام خاں خیر آبادی کو امیر بنایا جائے۔ پھر غازی جسے چاہیں امیر مقرر کر لیں۔ اخوند ظہور اللہ جہانگیرا کے تھے، جو اٹک سے قریب ہے، ان اطراف کے حالات سے پوری طرح واقف تھے، انہیں غازیوں کی رہبری کے لئے ساتھ کر دیا، ان سب نے دو دو وقت کی روٹیاں پکا لیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں روانہ ہو گئے اور باہر جا کر مقررہ مقام پر مل گئے۔

بھید کھل گیا

گڑھی امان زئی سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر جلسئی ہے۔ غازی جلسئی سے دو کوس پر ہوں گے کہ صبح ہو گئی۔ ادائے نماز کے بعد سب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بکھر کر اِدھر اُدھر چھپ گئے، سارا دن اسی حالت میں گزارا، عشاء کے وقت پھر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ جہانگیرا کے گھاٹ پر پہنچے تو سید جمیل شاہ، سید محبوب شاہ، فتح شیر خاں، محمود اور قادر بخش انتظار کر رہے تھے۔ عبور دریا کے لئے جالے موجود تھے، عین اس حالت میں محمد بخش شناس پر سوار ہو کر آ پہنچا اور اس نے بتایا کہ ہمارے ایک ساتھی نے راز فاش کر دیا، تیز خادے خاں کی طرف سے ایک قاصد پہنچ گیا، جس نے بتا دیا کہ سید صاحب کے غازی اٹک پر حملہ کرنے والے ہیں، قلعہ دار نے مقابلے کیلئے پوری تیاری کر لی ہے اور کئی مسلمان گرفتار ہو چکے ہیں۔ (۱)

اس اطلاع کے بعد قدم آگے بڑھانے کی کوئی صورت نہ تھی، اور ٹھہرے رہنا بے سود تھا۔ اس لئے ارباب نے غازیوں کو واپسی کا حکم دے دیا، مولوی خیر الدین اور دوسرے لوگ بھی ساتھ ہو گئے۔ (۲) پہلے کی طرح دن چھپ چھپا کر گزارا، پھر امان زئی پہنچ کر سارے حالات سید صاحب کے گوش گزار کر دیے۔

جو لوگ اٹک میں گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے بعض کو موت کی سزا دی گئی، بعض کو قید کر دیا گیا۔ ان میں سے منگا خاں نے پیر ظہور شاہ نام ایک درویش کے ذریعے سے رہائی

---

(۱) وقائع میں ہے کہ مخبر نے لالہ خزانہ مل قلعہ دار کو بتایا کہ جو لوگ برات کے استقبال کی اجازت لے کر گئے ہیں وہ سید صاحب کے غازیوں کو لائیں گے۔ خزانہ مل کو یقین نہ آیا مخبر نے کہا کہ ان کے گھروں کی تلاشی لے لیجئے، اگر وہاں سے ہتھیار، سیڑھیاں اور رسے مل جائیں تو میں سچا، ورنہ مجھے توپ دم کرا دیجئے۔ عین اس حالت میں خادے خاں کا قاصد پہنچ گیا، خزانہ مل نے تلاشی لی اور سارا سامان مل گیا۔

(۲) روایتوں میں خیر الدین کے نام کی تصریح ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے لوگ بھی ساتھ رہے ہوں گے، اگر وہ لوٹتے تو گرفتار ہو جاتے، پھر قتل کیے جاتے یا قید کی سزا پاتے۔

پائی۔ مولوی خیر الدین کے بال بچوں کو بھی بعد میں رہا کر دیا گیا اور وہ پنجتار پہنچ گئے۔

سید عبدالجبار شاہ کا بیان

واقعۂ اٹک کے متعلق سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے اپنی کتاب ''عبرۃ لاولی الابصار'' میں مستند خاندانی روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ اخوند سید امیر عرف ملاّ صاحب کوٹھا کے جد امجد طریق مجددیہ کے شیخ تھے۔ اٹک میں انگریزوں کا ایک خاندان ان کا مرید تھا، اس خاندان نے یورش اٹک کو کامیاب بنانے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا تھا، سیڑھیاں اور رسے انہیں کے ہاں رکھے گئے تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خادے خاں کو اس تجویز کا حال کہاں سے معلوم ہوا؟ سید عبدالجبار شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اخوند عبدالغفور، جو بعد میں اخوند صاحب سوات کے لقب سے مشہور ہوا (موجودہ والیٔ سوات کا پردادا)، اس زمانے میں بیکی (۱) کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ایک غار میں رہتا تھا، یہاں اس نے بارہ برس چلہ کشی میں گزار دیے تھے۔ ملا صاحب کوٹھا سے اس کا گہرا تعلق تھا، سید صاحب کے پاس بھی آتا جاتا تھا، اسے اٹک پر یورش کی تجویز کا علم ہو گیا تھا۔

زہد و ریاضت کی وجہ سے خادے خاں کو بھی اخوند عبدالغفور کے ساتھ عقیدت تھی، اخوند کو علم نہ تھا کہ خادے خاں سید صاحب سے منحرف ہو چکا ہے۔ باتوں باتوں میں اخوند نے یورش اٹک کی تجویز کا ذکر خادے خاں سے کر دیا، خان نے یہ اطلاع پاتے ہی ایک تیز سوار ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ کے پاس بھیج دیا، اس نے خزانہ مل کو حکم دے دیا کہ رنگریزوں کی گھروں کی تلاشی لی جائے۔ سامان برآمد ہو گیا، رنگریز گرفتار کر لئے گئے، بعد میں انہیں موت کی سزا ملی۔

---

(۱) ہنڈ کے قریب ایک گاؤں ہے میں اسے دیکھ نہ سکا۔

اخوند کو اپنی بے احتیاطی کے نتائج الیمہ کا علم ہوا تو اس درجہ ندامت لاحق ہوئی کہ وہ فوراً بیکی کو چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا، کئی برس کے بعد زیارت غلاماں میں اس کا سراغ ملا۔ ملا صاحب کوٹھا کے ساتھ اخوند کی عداوت بھی اسی وقت سے شروع ہوئی، انجام کار ملا صاحب پر "وہابیت" کا الزام لگایا اور انہیں بڑی مصیبتوں میں اُلجھائے رکھا۔

مسلمہ حقائق

میں اس روایت کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ:

۱۔ اٹک پر حملے کی اطلاع سکھوں کو خادے خاں نے پہنچائی تھی۔(۱)

۲۔ اخوند سوات اس زمانے میں بیکی میں مقیم تھا اور خادے خاں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔(۲)

۳۔ اسی واقعے کے بعد اخوند نے بیکی کو چھوڑا۔

ان حالات میں اغلب ہے یہ روایت درست ہو، خصوصاً اس لئے کہ خادے خاں کو اٹک پر حملے کی تجویز کا علم اخوند صاحب کے سوا اور کسی ذریعے سے ہو ہی نہ سکتا تھا۔

مجلس شوریٰ

سید صاحب امان زئی سے شیخ جانا ہوتے ہوئے پنجتار پہنچے تو چھ سات روز کے بعد مجلس شوریٰ منعقد کی، جس میں مولانا شاہ اسماعیل، سید احمد علی، ارباب بہرام خاں،

---

(۱) اے جنرل رپورٹ آن دی یوسف زئی (انگریزی) مصنفہ بلیو ص: ۷۸ مطبوعہ ۱۸۶۴ء)

(۲) اے جنرل رپورٹ آن دی یوسف زئی (انگریزی) مصنفہ بلیو ص: ۷۸ مطبوعہ ۱۸۶۴ء)

بلیو نے لکھا ہے کہ سید صاحب نے اخوند سوات کے ذریعے سے خادے خاں کو بلایا تھا، جب وہ آ گیا تو موقع پا کر اسے قتل کرا دیا۔ اس وجہ سے اخوند کو سخت ندامت ہوئی اور اسے روپوش ہونا پڑا۔ یہ بیان سراسر غلط ہے، نہ خادے خاں کو اخوند کے ذریعے سے بلایا گیا نہ بلا کر قتل کیا گیا۔ سید صاحب نے ہنڈ پر باقاعدہ یورش کی تھی جس میں خادے خاں لڑتا ہوا مارا گیا۔

مولوی محمد حسن، فتح خاں پنجتاری اور بعض دوسرے اکابر شریک تھے۔ آپ نے فرمایا:

> آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ اتنی مدت سے اس ملک میں واسطے جہاد فی سبیل اللہ آئے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی ریاست سمجھ کر یہاں اترے ہیں، فقط اس نیت سے کہ سب مسلمان بھائیوں کے اتفاق سے دین اسلام کا کام درست ہو، لیکن یہاں کے مسلمان بھائیوں کی نااتفاقی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم کوئی صورت کفار کو زیر کرنے کی نکالتے ہیں تو انہیں مسلمانوں میں سے ایک نہ ایک ان کا حامی بن کر بیچ میں حارج ہو جاتا ہے اور ان کو خبر دے دیتا ہے۔
>
> چنانچہ ایک سردار یار محمد خاں کہ اس کا فساد آپ سب جانتے ہیں شیدو کی لڑائی میں اسی نوے ہزار آدمی ہماری طرف سے جمع تھے، اس کی شرارت سے لڑائی میں شکست ہوگئی اور جمعیت مسلمانوں کی پراگندہ ہوگئی۔
>
> دوسرا ان میں سے خادے خاں ہے کہ چند مہینے سے کیسی کیسی حرکتیں بے جا کرنی شروع کی ہیں۔ چنانچہ آپ کو خود معلوم ہے کہ جو غازی ہندوستان سے واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے ارادہ کرتا ہے، سکھوں کے ملک سے تو سلامت چلا آتا ہے، لیکن اس (خادے خاں) کے ہاں سے کسی طور سلامت نہیں پہنچتا۔ کسی کو لوٹ کر دریائے اباسین میں غوطے دلاتے ہیں کسی کا مال و اسباب چھین کر بہ زور بخشواتے ہیں اور سردار اشرف خاں مرحوم پر جو انہوں نے فوج کشی کی فقط اس عداوت سے کی کہ خان مرحوم ہم سے موافق تھے، اس کے بعد یہ فساد کیا کہ دختوڑا کو چڑھا لائے، اس میں حتی المقدور انہوں نے تو درگزر نہیں کی مگر اللہ تعالی نے اپنی مدد سے اس کو دفع کیا۔
>
> اس کے بعد ایک تازہ فساد یہ کیا کہ ادھر سے اٹک پر ہمارا چھاپا چلا اور ادھر سے خادے خاں نے اپنا آدمی بھیج کر قلعدار کو خبر کر دی۔ اس طور کے اور بھی بہت سے فساد انہوں نے کیے ہیں۔ ابھی دیکھا چاہیے کہ یہ کیا کیا فساد کریں اور انہوں نے جو شرارتیں ہمارے ساتھ کی ہیں ان کی کدورت اصلاً

ہمارے دل میں نہیں ہے، جو کچھ کیا اپنے واسطے کیا، وہ جانیں ان کا خدا جانے۔ جیسا کرے گا ویسا پاوے گا، اب کوئی ایسی تدبیر کرو کہ مسلمانوں میں اتفاق ہو جائے، جسکے سبب سے کچھ اللہ تعالیٰ کا کام نکلے، دین اسلام کی ترقی ہو۔(۱)

اجتماع کا انتظام

یہ تقریر سن کر سردار فتح خاں نے عرض کیا کہ آپ ملک سمہ کے سادات وعلماء وخوانین کو بلائیں اور بطور نصیحت یہی باتیں ان سے فرمائیں، وہ سب آپ کے دست مبارک پر بیعت کر چکے ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ یہاں کے رئیس ہیں، اس لئے آپ ہماری طرف سے دعوت نامے بھیجیں۔

چنانچہ جمعہ کا دن مقرر کر کے جگہ جگہ آدمی دوڑا دیے گئے۔ 'منظورہ' کا بیان ہے کہ تین ہزار سے زیادہ آدمی جمع ہوئے۔(۲) پنجتار کی پانچوں بستیوں نے مل کر دعوت کا انتظام کیا، ضرورت کے مطابق تمام جنسیں مولانا شاہ اسمٰعیل کے پاس پہنچادی گئیں، اس لئے کہ کھانا تیار کرانے کے مہتمم وہی تھے۔

''وقائع'' میں ہے کہ دس من گوشت، آٹھ من گھی (۳) اور پندرہ سولہ من آٹا خرچ ہوا۔ سید صاحب نے حکم دے رکھا تھا کہ طلوع آفتاب سے پیشتر کھانا تیار ہو جائے تا کہ

---

(۱) وقائع ص: ۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷- میں نے اس تقریر کو بجنسہ لے لیا اس لئے کہ اس میں سید صاحب کے انداز گفتار کی زیادہ سے زیادہ جھلک نظر آتی ہے، لیکن خطاب میں "تم" کی جگہ "آپ" بنادیا ہے، کیونکہ سید صاحب کسی کو بھی "تم" سے خطاب کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ اپنے مریدوں اور نیازمندوں کو بھی ہمیشہ بھائی کہہ کر پکارتے تھے، شیخ بھائی، سید بھائی، خان بھائی۔ صرف مولانا شاہ اسمٰعیل کو "میاں صاحب" کہتے تھے کہ یہ ان کا خاندانی لقب تھا۔

(۲) ''وقائع'' میں ہے دس گیارہ سو۔ سامان دعوت کی مقدار کے پیش نظر "منظورہ" کا بیان زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

(۳) دس من گوشت کے ساتھ آٹھ من گھی پر تعجب نہیں ہونا چاہئے، سرحد میں پرتکلف تواضع کا طریقہ اب بھی یہی ہے کہ مہمان کے پیالوں یا رکابیوں میں شوربا ڈال چکنے کے بعد گھی لوٹوں میں بھر بھر کر ڈالتے ہیں، اس طرح گوشت پکانے کے علاوہ بھی گھی خاصی مقدار میں خرچ ہوتا ہے۔

مہمان پنجتار پہنچتے ہی کھانا کھا کر اصل کام کے لئے فارغ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام وعظ و تذکیر کے علاوہ سید صاحب کی ایک خاص غرض یہ بھی تھی کہ خادے خاں کو پھر ایک مرتبہ سمجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، اور اگر یہ تفہیم بھی بے سود رہے تو علماء سے فتویٰ حاصل کیا جائے کہ ایسے شخص کے متعلق شرعی حکم کیا ہے۔

شیشم کے درختوں کے نیچے نماز جمعہ ادا کی گئی، قاضی احمد اللہ میرٹھی نے خطبہ پڑھا، نماز کے بعد سید صاحب خطبے کیلئے اٹھے، قابل اخوندزادہ کو برابر کھڑا کر لیا، وہ ہندوستانی، پشتو، فارسی وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں ہندوستانی میں تقریر کروں گا، جس بھائی کو کسی بات کے سمجھنے میں دقت محسوس ہو وہ قابل اخوندزادہ سے دریافت کر لے۔

سید صاحب کا خطبہ

حمد وثناء کے بعد آپ نے فرمایا:

> آپ سب بھائی جانتے ہیں کہ دنیا میں لوگ اپنی معاش اور میراث کے حاصل کرنے میں کیسی کیسی کوشش اور جانفشانی کرتے ہیں اور طرح طرح کی محنت اور تکلیف اٹھاتے ہیں، بلکہ اس رنج کو راحت جان کر ہرگز نہیں گھبراتے۔ فقط اس خیال سے کہ اگر وہ معاش و میراث ہاتھ لگے تو چین سے کھاویں اور یہ امر موہوم ہے، اگر یہ موافق خواہش کے حاصل ہوا فبہا والا کچھ نہیں۔
>
> واسطے حاصل کرنے دولت دین کے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، جسکے باعث فلاح دنیا اور آخرت کی، ترقی اسلام اور رضامندی رب انام کی حاصل ہوتی ہے، اور یہ امر ہر حال میں مقدم ہونا چاہئے، سو اس سے لوگ غافل ہیں۔
>
> مجھ کو جناب باری نے ارشاد ہوا کہ دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دار الامان میں جا اور کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کر۔ سو میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے جاؤں اور تدبیر جہاد

کروں، باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں ملک ہند واقع ہے، کوئی جگہ لائق ہجرت کے میرے خیال میں نہ آئی۔

کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں (یعنی ہندوستان میں) جہاد کرو، جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے، مجھ کو منظور نہ ہوا، اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہئے، بلوا کرنا منظور نہیں تھا۔

آپ کے اس ملک کے ولایتی بھائی بھی وہاں حاضر تھے، انہوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس امر کے واسطے بہت خوب ہے، اگر آپ وہاں چل کر کسی جگہ قیام پکڑیں تو لاکھوں مسلمان وہاں کے جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے، ہتک حرمت اہل اسلام کی کرتا ہے۔ جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتی تباہ کرتے ہیں، مال و اسباب لوٹتے ہیں بلکہ عورتوں، بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں بیچ ڈالتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں تو وہ...... مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے اور مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں اور گاؤ کشی کا تو کیا ذکر، جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی، اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ سچ ہے، بہتر یہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں۔

علماء سے بالخصوص مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا:

آپ لوگوں نے ہمیں جگہ دی، ہمارے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی، آپ کے مشورے کے مطابق اس مقام سے جہاد شروع ہوا، اب آپ مسائل جمیلہ سے دست کش ہو رہے ہیں، حالانکہ آپ کو وارث الانبیاء کہا گیا ہے، اس کا سبب کیا ہے؟

سید صاحب نے اس سلسلے میں کئی مثالیں بھی دیں، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، دل میں حمیت اسلام کا دریا موجزن تھا۔ لوگ بھی یہ پُر تاثیر تقریر سن کر رونے لگے، اس کے بعد دعا فرمائی اور کہا کہ اب مولانا اسماعیل جو کچھ فرمائیں اسے بھی سن لیجئے۔ اگر کسی کے دل میں شک ہو تو اسے صاف کرلیا جائے۔

مولانا شاہ اسماعیل کی تقریر

پھر آپ مجلس سے اُٹھ کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور مولانا شاہ اسماعیل نے تقریر شروع کی۔ اس کا عنوان تھا: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" الخ آپ نے اس آیت کریمہ کی مفصل تفسیر فرمائی، پھر علماء سے پوچھا کہ آیا اس کی رو سے امام کی اطاعت ضروری نہیں؟ سب نے کہا کہ ضروری ہے۔ مولانا نے پھر سوال کیا کہ عاصی کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ سب نے جواب دیا کہ وہ باغی ہے، پھر مولانا نے بغاوت کے سلسلے میں شرعی احکام کے متعلق استفتاء پیش کیا، سب نے فتویٰ دیا کہ باغیوں کی سزا قتل ہے اور فتوے پر مہریں ثبت کردیں۔

بعد ازاں مولانا نے علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> سارا قصور آپ کا ہے، اس ملک کے تمام خوانین آپ کے تابع فرمان ہیں، لیکن آپ لوگ اظہار حق میں مداہنت سے کام لیتے رہے ہیں، ورنہ یہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔

پھر آپ نے دردِ دل سے دعاء کی، سب لوگ اس میں شریک رہے، لیکن خادے خاں مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے فتوے کی روشنی میں اسے اپنے اعمال کی بدوضعی اور مشئومیت کا پورا احساس ہوگیا تھا، اس وجہ سے وہ حد درجہ مشوش و پریشان تھا۔ ممکن ہے اس نے سمجھ لیا ہو کہ فتویٰ صرف اسی کے لئے تیار ہوا ہے، لیکن ضد اور ہٹ اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور متنبہ ہونے کے بجائے وہ اپنی روش میں اور بھی

متصلب ہوگیا۔

عصر کی نماز سید صاحب ہی نے پڑھائی۔ اس کے بعد اکثر مہمان رخصت ہوگئے، جو شب بھر کے لئے ٹھہر گئے یا ٹھہرا لئے گئے، ان میں خادے خاں بھی تھا۔

خادے خاں سے بات چیت

رات کے وقت سید صاحب نے خادے خاں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

> خان بھائی! آپ ہی نے ہم کو اس ملک میں ٹھہرایا تھا اور آپ ہی ہمارے انصار بھی سب سے پہلے بنے تھے۔ آج اس مجلس علماء کی مشورت سے منحرف ہو کر اٹھ گئے، یہ بات آپ کی دانشمندی سے نہایت بعید تھی۔ آپ کو لازم تھا کہ اگر کوئی اور منحرف ہو کر اٹھتا تو اس کو سمجھاتے، نہ کہ خود سبقت کرتے۔ آپ کو لائق ہے کہ جس بات پر علماء نے اتفاق کیا ہے، اس کی مخالفت نہ کریں، اسی میں دین و دنیا کی بہتری ہوتی ہے، اور اس کے خلاف میں دنیا و عقبیٰ دونوں کی خرابی ہے۔ ہم آپ کی خیر خواہی کی راہ سے کہتے ہیں، ماننا نہ ماننا آپ کا اختیار ہے۔

خادے خاں نے جواب میں کہا:

> حضرت ہم پختون (پٹھان) لوگ کاروبار ریاست کا رکھتے ہیں اور یہ مشورہ ملاؤں نے مل کر کیا ہے، یہ لوگ ہمارے یہاں اسقاط اور خیرات کے کھانے والوں میں ہیں، کاروبارِ ریاست میں ان کو کیا شعور؟ ان کا جو مشورہ ہمارے ذہن میں آتا ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتا اسے نہیں مانتے۔ ان کی صلاح اور مشورت کی ہمیں کچھ پروا نہیں، خود ہماری قوم اور جمعیت بہت ہے، کسی طور ہم پر ان کا دباؤ نہیں، یہ ہمارے تابع ہیں، ہم ان کے تابع نہیں ہیں۔

سید صاحب کا خاصہ تھا کہ اگر کسی دوست اور عزیز کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل جاتی جس کا اثر خدا اور رسولؐ کے احکام و اوامر کی حرمت پر پڑتا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ خادے خاں کا جواب سنتے ہی چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا، لیکن آپ نے تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

> علماء وارث الانبیاء ہیں، ان کی شان میں ایسا کلام کمال نادانی ہے۔ یہ لوگ دین اور سنت سید المرسلینؐ سے واقف ہیں، کتاب و سنت کے مطابق جو کچھ کہیں مسلمان کو اس سے مجال انکار نہیں۔

خادے خاں: ہم لوگ پختون بے علم ہیں، ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔

سید صاحب: ہم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا، اب اخیر میں ایک بات سن لیں، آپ نے حد شریعت سے قدم باہر نکالا، صرف اس خیال سے کہ آپ ملک کے خان ہیں، قوم و جمعیت کے مالک ہیں، کوئی کیا کر سکے گا؟ یہ محض گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا قادر ہے، اس نے کروڑوں پیدا کئے اور کروڑوں کو نابود کر ڈالا، کیا معلوم کہ کسی صبح آپ کی آنکھ کھلے تو انتظام کی باگ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔

نماز عشا کے بعد وہ اپنی قیام گاہ پر چلا گیا، صبح کے وقت رخصت ہو رہا تھا تو سید صاحب نے پھر فرمایا: ہم نے اتنا سمجھایا، مگر آپ کے خیال میں نہ آیا۔ اب ہم ناچار ہیں، آپ جائیں۔

وہ چپ چاپ رخصت ہو گیا، سید صاحب بڑا افسوس کرتے رہے کہ ایسا ہوشیار اور دانا شخص جو سب سے پہلے ہماری نصرت کے لئے کھڑا ہو کر انصار سابقین میں شامل ہوا، اسی نے سب سے پہلے بغاوت کا علم بلند کیا۔ (۱)

---

(۱) میں نے یہ تقریریں اور سوال و جواب زیادہ تر "وقائع" سے لئے ہیں، لیکن ان میں بعض ٹکڑے "منظورہ" سے بھی لے کر شامل کر دیے ہیں، جو وقائع میں نہیں تھے۔

گیارہواں باب:

جنگ پنجتار

دنتورا کی دوبارہ آمد

سید صاحب سے لڑے بغیر دنتورا کی سراسیمگی اور مراجعت نے اسکی شہرت کا دامن داغدار کر دیا تھا۔ دربار لاہور میں اس پر ناراضی کا اظہار ہوا۔ بعض لوگوں نے بے تکلف یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ خلیفہ صاحب (۱) کے ساتھ مل گیا ہے، لہٰذا پھر پنجتار پر پیش قدمی ضروری ہو گئی۔ (۲) خادے خاں بہ دستور اس کا معاون و رفیق تھا، اس کی آرزو یہ تھی کہ مقرب خاں زیدہ کا رئیس مان لیا جائے اور ہانیری پر اس کے حلیفوں کا قبضہ ہو جائے۔

ایک روز مقرب خاں نے اپنے خاص آدمی کے ذریعے سے سید صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ چند روز کیلئے پنجتار چھوڑ کر چنگئی چلے جائیں، دنتورا واپس چلا جائے گا تو آ جائیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں، ہم خدا کی رضا کیلئے بہ غرض جہاد نکلے ہیں دشمن کے مقابلے میں بھٹنا ہمارے لئے حد درجہ مکروہ ہے، البتہ اگر فتح خاں کو مضرت کا

---

(۱) سکھ سید صاحب کو خلیفہ صاحب ہی کہتے تھے۔

(۲) اس مقام پر روایتوں میں بڑی پیچیدگی ہے۔ "وقائع" میں ہے کہ جنگ پنجتار کے بعد رمضان کا چاند ہوا، سال درج نہیں۔ اگر اسے رمضان ۱۲۴۴ھ سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ۱۵/ شعبان ۱۲۴۴ھ کو بیعت اقامت شریعت کے بڑے اجتماع کے بعد چند روز میں اٹک کا واقعہ پیش آیا، امان زئی کا دورہ بھی ہوا، پنجتار پر پہلی مرتبہ پیش قدمی کے بعد دنتورا لوٹا اور دوبارہ بھی آ گیا۔ رمضان ۱۲۴۵ھ ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ اس زمانے میں سید صاحب سمہ کی طرف تھے۔ "منظورہ" میں ہے کہ جنگ پنجتار اواخر ذی قعدہ میں ہوئی، سال اس میں بھی درج نہیں۔ میرے نزدیک "منظورہ" کا بیان درست ہے، یہ جنگ اواخر ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ (اوائل جون ۱۸۲۹ء) میں ہوئی، گویا دنتورا پہلی پیش قدمی سے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد دوبارہ اس حصے میں پہنچ گیا۔

اندیشہ ہو تو ہم اس مکروہ کو بھی گوارا کرلیں گے۔ آخری فیصلے کا حقدار وہی ہے۔ اس لئے کہ ہم اس کی جگہ میں بیٹھے ہیں اور اس جگہ میں اس کی رائے کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھیں گے۔ فتح خاں نے یہ سنا تو فرمایا کہ میں خلوصِ نیت سے سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرچکا ہوں، اب کسی مخالف طاقت سے نہیں ڈرتا۔(۱)

دفاعی انتظامات

سید صاحب فتح خاں کے جواب پر بہت خوش ہوئے اور پوری سرگرمی سے حفظ و دفاع کے انتظامات میں مصروف ہوگئے۔ سب سے پہلے فتح خاں سے فرمایا کہ سرحد آزاد کے تمام علماء و خوانین کو خط لکھئے۔ ان کا مضمون یہ تھا کہ پنجتار، ہملہ و بونیر کا دروازہ ہے، یہ دشمن کے قبضے میں چلا جائے گا تو ہملہ و بونیر محفوظ نہ رہ سکیں گے، آؤ اور ہمارے ساتھ ہو کر دشمن کو درۂ پنجتار میں روکو۔ ان خطوط کا اثر بہت اچھا ہوا، مختلف حصوں سے جنگی دستے پنجتار پہنچنے لگے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، پنجتار پہنچنے کے دو راستے تھے، اول درے کا راستہ، دوم وہ پگڈنڈی جو تو تالی سے سیدھی آتی تھی اور پنجتار کے سامنے درے میں داخل ہوتی تھی، جہاں غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے تھے۔ بڑا لشکر اور بھاری ساز و سامان صرف پہلے راستے سے لایا جاسکتا تھا، پگڈنڈی سے چھوٹے چھوٹے دستے پیدل آسکتے تھے۔ سید صاحب نے دونوں کی حفاظت کے لئے دیواریں تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا، ان کے دو فائدے تھے، ایک یہ کہ دشمن دیواروں کو توڑے بغیر اندر نہیں آسکتا تھا۔ دوسرے ان دیواروں کی اوٹ میں بیٹھ کر غازی اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔

---

(۱) "منظورہ" میں ہے: من مال و جانِ خود را و خان و مان خود را فی سبیل اللہ باختیار امیر المومنین دادہ ام ...... بارہا ہمراہ مجاہدین با کفار منازعت و جنگ کردم .... حالانکہ حق جل و علا بدست حضرت قائم گردانید و باب جہاد بر اہل شرع رب العباد مفتوح گردید، صد حیف کہ دریں وقت از جنگ کفار پہلو تہی کنم۔ بسم اللہ، حضور مستعد مقابلہ و مقاتلہ شوند۔

دونوں دیواروں کی جگہیں خود سید صاحب نے موقعے اور ماحول کی مناسبت کے مطابق تجویز کیں۔

دو دیواریں

پہلی دیوار علی کلئی کے سامنے بنوائی، یہ قدِ آدم اونچی اور چار ہاتھ (یعنی چھ فٹ) چوڑی تھی۔ یہ دیوار دائیں اور بائیں جانب کے پہاڑوں سے ملادی گئی تھی، اور راستہ بالکل روک دیا تھا۔(۱) یہ پوری دیوار فتح خاں کے ہم قوموں نے بنائی تھی، سید صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آپ نے اس میں غازیوں کی چار جماعتوں کے لئے چار چوکیاں مقرر کردیں: دو چوکیاں قندھاریوں کے لئے تھیں اور دو ہندوستانیوں کے لئے۔ چار چور پہرے لگائے: دو دائیں جانب کے پہاڑ پر اور دو بائیں جانب کے پہاڑ پر۔ ان لوگوں کو حکم تھا کہ جب دشمن کی آمد کا یقین ہو جائے تو نیچے کے غازیوں کو خبردار کرنے کے لئے بندوقیں سر کرکے ان سے آملنا۔ فتح خاں کے سواروں کو اس حصے میں شب گردی کے لئے مامور فرمایا۔

دوسری دیوار پنجتار کے سامنے اس جگہ کے قریب بنائی گئی جہاں غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ اولاً پگڈنڈی سے آنے والوں کیلئے روک تھی، ثانیاً درے کے اندر دوسرے زبردست مورچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ پوری دیوار ہندوستانی غازیوں نے بنائی، اس کا طول چالیس پچاس گز (سوا سو ڈیڑھ سو فٹ) ہوگا، سید صاحب نے اس دیوار کے مختلف حصے غازیوں کی مختلف جماعتوں میں بانٹ دیے اور خود بھی ان کے ساتھ کارِ تعمیر میں برابر شریک رہے۔

---

(۱) میرے دل میں یہ شبہ تھا کہ نالے میں دیوار کیوں کر بنی ہوگی؟ سید عبدالجبار شاہ مرحوم نے بتایا کہ گرمیوں میں نالے کا پانی بعض حصوں میں بالکل خشک ہوجاتا ہے۔ اگر تھوڑا سا پانی بہتا بھی ہوگا تو اس کے گذرنے کے لئے دیوار میں چھوٹی چھوٹی موریاں چھوڑ دی ہوں گی۔

دشمن کی آمد

دیواریں بن چکنے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن شب گرد سواروں نے نماز فجر کے وقت اطلاع دی کہ دشمن کا لشکر درے کے سامنے پہنچ گیا ہے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی سید صاحب نے غازیوں کو کمر بندی کا حکم دے دیا اور پنجتار کے سامنے والی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ دن کا اُجالا ہوا تو صوابی اور مانیری کی طرف سے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے، معلوم ہوا کہ سکھوں نے عادت و معمول کے مطابق دیہات سے گذرتے وقت مختلف مکانوں کو آگ لگادی۔ موضع سلیم خاں درے کے دہانے پر تھا، وہ بھی آتش زنی سے محفوظ نہ رہا۔

سید صاحب نے میرزا احمد بیگ پنجابی کو ایک سو غازیوں کے ساتھ ٹلی ٹلکی والی دیوار کی طرف یہ حکم دے کر بھیج دیا کہ چاروں چور پہروں کے آدمیوں کو واپس کر دیجئے، سکھ درے کے اندر آجائیں تو دائیں جانب پہاڑ پر چڑھ جایئے اور مقابلہ نہ کیجئے۔ جب ان کا پورا لشکر آگے بڑھ کر غازیوں کے ساتھ پیکار میں مصروف ہو جائے تو عقب سے ان پر حملہ کیجئے۔ فتح خاں نے بھی اپنے چالیس پچاس آدمی میرزا احمد بیگ کے ساتھ کر دیے، باقی آدمیوں کو سید صاحب کے حکم کے مطابق بائیں جانب کے پہاڑ پر بھیج دیا۔ پھر دونوں دیواروں کے درمیان دونوں جانب کے پہاڑوں پر جابجا چملہ و بونیر کے آدمیوں کو بٹھا دیا، صرف غازیوں کو میدان میں سکھ لشکر کے مقابلے کیلئے رکھا، پہاڑوں پر بیٹھنے والے تمام مجاہدوں کو حکم تھا کہ سکھوں کی پیش قدمی کے وقت مزاحمت نہ کریں، جب غازیوں سے ان کی جنگ شروع ہو جائے تو ہر طرف سے ان پر ہلّہ بول دیں۔

موت کی بیعت

سید صاحب اس دیوار کے پاس بیٹھے تھے جو غازیوں کی نماز گاہ کے قریب تھی،

غازیوں کے علاوہ علماء و سادات و خوانین میں سے جو لوگ آئے تھے، وہ بھی آپ کے پاس تھے۔ کل اصحاب نو سو کے قریب ہوں گے۔ دشمن کی جمعیت دس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی تھی، اس کے پاس ساز و سامان کی بھی فراوانی تھی، اس بنا پر مقابلے میں انتہائی ہمت و استقامت درکار تھی۔ مولانا شاہ اسماعیل نے موقعے اور محل کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ سب غازی سید صاحب کے دست مبارک پر موت کی بیعت کریں۔ چنانچہ مولانا نے پہلے بیعتِ رضوان کی آیت پڑھی، پھر اس بیعت کے فضائل نہایت مؤثر و دل نشیں انداز میں بیان فرمائے۔ آخر میں کہا:

> اس وقت سب صاحب جو حاضر ہیں، حضرت امیر المومنین کے دست مبارک پر اس نیت خالصہ سے بیعت کریں کہ انشاء اللہ زندہ جان آج ہم مقابلۂ کفار سے نہ ہٹیں گے۔ یا ان کو مار کر فتح پائیں گے، یا اسی میدان میں شہید ہو جائیں گے۔ اس میں جو صاحب بہ مشیت ایزدی شہید ہوں گے، شہادت کبریٰ کا درجہ پائیں گے، اور جو زندہ بچیں گے وہ اعلیٰ مراتب کے غازی ہوں گے۔ (۱)

سب سے پہلے مولانا نے بیعت کی، پھر وہ غازی اس سے مشرف ہوئے جو سید صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ سب غازی آپ تک پہنچ نہیں سکتے تھے، اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جن غازیوں نے سید صاحب کے دستِ مبارک میں ہاتھ دے رکھے تھے، متصل غازیوں نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ لیے، اسی طرح آخر تک یہ سلسلہ قائم

---

(۱) یہ "وقائع" کی روایت ہے۔ "منظورہ" میں ہے کہ بیعت موت جنگ سے دو روز پیشتر ظہر کی نماز کے بعد یا عصر کے وقت لی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اس کا موزوں ترین وقت وہی تھا جب کہ دشمن سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ مولانا کی تقریر میں "آج" کے لفظ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔

جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں، یہ تحریک مولانا نے پیش کی تھی۔ سید صاحب کے منشیوں کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل تحریک سید صاحب نے فرمائی تھی۔ دونوں روایتوں میں توافق یوں ہو سکتا ہے کہ تجویز سید صاحب کی ہوگی اور اسے پیش مولانا شاہ اسماعیل نے کیا۔

کر کے بیعت کی گئی۔

بیعت کے بعد سید صاحب نے ننگے سر ہو کر بہ عجز و الحاح دعا کی:

> الٰہی! ہم تیرے بندے عاجز و ناچار صرف تیری مدد کے امیدوار ہیں، ہم پر ان کافروں کو نہ لا اور ہم کو ان کے شر سے بچا۔ اگر تیری مشیت ازلی میں لانا ہی منظور ہے تو ہم عاجزوں اور ضعیفوں کو صبر اور استقامت عطا کر، ان کے مقابلے میں ثابت قدم رکھ اور ان پر فتح یاب کر۔

شانِ للّٰہیت

راوی کہتا ہے کہ اس دعاء کی تاثیر و برکت سے سب پر اور ہی عالم طاری ہو گیا۔ ہر ایک اپنی ہستی سے گذر چکا تھا، تمام بھائی کمال تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے کے گلے مل مل کر خطائیں معاف کروانے لگے۔ دنیوی علائق کا ہر نقش ان کے صفحاتِ قلوب سے محو ہو چکا تھا۔

ایک دوسرے کو وصیت کرتے تھے، تو یہ نہیں کہ ہمارے بال بچوں کا خیال رکھنا یا اقربا کو سلام پہنچانا یا ہماری جائیدادوں کو سنبھالنا اور یادگاریں قائم کرنا۔ حاشا! ثم حاشا!! وہ قدوسی رضائے باری تعالیٰ میں اس طرح گم ہو چکے تھے کہ عالم ناسوت کے ساتھ گویا ان کا رشتہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔ سب کی زبانوں پر صرف ایک توصیہ اور ایک پیام تھا اور وہ یہ کہ بھائیو! ہم شہید ہو جائیں یا زخموں سے چور ہو کر گر پڑیں، ہمیں اٹھانے یا سنبھالنے سے بے پروا ہو کر فرصت و مہلت کے ہر لمحے کو صرف آگے بڑھنے، لڑائی جیتنے اور دشمن کو مار بھگانے کے لئے وقف رکھنا۔

اللہ اللہ للّٰہیت کے یہ گہرہائے شب چراغ تھے، جنہیں سید صاحب آج سے صرف سوا سو برس پیشتر ظلمت زارِ ہند سے نکال کر سرحد لے گئے تھے کہ شاید ان کی جلا سے یہ سرزمین از سرِ نو منور ہو جائے۔

سید صاحب کا مقام

یہاں مسلمان ہزار برس تک اس شان و شکوہ اور اس جاہ و جلال سے فرمانروا رہے کہ اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں شاذ ہی مل سکیں گی۔ اس بوقلموں مرقعے میں رنگ بہ رنگ تصویریں نظر آتی ہیں، بالکل ابتدائی ورق کھولئے تو سترہ برس کا ایک عرب نوجوان سامنے آتا ہے، جس نے پانچ سات ہزار غازیوں کے ساتھ بڑے بڑے لشکروں کو شکست دے کر سندھ اور ملتان پر اسلامیت کا گہرا نقش جمایا۔ یہ محمد بن قاسم ثقفی تھا۔ اس کے بعد غزنوی کی ترکتازیوں، غوری کی سلطنت آرائیوں اور خلجی کی کشور کشائیوں کے ہنگامے یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں اور ہر نقش و اثر کی دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ:

کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جاست!

پھر مختلف رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، کوئی تلوار کا دھنی ہے اور اسی کے بل پر سلطنتیں پیدا کر لیتا ہے۔ کسی کو خدمتِ خلق سے دلچسپی ہے اور وہ اپنے اوقاتِ گراں مایہ کا بیشتر حصہ، آبادی و عمران ہی کے وسائل فراہم کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ آخر میں فرغانہ کا ایک مجاہد نظر آتا ہے، جسے اقربا و اعدا نے وطن میں ٹھہرے رہنے کی مہلت نہ دی، وہ کابل پہنچتا ہے، پھر ہندوستان آ کر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھ دیتا ہے، جس کی عظمت و ہیبت کے جلوے سرگزشتِ عالم میں یگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ظہیر الدین بابر تھا، جس کے جانشینوں نے ہندوستان کو شہرت و عزت کے اس مقامِ بلند پر پہنچا دیا جو اسے نہ پہلے کبھی نصیب ہوا تھا اور نہ غالباً دوبارہ نصیب ہو گا۔

ان میں سے کون سی تصویر ہے جس کی دلکشی اور نظر افروزی پر سینے میں فخر و مباہات کا دریا جوشاں نہیں ہوتا؟ لیکن کیا آپ کو اس پورے مرقعے میں کوئی ایسا خاکہ بھی ملتا ہے، جو سید احمد شہید کے مجاہدوں نے جنگ پنجتار کے روز بیعتِ موت سے پیش کیا؟ بلاشبہ سید

صاحب کے مرقعے میں تاج محل، لال قلعہ، تخت طاؤس اور کوہ نور یا دریائے نور کی تلاش بے سود ہوگی، ایسے بڑے بڑے لشکر بھی نظر نہیں آئیں گے، جن کے علم اٹھتے تھے تو فضا اپنی ساری پہنائیوں کے باوجود تنگ نظر آتی تھی، رزم و پیکار کے ایسے طوفان بھی نہیں ملیں گے، جن میں سلطنتوں کے شیرازے بکھر بکھر کر جمے، تاج وتخت ریزہ ریزہ اور پاش پاش ہوکر نئے سرے سے استوار ہوئے، لیکن اس خاکے میں وہ سرمدی دولت بدرجۂ کمال موجود ہے جس سے پہلے خاکے بڑی حد تک خالی نظر آتے ہیں۔ وہ ہے للّٰہیت کی دولت، وہ ہے رضائے باری تعالیٰ کی دولت، وہ ہے جذبۂ سربلندیٔ اسلام کی دولت۔

ایسے سلاطین کی کمی نہیں جنہوں نے اپنوں اور دوسروں کے خون سے صرف اس لئے ہولی کھیلی کہ روئے زمین کے بڑے حصے پر اپنی حکمرانی کے تخت بچھالیں، لیکن اپنے خونِ حیات کے ہر قطرے کو صرف اسلام کی راہ میں بہادینے کی قدوسیت ہر جگہ نہیں مل سکتی اور معاوضے میں نہ تاج وتخت کی آرزو ہے، نہ حکومت وسلطنت کی۔ نہ شہرت کا خیال ہے، نہ شجاعت وجوانمردی کے لئے تحسین کی طلب ہے۔ نہ یہ ہوس ہے کہ کوئی یادگار قائم ہو یا ایسا عالی شان مقبرہ بنے، جس کی زیارت کے لئے دنیا کے ہر حصے سے لوگ شدرحال کر کے آئیں۔ اول و آخر ایک ہی طلب اور ایک ہی آرزو ہے اور وہ یہ کہ کلمۂ حق سربلند ہو، دنیا کا ہر گوشہ اسلام کے پیغام کا عملی مرقع بن جائے۔ جو آنکھیں اسلامیت کو عالمگیر لشکروں، عدیم المثال تخت گاہوں اور جاہ وجلال کے ہیبت انگیز سامانوں میں دیکھنے کی عادی ہوچکی ہیں، انہیں درویشوں اور مسکینوں کے داعیۂ اسلامیت کا صحیح اندازہ خدا جانے کب ہوگا۔

جنگی پوشاک

بیعت موت کے بعد سید صاحب نے اسی مقام پر جنگی پوشاک پہنی اور ہتھیار

لگائے، ان کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سپید پاجامہ۔
۲۔ سرمئی ارخالق، جس میں سرخ تافتے کی سنجاف لگی ہوئی تھی۔
۳۔ آبی پٹکا۔
۴۔ کانگریزی دستار۔
۵۔ سازاور سینگڑا کیمختی کا۔
۶۔ انگریزی پستولوں کی جوڑی جن میں سابری تسمے لگے ہوئے تھے۔
۷۔ ولایتی فولاد کی ایک چھری جو شیخ غلام علی الہ آبادی نے نذر کی تھی، اس کا تسمہ بھی سابری تھا۔
۸۔ ایک تلوار جس میں الٹی کٹوری کا سنہرا قبضہ لگا ہوا تھا، اس کا پرتلہ کا کنز کا تھا، یہ ارباب بہرام خاں کی نذر تھی۔
۹۔ بڑے تیر کی رائفل جو دیوان عنایت اللہ (ساکن موضع سالار ضلع مرشد آباد) نے شیخ باقر علی کے ہاتھ تکیہ شریف (رائے بریلی) بطور نذر بھیجی تھی۔

نشان

لشکر میں تین نشان تھے:

۱۔ صبغۃ اللہ: یہ جماعت خاص کا نشان تھا اور دادا ابوالحسن کے پاس رہتا تھا، جو جماعت خاص کے علمدار تھے۔ اس پر پارہ الٓمّٓ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔ یہ نشان صرف اس لڑائی میں جاتا تھا جس میں سید صاحب بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے۔

۲۔ مطیع اللہ: یہ ابراہیم خاں خیر آبادی کے پاس تھا، اس پر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔

۳۔ **فتح اللہ:** اس پر سورۂ صف کی یہ آیتیں سرخ ریشم سے کڑھی ہوئی تھیں: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ" الخ۔ یہ نشان پہلے محمد بن عرب کے پاس تھا، پھر فرج اللہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

تینوں نشان اس وقت لشکر میں موجود تھے۔ سید صاحب غازیوں کو لے کر دیوار کے پاس گئے، جماعتوں کو جا بجا ٹھہرا دیا نیز تاکید فرما دی کہ جب تک ہم بندوق نہ چلائیں کوئی بھائی نہ بندوق چلائے۔ نہ دیوار پھاند کر آگے بڑھے، پھر صفوں کے آگے چہل قدمی کرتے ہوئے فرماتے جاتے تھے کہ جس بھائی کو سورۂ قریش یاد ہو، گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کر لے، جسے یاد نہ ہو دوسرا بھائی پڑھ کر اس پر دم کر دے۔ اس سے فارغ ہو کر اپنی رائفل دیوار سے لگا دی اور متوجہ الی اللہ ہو گئے۔

دنتورا کی نقل و حرکت

دنتورا سلیم خاں سے آگے بڑھ کر توتالی کے برابر پہنچا۔ وہیں اس نے کھانا کھایا پھر توتالی کے ٹیلے پر چڑھ کر دوربین سے پنجتار اور آس پاس کے مقامات کو بہ غور دیکھا۔ اگرچہ غازی سرحدی مجاہدوں سمیت اڑھائی تین ہزار سے زیادہ نہ تھے۔(۱) لیکن انہیں پہاڑوں پر اس ترتیب سے بٹھا دیا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا درے کے دونوں جانب کے ٹیلے غازیوں سے بھرے پڑے ہیں، اس پر دنتورا شش و پنج میں پڑ گیا، اس اثناء میں خادے خاں نے توتالی کے بعض مکانوں کو آگ لگوا دی۔

پھر دنتورا نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا، چنانچہ ابتدائی دستے پہلی دفاعی دیوار کے پاس پہنچ کر اسے ڈھانے لگے۔ سید صاحب نے سواروں کو پیش قدمی کا حکم دیا اور میرزا حسین بیگ سے فرمایا کہ شاہینوں سے دشمن پر گولے پھینکے جائیں، جو غازی دائیں

---

(۱) ایک روایت کے مطابق پانچ ہزار۔

بائیں جانب کے پہاڑوں پر بیٹھے تھے، وہ عین اس موقع پر نیچے اترنے لگے تاکہ ایسے مقامات پر پہنچ جائیں جہاں سے دشمن پر موثر حملہ ہو سکے۔ اس حالت میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ پہاڑوں کا ایک ایک پتھر حرکت میں آ گیا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر دنتورا کو یقین ہو گیا کہ درے کے اندر جا کر لڑنے سے فوج کو سخت نقصان پہنچے گا، ساتھ ہی اس نے فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، غازیوں نے درے کے دہانے تک دشمن کا تعاقب کیا۔

ایک روایت ہے کہ خادے خاں نے دنتورا کو یقین دلا رکھا تھا کہ پنجتار میں غازیوں کی تعداد بہت معمولی ہے، دنتورا کو جب پہاڑوں پر آدمی ہی آدمی نظر آئے تو خادے خاں پر خفا ہوا۔

ادائے شکر

سید صاحب کو دنتورا کی واپسی کی خبر ملی تو نالے ہی پر دوگانہ شکر ادا کیا، پھر پنجتار تشریف لے گئے۔ جب خبر مل گئی کہ دنتورا دریائے سندھ سے گذر کر پنجاب پہنچ گیا ہے تو چملہ اور بونیر سے جو لوگ امداد کے لئے بلائے تھے، فتح خاں نے انہیں رخصت کر دیا۔

اس لڑائی میں غازیوں کے خراش تک نہ آئی، سکھوں کے دو آدمی مارے گئے، خادے خاں نے مانیری پر قبضہ کر لیا تھا، جب دنتورا واپس چلا گیا تو مانیری کے باشندوں نے خادے خاں کے آدمیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔

بارہواں باب:

تنگی پر شبخون

خادے خاں کی اصلاح کیلئے ایک اور کوشش

خادے خاں کی روش حد درجہ یاس انگیز ہو چکی تھی، لیکن سید صاحب کو اس کی مخالفت میں قدم اٹھاتے ہوئے بار بار تامل ہوتا تھا، حقیقی مصلح کی حیثیت میں آپ چاہتے تھے کہ خان انحراف کا راستہ ترک کر کے کاروبارِ دین میں معاون بن جائے یا کم از کم مخالف نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے ایک معتبر قاصد ہنڈ بھیج کر اسے پنجتار بلایا۔ اس نے جواب دیا کہ میں پنجتار نہیں آسکتا، سلیم خاں میں مل سکتا ہوں۔ سید صاحب اس کیلئے بھی تیار ہو گئے اور تین سو غازیوں کو لے کر سلیم خاں پہنچ گئے۔ خادے خاں چوتھے پانچویں دن ساٹھ سوار اور چار سو پیادے لے آیا۔ ملاقات کی جگہ مقرر ہو گئی، سید صاحب جانے لگے تو دوسرے اصحاب کے علاوہ مولانا شاہ اسماعیل نے اختلاف کیا اور خود جانے کی اجازت مانگی۔

چنانچہ مولانا ایک سو غازیوں کو لے کر مقامِ ملاقات کی طرف روانہ ہوئے، تورو کے مولوی عبدالرحمٰن، اخوندزادہ قابل اور ڈاگئی کے ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے۔ تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو آپ نے تینوں ساتھیوں کو خادے خاں کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ تین چار آدمی لے کر مولانا آجائیں، اب غازی مولانا کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، انہوں نے کہا کہ خادے خاں دغاباز آدمی ہے، ہم آپ کو تین چار آدمیوں کے ساتھ نہ جانے

دیں گے۔ مولانا نے ان سب کو سمجھا کر مطمئن کیا اور فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے اور کسی بات کا اندیشہ نہیں، ملاقات سے مقصود یہ ہے کہ خادے خاں کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لایا جائے۔

ملاقات اور گفتگو

بہر حال میدان میں خادے خاں سے ملاقات ہوئی، بات چیت کی کیفیت خلاصۃً یہ تھی:

مولانا: خان بھائی! آپ سے یہ امید نہ تھی کہ سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لائیں گے، اور ان کے ساتھ ہو کر اپنے بھائیوں سے جنگ کریں گے۔ یہ بہت برا کیا، بغاوت کا ثبوت فراہم کر دیا، آپ نے بغاوت پر کیوں کمر باندھ لی ہے؟ اب بھی خیر اسی میں ہے کہ سکھوں کی مشارکت سے توبہ کیجئے۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، شریعت کے دائرے سے قدم باہر نہ رکھئے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ آپ کے گناہ معاف کر دے گا۔ ورنہ دنیا اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

خادے خاں: مولانا! خفا نہ ہوں، ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، سید بادشاہ کی طرح ملا مولوی نہیں۔ ہمارا طریقہ جدا ہے، ان کا راستہ جدا۔ سید بادشاہ کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کیوں کر چل سکتے ہیں؟ سید بادشاہ کیوں ہمارے درپے ہیں؟ ہمارے حق میں جو کچھ ان سے ہو سکے درگذر نہ کریں۔

کمال مایوسی

یہ کامل مایوسی کا پیغام تھا، اگر اس کے رنج و ملال کی کوئی معقول وجہ ہوتی تو سید صاحب اس کی تلافی کے لئے ہمہ تن تیار تھے۔ تالیف قلب کے سلسلے میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت بھی فرما سکتے تھے، لیکن اس بنیاد کے انہدام پر کیوں کر راضی

ہو سکتے تھے جس پر سید صاحب کی ساری تحریک قائم تھی؟ شریعت حقہ کی جگہ افغانیت اور پختونیت کے تقاضوں کا ساتھ کیوں کر دے سکتے تھے؟

بے شک خادے خاں بہت بڑا رئیس تھا اور اس کے مرکز کو جائے وقوع کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اگر اسے سکھوں کی مشارکت سے الگ کر لیا جاتا تو سکھ لشکروں کے لئے میدانی علاقے پر بے تکلف چڑھ آنا سہل نہ رہتا۔ اس کیلئے مصالح وقت کے اعتبار سے ہر قیمت ادا کی جا سکتی تھی، لیکن یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا تھا کہ اس کے پاسِ خاطر سے شریعت کی جگہ افغانیت کے مراسم و مروجات کو مدارِ کار بنا لیا جائے؟ اور ایک دعویدارِ اسلام کی زبان سے یہ کلمہ کس درجہ جسارت و بے باکی پر مبنی تھا کہ ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، ملا مولوی نہیں، اور ہم شریعت پر نہیں چل سکتے۔ خادے خاں کے دل و دماغ پر پختونیت اس درجہ غالب تھی کہ ہر سعیِ تفہیم اسے قریب تر لانے کے بجائے دُور ہٹاتی گئی، اس کے بعد مجبوراً اس کے باب میں قطعی فیصلہ کرنا پڑا، جس کی تفصیل آگے چل کر معلوم ہو گی۔

خوانین میں مصالحت

چند روز بعد سُدم سے مبین خاں اور اس کا بھائی امیر خاں سید صاحب کے پاس پہنچے اور منصور خاں رئیس چارگلی کے خلاف شکایت کی۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں برادری کا دستور یہ ہے کہ جب باہمی تقسیم میں دو بھائی دو مختلف گاؤں لے لیں اور ان کی آمدنی میں تفاوت ہو تو سال دو سال کے بعد قبضہ و تصرف میں مبادلہ ہوتا رہتا ہے، تاکہ حصہ داری از روئے انتفاع برابر ہو جائے۔ منصور خاں چونکہ زور آور ہے، اس لئے بدل پر راضی نہیں ہوتا۔ سید صاحب فیصلے کیلئے دورے پر نکلے، فتح خاں کو پنجتار سے اور آخند خاں، مشکار خاں کو شیوہ سے ساتھ لیا۔ گڑھی امان زئی میں پہنچ کر گرد و پیش کے خوانین کو

بلایا، پورے حالات معلوم کر لینے کے بعد فریقین منازعت کو بلا کر فرمایا کہ آپ راضی ہوں تو ہم خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق فیصلہ کر دیں؟ جب انہوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو آپ نے منصور خاں کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ منصور خاں نے اسے بہ دل وجان منظور کر لیا۔ پھر سید صاحب گھڑیالہ (یا گھڑیالی) اور چارگلئی ٹھہرتے ہوئے منڈم تشریف لے گئے۔

اسماعیل زئی اور دولت زئی

اہل سمہ میں دو قبیلے بڑے زور آور، پختگی قول وعہد میں مسلم جمہور اور صداقت ووفاداری میں زبان زد ومشہور تھے۔ ایک اسماعیل زئی، دوسرا دولت زئی۔ وہ بیعت شریعت میں شامل نہیں ہوئے تھے، ملا قطب الدین ننگرہاری دوروسیر کرتے ہوئے ان کے دیہات میں بھی پہنچ گئے اور حسب عادت بڑی صاف گوئی سے انہیں شریعت کے احکام سے آگاہ کیا۔ ان قبیلوں کے ملاؤں اور مولویوں کو اجراء قانون شریعت سے اس لئے اختلاف تھا کہ اول عشر ملاؤں کو ملنے کے بجائے امام کے پاس جمع ہوتا، دوسرے غیر شرعی مراسم خصوصاً رسم اسقاط سے انہیں جو مالی منفعت حاصل تھی اس کا دروازہ بند ہو جاتا۔ ملا قطب الدین ان حقائق سے آگاہ تھے، اس لئے سب باتیں کھول کر بیان کیں۔ اس سلسلے میں ملاؤں اور مولویوں کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کو بھی واضح کیا۔ آخر میں فرمایا: تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، حالانکہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جو شخص بیعت امامت کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا، اور امام تمہارے درمیان موجود ہے، نیز اسقاط شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور خدا کے نزدیک یہ قطعاً مقبول نہیں۔

ان لوگوں نے ملاؤں کو بلا کر کہا کہ مولوی قطب الدین سے مذاکرہ کرو، وہ مذاکرہ کیا کرتے؟ شرمندگی اور ندامت کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر کے خاموش

ہو گئے۔ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ ایک وفد سید صاحب کو بلانے کے لئے بھیج دیا، سید صاحب تشریف لے گئے، ان سب سے اقامت شریعت کی بیعت لی اور ان کے باہمی جھگڑے ختم کر دیے۔

اہلِ تنگی کا دعوت نامہ

اس قسم کے واقعات نے مختلف مقامات کے افغانوں کو سید صاحب کی طرف مائل کر دیا اور سرداران پشاور کی رعایا میں سے بعض افراد آ کر التجائیں کرنے لگے کہ لشکر اسلام کا ایک حصہ ہمارے ہاں بھیج دیجئے، ہم ہر ممکن خدمت بجالائیں گے۔

ان دنوں میں مولوی امیر الدین ولایتی سید صاحب سے مشورے کر کے کبھی کبھی تنگی(۱) جایا کرتے تھے اور وہاں سے بھی دو تین مرتبہ چار چار پانچ پانچ آدمی آتے۔ ان مشوروں کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک روز خود سید صاحب نے بعض خوانین سے ذکر کیا کہ تنگی سے ہمارے پاس کئی آدمی آ چکے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب سے ہماری بستی میں درانیوں کا عمل دخل ہوا ہے، ہم مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں، ہم نے بڑی کوشش سے بستی کے تمام لوگوں کو ہم رائے بنایا ہے، اگر آپ کچھ غازی بھیج دیں تو بستی پر آپ کا قبضہ کرا دیں گے۔ اس طرح پشاور کا راستہ کھل جائے گا۔

یہ بیان فرما کر سید صاحب نے خوانین سے پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟

سب نے غور و فکر کے بعد اس تجویز پر پسندیدگی ظاہر کی۔ سید صاحب نے تین سو غازیوں کا لشکر تیار کیا اور مولانا شاہ اسماعیل کو امیر بنا کر تنگی بھیج دیا، ارباب بہرام خاں اور مولوی امیر الدین ولایتی بھی ساتھ تھے۔

---

(۱) تنگی ہشت نگر کے علاقے میں ہے، پشاور کے شمال میں تقریباً ۲۹، ۳۰ میل کے فاصلے پر ہوگا۔

رخنہ اندازی

تنگی سدم سے بیس بائیس کوس ہوگا، عشاء کے وقت غازی روانہ ہوئے، پورا فاصلہ ایک مسافت میں طے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے صبح ہوئی تو ایک نالے پر ٹھہر گئے۔ تنگی کے دو آدمیوں کو عصر کے وقت آگے بھیج دیا کہ اپنے ہمسروں کو خبر کر دیں، خوب اندھیرا ہو گیا تو پھر روانہ ہوئے۔ جب تنگی پاؤ کوس پر رہ گیا تو غازیوں کو روک کر گاؤں کے ان آدمیوں کو بھیجا گیا، جو لشکر کے ساتھ تھے۔ تیس چالیس قدم کے فاصلے پر انہیں چار زرہ پوش سوار ملے، ان سے بات چیت کر کے واپس آئے تو مولانا، ارباب بہرام خاں اور مولوی امیر الدین کو ساتھ لے گئے۔ اس وقت یہ راز کھلا کہ ایک گروہ پہلے فیصلے سے پھر گیا ہے، اس نے درانیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں اگر بستی پر حملہ کیا گیا تو ان لوگوں کو خوفناک مصیبتوں سے سابقہ پڑے گا جو خلوص کے ساتھ درانیوں کے خلاف کوششیں کرتے رہے۔

مولانا کو طبعاً اس صورت حالات پر سخت رنج ہوا، میاں دین محمد نے کہا کہ تنگی والوں کی مشکیں کس لینی چاہئیں۔ محمد عرب بھی انہیں سخت سزا دینا چاہتے تھے، لیکن بہرام خاں اور مولوی امیر الدین نے جو سرحد کے اوضاع و رسوم سے پوری طرح واقف تھے، سب کو روک دیا اور ان لوگوں کو بہ خیر و عافیت بستی میں جانے کی اجازت دے دی۔

لشکر واپس ہوا تو اسی نالے پر پڑاؤ کیا، جہاں پہلا دن گزارا تھا۔ برسات کا موسم تھا، غازیوں کی ایک جماعت پار اُتر گئی تو نالے میں اچانک زور کا پانی آ گیا اور عبور ممکن نہ رہا۔ چنانچہ سب غازی ایک دن اور ایک رات وہیں ٹھہرے رہے۔ جب پانی پایاب ہوا اور بقیہ غازی پار اُترے تو لشکر سدم پہنچا۔ تنگی کا واقعہ ۱۵ر محرم ۱۲۴۵ھ (۱۷ر جولائی ۱۸۲۹ء) کو پیش آیا۔

تیرھواں باب:

جنگِ ہنڈ

دور کاوشیں

بیعتِ شریعت اور جنگِ پنجتار کو سید صاحب کی تحریک میں بہ اعتبار تاثیر ونفوذ خاص اہمیت حاصل ہے۔ جن لوگوں میں سعادت کا جوہر موجود تھا وہ اقامتِ شریعت کی برکات وحسنات سے متاثر ہوئے، جن کی نظریں کسی تحریک کے معنوی ثمرات پر نہیں بلکہ صرف اس کی صلاحیتِ استقامت اور استعداد ودفاع پر ہوتی ہیں، ان کیلئے یہ واقعہ جالبِ توجہ ہوا کہ جنگِ پنجتار میں غازیوں کی چھوٹی سے جماعت نے سکھوں کی بہت بڑی فوج کو ناکام مراجعت پر مجبور کر دیا۔ اس وجہ سے ان طبقات میں بھی بیعت واطاعت کی رغبت پیدا ہوگئی، جو ابھی تک سید صاحب سے الگ تھے، لیکن اس راستے میں دو بڑی مشکلیں کھڑی ہوگئی تھیں، اول سردارانِ پشاور خصوصاً یار محمد خاں، دوم خادے خاں رئیس ہنڈ۔

یار محمد خاں

یار محمد خاں نے جنگِ شیدو کے وقت سے سید صاحب کی مخالفت کو شعارِ خاص بنالیا تھا، اور وہ سکھوں کا معین ورفیق بن گیا۔ ابتداء میں وہ چھپ چھپ کر مزاحمت کے اسباب پیدا کرتا رہا، لیکن کچھ عرصے کے بعد کھلم کھلا میدانِ مقابلہ میں آگیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس اثناء میں سکھوں کی طرف سے پے بہ پے اس کی تذلیل بھی ہوتی رہی، کبھی اس کے بیٹے کو یرغمال میں پکڑ کر لاہور لے گئے، کبھی خراج بڑھا دیا اور کبھی ''لیلیٰ'' نام گھوڑی کی

طلب کے سلسلے میں پشاور پر چڑھائی کر دی۔ لیکن تازیانۂ تذلیل کی پیہم ضربیں بھی یار محمد خاں کی حسِ غیرت وحمیت کو بیدار نہ کر سکیں اور وہ جس غلط راستے پر پڑ چکا تھا، تادمِ واپسیں اسی سے چمٹا رہا۔

خادے خاں

خادے خاں کی حیثیت اس سے مختلف تھی، وہ ایک حد تک رقیبانہ جذبات کے زیرِ اثر سید صاحب سے برگشتہ ہوا تھا۔ یعنی اسے یہ منظور نہ تھا کہ سید صاحب خان زیدہ کو اس سے بہتر سمجھیں، حالانکہ ہر شخص کو بہتر یا کمتر سمجھنے کا انحصار اصلاً اس کے اعمال پر ہوتا ہے۔ نیز اسے یہ منظور نہ تھا کہ سید صاحب ہنڈ کو چھوڑ کر پنجتار کو مرکز بنائیں، اور اس طرح خادے خاں کے بجائے فتح خاں کو اس تحریک میں مرکزی حیثیت مل جائے۔ پھر مانیری کے واقعے نے اسکی ''افغانیت'' اور ''اسلامیت'' کے درمیان سخت کشمکش پیدا کر دی، جس میں ''افغانیت'' غالب آئی اور وہ بھی سید صاحب سے کٹ کر سکھوں کا معاون بن گیا۔

تین راستے

سمہ تحریکِ جہاد وتحریکِ اقامتِ شریعت کا مرکز تھا، اب اس کے لئے دو جانب سے خطرے پیدا ہو چکے تھے۔ شمال ومغرب میں سردارانِ پشاور کی طرف سے اور جنوب میں خادے خاں کی طرف سے۔ تنگی سے بے نیلِ مرام مراجعت کے بعد غازیوں کے لئے عمل کے تین راستے رہ گئے تھے۔

۱۔ موت پر بیعت کر کے سردارانِ پشاور سے لڑیں، اس لئے کہ ان کی قوت غازیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

۲۔ خادے خاں کی سرکوبی کریں اور اس کا خرخشہ مٹا دیں۔

۳۔ سمہ کو چھوڑ کر پکھلی چلے جائیں اور وہاں نیا مرکز پیدا کریں جو کم از کم اپنوں کی

مصیبت خیز دراندازیوں سے محفوظ ہو۔

نئے مرکز کی تاسیس میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، لیکن سردارانِ پشاور اور خادے خاں کا مقابلہ کئے بغیر نکل جانے کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو دو ڈھائی برس کی کوششوں سے ایک نظام کے ماتحت لانے کا مناسب انتظام کیا تھا اور جو سید صاحب کی معیت میں دونوں مخالف قوتوں کے غیظ وعتاب کا مرجع بن چکے تھے، وہ بے یارومددگار رہ جاتے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ نئے مرکز میں بھی مختلف لوگ جب چاہتے، ذاتی اغراض کے جنون میں ویسی ہی مشکلات پیدا کر دیتے، جیسی سمہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ لہٰذا سید صاحب کے لئے حفظ ودفاع میں لڑنا بالکل ناگزیر ہو گیا تھا، لڑائی سردارانِ پشاور اور خادے خاں سے یکے بعد دیگرے ہی ہو سکتی تھی۔

باطل کی دو صورتیں

جن لوگوں کی نظریں بالعموم ظاہری وسطحی حالات سے متاثر ہو جاتی ہیں، ان کے اطمینان کے لئے یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اہل حق کی لڑائی ذاتی اغراض، شخصی مقاصد اور انفرادی مصالح کی نجاستوں سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ ان کا مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ باطل کو مٹا کر حق کے لئے غلبہ وتفوق کا بندوبست کریں۔ باطل کی دو صورتیں ہیں: ایک جلی، دوسری خفی۔ جلی وہ ہے جو اپنے ظاہر وباطن میں کسی بحث ودلیل یا تشریح وتوضیح کا محتاج نہ ہو، خفی وہ ہے جس کے ظاہر پر باطل کا حکم لگانے کی کوئی وجہ نہ ہو، تاہم اس کے فعل وعمل کی ہر صلاحیت حق کے بجائے باطل کے رسوخ وبرتری کی خاطر وقف ہو جائے اور اس طرح صورۃً نہیں تو معناً اور ظاہراً نہیں تو باطناً وہ باطل کے حکم میں داخل سمجھا جائے۔ ان حالات کے پیش نظر اہل حق کے لئے فیصلہ وتحکیم میں یقیناً امتیاز واستثناء کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور باطل کی ہر قوت سے لڑنا پڑتا ہے۔ اگرچہ لڑائی کتنی ہی

ناپسند ہو۔

یہی حالت سید صاحب کو پیش آئی جس سے بچنے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ سعی اٹھانہ رکھا۔ لیکن حالات کے بے پناہ سیل کا بہاؤ نہ رکا اور جو کچھ پیش آیا اس پر جتنا بھی افسوس اور رنج کیا جائے بالکل بجا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں سید صاحب کے فیصلے وتحکیم کا دامن ہر داغ سے کاملاً پاک ہے۔ جب اس قسم کے اسباب پیش آئیں گے شریعت حقہ اور مصالح ملیہ کا حکم بہر حال وہی ہوگا، جس پر سید صاحب عمل پیرا ہوئے۔

ہنڈ پر حملے کی تیاری

غرض غور و مشورہ کے بعد یہ تجویز قرار پائی کہ سب سے پہلے خادے خاں کا خرخشہ مٹایا جائے۔ اول اس لئے کہ بار بار تفہیم و انتباہ کے باوجود وہ مخالفت میں زیادہ سرگرم و متصلب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سکھوں کو ترغیب دے دے کر ایک سے زیادہ مرتبہ اہل سمہ کے لئے مصیبتیں پیدا کرنے میں بھی متامل نہ ہوا۔ دوم اس لئے کہ اس کا مقام (ہنڈ) جائے وقوع کے اعتبار سے بڑا اہم تھا اور سکھ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ سوم اس لئے کہ اگر خادے خاں کو چھوڑ دیا جاتا تو اجرائے شریعت کا جو بندوبست کیا گیا تھا، وہ دوسرے حصوں میں بھی مختل و مضطرب ہو جاتا، اس لئے کہ سب پرسش و احتساب سے بے پروا ہو جاتے۔ (۱)

ہنڈ پر حملے کا فیصلہ ہو چکا تو تیاری کے لئے سید صاحب نے سدم میں بستی کے کنارے پر ایک حویلی خالی کرائی جس میں اخفاء کی مصلحتیں بہتر طریق پر پوری ہو سکتی تھیں۔ وہاں آپ نے چیڑ کی لکڑی قلابے اور سیڑھیاں بنوائیں تمام جماعتوں میں سے پانسو آزمودہ کار غازی چنے، مولانا شاہ اسماعیل کو ان کا امیر اور ارباب بہرام خاں کو نائب

---

(۱) ''منظورہ'' میں خود سید صاحب کی ایک تحریر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خان ہنڈ کی مثال نے بعض شریروں کو اس درجہ دلیر و جری بنا دیا تھا کہ وہ برملا کہتے تھے، خان ہنڈ نے شریعت قبول نہ کی: با او چہ شد کہ با ما خواہد شد۔

امیر بنایا۔ لیکن امیر اور نائب امیر کے سوا (جو مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن تھے) کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس طرف جانا مقصود ہے۔ رخصت کے وقت سید صاحب نے مولانا سے علی الاعلان صرف یہ کہا کہ ”آپ گڑھی امان زئی ہو کر جائیں، ہم بھی آپ کے پیچھے پنجتار آتے ہیں“ ساتھ ہی باورچی خانہ کا سامان خچروں پر لدوا کر بھیج دیا۔ سیڑھیاں اور قلابے شلیتوں میں لپیٹ کر اونٹوں پر سوار کرا دیے۔ ارباب بہرام خاں کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا، اس طرح عوام اور غازی یہی سمجھتے رہے کہ پنجتار جانا منظور ہے۔

سفر کی صعوبتیں

مولانا، بازار (سدم) سے گڑھی امان زئی ہوتے ہوئے ترکئی پہنچے، ارباب بہرام خاں پہلے شیوہ گئے پھر ترکئی میں مولانا سے جا ملے۔

ترکئی سے ہنڈ گیارہ بارہ کوس پر تھا، مولانا نے غازیوں کو ضرورت کے مطابق رسد دے کر تاکید فرمادی کہ جلد سے جلد دو وقت کا کھانا تیار کر لیں۔ مغرب کے بعد ترکئی سے نکل کر پہلے پنجتار کی جانب گئے، تاکہ اہل ترکئی میں سے بھی کسی کو شبہ پیدا نہ ہو کہ کسی دوسری طرف جا رہے ہیں۔ دو کوس پر نماز عشاء ادا کی، پھر جن کے پاس گھوڑے اور ٹٹو تھے انہیں پنجتار بھیج دیا اور خود ہنڈ کی جانب اس علاقے میں نکل پڑے جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ (۱)

اندھیری رات اور میدانی علاقہ، وہاں سے ہنڈ سات کوس، نہ آبادی کا سراغ، نہ

---

(۱) ”وقائع“ میں ہے کہ مولانا بازار سے گڑھی امان زئی پہنچے (آٹھ کوس) اور تین چار روز تک وہاں بعض انتظامات کی تکمیل میں مصروف رہے۔ پھر سید صاحب سے دوبارہ اجازت لے کر ترکئی آ گئے (سات کوس)، بظاہر ارخ اگرچہ پنجتار ہی کی طرف تھا اور اعلان بھی یہی تھا کہ پنجتار جا رہے ہیں، لیکن ترکئی میں خان ہنڈ کے دوست بھی رہتے تھے، انھیں شبہ ہو سکتا تھا، اس لیے ترکئی سے باہتمام خاص پنجتار کا رخ کیا۔

سمت و جہت کا پتہ۔ خادے خاں کے ایک عم زاد بھائی، محمد بیگ خاں (۱) کو خان کے خلاف خون کا دعویٰ تھا، وہ رہبری کے لئے ساتھ تھا، لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بھی راستہ بتانے سے معذور ہو گیا۔ اگست (۲) کا مہینا، شدید گرمی کا موسم، قدم قدم پر پیاس لگتی، ان سب مصیبتوں اور زحمتوں پر مستزاد یہ پریشانی کہ اگر صبح ہونے سے پہلے پہلے ہنڈ نہ پہنچے تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چلتے چلتے کافی رات گذر گئی تو یہی مناسب سمجھا گیا کہ کسی ایسے مقام کی طرف نکل جانا چاہئے، جہاں صبح ہونے سے پہلے پہلے جا چھپیں، اور سارا دن اخفا میں گزار کر اگلی شب میں حملے کی تدبیر کریں۔ اس مصلحت کے پیش نظر غازیوں کی کئی ٹولیاں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

آخر خود مولانا نے ایک جگہ ٹھہر کر توکلاً علی اللہ ایک سمت مقرر کی اور ادھر چل پڑے۔ پھر ایک آدمی مل گیا جو ہنڈ کے راستے سے بخوبی واقف تھا، اس طرح صبح کاذب کے وقت مولانا تقریباً ڈیڑھ سو غازیوں کے ہمراہ اس تالاب پر پہنچ گئے جو ہنڈ سے ایک گولی کی زد پر تھا، واقعہ حضرو کے بعد سید صاحب اسی جگہ ٹھہرے تھے، بیعت امامت جہاد بھی اسی مقام پر ہوئی تھی۔

حملے کی نئی اسکیم

اب بقیہ غازیوں کا انتظار ہونے لگا، زیادہ تر اسلئے کہ سیڑھیاں بھی انہیں کے پاس تھیں اور سیڑھیوں کے بغیر قلعہ کی دیواروں پر چڑھ کر اندر پہنچنا غیر ممکن تھا۔ (۳) جب

---

(۱) ''منظورہ'' میں محمد بیگ خاں کو خادے خاں کا عم لکھا ہے: یکے از اقرباء والی ہنڈ محمد بیگ خاں نام عم او بود۔ (ص:۵۱۳)

(۲) ہنڈ پر حملہ ۷رصفر ۱۲۴۵ھ (۸راگست ۱۸۲۹ء) کو ہوا تھا۔

(۳) سید عبدالجبار شاہ ستھانوی نے اس سلسلے میں بابا بہرام خاں تہکالی کا بیان پیش کیا ہے، جو خود حملہ ہنڈ میں غازیوں کے ساتھ تھے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ مولانا محض اخفا کی غرض سے پہلے گڑھی امان زئی پھر ترکئی گئے، پانی کی مشکیں ساتھ لے لی تھیں، اس لئے کہ سامنے بے آب بیابان تھا، جو چھتیس میل لمبا ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ان کا کوئی نشان نظر نہ آیا اور ادھر صبح صادق نمودار ہونے لگی تو مولانا نے حملے کو ملتوی کرنیکے بجائے نئی اسکیم بنالی، جس میں سیڑھیوں کی بھی ضرورت نہ تھی۔ سیڑھیاں آ بھی جاتیں تو بیکار تھیں، اسلئے کہ صبح ہو چکی تھی اور دیواروں پر چڑھ کر حملے کا وقت گذر چکا تھا۔

مولانا نے ڈیڑھ سو غازیوں کو پانچ دستوں میں تقسیم کیا۔ ایک دستہ اپنے پاس رکھا اور چار دستے شیخ ولی محمد کے حوالے کر کے حکم دے دیا کہ انہیں قلعے کے دروازے سے باہر دونوں طرف گنے کے کھیتوں میں مناسب مقامات پر بٹھا دیجئے۔ جب دروازہ کھلے تو فوراً بندوق چلا کر اندر داخل ہو جایئے، ہم بھی بندوقوں کی آواز سنتے ہی پہنچ جائیں گے۔ شیخ نے تین دستے تھوڑے فاصلے پر ایک سمت کے کھیتوں میں بٹھا دیئے چوتھے دستے کو خود لیکر کھیت کے اس گوشے میں جا بیٹھے، جو دروازے سے عین متصل تھا۔

یہ انتظامات ہو چکے تو قلعے میں سے پہلے ایک گدھے کے بولنے کی آواز آئی، پھر مسجد میں اذان ہوئی، بعد میں ایک شخص نے قلعے کے اندر سے آ کر چوکیدار سے کہا کہ دروازہ کھول دو۔ وہ بولا کہ سید بادشاہ کے چھاپے کی خبر تھی، دروازہ خان کے حکم کے بغیر نہ کھولوں گا۔ (۱) اس شخص نے کہا کہ اب تو نماز فجر کی اذان بھی ہو گئی، چھاپا آتا تو رات کو آتا، اب کیا آئے گا؟ چوکیدار نے پھر بھی احتیاط کے طور پر ایک آدمی سے کہا کہ کوٹھے پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھ لے۔ چنانچہ دیکھا گیا، لیکن نظر کیا آ سکتا تھا۔ مولانا اپنے دستے کے ساتھ تالاب کے پاس چھپے بیٹھے تھے، باقی غازی گنے کے کھیتوں میں مستور تھے۔ (۲)

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ۔ ۔ ۔ اور تقریباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ باقی غازی اس کے مغربی گوشے میں سے ہو کر صبح کے وقت ہنڈ پہنچے، نیز مولانا کے ساتھ صرف تین آدمی تھے۔ ملاحظہ فرمایئے (عبرۃ لاولی الابصار ص ۲۳۶)

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈ والوں کو صحیح وقت اور تاریخ یورش کا علم ہو یا نہ ہو، لیکن یہ اندیشہ ضرور تھا کہ سید صاحب یورش کریں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے ۱۰ صفر کی تاریخ طے کی تھی، پھر تین دن پہلے حملہ کر دیا، بہر حال حملے کی شہرت ضرور تھی۔

(۲) بابا بیرم خان تنولی کا بیان ہے کہ مولانا نے کل ۲۵ قراولین دار بھیجے تھے۔

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

قلعے کے دروازے پر قبضہ

شیخ ولی محمد چونکہ بالکل پاس تھے، اس لئے ساری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر دروازہ کھلا اور وہ شخص اس سمت میں نکل گیا جدھر کوئی غازی نہ تھا۔ پھر ایک کسان ہل کندھے پر رکھے اور بیلوں کی جوڑی ساتھ لئے نکلا اور اس راستے پر ہولیا جو کھیتوں کے بیچ میں تھا، وہ تین دستوں کے پاس سے گذر گیا جو تھے کے روبرو پہنچا تو اتفاقاً اس کی نظر کسی غازی پر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی اس نے شور مچانا چاہا، عبداللہ خاں رام پوری نے بجلی کی تیزی سے لپک کر ایسا وار کیا کہ آواز نکلنے سے پیشتر ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔

عین اسی وقت شیخ ولی محمد کمین گاہ سے نکل کر دروازے میں جا گھسے اور دو چار ہی لمحوں میں وہاں اپنا بندوبست کر لیا۔ ملا قطب الدین نے فوراً قرابین چلا دی، جس کی آواز سنتے ہی مولانا اپنے دستے کو لے کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شیخ ولی محمد کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثناء میں بچھڑے ہوئے غازیوں کی ایک جماعت بھی قریب آ گئی تھی، ان کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

مولانا نے پہنچتے ہی بہ آواز بلند اعلان کرا دیا کہ جو شخص دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا، مارا جائے گا۔ جو لوگ اپنی جگہوں پر چپ چاپ بیٹھے رہیں گے اور کسی معاندانہ حرکت میں حصہ نہیں لیں گے، انہیں کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔ ہم صرف خادے خاں کے لئے آئے ہیں اور کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ سب لوگ دم بخود ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ محمد بیگ خاں غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ خادے خاں کے مکان کی طرف گیا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ۔ ''منظورہ'' میں بھی یہی ہے کہ مولانا صاحب بست و پنج نفر قرابین چیاں و تفنگ چیاں چقماقی را کہ بچابکدستی و چالاکی ممتاز لشکر بودند از راہ روانہ نمودند کہ شبانہ نزدیک دروازہ قلعہ بکمال ہوشیاری خفیہ برسید۔ ص: ۵۱۵

خادے خاں کا قتل

بعض لوگوں نے ایک رات پہلے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ سید بادشاہ کا لشکر حملے کے لئے آنے والا ہے، خبردار رہو۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ نامرد لوگ اپنی عورتوں سے باتیں سن سن کر مجھے سنانے کے لئے آ جاتے ہیں:

> سید چیست کہ ارادۂ ایں طرف نماید؟ یک بیچارہ فقیر محتاج نانِ خود است۔
>
> **ترجمہ** : سید کی کیا ہستی ہے کہ اس طرف کا ارادہ کرے؟ وہ بیچارہ فقیر خود اپنی روٹی کے لئے بھی محتاج ہے۔

اسے یقین تھا کہ اس پر حملہ ہوگا تو راستے کے اہل دیہات پہلے خبر پہنچا دیں گے۔

علی الصباح قرابینوں کی آواز نے اسے جگایا تو مبہوت رہ گیا، اپنے آدمیوں کو کمر بندی کا حکم دیا، لیکن وہ سب تو پہلے ہی اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے اور کسی ایک کی توثیق یا ترجیح کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ''منظورہ'' کا بیان ہے کہ خادے خاں نے اپنے اہل خانہ کو سادات کے مکان پر بھیج دیا، اس لئے کہ سادات اور ملاؤں کے مکانات پٹھانوں میں جائے امن سمجھے جاتے تھے اور سخت سے سخت دشمن بھی ان کے مکانوں میں کسی کو آزار نہیں پہنچاتے تھے۔ پھر اپنا مال سمیٹنے لگا۔ غازی پہلی مرتبہ اس کے مکان میں داخل ہوئے تو کچھ سراغ نہ ملا، دوسری مرتبہ تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے تو وہ چھت پر چڑھ کر اضطرار کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔(۱) غازیوں نے پے بہ پے بندوقیں سر کیں اور وہ مارا گیا۔ اس وقت تک دو سو مزید غازی ہنڈ پہنچ چکے تھے، باقی دو گھڑی دن چڑھے آ گئے۔(۲) اس کا مال و اسباب معلوم نہیں کہاں گیا اور کون لے گیا۔

---

(۱) ''منظورہ'' میں ہے: دو سہ بار حملہ کردند۔

(۲) ''منظورہ'' ص: ۵۱۷، ۵۱۸

''وقائع'' میں ہے کہ غازیوں کے جمنے کی اطلاع پا کر خان نے تلوار باندھی، پستول کی جوڑی لی اور کوٹھے پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ جلد نقارہ بجاؤ اور مقابلے کے لئے کمریں باندھ لو۔ اس اثناء میں چار غازیوں نے جوڑ کر بندوقیں ماریں، خدا جانے کس کی گولی لگی کہ وہ اپنی جگہ سے اچھل کر دھم سے زمین پر آگرا۔ محمد بیگ خاں نے آگے بڑھ کر کئی مرتبہ تلوار کے وار کئے اور اس کا کام تمام کر ڈالا۔(۱)

بابا بہرام خاں تنولی فرماتے ہیں کہ قلعہ کے دروازے پر قبضہ ہو گیا تو خادے خاں گھوڑے پر سوار آرہا تھا اور اپنے آدمیوں کو مقابلے کے لئے اٹھا رہا تھا، اسی حالت میں وہ قرابینوں سے مارا گیا۔(۲)

قلعے میں غازیوں کا حسنِ انتظام

خان کے مارے جانے کے بعد مولانا نے اس کے مکان کے باہر جماعت خاص کا پہرہ لگا دیا تا کہ کوئی شخص اندر نہ گھسنے پائے۔ پھر شیخ ولی محمد، ارباب بہرام خاں اور چار پانچ ممتاز ملاؤں کو بھیجا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر خواتین کو تسلی دیں اور کہیں کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، خود انہیں کوئی آزار نہیں پہنچے گا۔ خان کا بڑا بیٹا شور وغل میں کہیں بھاگ گیا تھا، چھوٹا بیٹا بھوسے والی کوٹھڑی میں چھپا ہوا ملا، اسے بہ حفاظت تمام زنانے میں پہنچا دیا

---

(۱) ''وقائع'' ص ۱۹۲

(۲) سید عبد الجبار شاہ کی کتاب ''عبرۃ لاولی الابصار'' ص: ۲۳۶

بیلیو (Bellew) نے خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ سید صاحب نے خادے خاں پر حملہ کیا، جب کامیاب نہ ہوئے تو اخوند سوات کے ذریعے سے صلح کی کوشش شروع کردی۔ اخوند سوات نے اسے بلایا۔ جب وہ محافظوں سے الگ ہوا تو سید صاحب نے اسے قتل کرا دیا اور خود پنجتار چلے گئے۔ یہ بیان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیلیو نے یہ بات مقامی آدمیوں سے سنی، جو غرض مندوں کی پھیلائی ہوئی جعلی کہانیوں کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ میں بالا کوٹ اور بعض دوسرے مقامات پر ایسے کئی افسانے سن چکا ہوں۔

گیا۔ قلعے میں عام اعلان ہو گیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر باہر نہ نکلے اور نہ بھاگنے کی کوشش کرے، سب کو امن ہے۔ خادے خاں کی لاش چار پائی پر ڈال کر اس کے مکان کے پچھواڑے میں ایک حجرے کے اندر رکھوا دی گئی۔

فتح ہنڈ غازیوں کی حیرت انگیز صلاحیت، تحمل شدائد، وفورِ عشق مقاصد، کمال تدبر وحسن تدبیر اور یگانہ جرأت و مردانگی کا ایک درخشاں کارنامہ ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ اتنا بڑا قلعہ فتح ہو گیا، ایک بہت بڑا خطرہ ختم ہو گیا، لیکن خادے خاں اور اس کسان کے سوا جو راستے میں مارا گیا تھا، اہل ہنڈ میں سے کسی کے خراش تک نہ آئی اور نہ ایک دمڑی کا مال لٹا۔ سید صاحب حسبِ قرارداد سدم سے گھڑیالی پہنچ چکے تھے، وہیں ان کے پاس مژدۂ فتح بھیج دیا گیا۔

خان کی تدفین

خان کے گھر کی خواتین اپنے کپڑے، زیور اور نقد روپیہ لے کر پڑوس میں ایک ملا کے مکان پر چلی گئیں اور باقی اثاث البیت کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد خادے خاں کے بھائیوں امیر خاں اور غلام خاں (۱) کی طرف سے پیغام آیا کہ خان کی لاش اور اس کے اہل وعیال کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ خان کی لاش جس وقت چاہو لے جاؤ اور جہاں چاہو دفن کرو، لیکن اہل وعیال کو امیر المومنین کی اجازت کے بغیر نہیں بھیجا جا سکتا۔ آخر غلام خاں اور امیر خاں نے لاش اٹھوائی اور قلعہ ہنڈ سے آٹھ نو سو قدم کے فاصلے پر آبائی گورستان میں اسے دفن کر دیا۔ مولانا نے تاکیدی حکم دے دیا تھا کہ کوئی غازی ان سے معترض نہ ہو۔

---

(۱) "منظورہ" میں غلام خاں کو بھائی نہیں بلکہ ایک قریبی رشتہ دار اور مشیر لکھا ہے۔ (ص: ۵۲۱)

اقربا کی دو عملی

اس کے بعد پھر روایتوں میں جزوی اختلاف ہے۔ ''وقائع'' کا بیان ہے، مولانا نے سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا تھا کہ خادے خاں کے بھائی اس کے اہل وعیال کو لے جانا چاہتے ہیں، اس پر سید صاحب نے اجازت دے دی، لیکن ''منظورہ'' میں ہے کہ خادے خاں کے بھائی ملکی خوانین کو ورغلانے اور برانگیختہ کرنے لگے تھے، اور سید صاحب کے خلاف جوڑتوڑ میں مشغول ہو گئے تھے، اس وجہ سے مولانا کی رائے ہوئی کہ اہل وعیال کو ان کے حوالے نہ کیا جائے، اب ان کی شرارتوں کا یہ عالم ہے تو اہل وعیال کی رہائی کے بعد خدا جانے کیا کریں۔

زیدہ کا رئیس مقرب خاں اگرچہ سید صاحب کا عقیدت مند مرید تھا، لیکن خادے خاں کے ساتھ اس کی دوہری رشتہ داری تھی۔ خان کی بہن اس کی بیوی تھی، اور اس کی بہن خان کی بیوی تھی، لہٰذا وہ بھی اسی بات پر زور دے رہا تھا کہ اہل وعیال کو رہا کر دیا جائے اور ہنڈ کی ریاست امیر خاں کو دے دی جائے۔ سید صاحب نے اس کے پاسِ خاطر سے لکھ بھیجا کہ خادے خاں کے اہل وعیال کو رہا کر دیا جائے۔

چودھواں باب:

از ہنڈ تا زیدہ

آتش فتنہ کا اشتعال

خادے خاں کے اقربا ایک طرف خان کے اہل وعیال کی رہائی کے لئے التجائیں کر رہے تھے، دوسری طرف آس پاس کے دیہات میں پھر پھر کر لوگوں کو اکسا رہے تھے کہ خان کے خون کا بدلہ لینے میں امداد دو۔ وہ مقرب خان کے پاس بھی پہنچے، جو رشتہ داری کے باعث خادے خاں کے قتل پر رنج وغم میں ان کا شریک تھا، لیکن مخالفانہ سرگرمیوں کا قطعاً روادار نہ تھا، بلکہ اس نے صاف کہہ دیا کہ پوچھے بغیر میرے پاس چلے آنا بالکل نامناسب تھا، مخالفت کا طریقہ غلط ہے، اگر اسے چھوڑ دو تو میں سید صاحب کے پاس جا کر تمہارے قلعے اور خان کے اہل وعیال کی رہائی کے لئے بھی کہہ سکتا ہوں۔ (۱)

اس اثناء میں سید صاحب نے حکم بھیج دیا تھا کہ خان کے اہل وعیال کو چھوڑ دیا جائے، مقرب بھی بار بار اسی بات پر زور دے رہا تھا، مولانا نے ایک خط میں تمام مصلحتیں بہ طریق مرموز لکھیں جن کا مطلب سید صاحب کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، اور یہ خط

---

(۱) ایک روایت ہے کہ سید صاحب نے مقرب خاں کو کہلا بھیجا تھا کہ یکسو ہو جاؤ، یا ہمارا ساتھ دو یا مخالفت کا اعلان کردو۔ اسلام کی خیر خواہی میں پدر و مادر اور فرزند و برادر کی جانب داری جائز نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں حضور کا فرمانبردار ہوں نہ کہ خان ہنڈ کا۔ خادے خاں کے بھائیوں نے مقرب خاں سے کہا کہ یہ ہماری قوم ہمارا ساتھ دو، مقرب کے بھائی فتح خاں نے دنداں شکن جواب دیا کہ خان ہنڈ ہمارے باپ کا دشمن تھا اور سید صاحب کا بھی دشمن تھا، تم لوگ دین کے بھی دشمن ہو اور ہمارے باپ کے بھی دشمن ہو۔ مقرب خاں ہمارا بھائی ہے، اگر وہ تمہارا ساتھ دے گا تو ہم اس سے بھی بیزاری کا اعلان کردیں گے۔

مقرب خاں کے حوالے کر دیا کہ سید صاحب کو پہنچا دیا جائے۔ مقرب خاں نے اُسے اپنے منشی سے پڑھوایا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا، وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا، دل میں وسوسہ بیٹھ گیا کہ مولانا نے مرموز طریق پر اس کی شکایتیں لکھ دی ہیں۔ بس یہ سمجھتے ہی زیدہ کو چھوڑ کر کسی سمت نکل گیا۔ آخر اس کے بھائی فتح خاں نے سید صاحب کی اجازت سے زیدہ کی ریاست سنبھال لی۔

مولانا نے دوسرا خط ملا شاہ سید چیڑ منگی کے ہاتھ پنجتار روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ خادے خاں کے بھائی خوانین کے پاؤں پر پگڑیاں رکھ کر اور خوشامدیں کر کر کے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا بھائی مارا گیا، ریاست چھن گئی، ہماری امداد کرو، سید بادشاہ نے آج ہم سے جو معاملہ کیا ہے، وہی کل تم سے بھی کریں گے، نیز وہ ہر روز حملے کی نیت سے ہنڈ سے کوس دو کوس کے فاصلے پر آتے رہتے ہیں، آپ کے پاس جو شاہینیں ہیں وہ بہ حفاظت یہاں بھیج دیں تو مناسب ہوگا۔

غازیوں پر اچانک حملہ

سید صاحب نے ۱۲؍صفر ۱۲۴۵ھ (۱۳؍اگست ۱۸۲۹ء) کو دو شاہینیں خچروں پر لدوا کر دس آدمیوں کے ہمراہ روانہ فرما دیں۔ ان میں ایک کالے خاں شاہین چی تھا۔ ملا شاہ سید بھی ساتھ ہی لوٹے، رات شاہ منصور میں گزاری جو ہنڈ سے چار کوس پر ہے، وہیں سے کسی نے امیر خاں (برادر خادے خاں) اور غلام خاں کو خبر بھیج دی اور وہ پچیس تیس سوار لے کر ہنڈ سے آدھ کوس کے فاصلے پر گھات میں جا بیٹھے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ ہنڈ کے برجوں سے کسی نے ان سواروں کو دیکھ لیا تھا، یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ امیر خاں کے آدمی ہیں، اس پر بعض غازیوں نے کہا بھی کہ ہمارے آدمی شاہینیں لا رہے ہیں، یہ لوگ کہیں ان پر حملہ نہ کر دیں، لیکن دوسروں

نے کہا یہ یونہی پھرتے رہتے ہیں، حملہ کیا کریں گے۔ بہرحال اسی حیص بیص میں دو گھڑی کا وقت گذر گیا۔

شاہینوں والے غازی شاہ منصور سے نکل کر امیر خاں کی کمین گاہ کے پاس پہنچے تو اچانک ان پر حملہ ہو گیا۔ باقی لوگ تو مقابلہ کرنے لگے، بارہ برس کے ایک لڑکے نے دوڑ کر ہنڈ خبر پہنچائی۔ قلعے سے ایک جماعت فوراً اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے نکل پڑی۔ یہ لوگ موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ امیر خاں واپس جا چکا ہے، دس یا چودہ غازیوں(۱) میں سے دو تین میں قدرے دم ہے، باقی جا بجا بے دم پڑے ہیں۔ کالے خاں سسک رہا ہے، اس نے بتایا کہ حملے کے بعد شاہینوں کو بچانے کی کوئی شکل نظر نہ آئی تو میں نے انہیں کوئیں میں ڈال دیا، پہلے بندوقیں چلتی رہیں، پھر تلواروں کی نوبت آئی، ملا شاہ سید نے کئی آدمیوں کو مارا، اور زخمی کیا۔ جب ان پر ہجوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کوئیں میں جا گرے، دشمنوں نے اوپر سے دو تین پتھر ڈال دیے۔ پانچ چھ سوار بندوقوں سے مارے گئے، دس بارہ زخمی ہوئے، پھر وہ اپنے مقتولوں کو اٹھا کر چلے گئے۔ یہ داستان سنا کر کالے خاں بھی جاں بحق ہو گیا۔(۲)

کوئیں سے ملا شاہ سید کی لاش نکالی گئی، چیڑ منگ (درہ تندھیاڑ) کے رہنے والے تھے۔ ابتدا ہی سے سید صاحب کے خاص رفیقوں میں شامل ہو گئے تھے۔ پکھلی کی سمت مجاہدین کا جو پہلا لشکر مولانا شاہ اسمٰعیل کی قیادت میں گیا تھا، اس میں معاون و مشیر خاص کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی نعش اور باقی شہیدوں کی لاشیں چارپائیوں پر ڈال کر ہنڈ لائے اور وہیں ان فداکارانِ راہِ حق کو آغوشِ خاک میں سلا دیا گیا۔

---

(۱) ایک روایت ہے کہ چودہ آدمی تھے، ان میں سے صرف ایک ہندوستانی تھا۔

(۲) "منظورہ" میں ہے کہ سب متاسف تھے، پہلے کیوں نکلے، پھر بولے، آنچہ مشیت ایزدی است لابد و ناگزیر شدنی است۔

مقرب کا فرار اور فتح خاں کی سرداری

اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا نے پھر سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ خادے خاں کے اہل وعیال کی رہائی فی الحال خلاف مصلحت ہے۔ ہنڈ میں جتنے غازی تھے، ان سب نے مولانا کی رائے سے اتفاق کیا۔ مولانا اور سید صاحب کی رائے میں اختلاف کا سبب یہ ہوا کہ مولانا گرد وپیش کے حالات اور اپنے موقف کی مشکلات سے آگاہ تھے، یہ سب باتیں سید صاحب کو تفصیلاً معلوم نہ تھیں۔ ان کے سامنے یہ چیز تھی کہ خادے خاں کا قصہ طے ہوگیا، اب اس کے ضمن میں مفسدوں کو شورش انگیزی کا موقع کیوں دیا جائے؟

مقرب خاں زیدہ کو چھوڑ کر نکل گیا تھا، فتح خاں نے ریاست کی عنان ہاتھ میں لیتے ہی تمام خوانین ورؤسا کو خطوط بھیجے کہ امیر خاں اور غلام خاں مفسد وباغی ہیں، جو شخص ان کی جماعت میں شریک ہوگا، اس کا انجام بھی خادے خاں کا سا ہوگا۔ ان خطوط کے جواب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بھائی ہر خان ورئیس کے پاس پہنچ کر خادے خاں کے خون کے فریادی ہوئے، لیکن سب نے ان کی اعانت سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح فتح خاں کے رئیس بننے سے غازیانِ ہنڈ کی مشکلات ایک حد تک دور ہوئیں۔

فتح خاں (رئیس زیدہ) نے سید صاحب کی خدمت میں بھی عرض کیا کہ زیدہ ہنڈ سے صرف دو کوس کے فاصلے پر ہے، آپ تشریف لے آئیں تو شرارت وسرکشی کا ہر فتنہ خود بخود فرو ہو جائے گا، چنانچہ سید صاحب پنجتار کو چھوڑ کر زیدہ پہنچ گئے۔

سید صاحب کی خواہش

سید صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر امیر خاں یا خادے خاں کا کوئی دوسرا رشتہ دار بیعت کر لے اور احکامِ شریعت کی پابندی کا قول دیدے تو ہنڈ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن امیر خاں دورُخی پالیسی پر کاربند تھا، وہ سید صاحب کی خدمت میں التماسیں

کر رہا تھا کہ مجھے تمام شرطیں منظور ہیں، ادھر خوانین و رؤسا کی طرف سے اطلاعیں آ رہی تھیں کہ وہ بھائی کے خون اور خاندان کی مظلومیت کا واسطہ دے کر انہیں ساتھ ملانے کیلئے کوشاں ہے۔ اسی سعی و کوششوں کے سلسلے میں وہ پشاور بھی پہنچ گیا۔ وہاں سے ملا شاہ گل نے خبر بھیجی کہ بارہ ہزار روپے دیکر اس نے یار محمد خاں کو اپنی حمایت پر راضی کر لیا ہے، حملے کی تیاریاں شروع ہیں اور حاجی خاں کاکڑ کو کچھ سوار اور پیادے دے کر بطور مقدمۃ الجیش بھیجا جا رہا ہے۔(۱) یار محمد خاں صرف توپوں کے ڈھل جانے کا منتظر بیٹھا ہے۔

---

(۱) حاجی خاں کاکڑ اپنے عہد کا ایک عجائب کار شخص تھا۔ پشین (بلوچستان) کا رہنے والا تھا اور اس کا اصل نام تاج محمد تھا (ابن عطا محمد)۔ ابتدا میں بھیڑیں چراتا تھا، پھر رستم خاں کی مسجد میں تھوڑی تعلیم پائی اور عزیز اللہ خاں کاکڑ کے پاس ملازم ہو گیا۔ وہ بڑا ہوشیار آدمی تھا، اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے بہت فریب آتے ہیں لیکن تاج محمد (حاجی خاں کاکڑ) وہ سب جانتا ہے، علاوہ بریں اسے ایک ایسا فریب بھی یاد ہے، جو سب کا توڑ بن سکتا ہے۔

تاج محمد ملازمت چھوڑ کر پیادہ حج کو چلا گیا۔ واپس آیا تو مختلف رئیسوں کے پاس ملازم رہا۔ جس کے ملازم ہوتا اسے کچھ مدت بعد کوئی نہ کوئی فریب دے کر دوسرے کے پاس چلا جاتا۔ آخر وزیر فتح خاں بارک زئی کے پاس پچاس سواروں کا افسر بن گیا، ہرات میں اس کے ساتھ بھی فریب کیا، بعد میں کافر قلعہ کی جنگ میں اس بہادری سے لڑا کہ فتح خاں کے دل سے فریب کا رنج بھلا دیا۔ پھر کامران کا پیش خدمت بن گیا، وہاں سے شیر دل کے پاس قندھار آ گیا۔ اس کے رازوں سے دوست محمد خاں کو آگاہ کر کے پانسو سواروں کا افسر اور بامیان کا گورنر بن گیا۔ غالباً اسی زمانے میں اسے حاجی خاں کا خطاب ملا، دوست محمد خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ "حاجی خاں بڑا اچھا آدمی ہے، لیکن ملک میں سب سے بڑا کتا (سگ) ہے۔"

پھر دوست محمد خاں کے پاس سے پشاور چلا آیا، پشاور سکھوں کے قبضے میں چلا گیا تو حاجی خاں دوبارہ دوست محمد خاں کے پاس پہنچ گیا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر خاں نے ہری سنگھ کے خلاف درۂ خیبر میں جو جنگ کی تھی، اس میں حاجی خاں بھی اکبر خاں کے ہمراہ تھا، لیکن اسی زمانے میں اس نے سکھوں سے چالیس ہزار روپے لے کر ان کی امداد شروع کر دی تھی۔ پھر رحم دل کے پاس قندھار چلا گیا۔ بعد میں اس کے بھائی کہن دل سے جا ملا۔ انگریز شجاع الملک کو لے کر افغانستان پر بڑھے تو شاہ کا طرف دار بن گیا اور نصیر الدولہ خطاب پایا۔ پھر شاہ کے خلاف دوست محمد خاں کی امداد کی۔ اس کا انجام غالباً اچھا نہ ہوا۔ سید صاحب نے اسے بھی ایک مرتبہ جہاد کی دعوت دی تھی، جب وہ دوست محمد خاں کے پاس تھا۔ یہ دعوت نامہ سید صاحب کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہے، کاکڑ اس کی قوم کا نام ہے۔ "منظورہ" میں حاجی خاں کا نام نہیں دیا، صرف یہ مرقوم ہے کہ "معتمد خود را با سہ صد سوار زن و بچہ سرداران کلاں پیش خیمہ فرستادہ۔"

یار محمد خاں کے مقاصد

اس اطلاع کے کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ حاجی خاں کاکڑ ہریانہ پہنچ گیا، جو امیر خاں کا مرکز تھا۔ یار محمد خاں کے سامنے اس لشکر کشی میں کئی فائدے تھے، مثلاً: اسے بارہ ہزار کی رقم ایک مشت ملی تھی اور اس عہد میں یہ خاصی وقیع رقم تھی۔ وہ سید صاحب کو دشمن سمجھتا تھا اور اب خادے خاں کے بھائیوں اور ان کے ہم قوموں کی معیت میں اس دشمن کو ختم کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سید صاحب ختم ہو جائیں گے تو سمہ کے سارے خوانین خود اس کی تابعیت قبول کر لیں گے، یوں اس کی سرداری کا حلقہ بہت وسیع ہو جائے گا۔(۱) ایک خیال یہ بھی ہو گا کہ جن غازیوں نے خادے خاں جیسے باجبروت رئیس کو اتنی آسانی سے ختم کر ڈالا، وہ اسے بھی نہ چھوڑیں گے، لہٰذا انہیں فرصت و مہلت نہ دینی چاہیے، بلکہ جلد سے جلد مٹا دینا چاہیے۔

غازیوں سے چپقلشیں

حاجی کاکڑ ہریانہ پہنچ گیا تو غازیوں کے ساتھ پے در پے چپقلشیں ہونے لگیں۔ ایک روز حاجی اور امیر خاں چھ سات سو سوار لے کر ہنڈ کی طرف بڑھے۔ قلعہ کا جنوبی دروازہ دریا کی سمت تھا، اس سے ڈیڑھ دو سو قدم کے فاصلے پر کچھ ٹیلے تھے۔ مولانا نے ڈیڑھ سو غازی ان میں چھپا دیے اور کہہ دیا کہ جب سوار قلعہ کے پاس آ جائیں اور ہم لوگ ان پر بندوقیں اور شاہینیں مارنے لگیں تو کمین گاہ سے نکل کر ان پر حملہ کر دینا، اس سے پیشتر اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلنا۔

سوار آئے، پہلے ان پر شاہینوں سے گولے پھینکے گئے، وہ نہ رکے۔ پھر بندوقوں کے فائر شروع ہوئے اس اثناء میں کمین گاہ والوں نے ایک ایسی باڑھ ماری کہ سب سوار

---

(۱) "منظورہ" ص: ۵۲۸

منتشر ہو کر ہریانہ کی طرف بھاگ گئے، اس چپقلش میں غازیوں یا مخالفوں میں سے نہ کوئی مارا گیا اور نہ زخمی ہوا۔

مزید تین مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ ایک روز امیر خاں اڑھائی تین ہزار کی جمعیت لیکر آ گیا، مولانا نے قلعے کی جنوبی سمت میں غازیوں کو کمین گاہ میں بٹھا دینے کے علاوہ شمالی سمت میں بھی دو اڑھائی سو قدم کے فاصلے پر کمین نشینی کا انتظام کر دیا۔ شیخ بلند بخت دیوبندی کو شمالی کمین گاہ کے ڈیڑھ سو غازیوں کا کماندار بنایا، خود قلعے میں رہے اور دونوں کمین نشیں لشکروں کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن قریب نہ آ جائے حرکت نہ کرنا۔ چنانچہ یہ سوار قریب آئے تو مولانا نے قلعہ سے نکل کر نعرۂ تکبیر کے ساتھ ایسا سخت حملہ کیا کہ وہ بے تحاشا بھاگ نکلے۔ غازی آدھ میل تک ان کے تعاقب میں گئے۔ (۱)

ہندوستانی غازیوں کی چابک دستی

غازیوں کے پاس دس اونٹ تھے، جنہیں چرنے کیلئے روزانہ باہر بھیجا جاتا تھا، بیس تیس بندوقچی ان کی حفاظت کیلئے جاتے تھے۔ ایک روز کنڈوہ کی طرف سے، جو ہنڈ اور زیدہ کے درمیان شمال مائل بہ غرب واقع ہے، بندوقوں کی آواز آئی۔ مولانا دریافت احوال کیلئے قلعہ کے دروازے سے باہر نکلے، جب کچھ معلوم نہ ہو سکا تو وہیں بیٹھ گئے۔ دوسرے غازی اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اس اثناء میں برجوں والے غازیوں نے دیکھا کہ اطراف سے دشمن کے سوار چلے آ رہے ہیں اور وہ حوالیٔ قلعہ کو میدانِ قتال بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اطلاع مولانا کو ملی تو آپ نے خود نقارہ بجا کر غازیوں کو تیاری کا حکم دے دیا لیکن سخت تاکید کر دی کہ کوئی باہر نہ نکلے، صرف ایک جماعت کو دروازے سے نکال کر مکئی اور گنے کے کھیتوں میں چھپا دیا اور فرمایا کہ جب دشمن قریب آ جائے تو باڑھ ماری جائے۔

---

(۱) "وقائع" ص: ۱۲۱، ۱۲۲

مجاہدین گھات میں بیٹھے رہے، لیکن جب دشمن کو دیکھا تو جوشِ تہور میں مولانا کے فرمان کو فراموش کر بیٹھے اور باہر نکل کر دو بدو جنگ کرنے لگے۔ چونکہ ان کی تعداد کم تھی اس لئے نرغے میں آگئے، اس وجہ سے ان کو کمک پہنچانا ضروری ہو گیا۔

مولانا نے تین سو غازیوں کو باہر بھیج دیا، ان کی چابک دستی اور مہارت جنگ کا یہ عالم تھا کہ جب تک دشمن کی طرف سے ایک مرتبہ گولیوں کی باڑھ آتی، مجاہدین کئی مرتبہ بندوقیں چلاتے۔ یار محمد خاں کے آدمی پیچھے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ ہندوستانی تو ایک بلا ہیں، کس قیامت کی آگ برساتے ہیں، اپنے بندوقچیوں کو دیکھو، جب تک وہ ایک فائر کرتے ہیں ہندوستانی بے شمار فائر کر جاتے ہیں۔(۱)

آخر خود یار محمد خاں کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا، وہ نوشہرہ میں تھا کہ سید صاحب نے مولانا کو ہنڈ سے اپنے پاس بلا لیا۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادی قلعے کی فوج کے افسر اعلیٰ، پیر خاں مورائیں اور میرزا احمد بیگ پنجابی ان کے مشیر مقرر ہوئے۔

یار محمد خاں ہریانہ پہنچا تو اس کے پاس تو دس ہزار آدمیوں، چھ توپوں کے علاوہ شاہینیں اور اونٹ بھی تھے، ایک ہاتھی بھی تھا۔ سلطان محمد خاں نے اسے بہت روکا، یہ بھی بتایا کہ سید صاحب کو زیر کرنے کیلئے دستورا اتنا بڑا لشکر لے کر آیا، لیکن زیر نہ کر سکا، کیوں خواہ مخواہ بلا میں پڑتے ہو؟ لیکن یار محمد خاں نہ رکا، یا سمجھ لیجئے کہ گردشِ تقدیر نے اسے نہ رکنے دیا اور اسے کشاں کشاں انجام گاہ پر لے آئی۔

ایک دردناک حادثہ

اس عہد کا ایک دردناک واقعہ بھی سن لیجئے۔

---

(۱) "منظورہ" ص ۵۳۱

عبدالرحیم نومسلم منشی محمدی انصاری کا رفیق تھا۔ منشی صاحب نے اپنی بندوق اسے دے کر تاکید کر رکھی تھی کہ اگر اچانک جنگ چھڑ جائے تو اسے جلد میرے پاس پہنچا دینا۔ عبدالرحیم ایک روز اونٹ چرانے چلا گیا، پیچھے جنگ شروع ہوگئی۔ منشی صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے تھے، بہادر عبدالرحیم جوشِ حمیت میں خود شریک جنگ ہوگیا اور بندوق کا چقماق گم کر بیٹھا۔ بھاگا بھاگا قلعہ میں آیا، منشی صاحب نے بندوق لے کر خود جنگ میں جانا چاہا، اس کیلئے موزوں چقماق نہ ملا تو ایک پرانا مستعمل ٹکڑا اٹھا کر لگا لیا۔ منشی صاحب کا خیال تھا کہ بندوق خالی ہے۔ عبدالرحیم نے بھی کچھ نہ بتایا، منشی صاحب نے بندوق کی لبلبی دبادی تاکہ نئے چقماق کی درستی کا اندازہ ہوجائے۔ اس چقماق کے چار ٹکڑے ہوگئے، منشی صاحب نے ان میں سے بڑا ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ لگایا اور عبدالرحیم سے فرمایا کہ اگر یہ ٹکڑا آگ دے گیا تو فی الحال اسی سے کام لوں گا۔

عبدالرحیم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، جانتا تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے، اگر چقماق آگ دے گیا تو گولی چلے گی، لیکن تقدیر کی بات وہ اب بھی چپ رہا۔ منشی صاحب نے دوبارہ لبلبی دبائی، ادھر لبلبی دبی ادھر چقماق سے شعلہ نکلا۔ بھری ہوئی بندوق چلی اور گولی عبدالرحیم کے شانے سے نیچے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن (بروز جمعہ ۲۷/صفر ۱۲۴۵ھ، مطابق ۲۶/اگست ۱۸۲۹ء) اسی صدمے سے عصر کے وقت عبدالرحیم کا انتقال ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس لڑائی کا ذکر اوپر آیا وہ صرف ایک روز پہلے یعنی ۲۶/صفر مطابق ۲۵/اگست کو ہوئی تھی۔

منشی محمدی کو اس واقعہ کا بڑا قلق تھا، لیکن بہادر و نیک دل عبدالرحیم سکراتِ موت میں بھی بار بار منشی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہتا رہا: بھائی صاحب! رنج و غم نہ کریں، آپ نے مجھے نہیں مارا آپ کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے؟ میں بتا نہ سکا۔ جو کچھ پیش آیا، وہ تقدیری معاملہ تھا۔

پندرھواں باب:

جنگِ زَیدہ

یار محمد خاں کی تدبیریں

یار محمد خاں نے ہریانہ پہنچتے ہی زور شور سے توپیں چلانے کا حکم دے دیا۔ اہل سمہ توپوں سے بہت خائف تھے۔ یار محمد کی غرض یہ تھی کہ جو لوگ سید صاحب کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں، وہ توپوں کی آواز سن کر رُک جائیں، یا پہاڑوں پر بھاگ جائیں۔ یوں دورانِ جنگ میں اندیشہ ہی نہ رہے گا کہ وہ کسی موقع پر سید صاحب کی اعانت کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ یہ تدبیر خاصی کامیاب ہوئی۔ اکثر ملکی لوگ گھر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے اور سید صاحب کے ساتھ رؤسا میں صرف فتح خاں پنجتاری، فتح خاں والیٔ زَیدہ، اس کا بھائی ارسلان خاں یا ان کے کچھ عزیز اور متفرق لوگ رہ گئے۔

پھر یار محمد خاں نے زیدہ سے تھوڑے فاصلے پر بدرئی ندی کے کنارے ڈیرہ جمایا، غازیوں نے مقابلے پر صف بندی کر لی جو زیدہ سے شاہ منصور تک پہنچی ہوئی تھی۔ دفعۃً یار محمد خاں کے لشکر سے پانسو سوار الگ ہو کر غازیوں کی صف بندی کے دائیں جانب بڑھے، خیال ہوا کہ شاید وہ عقب میں پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن وہ دریا کے کنارے کنارے کالا ڈورہ، صوابی اور مانیری کی طرف نکل گئے اور راستے میں کچھ مویشی پکڑ لئے، پھر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ساتھ ملانا چاہا، مانیری والوں نے اس زور سے ان پر حملہ کیا کہ وہ بھاگ نکلے اور مویشی بھی چھوڑ گئے۔ سید صاحب نے فتح خاں کے پچیس تیس سوار بھیج کر تمام مویشی اصل مالکوں کو لوٹا دیے۔

اس کے ساتھ ہی یار محمد خاں کے کچھ آدمیوں نے قلعہ ہنڈ کے سامنے جا بجا دمدمے بنانے کی تیاری کی، مقصود یہ تھا کہ توپیں لگا کر قلعے پر گولے برسائیں۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے ایسی باڑھ ماری کہ خان کے سب آدمی بھاگ گئے۔

پیامِ مصالحت

اس اثناء میں چار ملا گھوڑوں پر سوار یار محمد خاں کی طرف سے صلح کا پیغام سید صاحب کے پاس لائے۔ مضمون یہ تھا کہ آپ زیدہ سے پنجتار چلے جائیں اور ہنڈ خالی کر دیں، ورنہ توپیں لگا کر زیدہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائیگی اور غازیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا جائے گا۔ ''وقائع'' کے بیان کے مطابق سید صاحب نے فرمایا:

> یار محمد خاں کو ہماری طرف سے بعد سلام کہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے ملک میں آئے ہیں، صرف اس لئے کہ سب بھائیوں کو متفق کر کے جہاد کریں تاکہ دین اسلام ترقی کرے اور قوت پکڑے۔ آپ بھی مسلمان رئیس، والیٔ ملک اور نامور ہیں، آپ کو بھی لازم ہے کہ ہمارا ساتھ دیں، نہ کہ کافروں اور باغیوں کے حامی اور طرفدار بن کر ہم سے لڑیں۔ ہم نے خادے خاں کو جو قتل کیا اور اس کا قلعہ چھین لیا تو وہ ہمارے ہاتھ پر بیعت امامت کر کے باغی ہو گیا تھا اور کئی بار سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لایا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے ہماری خونریزی اور بدخواہی میں کوتاہی نہ کی، مگر اللہ تعالیٰ ہمارا حافظ و ناصر تھا، اس نے ہم لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ اب آپ اس باغی کے خون کا دعویٰ لے کر ہم سے لڑنے آئے ہیں، یہ حرکت آپ کی شان سے بعید ہے۔ واجب ہے کہ آپ اس بات سے توبہ کریں، خدا سے ڈریں، اپنے ملک کو چلے جائیں اور دائرۂ اسلام سے قدم باہر نہ دھریں۔ حد شریعت سے تجاوز نہ فرمادیں، نہ مانیں گے تو دنیا میں رسوا

دشرمسار اور قیامت کے دن عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے۔(۱)

سید صاحب نے یہ جواب دے کر ملا صاحبان سے کہا کہ پہر چھ گھڑی میں اس کا جواب لا دیجئے۔ وہ مقررہ وقت پر نہ آئے تو سید صاحب نے اپنی طرف سے چار آدمیوں کو بھیج دیا، ایک قابل اخوندزادہ ساکن منگل تھانہ، دوسرا مولوی عبدالرحمٰن تورو، تیسرا ملا صاحب ڈاگئی اور چوتھا ملا صاحب گبائی۔ منشی خواجہ محمد اور چار قراجین دار ساتھ کر دیے تاکید فرما دی کہ ان پانچوں غازیوں کو سردار کے لشکر سے ورے ٹھہرا دینا۔

یار محمد خاں نے سید صاحب کے پیغام مصالحت کا نہایت درشت جواب دیا، آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب کوئی شخص صلح کا پیام لایا تو اس کا سر اڑا دوں گا۔(۲) سید صاحب نے اسی وقت حکم دیدیا کہ تمام غازیوں کو باہر کے مورچوں سے بستی میں بلا لیا جائے۔

قلندر کا واقعہ

لشکر اسلام میں ایک مجذوب درویش رہتا تھا جسے سب "قلندر" کہتے تھے۔ اسے پکی پکائی روٹی دی جاتی تھی، وہ پھرتا پھراتا درانیوں کے لشکر میں چلا گیا۔ واپس آیا تو دونوں کانوں سے خون بہہ رہا تھا۔ غازیوں نے سبب پوچھا تو بولا: بھائیو! میرا خون بہہ چکا ہے، اب تمہارا خون نہیں بہے گا۔ سید صاحب نے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ مجھے یار محمد خاں کے پاس لے گئے تھے اور وہاں یوں سوال و جواب ہوئے۔

یار محمد: تم کہاں رہتے ہو اور ہمارے لشکر میں کیا دیکھتے پھرتے ہو؟

---

(۱) "وقائع" ص: ۸۴۷۔ "منظورہ" میں ہے کہ سادات میں سے ایک شخص صلح کا ایلچی بن کر آیا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ صلح بہر حال بہتر ہے لیکن یہ تو دیکھا جائے کہ کشمکش کا سبب کیا ہے؟ ہماری کوئی ذاتی غرض نہیں، صرف یہ چاہتے ہیں کہ مخالف لوگ خدا اور رسولؐ کے احکام قبول کر لیں۔ وہ مسلمان ہیں، ان کے لئے یہی زیبا ہے۔ یہ ایلچی کئی مرتبہ آیا گیا، یہاں تک کہ شام ہو گئی اس پر مجاہدین کے دل میں شبہ پیدا ہو گیا کہ دشمن نے صلح کا دام فریب صرف اس غرض سے بچھایا ہے کہ رات اطمینان سے گزار لے۔

(۲) "منظورہ" ص: ۵۲۰

قلندر: میں مسلمانوں کے لشکر میں رہتا ہوں۔

یار محمد: یہ لشکر بھی تو مسلمانوں کا ہے۔

قلندر: نہیں، یہ باغیوں کا لشکر ہے۔

یار محمد: (خفگی کے لہجے میں) ادھر اُدھر کیا دیکھتا پھرتا تھا؟

قلندر: مسلمانوں کا مال و اسباب۔

یار محمد: تو اس لشکر کو باغیوں کا بتاتا ہے، تو اس کا مال کن مسلمانوں کا ہے؟

قلندر: یہ سب انہیں مسلمانوں کا ہے جن کے لشکر میں میں رہتا ہوں۔

یار محمد: ایسی بات منہ سے نہ نکال، ہمارے لئے دعاء کر، ورنہ مارا جائے گا۔

قلندر: میں موت سے نہیں ڈرتا، دعاء انہیں مسلمانوں کے لئے کروں گا، تیرے لئے نہیں کرسکتا، تو باغی ہے اور باغیوں کا ساتھی۔

سردار نے حکم دیدیا کہ اسے قتل کردو، مصاحبوں نے کہا کہ یہ تو دیوانہ ہے، جو منہ میں آتا ہے بکتا پھرتا ہے۔ اس بیچارے کو سزا دینا مناسب نہیں۔ یار محمد نے کہا کہ اچھا اس کے ہاتھ اور ناک کاٹ دو، مصاحبوں نے پھر نرمی کی درخواست کی، سردار نے کہا کہ اچھا اس کے کان کاٹ کر رخصت کردو، اس پر عمل ہوا۔

سید صاحب یہ سن کر دیر تک سکوت میں رہے پھر فرمایا: وہ بڑا بے درد ہے، تمہارا بدلہ منتقم حقیقی لے گا۔ نور بخش جراح کو حکم دیا کہ قلندر کی مرہم پٹی کردو۔

لشکروں کی کیفیت

اسی وقت مغرب کی اذان ہوئی، بعد نماز سید صاحب نے دعاء فرمائی:

الٰہی! تو بڑا قادر، کارساز اور عاجز نواز ہے۔ ہم تیرے بندے عاجز و ناچار تیرے فضل و کرم کے امیدوار ہیں۔ تو ہی ہم عاجزوں کا حامی و مددگار

> ہے۔ دشمنوں کے شر و فساد سے ہم لوگوں کو محفوظ و مامون رکھ اور اپنی مدد سے
> ناتوانوں کو ان پر مظفر و منصور کر۔

غازیوں اور درانیوں کے لشکروں کا موازنہ کرتے ہوئے صاحب ''منظورہ'' نے کیا خوب لکھا:

> ایک طرف کمال شوکت و قوت کا مظاہرہ تھا، دوسری طرف رب العزت کی اعانت پر نظر تھی۔ ایک طرف عساکر و توپ خانہ کا غرور، دوسری طرف قادر یگانہ کی قوت کے بھروسے پر دل مطمئن۔ سردار کی فوج شکوہ و جلال میں اصحاب فیل کے مثیل تھی، غازی عجز و ناتوانی کے پیش نظر ربِ ابابیل سے مدد کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ مخالفوں میں لشکر جالوت کا سا تبختر نمایاں تھا، مجاہدین کے دل قصہ طالوت سے فرحاں تھے۔

جنگ کے مشورے

''وقائع'' کا بیان ہے کہ نماز مغرب کے بعد سید صاحب نے اپنے خاص رفیقوں سے جنگ کے بارے میں صلاح پوچھی، مختلف تجویزیں پیش ہوئیں، لیکن کسی بھی تجویز پر طبیعت میں انشراح پیدا نہ ہوا۔ آخر سید صاحب نے فرمایا کہ بھائیو! ہر بات کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو، صبح کو بستی کے کنارے قبرستان والے میدان میں مقابلہ ہوگا، پھر یا تو اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا کرے گا یا اسی جگہ ہم سب شہادت پائیں گے۔ مولانا سے فرمایا کہ شہر پناہ میں مناسب مقامات پر پہروں کا انتظام کر دیجئے، باقی سب بھائی آرام کریں، لیکن کمریں باندھے رہیں۔

''منظورہ'' میں ہے کہ درانیوں کی تعداد چونکہ غازیوں سے بہت زیادہ تھی اور ان کے پاس ساز و سامانِ جنگ بھی بہت اچھا تھا، اس لئے مشیروں نے عرض کیا کہ شبخون کی اجازت دی جائے، اگر دشمن لشکر کے لوگ غافل ہوں گے تو ہم انہیں مار لیں گے، اگر وہ

غافل نہ ہوئے اور لڑائی چھڑ جائے گی تو اس کیلئے بھی رات ہی کا وقت بہتر ہے، جس میں غازیوں کو اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کا مشاہدہ پریشان نہ کرے گا۔ لیکن اس وقت تک گفتگوئے صلح کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی، اس وجہ سے سید صاحب نے اجازت نہ دی۔ آخر یار محمد خاں کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ اب کوئی شخص صلح کی تجویز لے کر آیا تو اس کا سر اڑا دوں گا۔ اس وقت سید صاحب نے شبخون کا حکم دے دیا، اسی لئے باہر کے مورچوں کے غازیوں کو بستی میں بلا لیا گیا تھا۔

آخری حکم

"وقائع" کے بیان کے مطابق سید صاحب نے نمازِ عشاء کے بعد کھانا کھایا، مولانا بھی ساتھ بیٹھے، فارغ ہو کر مولانا سے فرمایا کہ آپ اب آرام کریں، گویا اس وقت تک صبح کے وقت قبرستان کے میدان میں جنگ کرنے کی تدبیر پکی تھی، تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد آپ اُٹھے اور آواز دی کہ کوئی ہے؟ حافظ صابر تھانوی حاضر ہوئے تو فرمایا: میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) کو بلا لایئے۔ مولانا آئے تو فرمایا کہ شبخون کی تدبیر بہت مناسب ہے، آپ بستی سے باہر گڑھی میں ٹھہریں، ہم وہیں آدمیوں کو بھیجتے ہیں۔ (۱) بعض بیانات میں بتایا گیا ہے کہ یار محمد کے لشکر میں ایسے اصحاب بھی تھے جو سید صاحب کے ساتھ دلی خلوص رکھتے تھے، مثلاً ارباب فیض اللہ خاں مہمند ہزار خانی، ارباب جمعہ خاں، (برادر ارباب بہرام خاں) وہ مجبوراً سردار کے ساتھ آئے تھے، انہوں نے عبدالحلیم نام ایک شخص کے ہاتھ خفیہ پیغام بھیجا کہ صبح زیدہ کو توپوں سے تباہ کر ڈالنے کا فیصلہ ہو چکا ہے، آپ اس وقت جو تدبیر فرما سکیں، اس میں توقف نہ فرمائیں۔ (۲)

---

(۱) ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ مجھے ابھی جناب الٰہی سے اشارہ ہوا کہ دشمن تدبیر کر رہے ہیں تو کیوں اپنی تدبیر سے غافل ہے؟

(۲) بعض اصحاب نے حاجی خاں کاکڑ کو بھی انہیں مخلصین میں شمار کیا ہے۔

مولانا گڑھی میں پہنچ گئے، سید صاحب نے تھوڑی دیر میں تین سو غازی اور چار سو ملکی ان کے پاس بھیج دیے۔(۱) حسب معمول سب سے فرمایا کہ گیارہ گیارہ مرتبہ سورۂ قریش پڑھ کر دم کرلو۔

سواروں سے مڈ بھیڑ

مولانا نے غازیوں کو گڑھی سے نکال کر میدان میں کھڑا کیا۔ دیر تک ننگے سر ہو کر دعاء کرتے رہے، پھر ایک رہبر کے پیچھے پیچھے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ درانیوں کا لشکر اگرچہ دور نہ تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غازی سیدھے جانے کے بجائے کوس ڈیڑھ کوس کا چکر کاٹ کر گئے تھے، اس وجہ سے ذرا دیر ہوگئی۔ اخفا کی یہ کیفیت تھی کہ جن لوگوں کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں، انہیں حکم دے دیا گیا تھا کہ توڑوں کو اس وقت تک مٹھیوں میں چھپائے رکھیں جب تک بندوقیں سر کرنے کی نوبت نہ آئے۔ چلتے چلتے ایک سو سوار ہند کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔(۲) غازی ان پر گولیاں چلانا چاہتے تھے، مولانا نے سب کو روک دیا۔

سوار عین سامنے پہنچ گئے تو انہوں نے غازیوں کو دیکھ لیا، ایک نے پشتو میں پوچھا: سوکے؟'' (یعنی کون ہو؟) شیخ علی محمد دہلی (دیوبندی) بے تکلف پشتو بولتے تھے، انہوں نے جواب دیا: ''اخپل'' (یعنی اپنے ہی لوگ ہیں)۔ سوار نے پھر پوچھا: کم جائے راغلے؟ (کہاں سے آئے ہو؟) شیخ نے جواب دیا: لـــخـــکـــر اوتمان زئی (اوتمان زئی

---

(۱) ''منظورہ'' میں ہے: مجاہدین ہندوستانی و قندھاری و دیگر مخلصین اہل دیار ششش بقلت صد، غایت ہشت صد نفر سوار و پیادہ خواہند بود۔

(۲) ''وقائع'' میں ہے چار پانچ سو۔ میرے نزدیک ''منظورہ'' کا بیان صحیح ہے، ویسے رات کا وقت تھا، راویوں نے تخمینہ پیش کیا۔ صحیح تعداد کسی کو معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ ''منظورہ'' میں یہ بھی ہے کہ پہلے ایک چوبدار مشعل لیے نظر آیا، اس نے غازیوں کو دیکھ کر خوف سے مشعل بجھا دی، غازی آگے بڑھے تو سوار دکھائی دیے۔

سے لشکر آیا ہے)۔ یہ سن کر ایک سوار قریب آیا۔ غازیوں کو پہچان کر شور مچاتا ہوا بھاگا: ''داغازیاں دے'' ''داغازیاں دے'' (یہ غازی ہیں، یہ غازی ہیں)۔ باقی سوار بھی بھاگے، غازیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے حملہ کر دیا، لشکر گاہ کے قریب پہنچے تو توپخانے کی مہتابی روشن ہوئی اور توپیں چلنے لگیں۔ ان کی آواز سن کر ملکی لوگ سراسیمگی میں زیدہ کی جانب لوٹ پڑے۔ مولوی امیر الدین ولایتی بھی انہیں میں تھے، انہیں غالباً کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا صورت پیش آئی۔(۱)

جنگ کی کیفیت

مولانا نے گڑھی سے نکلتے ہی اپنے غازیوں اور ملکی لشکریوں کی ٹولیاں الگ الگ بنا دی تھیں، اپنے غازیوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا اور پہلے سے بتا دیا تھا کہ حملہ اس جگہ کیا جائے گا جہاں توپیں اور شاہینیں ہیں۔ توپوں سے گولے چھوٹنے لگے تو مولانا نے اپنے غازیوں کی ایک جماعت کو توپوں کی دائیں جانب، دوسری کو بائیں جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ تیسری جماعت کو لے کر خود عین سامنے سے پیش قدمی کی، گولے برابر آرہے تھے، دو مرتبہ پہلے فائر ہوا تھا، تین مرتبہ بعد میں ہوا۔ اس اثناء میں مولانا نے پانچ توپوں پر قبضہ کر لیا، چھٹی توپ وہاں سے کسی قدر فاصلے پر کنڈ وہ کی جانب تھی، وہ اس سے تیزی کے ساتھ فائر ہونے لگے، مولانا نے چالیس پچاس بندوقچیوں اور قرابین چیوں کو اس کے عقب سے حملے کے لئے بھیج دیا، دو گولہ انداز گرفتار ہو گئے، تیسرا بھاگ گیا اور وہ توپ بھی قبضے میں آگئی۔ گویا درانی لشکر کا سب سے کارگر اور دہشت انگیز سامانِ جنگ غازیوں کے ہاتھ آ گیا۔

---

(۱) ''منظورہ'' میں ہے کہ غازی، سواروں کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ کسی غازی نے اچانک گولی چلا دی۔ گولی کی آواز سن کر سوار بھاگے اور غازی ان کے پیچھے لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

اس اثناء میں یار محمد خاں کا ایک مصاحب پکڑا گیا، جس کی پشت پر تلوار لگی۔ اس سے اور دوسرے اسیروں سے یار محمد خاں کا پتا پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کنڈ و والی توپ کے پاس تھا، اس کے گولی لگی اور ساتھی اسے اٹھا کر لے گئے۔

اس توپ سے چند فائر کرنے کے بعد غازیوں نے لشکر گاہ میں پھر پھر دیکھنا شروع کیا تو زیادہ تر خیمے خالی پائے۔ بعض خیموں سے دو دو چار چار آدمی سراسیمہ وار بھاگ رہے تھے، بعض لوگ یار محمد خاں کی امداد کے لئے اِدھر اُدھر سے جمع کیے گئے تھے، انہوں نے پانسہ پلٹتے دیکھا تو جو مال ہاتھ لگا اٹھا کر اپنے گھروں کو فرار ہو گئے۔

اگرچہ فتح حاصل ہو چکی تھی لیکن اندیشہ تھا کہ یار محمد خاں کہیں پلٹ کر حملہ نہ کر دے، مولانا نے حکم دے دیا کہ غازی توپوں سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ اس اثناء میں مولانا مظہر علی عظیم آبادی اور پیر خاں مورائیں ہنڈ سے ستر اسی غازیوں کے ساتھ آ گئے، انہوں نے بتایا کہ یار محمد خاں کے لشکری ہمارے پاس سے بھاگے جا رہے تھے۔ ہم نے بھی ان پر گولیاں چلائیں، مولانا نے فرمایا کہ اس نازک موقع پر قلعے کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، آپ واپس چلے جائیں۔

یار محمد کا انجام

مولانا نے مال غنیمت جمع کرایا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں: ایک ہاتھی، ساٹھ ستر اونٹ، کچھ کم تین سو گھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاکشیں، تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا، بلکہ لوگ جو مال اٹھائے لئے جا رہے تھے، اسے حسن تدبیر سے واپس لیا، بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جوتے بھی چھوڑ گئے تھے، پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں، منوں خشک میوہ موجود تھا، بعض خیموں سے مستورات نکلیں، جنہیں سردار کے لشکری عیش رانی کی غرض سے زبردستی پکڑ لائے تھے، انہیں مولانا نے فوراً ان کے گھروں میں بھیج دیا۔

یار محمد خاں کے کاری زخم لگا تھا، اسے بہ مشکل گھوڑے پر سوار کر کے میدان سے باہر پہنچایا گیا۔ وہ ہریانہ اور دو ڈھیر کے درمیان لہادر میں یا اس کے آس پاس فوت ہوا، میت کو پشاور پہنچا کر دفن کیا گیا۔ اس یورش میں یار محمد خاں کے تین سو ساتھی مارے گئے، جن میں سے سات بڑے سردار تھے، ایک ہزار کے قریب گھوڑے ان ملکیوں کے قبضے میں چلے گئے، جنہیں یار محمد خاں نے دھمکا کر ادھر ادھر سے اپنے لشکر میں شامل کر لیا تھا۔

کارنامے کی حیثیت

غازیوں میں سے دو شہید ہوئے: ایک محمد حسن جن کے سینگڑے میں اتفاقیہ آگ لگ گئی اور وہ جل گئے، دوسرے نور محمد۔ چار غازی زخمی ہوئے: ایک کے ہاتھ پر تلوار لگی اور چار انگلیاں کٹ گئیں، صرف انگوٹھا باقی رہ گیا، دیندار خاں کے دائیں مونڈھے پر تلوار کا زخم آیا، میرزا وزیر بیگ کے ہاتھ پر تلوار لگی، شیخ علی محمد دہلوی کے سر پر تلوار کا زخم آیا۔ (۱) اتنے تھوڑے نقصان کے ساتھ اتنے کثیر التعداد اور ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس لشکر کو ایسی سخت شکست دینا یقیناً ایک عظیم الشان کارنامہ تھا، جسے بڑے بڑے جرنیلوں کی بہترین فتوحات کے مقابلے میں بے تکلف فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مولانا شاہ اسماعیل کی یگانہ صلاحیتِ قیادت اور مہارتِ فنونِ حرب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

زیدہ کے حالات

مولانا میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت کی فراہمی اور فہرستوں کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ فتح کی خبر زیدہ بھیجی تو یہ حیرت انگیز اطلاع ملی کہ سید صاحب پنجتار روانہ ہو گئے، ہوا یہ کہ غازی شبخون کے لیے روانہ ہوئے تو سید صاحب مسجد میں جا بیٹھے اور بڑی دیر تک دعاء کرتے رہے۔ پھر گڑھی کے برج میں پہنچے، دیر تک گولیوں کی آواز نہ آئی، سید

---

(۱) "منظورہ" میں ہے: چار نفر بہ درجہ شہادت معزز و سرفراز گشتند۔

صاحب دوبارہ دعاء میں مشغول ہو گئے۔ چند مرتبہ توپیں چلنے کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اس اثناء میں وہ ملکی لوگ پہنچ گئے جو میدانِ جنگ سے خواہ مخواہ بھاگ گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ سب غازی شہید ہو گئے۔(۱) یہ خبر سن کر ہر دل پر غم والم کی گھٹائیں چھا گئیں، فتح خاں پنجتاری نے سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ پنجتار تشریف لے چلیں، آپ سلامت ہیں تو خدا پھر سامان درست کر دے گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ خان بھائی! ذرا توقف کریں، تعجیل مناسب نہیں، اللہ کے فضل سے ہمیں فتح کی امید ہے۔

سید احمد علی نے کہا کہ آپ کس دلیل سے فتح کی امید ظاہر کرتے ہیں؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ پہلے توپیں اور بندوقیں چلی تھیں تو شعلہ ہائے رنجک ست مخالف میں تھے، اور شعلہ ہائے کارتوس ہماری جانب، دوسری مرتبہ معاملہ برعکس نظر آیا، اس سے ظاہر ہے کہ پہلے توپیں درانیوں کے قبضے میں تھیں، پھر غازیوں کے قبضے میں آ گئیں، لیکن فتح خاں اور سید احمد علی اصرار کرتے رہے، پھر سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر برج سے اُتارا اور ساتھ لے کر یہ کہتے ہوئے پنجتار کی جانب روانہ ہو گئے کہ اگر فتح ہماری ہے تو پھر بھی نکل جانے میں قباحت نہیں، دوبارہ واپس آ سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں چلنا ہی قرین احتیاط ہے۔ سید صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اگر غازیوں کی شہادت کا بیان درست ہے تو ہم تھوڑے غازیوں کو لے کر کہاں جائیں گے، بہتر یہ ہے خدا کے بھروسے پر یہیں بیٹھیں، جو کچھ منظور ہوگا ہو رہے گا، لیکن یہ بات کسی نے نہ سنی۔

---

(۱) "وقائع" میں ہے کہ یہ خبر مولوی امیر الدین ولایتی نے دی تھی، لیکن مولوی صاحب ممدوح بڑے متقی، دیندار، مخلص، شجاع اور سید صاحب کے معتمد علیہ تھے۔ ان کے ساتھ اس قسم کی غیر محقق بات منسوب نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو ملکی لوگ میدان چھوڑ کر آ گئے تھے، انہوں نے اپنی مراجعت کو معقول ظاہر کرنے کے لئے یہ داستان وضع کر لی، مولوی امیر الدین چونکہ ان میں شامل تھے، اس لئے ممکن ہے مختلف لوگوں کے بیانات کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ "منظورہ" میں ہے: ولایتیاں کہ وقت مقابلۂ درانیاں گریختہ بودند، بہ لحاظ بے سامانی مومنین بظن فاسد خود خبر دروغ شکست مومنین رسانیدند۔

سفر مراجعت

مولانا نے سید عبدالرؤف بابڑہ والے اور مومن قیصری کو بھیجا اور سید صاحب کو مانیری سے واپس بلایا۔ دیر کے بعد مال و اسباب لے کر زیدہ کی طرف چلے۔ آگے آگے چار توپیں تھیں، پچاس ہندوستانی غازی اور سارے ملکی ان کے ساتھ تھے، دو توپیں سب سے پیچھے تھیں، بیچ میں مال سے لدے ہوئے گھوڑے، خچر اور اونٹ تھے۔ جو قیدی پکڑے گئے تھے، وہ بھی ساتھ تھے۔ غازیوں کے جیش دائیں بائیں جا رہے تھے، سید صاحب شاہ منصور پہنچے تو مولانا خود پیشوائی کے لئے باہر نکلے، سید صاحب نے گھوڑے سے اتر کر فرط محبت سے مولانا کو سینے سے لگا لیا۔

غازیوں میں سے ایک صاحب ''نواب'' کے لقب سے مشہور تھے۔ خیر میں سید صاحب کے پاس پہنچے تھے، اس تلقب کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو سید صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا: آؤ نواب بھائی: انہوں نے عرض کیا کہ حضرت نے مجھے نواب تو بنا دیا، اب سواری کیلئے ہاتھی دیجئے۔ فرمایا خدا تعالیٰ کی رحمت سے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جنگ زیدہ میں جو ہاتھی ملا تھا، مولانا نے ''نواب'' کو اس پر سوار کر کے پیشوائی کے لئے پہلے بھیج دیا تھا۔ ''نواب'' نے خود عرض کیا کہ آپ کی دعاء سے ہاتھی بھی مل گیا۔

چوتھے روز سید صاحب پنجتار روانہ ہوئے۔ کالا درہ، صوابی، مانیری، سلیم خاں، خلی کلئی، سنگ جئی اور غور غشتی ہوتے ہوئے گئے۔ ہر موضع میں کچھ روپے بطور انعام تقسیم فرمائے۔

جنگِ زیدہ کی تاریخ

اب ایک سوال رہ گیا کہ جنگ زیدہ کس تاریخ کو ہوئی؟ ''منظورہ'' میں ہے کہ ربیع

الاول کی پندرھویں تاریخ (۱۲۴۵ھ) اور ہفتے کا دن تھا، دو گھڑی دن چڑھا تھا کہ مخالف لشکر نمودار ہوا۔ تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کا دن یا ۵/ ربیع الاول کو تھا یا ۱۳/ کو، اس بنا پر ۵/ ربیع الاول کی تاریخ تو قبول کی جا سکتی ہے، ۱۵/ درست نہیں سمجھی جا سکتی۔

سید صاحب نے جنگ زیدہ کے بعد پشاور کے بعض مشہور علماء کو ایک مکتوب بھیجا تھا، جس پر ۱۰/ ربیع الاول کی تاریخ ثبت ہے۔ اس میں خادے خاں اور یار محمد خاں دونوں کے یکے بعد دیگرے قتل کا ذکر ہے۔ (۱) ایک اعلام سلطان محمد خاں کو بھی ارسال فرمایا تھا اس پر ۸/ ربیع الاول مرقوم ہے۔ (۲) اس میں بھی جنگ زیدہ کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ ۵/ یا ۶/ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (۴/ یا ۵/ ستمبر ۱۸۲۹ء) کو ہوئی۔

اہم کاغذات

مال غنیمت میں یار محمد خاں کے کچھ کاغذات بھی ملے تھے، جن میں رنجیت سنگھ کا ایک فرمان تھا، اس کا مضمون یہ تھا۔

۱۔ غازیوں پر لشکر کشی کی جائے۔

۲۔ لیلیٰ، مرواریہ، سیہ کہار غیرہ گھوڑے دنتو را کے حوالے کر دیے جائیں۔ (یہ تینوں گھوڑے سلطان محمد خاں کے تھے اور اس عہد میں اپنی خوبصورتی اور تیز رفتاری کے باعث دور دور مشہور تھے۔ لیلیٰ کی قیمت ساٹھ ہزار روپے بتائی جاتی تھی)۔

۳۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جلد سے جلد ملک سے نکال دیا جائے۔

۴۔ ہنڈ کو خادے خاں کے متعلقین کے حوالے کر دیا جائے۔

اگر ان تمام ہدایات کی تعمیل نہ ہوئی تو مجھے خود لشکر لے کر آنا پڑے گا۔ (۳)

ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یار محمد خاں اپنی غلط اندیشی کے باعث کس نوع کے

---

(۱) "منظورہ" ص ۵۲۸ (۲) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۲۰۵ (۳) مکاتیب شاہ اسماعیل ص ۲۰۶

نازیبا مقاصد کے لئے وقف ہو چکا تھا اور سکھوں کی نظروں میں اس نے اور خادے خاں نے جو اعتبار حاصل کیا تھا، اس کیلئے کس طرح انہیں اسلامیت کے تقاضوں سے یک قلم بے پروائی اختیار کرنی پڑی تھی۔

ملکیوں کو تفہیم

پنجتار پہنچتے ہی سید صاحب نے سب سے پہلے مسجد میں جا کر دوگانہ شکر ادا کیا، پھر قیامگاہ پر گئے۔ تھوڑے دن بعد جنگ ہنڈ اور جنگ زیدہ کا پورا مال غنیمت آ گیا۔ سید صاحب نے ایک روز وعظ میں لوٹ مار کی برائیاں بھی واضح کیں، فرمایا:

> لوٹ بہت بری چیز ہے، درحقیقت یہ اسلام کی بدخواہی ہے، جہاد بارگاہ الٰہی میں مقبول ہے، اس وجہ سے گناہ بخشے جاتے ہیں، لیکن لوٹ اور وہ بھی عین معرکے کے وقت، قوت اسلام کی شکست کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے تمام نیک اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ یہ وعظ سن کر مختلف ملکیوں نے اپنے گھروں سے ایک سو ستائیں گھوڑے لا کر پیش کر دیے۔ سید صاحب نے ان کے اس طریقے کی تحسین فرمائی۔

مال غنیمت کی تقسیم

جب پورا مال غنیمت پنجتار پہنچ گیا تو سید صاحب نے توپیں، شاہینیں، بندوقیں، تلواریں، تیغچے اور ڈیرے خیمے پورے مال سے الگ کر کے بیت المال میں داخل کر دیے۔ باقی مال کی قیمت کا اندازہ کر لینے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ جتنی قیمت بنے اس کے چار حصے غازیوں میں تقسیم کر دیے جائیں، ایک حصہ بیت المال میں رہے۔ غازیوں کے حصے میں سے سواروں کو دوہرا حصہ دیا جائے، پیادوں کو اکہرا۔ کل تخمینہ بائیس تیئس ہزار کا کیا گیا، ملکی لوگ اپنے حصے لے کر چلے گئے، ہندوستانی غازیوں نے عرض کیا کہ ہم تو

بیت المال سے لے کر کھاتے ہیں، بیت المال ہی سے کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں، ہم حصہ لے کر کیا کریں گے؟ یہ بھی بیت المال میں داخل فرما لیجئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ جو بھائی خوشی سے اپنا حصہ بیت المال کو دیں گے، اس کا ثواب جدا پائیں گے۔ اکثر نے اپنا حصہ لوٹا دیا، بعض اصحاب نے صرف وہ چیزیں رکھ لیں جن کی انہیں فوری ضرورت تھی۔

یار محمد خاں کے قتل کے بعد سلطان محمد خاں کی حالت اتنی نازک ہوگئی تھی کہ سید صاحب چاہتے تو زیدہ سے نکل سیدھے پشاور پہنچ جاتے۔ چونکہ سلطان محمد خاں کبھی کبھی اخلاص و ارادت کا اظہار کرتا رہتا تھا، اس لئے سید صاحب نے فرمایا کہ اس پر اعلام کے بغیر حملہ نہیں کریں گے۔

سلطان محمد خاں کی پریشانیاں

سلطان محمد خاں سخت کشمکش میں مبتلا تھا، ایک طرف یہ خطرہ تھا کہ سید صاحب پشاور پر چڑھائی نہ کر دیں، دوسری طرف رنجیت سنگھ کی طرف سے بار بار ''لیلیٰ'' ''مروارید'' اور ''سبھ کہار'' نام گھوڑوں کے لئے تقاضے ہو رہے تھے اور یہ مطالبہ مانے بغیر اس کے شر سے محفوظ رہنا مشکل تھا۔ سلطان محمد گھوڑے دینے پر راضی نہ تھا، خصوصاً لیلی (جو غالباً گھوڑی تھی) اسے بہت عزیز تھی۔ فتح علی پاشا بادشاہ ایران نے اس کے لیے ساٹھ ہزار روپے پیش کیے تھے، لیکن سلطان محمد خاں نے اس قیمت پر بھی دینے سے انکار کر دیا تھا، اب ہراس زدگی کے عالم میں ''لیلیٰ'' اور ''مروارید'' دونوں سکھوں کے حوالے کرنے پڑے۔ ''سبھ کہار'' جنگ زیدہ میں یار محمد کے ساتھ تھا، جب شبخون کی وجہ سے افراتفری مچی اور مختلف لوگ مال و اسباب لوٹنے لگے، تو خٹک قوم کے ایک فرد بخت خاں نے یہ گھوڑا سنبھال لیا اور لے کر میدان سے نکل گیا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ اس کا بہت آرزومند ہے، اس لئے بڑی قیمت لے کر یہ گھوڑا اٹک پہنچا دیا۔

یار محمد خاں اور خادے خاں کے مارے جانے سے سید صاحب کی تحریک دو بڑے خطروں سے فی الوقت محفوظ ہو گئی۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان حیرت انگیز فتوحات پر دوستوں کے حوصلے بڑھ گئے، دشمنوں، مخالفوں اور مذبذبوں کے دلوں پر رعب چھا گیا۔

جنگی فنون کی مشق

ورزش اور مختلف فنونِ حرب کی تعلیم کا زیادہ اہتمام اسی زمانے میں ہوا، نمازگاہِ جمعہ وعیدین کے پاس جو میدان تھا، اس میں اسپ سواری، نیزہ بازی، نشانہ بندی، شمشیر زنی وغیرہ کی باقاعدہ مشق ہوتی تھی۔ مختلف فنون کیلیے الگ الگ اکھاڑے بن گئے تھے، مثلاً:

۱۔ پھری گدکا اور رستم خانی: اس اکھاڑے کی ساری تعلیم شیخ عبدالوہاب اور خدا بخش ساکن منجھاؤں کے زیر اہتمام ہوتی تھی۔

۲۔ امر دج: یہ اکھاڑہ میرزا محمدی بیگ شاہ جہان آبادی نے قائم کیا تھا۔

۳۔ غفور خانی: اس اکھاڑے کے استاد سید لطف اللہ اور امام الدین رامپوری تھے۔

۴۔ اہلیٹی: اس فن کے استاد رجب خاں تھے۔

اسپ دوانی اور نشانہ بازی کی مشقیں الگ ہوتی تھیں۔

رسالداری کی تجویز

ایک روز سید صاحب اپنی قیامگاہ میں تشریف فرما تھے، مولانا شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، سردار فتح خاں پنجتاری، سید احمد علی بریلوی پاس تھے۔ فرمایا: ہمارا خیال ہے اب کسی کو رسالدار مقرر کردیں۔ سید احمد علی نے فوراً کہا کہ حمزہ علی خاں لوہاری والے اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، وہ بڑے ہوشیار اور بردبار آدمی ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل نے عبدالحمید خاں کا نام پیش کیا اور ارباب بہرام خاں نے مولانا کی تائید فرماتے ہوئے

کہا کہ عبدالحمید خاں واقعی فن سپہ گری میں بڑے ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر ہیں۔

سید احمد علی نے کہا کہ ان اوصاف کا سب اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ مزاج کے بڑے تند ہیں اور بات بات پر ناخوش ہوجاتے ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مجھے میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) اور ارباب صاحب کی تجویز بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اگلے روز سید صاحب نے مولانا، ارباب، سید احمد علی، شیخ عبدالحکیم، شیخ ولی محمد وغیرہ کو جمع کیا، پھر عبدالحمید خاں کو بھی بلایا اور فرمایا: خان بھائی! ہم کئی روز سے کسی کو رسالدار مقرر کرنا چاہتے تھے، تو ہم نے آپ کو یہ عہدہ دیا، آپ ان بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم دیتے رہیں۔

عبدالحمید خاں نے عذر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! میں فرمانبردار ہوں، لیکن میرا مزاج ذرا تند ہے اور یہ امر اختیاری نہیں کہ چھوڑ دوں۔ شاید بھائیوں کو میری افسری گراں گذرے، یہ کام خدا کے واسطے ہے اور عام رئیسوں کی سی فوج کا نہیں۔ سید صاحب نے سراپا شفقت بن کر فرمایا: خان بھائی! آپ اس کا اندیشہ نہ کریں، ہم دعاء کریں گے، امید ہے اللہ تعالیٰ مزاج کی تیزی دور کردے۔

اہم تقرر

پھر اپنا عمامہ دست مبارک سے عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا اور فرمادیا دوشالہ اور رومال دونوں میں سے جو پسند ہو لے لیجئے۔ خان نے رومال لے لیا، ایک سروہی سنہری قبضے کی جو خود ان دنوں باندھتے تھے، اس کا پرتلہ سابری تھا، خان کے گلے میں ڈال دی۔ یہ سروہی نواب امیر الدولہ نے سید صاحب کو نذر میں دی تھی اور نواب کو یہ راجا مان سنگھ والیٔ جودھ پور سے ملی تھی۔ ایک تلوار عنایت کی اور گھوڑا دے دیا جو نواب وزیر الدولہ نے ٹونک سے عبدالحمید خاں کے ہاتھ سید صاحب کیلئے بھیجا تھا، پھر برہنہ سر ہو کر دعاء کی کہ

اللہ تعالیٰ کفار پر کامیابی عطا کرے۔

رسالدار عبدالحمید خاں نے ایک اشرفی اور پانچ روپے بطور نذر پیش کئے، پھر وہاں سے نکل کر سیدھے مسجد میں گئے اور شکرانے کے دو نفل پڑھے۔

جنگ زیدہ کے بعد یہ عہدہ قائم ہوا اور سب سے پہلے عبدالحمید خاں نے اس پر تقرر کا شرف حاصل کیا۔ وہ شہید ہوئے تو حمزہ علی خاں کو رسالدار بنایا گیا۔ عبدالحمید خاں کے اخلاق و فضائل کی تفصیل کا یہ مقام نہیں بلاشبہ انکے مزاج میں ذرا تیزی تھی لیکن سب راوی متفق ہیں کہ رسالدار بننے کے بعد حلم، بردباری اور سلامت مزاج کا پیکر بن گئے تھے۔

سولھواں باب:

تربیلہ، ستھانہ اور امب

تربیلے پر حملے کی دعوت

ہزارہ میں محاذِ جنگ قائم کرنے کی سعی سید صاحب نے ۱۸۲۷ء میں فرمائی تھی، لیکن حالات ایسے پیش آ گئے کہ اچانک وہاں سے لوٹنا پڑا۔ تاہم ہزارہ سید صاحب کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوا، انہیں صرف یہ انتظار تھا کہ سمہ میں قدرے اطمینان کی شکل پیدا ہو جائے تو ہزارہ پر توجہ کریں۔ جنگ ہنڈ و زیدہ کے بعد خان زمان مشوانی رئیس کنگر نے ایک عریضہ اپنے ایک عزیز کے ہاتھ بھیجا کہ تربیلہ (۱) سکھوں سے خالی پڑا ہے، اگر آپ غازیوں کی ایک جماعت کو کھبل (۲) بھیج دیں تو میری قوم (مشوانی) پختہ ارادہ کر چکی ہے کہ فوراً تربیلہ پر ہلہ بول کر اس اہم مقام کو قبضے میں لے لیا جائے اور خود تربیلہ کے مسلمان اس تجویز پر متفق ہیں، وہ ہماری پوری امداد کریں گے۔

خان زمان خاں سید صاحب کے اخلاص مندوں میں سے تھا، آپ نے فیصلہ فرمایا کہ اب کے خود اس طرف تشریف لے چلیں۔ چنانچہ زمان خاں کو لکھ دیا گیا کہ مجاہدین

---

(۱) تربیلہ کسی ایک بستی کا نام نہیں بلکہ ایک مقام کی چھوٹی بستیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس مقام پر سرن ندی دریائے سندھ میں ملتی ہے، پہلے یہاں شیشم کا گھنا جنگل تھا جو ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہہ گیا، اب تربیلہ میں کم و بیش گیارہ مواضع یا اطراف ہیں، جن کے نام یہ ہیں: تربیلی، تھانیہ، گوجرہ، ناملی، بیہرا، مورتی، باندی یا گدڑ باندی، ڈموں، تندول، جہاز، جھنو۔

(۲) کھبل دو ہیں، جو ایک دوسرے کے پاس پاس ستھانہ سے چھ میل جنوب میں تربیلہ کے عین متصل دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہیں۔

جلد پہنچیں گے، آپ تیار رہیں۔ پانچ چھ روز کے بعد سید صاحب نے ڈیڑھ سو سوار تین سو پیادے اور چھ یا آٹھ شاہینیں ساتھ لیں اور تربیلہ کی تسخیر کے لئے نکل پڑے۔ جو غازی پنجتار میں رہے، ان پر مولوی احمد اللہ ناگپوری کو امیر بنا دیا گیا۔

سید صاحب کی روانگی

پنجتار سے نکل کر دو روز مینئی میں رہے، جہاں غازیوں کے لئے پن چکیوں پر آٹا پستا تھا، وہاں پن چکیوں کا معائنہ کیا۔ سید حامد علی کو ہدایت فرمائی کہ جو غازی کھبل کی طرف جا رہے ہیں ان کی رسد وہاں بھیجی جائے، پھر گیارہ باڑہ پہنچے۔ (۱) بہوڑ کے گھاٹ سے پچاس ساٹھ قندھاریوں کو پار اتار کر خان زمان خاں کے پاس گنگر بھیج دیا، اور خود باقی غازیوں کے ساتھ کھبل پہنچ گئے۔

سکندر پور (۲) سے جو راستہ تربیلہ آتا ہے، اس سے ذراہٹ کر تربیلہ سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر بہادر کوٹ (۳) ایک مقام ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہاں مضبوط قلعہ تھا، جس میں ہری سنگھ پانچ ہزار فوج لئے بیٹھا تھا۔ خان زمان خاں نے دو سو آدمی بہادر کوٹ کا راستہ روکنے کے لئے مقرر کر دیے، خود غازیوں اور اپنے آدمیوں کو لے کر تربیلہ پر حملہ کیا اور سارے خطے پر قبضہ جما لیا، صرف ایک گڑھی (۴) باقی رہ گئی، جس میں سوا سو سکھ فوجی تھے، اس کا محاصرہ ہو گیا، ارد گرد مورچے بن گئے اور فریقین

---

(۱) بہوڑ سمہ کے انتہائی مشرقی گوشے میں ٹوپی سے آگے دریا کے کنارے پر واقع ہے، اسے پکھلی کی جانب سے سمہ میں داخل ہونے کا دروازہ سمجھنا چاہیے۔

(۲) سکندر پور اس زمانے میں ہزارہ کا مشہور مقام تھا اور ہری پور موجود ہی نہ تھا۔ ہری سنگھ نلوہ نے اپنی گورنری کے زمانے میں سکندر پور کے پاس ایک گڑھی بنائی جس کا نام ہرکشن گڑھ رکھا، اس کے پاس بستی بس گئی جو ہری پور کے نام سے مشہور ہوئی۔ سکندر پور اب بھی موجود ہے اور اسے ہری پور کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

(۳) یہ مقام اب بھی موجود ہے لیکن آج اس کی کوئی اہمیت نہیں، نہ وہاں کوئی قلعہ ہے۔

(۴) کہتے ہیں یہ گڑھی جھاڑ اور مٹھو کے درمیان اس جگہ تھی جہاں آج کل تھانہ ہے۔

میں آتش باری شروع ہوگئی۔

سکھوں کی آمد

عین اس حالت میں معلوم ہوا کہ ہری سنگھ کو تربیلہ پر شبخون کی اطلاع مل گئی ہے اور وہ بہادر کوٹ سے فوج لیکر آرہا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا راستہ روکنے پر مامور کیا گیا تھا، وہ باجود قلت تعداد چار گھنٹے تک مقابلہ کرتے رہے، جب کثیر فوج کی روک تھام سے عاجز رہ گئے تو آس پاس کے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور ہری سنگھ آگے نکل گیا۔ اسکے بعد تربیلہ پر قابض رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ خان زمان خاں نے اپنے آدمیوں کو آس پاس کے پہاڑوں پر بھیج دیا اور غازیوں کو کشتیوں میں بٹھا کر سید صاحب کے پاس کھبل پہنچا دیا۔

ہری سنگھ کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور غازیوں پر گولیاں چلانے لگے، سید صاحب یہ سارے حالات مقابل کے کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے، آپ نے معاً عبداللہ جمعدار، شیخ وزیر اور میرزا حسین بیگ کو حکم دے دیا کہ شاہین لگا کر سکھوں پر گولے برساؤ۔ غازیوں کی ایک جماعت دریا کے کنارے گھات پکڑ کر بیٹھ گئی، جب سکھ ان کی زد میں آئے تو غازیوں نے گولیوں کی بارش شروع کردی۔ سکھ اولاً ٹھٹک کر ٹھہر گئے، پھر تھوڑی دیر مقابلے کے بعد لوٹ گئے، قندھاری غازی بہ اطمینان کھبل پہنچ گئے۔

متفرق چپقلشیں

کھبل کی جانب سے شاہینیں برابر چل رہی تھیں، سوءِ اتفاق سے ایک شاہین پھٹ گئی میرزا احمد بیگ چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے تھے، ایک ٹکڑا ان کی پنڈلی میں لگا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی، چارپائی پر ڈال کر انہیں گاؤں پہنچایا گیا۔ سید صاحب نے نور بخش جراح سے مرہم پٹی کرائی۔

سکھ فوج سرن ندی کے کنارے ٹھہری رہی، دوسرے روز غازی ظہر کی نماز سے

فارغ ہوئے تو تین چار سو سکھ سوار کھبل کے محاذ میں نمودار ہوئے۔ سید صاحب کے حکم سے ٹیکری پر شاہینیں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ دو سوار مارے گئے، باقی پھر تیزی سے واپس چلے گئے۔

یہ غالباً دسمبر ۱۸۲۹ء کا زمانہ تھا جب کہ ان حصوں میں سخت سردی ہوتی ہے اور دریا کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے سید صاحب نے غازیوں میں اعلان کر دیا تھا، اگر کسی بھائی کو غسل کی حاجت ہو اور گرم پانی نہ مل سکے تو ازالۂ نجاست کے بعد تیمم کر کے نماز ادا کرے، ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈے پانی میں غسل موجب مضرت بن جائے۔

تیسرے دن سکھ رات کی تاریکی میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر چھپ کر بیٹھ گئے، صبح کے وقت غازی اور عام مسلمان وضو کے لئے دریا پر پہنچے تو سکھوں کی گولیاں آئیں لیکن کسی غازی کو گزند نہ پہنچا۔ کھبل کی طرف سے شاہینیں چلنے لگیں چند سکھ مقتول ہوئے، باقی بھاگ گئے۔ تربیلہ سے ایک ملکی آیا تو اس نے بتایا کہ دو تین روز کی لڑائیوں میں دس گیارہ سکھ مارے گئے اور ان سے زیادہ زخمی ہوئے۔

پنجاب کے ایک شاہین چی نے بھری ہوئی شاہین کو خالی سمجھ کر اس میں مزید گولی بارود بھر لی، شاہین چلائی تو وہ پھٹ گئی، ایک ٹکڑا اس بیچارے کی کنپٹی پر لگا اور اندر گھس گیا۔ اس صدمے سے اس مرحوم نے دو تین گھڑی بعد وفات پائی۔

ساداتِ ستھانہ

سید صاحب ابھی کھبل ہی میں تھے کہ سید اکبر شاہ ستھانوی اپنے بھائی سید اصغر شاہ اور بعض دوسرے عزیزوں (مثلاً سید نور جمال ساکن منڈی اور سید کامل شاہ) کو ساتھ لے کر ملاقات کے لئے پہنچے۔ ان ساداتِ کرام کے ساتھ مکاتبت مدت سے جاری تھی، اور ان کے اخلاق کریمہ کی وجہ سے سید صاحب اور تمام غازیوں کے دل میں ان کے لئے

خاص عزت پیدا ہو گئی تھی۔ مولوی سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں:

> اخلاق کریمۂ ایں سادات خصوصاً سید اکبر شاہ بیروں از بیان است ووفا از ابتدا تا انتہا یکساں نمودند۔ (۱)

ترجمہ : ان سادات خصوصاً سید اکبر شاہ کے اخلاق کریمہ دسترس ذکر و بیان سے باہر ہیں۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک وہ اخلاص و وفا میں برابر ثابت قدم رہے۔

"وقائع" میں ہے:

> سید اکبر شاہ کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کا بیان کہاں تک کروں۔ جس نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے وہی خوب واقف ہے کہ ایسا خوش خلق، خندہ رو، کشادہ پیشانی، سلیم الطبع، سلیم المزاج، سخی، شجاع، صاحب تدبیر، صاحب دل، راست گفتار اور حضرت امیر المومنین کا مخلص بے ریا اور محب باوفا اور معتقد صادق کوئی رئیس اس ولایت میں نہ تھا۔ (۲)

ان بیانات کا ایک ایک حرف درست ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ جو کچھ بیان ہوا حقیقت حال اس سے کہیں زیادہ ہے۔ سرحد میں یہی ایک خاندان ہے جس کے ہر فرد کا ایک ایک لہو سید صاحب کے ساتھ ابتدائی تعلق سے لے کر ان کی شہادت تک بے توقف اخلاص و محبت کے ساتھ تمام دینی مقاصد کی اعانت کے لئے وقف رہا، اور یہی ایک خاندان ہے جس نے سید صاحب کی شہادت کے بعد اپنی جانوں اور مالوں کو بالکل بے غرضانہ اور بے دریغ مجاہدین کی خدمت کے لئے وقف کیا، یہاں تک کہ ان سادات کو پشتوں کے وطن ستھانے سے بھی محروم ہونا پڑا، پھر وہ پینتیس میل پہاڑوں میں ملکا نام ایک مقام پر جا بیٹھے، وہاں سے بھی محروم ہوئے اور اس دنیا میں نام نیک کے سوا کوئی متاع باقی نہ رکھی۔ پھر اسی خاندان کے ایک فرد جلیل سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے اپنے

---

(۱) "منظورہ" ص: ۵۸۸

(۲) "وقائع" ص: ۱۱۸۶

اجداد کرام کی ویران سکونت گاہوں کے نشان از سر نو قائم کیے۔ ستھانہ کم وبیش پچاس برس تک صفحۂ ہستی سے محو رہنے کے بعد دوبارہ آباد ہوا۔ سید صاحب کی ذات گرامی اور ان کی مقدس دینی تحریک کی برکات، اعزاز واحترام میں آج بھی سادات ستھانہ کے گھرانے کا پرچم سرحد میں سب سے اونچا ہے۔

ستھانہ کی سرگزشت

پہلے مجملاً بتایا جاچکا ہے کہ یہ سادات کرام سید علی ترمذی غوث بنیر کے اخلاف میں سے تھے۔ سید اکبر شاہ کے جد امجد سید ضامن شاہ اپنے آبائی وطن تختہ بند سے نکل کر دہلی گئے، راستے میں پکھلی پہنچ کے ایک افغان سردار نے اپنی صاحبزادی ان سے بیاہ دی۔ دہلی سے ان کو نوشہرہ کا علاقہ جاگیر میں ملا، لیکن آپ آزاد منش اور سیر چشم تھے، اس جاگیر کو بے توقف دوسروں کے حوالے کردیا۔ اوتمان زئیوں نے انہیں ستھانہ کی اراضی دے دیں، جہاں ایک آبادی قائم کی، پکھلی بلکہ پورا ہزارہ ان کا معتقد ومخلص تھا۔ شجاعت اور خدا دوستی کے لحاظ سے اپنے عہد میں یگانہ تھے، پکھلی میں دورے پر گئے ہوئے تھے، یقہ میں اچانک وفات پائی، میت کو ستھانہ لاکر دفن کیا گیا۔

ان کے دو فرزند تھے: سید شاہ مردان اور سید شاہ گل عرف شاہ جی۔ سید شاہ مردان والد کی وفات کے بعد نوجوانی ہی میں واصل بحق ہوگئے۔ سید شاہ گل کی شادی گندف میں سید شیر شاہ کی صاحبزادی سے ہوئی، جو ان کا ہم خاندان تھا، گندف اور ستھانہ کے درمیان رشتہ داریوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

سید اکبر شاہ

سید شاہ گل بڑے عابد و زاہد اور صلح کل بزرگ تھے۔ اپنے پیچھے چھ فرزند چھوڑے: سید اعظم شاہ، سید اکبر شاہ، سید عمر شاہ، سید عمران شاہ، سید اصغر شاہ اور سید شاہ مدار۔ ان

میں سے ہر ایک اپنے خاندان کی عزیز ترین متاع یعنی فضائل اخلاق، دینداری، محبت واخلاص اور راہِ حق میں ایثار و قربانی کا پیکر تھا۔ سارے بھائیوں میں باہم انتہائی محبت تھی، لیکن سید اکبر شاہ درخشاں ستاروں کی اس انجمن میں بدرِ منیر کی حیثیت رکھتے تھے۔

سید اعظم شاہ سب سے بڑے تھے، ان کی شادی احمد علی خاں پلال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، جو صوبہ خانی تنولیوں کا رئیس تھا۔ یہ صاحبزادی نواب خاں رئیس ہندول تنولی کی حقیقی بھانجی تھی، اور اس کی دوسری بہن سردار پایندہ رئیس امب و دربند کی بیگم تھی۔ رشتہ داریوں کی اس سرسری تفصیل سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ساداتِ ستھانہ کا خاندان دنیوی وجاہت میں بھی اس عہد کے بلند ترین گھرانوں میں شمار ہوتا تھا، اور دینی وجاہت میں تو نہ پہلے علاقہ سرحد میں کسی کو اس کی ہمسری نصیب ہوئی اور نہ بعد میں کوئی اس کے رتبۂ عالی پر پہنچ سکا۔

سید شاہ گل کی وفات کے بعد قاعدے کے مطابق دستارِ قیادت سید اعظم شاہ کے سر پر رکھی گئی لیکن کچھ مدت بعد سید اعظم نے بہ طیبِ خاطر یہ اعزاز سید اکبر شاہ کے حوالے کر دیا، تاہم ان کا اعزازِ بزرگی بہ دستور قائم رہا، بلکہ ان بھائیوں کے باہمی تعلقات کے محبت و گرمجوشی کو دیکھتے ہوئے ان کے درمیان چھوٹے بڑے کا امتیاز پیدا کرنا ہی غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ستھانہ میں مشورے

سید اکبر شاہ ملاقات کے بعد خواہاں ہوئے کہ سید صاحب ستھانہ تشریف لے چلیں اور کہا کہ ستھانہ سے یہی ارادہ لے کر کھتل آیا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ سید بھائی! انشاء اللہ کل چلیں گے۔

اس اثناء میں سید حسن شاہ اور شاما جمعدار سردار پایندہ خاں کی طرف سے آرزودے

ملاقات کا پیغام لے کر پہنچ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم پہلے اکبر شاہ کے ساتھ ستھانہ جانے کا وعدہ کر چکے ہیں، اپنے خان سے جا کر کہو کہ ہم ستھانہ میں ٹھہریں گے، پھر جو کچھ وہ فرمائیں اس کے متعلق ستھانہ ہی میں ہمیں اطلاع دے دینا۔

چنانچہ سید صاحب دوسرے روز ڈیڑھ سو غازیوں کے ساتھ ستھانہ چلے گئے، باقی سب کو کھنل میں چھوڑ دیا۔ سید اکبر شاہ کے سارے بھائی انتہائی محبت وعقیدت سے ملے، ان کی والدۂ ماجدہ بھی زندہ تھیں۔ سب نے بیعت کی۔ سید اکبر شاہ نے سارے لشکر کے لئے پلاؤ پکوایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو الگ بیٹھ کر پایندہ خاں سے ملاقات کے متعلق مشورہ کیا، جس میں سید صاحب اور سید اکبر شاہ کے علاوہ صرف مولانا شاہ اسمٰعیل اور منشی خواجہ محمد شریک تھے۔

سید اکبر شاہ نے جو کچھ مولانا شاہ اسمٰعیل سے ۱۸۲۷ء میں کہا تھا، اسے پھر دہرایا یعنی یہ کہ یہاں لوگوں میں عہد کی پابندی اور اخلاص ووفا بہت کم ہے اور سردار پایندہ خاں بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ (۱) مزید کہا کہ ہمارے عزیزوں میں سید نادر شاہ ایک بزرگ اور جہاندیدہ آدمی ہیں۔ وہ پایندہ خاں کے والد کے زمانے سے ریاست امب کے مشیر ہیں، انہیں منڈی سے بلا لیتا ہوں تاکہ آپ کو زیادہ صحیح مشورہ مل جائے۔ سید صاحب خود منڈی جانے کے لئے تیار تھے، لیکن سید اکبر شاہ نے نادر شاہ اور ان کے بھائی کو ستھانہ بلا لیا۔

تنولیوں کی داستان

پایندہ خاں تنولی کے دل ودماغ کی صحیح کیفیت اسی صورت میں واضح ہو سکتی ہے کہ وہ فضا اور ماحول آنکھوں کے سامنے آجائے، جس میں اس نے تربیت پائی۔ اس سلسلے

---

(۱) "منظورہ" ص: ۵۸۸

میں تنولیوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

تنولی دو گروہ تھے: ایک پلال اور دوسرا ہندوال۔ پلالوں کی ریاست ہزارہ سے کر پلیاں تک تھی اور ہندوال اگرور سے دربند اور وہاں سے تین میل جنوب تک کے مالک تھے۔ ریاست کا منصب سب سے پہلے پلالوں نے حاصل کیا، جن میں سے اول صوبہ خاں رئیس بنا، پھر اس کا بیٹا سرفراز خاں بعد ازاں گل شیر خاں۔ ہندوالوں میں سب سے پہلے ہیبت خاں نے بلند حیثیت حاصل کی اور گلی بدر ہال کو اپنا مرکز بنایا، پھر دونوں گروہوں میں لڑائیاں چھڑ گئیں، صلح اس بات پر ہوئی کہ ہیبت خاں کی صاحبزادی گل شیر خاں کے فرزند احمد علی خاں سے بیاہ دی جائے، اور گل شیر خاں کی صاحبزادی کی شادی ہیبت خاں کے خلف اکبر ہاشم علی خاں سے ہو جائے۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کے واقعات ہیں۔ ان رشتہ داریوں کے بعد آپس میں اختلاف کا کیا اندیشہ تھا؟ لیکن گل شیر خاں اور ہیبت خاں کی وفات کے بعد جب دونوں ریاستوں کے مالک بالترتیب احمد علی خاں اور ہاشم علی خاں بنے تو اول الذکر کی بے چین طبیعت امن و صلح پر مطمئن نہ رہ سکی، اس لیے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی، جس میں خود اس نے سخت شکستیں کھائیں۔

بدقسمتی سے وہ اپنے دوسرے عزیزوں کو دشمن بنا چکا تھا، جب اسے بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو اپنے بہنوئی ہاشم علی خاں سے صلح کا طریق یہ سوچا کہ اپنی بہن کو بلا لیا، اور اسے اطمینان دلا کر ہاشم علی خاں کو پیغام بھیجا کہ وہ برادرانہ آئے اور اپنی اہلیہ کو لے جائے۔ ہاشم علی خاں انتہائی صاف دلی سے صرف چالیس آدمی لے کر گیا، جو اس عہد کے رئیسوں کے ساتھ عموما رہتے تھے۔ احمد علی خاں نے اسے اپنے قلعہ میں قتل کر دیا اور لاش بیوہ بہن کے ہمراہ گلی بدر ہال بھیج دی، جہاں ہاشم علی خاں کا چھوٹا بھائی نواب خاں مقیم تھا۔

نواب خاں

نواب خاں فی الفور انتقام کیلئے تیار ہو گیا، احمد علی خاں درۂ تندھیاڑ کی طرف بھاگا، جہاں اس کے ایک عزیز سربلند خاں نے اسے پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں، ایک کی شادی سید اعظم شاہ تھانوی سے ہو چکی تھی، دوسری اپنی والدہ (ہمشیرہ نواب خاں) کے ساتھ سربلند خاں کی قید میں تھی۔ نواب خاں نے انہیں قید سے رہائی دلائی، ہاشم علی خاں کی بیوہ سے خود شادی کر لی اور بڑے اطمینان سے ریاست کا کاروبار انجام دینے لگا۔

سوءِ اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ نواب خاں بھی مصائب کا ہدف بن گیا۔ کشمیر سے سردار عظیم خاں کی والدہ کابل جا رہی تھی، نواب خاں کے آدمیوں نے اس کا کچھ مال لوٹ لیا، عظیم خاں نے جوشِ انتقام میں نواب خاں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور راستے میں اسے دریائے لنڈے میں غرق کرا دیا۔

پائندہ خاں اس وقت سولہ سترہ برس کا ہوگا، وہ بھی والد کے ساتھ گرفتار ہوا تھا لیکن نواب خاں نے ایک حیلے سے اس کیلئے رہائی کی صورت پیدا کر دی اور تاکیداً وصیت کی کہ کبھی کسی سردار یا حاکم یا رئیس سے صاف دلی کے ساتھ نہ ملنا۔ کسی پر بھروسا نہ کرنا اور سب سے الگ تھلگ رہنا۔

پائندہ خاں

سید نادر شاہ نے بتایا کہ پائندہ خاں کی تربیت ابتدا ہی سے شکوک و بے اعتمادی کی فضا میں ہوئی۔ دورِ مصائب میں حسن زئیوں اور مدا خیلوں کے علاوہ ساداتِ تھانہ اور الف خاں پنجاری (والد فتح خاں) نے اس کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، لیکن پائندہ خاں نے قدم جماتے ہی الف خاں سے عشرہ، حسن زئیوں سے چھتربائی اور

مداخیلوں سے بھیت گلی کے علاقے چھین لیے۔ ستھانہ بھی لینا چاہتا تھا لیکن اکبر شاہ اور اس کے بھائیوں کا نصیب یاور تھا، اس لئے پاینده کامیاب نہ ہوا۔

اس نے خود مجھ سے کئی بار ذکر کیا کہ والد کی وصیت کے مطابق میرا دل کبھی کسی رئیس یا حاکم سے صاف اور مطمئن نہیں ہوا، بایں ہمہ آپ کے نزدیک پاینده خاں سے ملاقات ضروری ہے تو یہاں سے آدھے کوس پر کھڑی ہے، پاینده خاں کو اس مقام پر بلا لیجئے، اس کا دل صاف ہوگا تو بے توقف چلا آئے گا۔

سید صاحب کا ارشاد

سید صاحب نے نادر شاہ کی تکلیف کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ عقل کی رو سے آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔

> جو سردار اور رئیس جاہ طلب اور دنیادار ہیں، ان سب کا یہی برتاؤ ہے، ان کو اول خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے، دوسرا زوال ریاست کا۔ ہمارا معاملہ تو خواہ دین کا ہو یا دنیا کا صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پر موقوف ہے۔ اس کی رضا کے کام میں جان و مال صرف کرنا سعادت ابدی سمجھتے ہیں۔ کوئی ہم سے دغا اور فریب کرے گا تو ہمارا دین بگاڑے گا نہ ایمان۔ اس کا عوض وہ اللہ سے پاوے گا، ہم کو خطرہ کس بات کا ہے؟ ہم پاینده خاں سے ملاقات کا ارادہ رکھتے ہیں تو صرف اس نیت سے کہ وہ ہمارا مسلمان بھائی ہے۔ رئیس، خان اور مرد آدمی ہے، اگر وہ ہم سے موافق ہو جائے تو اس کے عمل میں سے ہو کر ہمارے لئے راستہ کشمیر کا صاف ہو جائے اور لوگ بے دغدغہ آنے جانے لگیں۔ کھڑی پر بلانے سے ممکن ہے وہ بدگمان ہو جائے۔ (۱)

---

(۱) "منظورہ" میں ہے کہ سید صاحب نے فرمایا: ہر چند سخن ہم چنیں است کہ آں برادر (سید نادر شاہ) بیان فرمودند، اما از طرف جائے مقرر نمودن ضرورتے ندارد، ہر جا کہ دل او بخواہد ملاقات نماید۔

سید نادر شاہ نے کہا کہ حضرت اگر خالصۃً للہ یہی نیت ہے تو بہر صورت آپ کا فائدہ ہے، نقصان کسی طور کا متصور نہیں۔ (۱)

ملاقات کا فیصلہ

پائندہ خاں کے متعلق سید صاحب کی رائے بھی درست تھی، سید اکبر شاہ اور سید نادر شاہ نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی صحیح تھا۔ خان یقیناً بہادر، بلند ہمت اور باتدبیر رئیس تھا، اس کی ریاست ایسے موقع پر واقع تھی کہ مشرقی سمت میں یعنی ہزارہ یا کشمیر کی طرف کوئی تحریک اس کی سرگرم اعانت کے بغیر شروع نہیں ہو سکتی تھی اور اس کی شجاعت و اولوالعزمی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ سب سردار سکھوں سے دب گئے، لیکن وہ ہزاروں مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود بدستور مقابلے پر جما رہا۔

یہ بھی درست ہے کہ اس کے والد کی وصیت جس موقع پر اور جن حالات میں ہوئی تھی، وہ بڑے درد انگیز تھے، اور اس وصیت کا نقش اس کے دل پر اس طرح جما کہ پھر وہ کسی پر بھروسے کا اہل نہ رہا۔ اس کی طبیعت ایسی بن گئی تھی کہ شکوک سے لبریز اور غیر مطمئن قلب کے آئینے میں اسے ساری دنیا سراسر مکر و فریب نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی کوتاہی تھی، جس نے اسے بعض اہم اسلامی خدمات میں بھی تعاون سے باز رکھا۔ لوگوں کی نظروں میں صرف یہ کوتاہی تھی، سید صاحب کے سامنے اس کے محاسن بھی تھے۔ انہیں امید تھی کہ ممکن ہے اللہ کے فضل سے اس کا دل شک و ریب کے زنگ سے پاک ہو جائے۔

غرض ملاقات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد پائندہ خاں کے وکیل آئے تو انہوں نے پیغام دیا کہ خان عشرہ میں ہے، وہیں دریا کے کنارے بڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ تھوڑے سے آدمی ساتھ لے کر آپ تشریف لے آئیں۔ سید صاحب نے یہ دعوت قبول فرمائی۔

---

(۱) "وقائع" ص: ۱۱۹۲-۱۱۹۷

سترہواں باب:

پائندہ خاں کی فرمانبرداری اور سرکشی

سید صاحب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ پائندہ خاں کی شکی طبیعت اس کیلئے وجہ مصیبت بنی ہوئی ہے، اس کا علاج یہی تھا کہ راہ و رسم پیدا کر کے عملاً اسے یقین دلایا جاتا کہ شکوک واوہام میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب ملاقات کا وقت اور مقام طے ہو گیا تو سید صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل سے فرمایا کہ ہمارے ساتھ زیادہ آدمی نہ جائیں، تاکہ خان کے دل میں سوءظن نہ پیدا ہو۔ مولانا نے عرض کیا کہ ستھانہ میں سب آدمیوں کو روکنے کی ضرورت نہیں، جائے ملاقات سے تھوڑے فاصلے پر جن جن کو چاہیں روک دیں اور جن جن کو چاہیں ساتھ لے لیں۔ سید صاحب کی معیت کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب تجویز ہوئے:

۱۔ مولانا شاہ اسماعیل
۲۔ منشی خواجہ محمد (حسن پوری)
۳۔ مولوی امام الدین بنگالی
۴۔ شیخ شرف الدین بنگالی
۵۔ شیخ ناصر الدین پھلتی
۶۔ شیخ عبدالرؤف پھلتی
۷۔ زبردست خان رائے بریلوی
۸۔ شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی
۹۔ حافظ صابر تھانوی
۱۰۔ حافظ عبدالرحمٰن پھلتی
۱۱۔ شیخ عنایت اللہ (منڈھیاؤں ضلع بنارس)
۱۲۔ شیخ عبدالرحمٰن خیرآبادی

مولانا نے بہ نظر احتیاط چوبیس آدمیوں کو بطور خود منتخب کر کے حکم دے دیا کہ دریا کنارے کی اوٹ میں مقامِ ملاقات کے قریب پہنچ جاؤ اور وہاں جا کر اوٹ میں تیار

کھڑے رہو۔ اگر خان یا کسی دوسرے آدمی کی طرف سے مخالفانہ حرکت کا ذرا سا بھی احساس ہو تو بجلی کی تیزی سے حضرت کے پاس پہنچ کر انہیں اپنی حفاظت میں لے لینا۔

ان اصحاب کے نام ذیل میں درج ہیں:

۱۔ شیخ علی محمد دیوبندی
۲۔ ابراہیم خاں خیرآبادی
۳۔ امام خاں خیرآبادی
۴۔ محمد خاں خیرآبادی
۵۔ گلاب خاں دوآبہ گنگ وجمن
۶۔ محمود خاں لکھنوی
۷۔ کریم بخش بنارسی
۸۔ چراغ علی رامپوری
۹۔ شیخ نجم الدین رام پوری
۱۰۔ حاجی عبداللہ رام پوری
۱۱۔ شیخ نصرت بانس بریلوی
۱۲۔ مراد خاں خورجوی
۱۳۔ بخش اللہ خاں خورجوی
۱۴۔ ولی داد خاں خورجوی
۱۵۔ شیخ نصر اللہ خورجوی
۱۶۔ سید ظہور اللہ بنگالی
۱۷۔ سید لطف اللہ بنگالی
۱۸۔ قاضی مدنی بنگالی
۱۹۔ ملا باز ار قندھاری
۲۰۔ ملا عزت قندھاری
۲۱۔ ملا عمر خاں قندھاری
۲۲۔ ملا لعل محمد قندھاری
۲۳۔ پیر خاں پھلکیت
۲۴۔ شیخ علی عظیم آبادی (۱)

اس احتیاطی تدبیر کا علم غالباً سید صاحب کو بھی نہ تھا، عجیب بات یہ ہے کہ پائندہ خاں نے بھی مقامِ ملاقات سے ایک گولی کی زد پر دامن کوہ میں، جہاں غزاسکا کا جنگل تھا، پانسو پیادے چھپا رکھے تھے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ (۲)

---

(۱) بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ یہ چوبیس آدمی سید صاحب کے ساتھ گئے تھے، جس مقام پر جا کر رکے مولانا نے وہاں سے انہیں دریا کے کنارے ٹھہرنے کے لئے بھیج دیا۔

(۲) عشرہ و ستھانہ سے تقریباً تین میل شمال میں ہوگا، پرانے امب اور عشرہ کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ تھا، اب ان مقامات پر دریا کے کنارے اوٹ کی کوئی جگہ نہیں۔ ۱۸۳۱ء کی طغیانی میں دریائے سندھ ... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ملاقات

سید صاحب ظہر کی نماز پڑھ کر تیار ہوئے، کمر میں تلوار اور تمنچہ باندھا اور ہاتھ میں برچھا لیا۔ سواری کے لئے عبدالحمید خاں رسالدار کا گھوڑا طلب فرمایا۔ پہاڑ سے گذر کر عشرہ کے قریب پہنچے تو پائندہ خاں کے وکیل پیشوائی کے لئے موجود تھے، انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے ساتھ آدمی زیادہ ہیں۔ سید صاحب نے سب کو روک دیا اور صرف بارہ آدمی ساتھ لئے جو پہلے سے تجویز ہو چکے تھے۔ جب مقامِ ملاقات پچاس ساٹھ قدم رہ گیا تو مزید دس آدمیوں کو روک دیا، صرف مولانا شاہ اسماعیل اور خواجہ محمد ساتھ رہے۔

عشرہ سے باہر نکل کر دریا کی جانب دامن کوہ میں بڑ کا ایک بھاری درخت تھا، اس کے نیچے عمدہ چبوترہ بنا ہوا تھا، پائندہ خاں کے وکیل سید حسن شاہ نے اس پر فرش بچھا کر سید صاحب کو بٹھایا، خان ایک گولی کے فاصلے پر کھڑا تھا، اس نے زرہ، چار آئینہ اور خود پہن رکھا تھا، صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ سید صاحب بیٹھ گئے تو خان پہنچا، مصافحہ و معانقہ اور مزاج پرسی کے بعد سید صاحب نے فرمایا:

> خان بھائی! آپ کسی بات کا اندیشہ نہ کریں، آپ ہمارے بھائی ہیں، ملاقات کی غرض محض یہ ہے کہ ہم اپنے پروردگار کا حکم جاری کر سکیں، آپ کی عملداری سے کشمیر کا راستہ ہے، دریائے اباسین کی کشتیاں آپ کے قبضے میں

گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ... کے اردگرد کی زمین تیرہ تیرہ گز گہرائی میں کھد گئی تھی، لہٰذا ان مقامات کے جس نقشے کا ذکر متن میں ہے، اسے آج کل موقع پر تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ ستھانہ اور عشرہ کے درمیان ایک کھڑی بھی تھی یعنی پہاڑ کی ایک کم بلند دیوار عین دریا کے کنارے تک پہنچی ہوئی تھی اور آنے جانے والے اس کے اوپر سے گذرتے تھے، اس وجہ سے دریا کے کنارے کنارے ستھانہ سے عشرہ جانا سہل نہ تھا۔ فرمانروائے امب نے اس کھڑی کو کٹوا دیا اور آج کل یہ راستہ ہموار ہے۔ ستھانہ سے عشرہ جانے کا ایک راستہ پہاڑ سے بھی تھا، سید صاحب ملاقات کے لئے اسی راستے سے گئے تھے، جائے ملاقات کے سلسلے میں بڑ کے جس درخت کا ذکر ہے وہ بھی ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہہ گیا تھا۔ بعد میں اس کی جگہ نیا بڑ لگا دیا گیا، وہ آج کل موجود ہے۔ اس سے جائے ملاقات کا نشان مل سکتا ہے۔

> ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگ اللہ تعالیٰ کے کاروبار کے لئے آپ کی عملداری میں سے آئیں جائیں تو کوئی ان کا حارج اور مزاحم نہ ہو۔ اگر آپ بھی للہ فی اللہ اس کار خیر میں شریک رہیں گے تو اللہ تعالیٰ دین اور دنیا میں فلاح اور خیر عطا کرے گا۔

پائندہ خاں نے عرض کیا کہ آپ پیر و مرشد اور امام ہیں اور ہم مطیع و فرمانبردار، جو کچھ آپ فرماتے ہیں، مجھے منظور ہے۔

خان کی پریشانی

سید صاحب چاہتے تھے کہ بات چیت کے ذریعے سے طریق کار کے متعلق مزید تفصیلات طے کر لیں، لیکن پائندہ خاں ڈرا ہوا تھا اور اس کی روش سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ملاقات کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہے۔ سید صاحب نے اس کے لئے ایک دستار رومال میں بندھوا کر ساتھ لے لی تھی، چاہتے تھے کہ اپنے دست مبارک سے دستار اس کے سر پر باندھیں، لیکن اس نے رومال سمیت دستار اٹھائی اور عرض کیا کہ مکان پر جا کر باندھ لوں گا۔

اس اثناء میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ پائندہ خاں کے سوار باگیں اٹھائے آ رہے ہیں، غازیوں کی جو جماعت دریا کے کنارے متعین تھی وہ تیزی سے جائے ملاقات پر پہنچ کر سید صاحب اور پائندہ خاں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ پائندہ خاں پر اور بھی گھبراہٹ طاری ہو گئی، لیکن سید صاحب نے اسے تسلی دی۔ آخر میں فرمایا:

> خان بھائی! آپ خدا کیلئے ہم سے ملے ہیں، کار خیر میں شرکت کیجئے، آپ کی عملداری سکھوں کی سرحد سے ملی ہوئی ہے، ہم آپ کو ایک ضرب توپ اور ایک ہاتھی دیں گے۔

ملاقات ختم ہوگئی، دن تھوڑا رہ گیا تھا، سید صاحب فیصلہ فرما کر گئے تھے کہ خان روکے گا تو عشرہ میں رات گزار لیں گے، لیکن پائندہ خاں نے ایک مرتبہ بھی نہ کہا کہ ٹھہر جائیے۔ بلکہ کہا: میں دعوت کا سامان ستھانہ پہنچا دوں گا، گویا چاہتا تھا کہ سید صاحب تشریف لے جائیں۔ عشاء کے وقت سید صاحب ستھانہ پہنچے، اس وقت پائندہ خاں کی طرف سے دو اونٹ آئے، ایک پر باریک چاول لدے ہوئے تھے، دوسرے پر دو مٹکے شہد کے اور دو مٹکے گھی کے تھے۔ (۱)

مراجعت

ستھانہ سے سید صاحب نے لشکر کے بڑے حصے کو مولانا کے ہمراہ کھنکل بھیج دیا، خود چھتی (۲) تشریف لے گئے، جہاں ایک ملا سے ملاقات منظور تھی، وہ اصلاً مانسہرہ کا تھا، لیکن جب وہاں سکھوں کا عمل دخل ہوا تو ہجرت کر کے آزاد علاقے میں پہنچ گیا، اس ملا سے مل کر سید صاحب بہت خوش ہوئے، تین راتیں اس کے پاس گزاریں۔

چھتی میں آپ کو اچانک یہ خبر ملی کہ درانیوں نے موقع پا کر قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا اور غازیوں کی جو جماعت وہاں موجود تھی، اس سے قلعہ خالی کرا لیا۔ اب وہ پنجتار پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ نے مولانا کو لکھا کہ جلد سے جلد گندف (۳) میں ملئے۔ چنانچہ مولانا سے گندف میں ملاقات ہوئی تو فیصلہ فرمایا کہ پنجتار جانا ضروری ہے، جھنڈا بوکا پہنچے تو فتح خاں پنجتاری استقبال کے لئے موجود تھا۔

پنجتار پہنچ کر شیشم کے درختوں میں آپ نے ظہر کی نماز ادا کی، بہت سے ملکی ملاقات

---

(۱) "وقائع" میں ہے کہ چاول خچر پر لدے ہوئے تھے، گھی اور شہد کے مٹکے مزدوروں کے سر پر تھے۔

(۲) چھتی ستھانہ کے پیچھے پہاڑوں کے بیچ میں ہے۔

(۳) یہ گندف پہاڑوں کے بیچ میں چھتی سے پنجتار کے راستے پر واقع ہے، دوسرا گندف تربیلہ سے آگے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔

کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہاں سرداران پشاور کے عزمِ پنجتار کا ذکر چھڑا تو سید صاحب نے برسر مجلس فرمایا: وہ کیا کریں گے؟ میرے پاس پانسو گھوڑے ہیں، غازیوں کو دور دراز کی رسید دیکر ایک ایک گھوڑے پر دو دو کو سوار کر کے بھیج دوں گا تو پشاور سے ادھر دم نہ لیں گے۔ یہ خبر سرداروں تک پہنچ گئی تو وہ سب مخالفانہ تدبیروں سے دست کش ہو کر پشاور کی حفاظت کے انتظامات میں لگ گئے۔

ہنڈ پر حملہ

سلطان محمد خاں کے متعلق تو معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحب کے خلاف اقدام میں اسے یار محمد خاں سے اتفاق نہ تھا، لیکن اس کی اور یار محمد خاں کی والدہ بار بار زور دے رہی تھی کہ بھائی کے خون کا بدلہ لو، بلکہ ایک موقع پر والدہ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تم نے کچھ نہ کیا تو میں خود باہر نکل کر فریادی بنوں گی اور سب لوگوں کو اٹھا کر سید پر چڑھائی کرا دوں گی۔ جب سید صاحب کھبل اور ستھانہ کی طرف چلے گئے تو سلطان محمد خاں نے سمجھا کہ والدہ کی خواہش کو پورا کرنے کا اچھا موقع نکل آیا ہے، چنانچہ اس نے فوج لے کر ہنڈ پر حملہ کر دیا، قلعے میں صرف ساٹھ غازی تھے، اخوند ظہور اللہ جہانگیرے والے ان کے افسر اور محمد خاں پنجابی اخوند کے نائب تھے۔ انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، محاصرہ کئی دن جاری رہا۔ سلطان محمد خاں کی فوج کا ایک فرنگی افسر محاصرے کا مہتمم تھا۔(۱) اس نے ایک روز غازیوں کو پیغام بھیجا کہ مقابلہ بے سود ہے، باہر سے کمک پہنچ نہیں سکتی بلکہ کمک کے لئے پیغام بھی بھیجنا مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قلعہ حوالے کر دو، میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اسلحہ سمیت عزت سے نکال دوں گا۔

غازیوں نے یہ شرط قبول کر لی، قلعہ حوالے ہو گیا تو سلطان محمد خاں غازیوں کو ساتھ

---

(۱) روایتوں میں اس کا نام کیوں نہ بتایا گیا ہے، مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ انگریز تھا یا فرانسیسی یا اطالوی۔

لے کر پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ فرنگی افسر سے کہا کہ خٹک کے علاقے میں پہنچ کر انہیں رخصت کر دیا جائے گا۔ جب غازیوں سے ہتھیار لے کر انہیں قیدی بنا لیا گیا تو فرنگی افسر کو بدعہدی پر سخت رنج ہوا، اور وہ سلطان محمد خاں کو چھوڑ کر نوشہرہ چلا گیا۔

غازیوں کی جوانمردی

اب سلطان محمد خاں روزانہ مجلس میں بڑ مارنے لگا کہ تمام غازیوں کو پشاور لے جا کر بھائی کی قبر پر ذبح کروں گا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جب مرنا ہی ہے تو لڑ کر کیوں نہ مریں۔ چارسدہ پہنچے تو انہیں ایک کمرے میں بند کر کے پہرے لگا دیے گئے، ایک غازی کے پاس چھری رہ گئی تھی، رات کے وقت اس چھری سے کام لے کر مکان کے پچھواڑے میں نقب کا بندوبست کیا گیا۔ جب آدمی کے لئے بے تکلف نکل جانے کا راستہ بن گیا تو ہر غازی نے دیوار سے نکلے ہوئے، پتھروں میں سے دو دو اُٹھا لئے اور بے باکانہ باہر نکل پڑے۔ بعض لوگوں نے انہیں دیکھ کر شور مچایا کہ سید کے غازی شبخون مارنے کے لئے آ پہنچے۔ اس سے سلطان محمد خاں کی سپاہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ غازی اس خداداد مہلت سے فائدہ اٹھا کر تین فرسنگ نکل گئے۔

اب یہ مشورہ ہوا کہ کہاں جائیں۔ بعض نے کہا کہ امیر المومنین کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے، قلعے کی حوالگی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا، اب حضرت کو کیا منہ دکھائیں؟ لیکن محمد خاں پنجابی نے کہا کہ بھائیو! ہمارا جینا اور مرنا حضرت کے ساتھ ہے، کچھ بھی ہو ہمیں وہیں جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ بیس غازیوں کو لے کر پنجتار پہنچ گئے۔ سید صاحب نے ان کی مردانگی کی داد دی اور پنجتار آنے کے فیصلے پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

سلطان محمد خاں نے ہنڈ کو خادے خاں کے بھائی امیر خاں کے حوالے کر دیا، اسے تنہا قلعے سنبھالے رکھنا مشکل نظر آیا تو سکھوں سے مدد مانگی۔ سکھوں نے سات سو آدمی

ہنڈ بھیج دیے، جب قاضی سید محمد حبان علاقہ سمہ کا دورہ کرتے ہوئے ہنڈ پہنچے تو سکھ قلعے کو خالی کر گئے، اس بارے میں تفصیلی حالات موقع پر بیان ہوں گے۔

سید صاحب کے عزائم

پایندہ خاں سے ملاقات کے بعد سید صاحب فوراً پنجتار نہیں آنا چاہتے تھے، اسی لئے لشکر کو کھتیل میں ٹھہرنے کا حکم دے دیا تھا کہ جلد سے جلد پکھلی میں پیش قدمی کی جائے۔ پنجتار پر حملے کے خطرے کی اطلاع پا کر لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سردارانِ پشاور کسی فوری اقدام کی ہمت نہیں رکھتے تو پھر پکھلی میں محاذِ جنگ پیدا کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اس اثناء میں ناصر خاں بھٹ گرامی، سر بلند خاں تنولی، کمال خاں اگروری، امان اللہ خاں عشرہ والے، مدو خاں (برادر پایندہ خاں) راجا زبردست خاں مظفر آبادی کے عرائض بھی پہنچ گئے کہ ہم اعانت کے لئے ہمہ تن حاضر ہیں۔ چنانچہ سید صاحب نے غازیوں کے ایک جیش کو مقدمے کے طور پر مولانا شاہ اسماعیل کی قیادت میں بھیج دینے کا فیصلہ فرمایا اور ان سے کہہ دیا کہ جیسے حالات پیش آئیں، ان کے مطابق آیندہ کے لئے پروگرام بنالیا جائے۔ مولانا خیر الدین شیرکوٹی کو شاہ اسماعیل کا نائب بنایا گیا۔

پایندہ خاں کی مزاحمت

شاہ صاحب نے ستھانہ پہنچ کر پایندہ خاں کو اطلاع دی کہ ہم امیر المومنین کے حکم سے پکھلی جا رہے ہیں، آپ کشتیاں تیار رکھیں۔ خان کی طرف سے بالکل خلافِ توقع یہ جواب آیا کہ میں امیر المومنین کا فرمانبردار ہوں، لیکن اگر آپ میری ریاست میں سے گذریں گے تو ہری سنگھ (ہزارہ کا سکھ گورنر) مجھے تنگ کرے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں۔

زبان سے اقرار اطاعت اور عمل میں صریح نافرمانی کا یہ عجیب وغریب منظر دیکھ کر شاہ صاحب حیران رہ گئے۔ بلاشبہ سکھوں کی طرف سے آزار کا اندیشہ غیر معقول نہ تھا، لیکن پائندہ خاں تو ابتدا سے سکھوں کے خلاف لڑ رہا تھا اور اس نے مصالحت منظور نہیں کی تھی، بلکہ سکھوں نے اس کے کچھ علاقے بھی دبا رکھے تھے۔ جو شخص بجائے خود سکھوں کا مخالف تھا اسے سید صاحب کی اعانت کے سلسلے میں سکھوں کی طرف سے مخصوص آزار کا کیا خوف ہوسکتا تھا؟ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ سید صاحب نے ملاقات کے دوران میں اس سے صرف ایک رعایت طلب کی تھی اور وہ یہ کہ آمد ورفت میں غازیوں کے لئے سہولت پیدا کی جائے۔ اس رعایت کو وہ ظاہراً بہ دل وجان قبول کر چکا تھا، اس وقت اسے سکھوں کی طرف سے اندیشۂ آزار کا خیال کیوں نہ آیا؟

شاہ صاحب نے دوبارہ لکھا کہ آپ ایک طرف امیر المومنین کی فرمانبرداری کے دعویدار ہیں، دوسری جانب سکھوں کے خوف سے ہمارا راستہ روک رہے ہیں، حالانکہ سکھوں سے آپ کے تعلقات بدستور معاندانہ ہیں، یہ کیسی فرمانبرداری ہے؟ اگر آپ اپنے علاقے میں سے عبورِ دریا کی اجازت کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں تو ہم کسی دوسرے گھاٹ سے گذر جائیں گے، لیکن اس حالت میں بھی بھیٹ گلی سے گذرنا ناگزیر ہے، جو آپ کی عملداری میں شامل ہے۔ اس گذرہی کی اجازت دے دیجئے۔ پائندہ خاں نے جواب دیا کہ امب ہو یا بھیٹ گلی، میرے علاقے میں سے ہرگز نہ گذریے، ورنہ لڑائی ہوجائے گی۔

تفہیم کی مساعی

شاہ صاحب خود ستھانہ میں ٹھہر گئے، سید صاحب کو پورے حالات لکھ بھیجے اور پوچھا کہ اب کیا حکم ہے؟ سید صاحب نے پکھلی کے ان اصحاب سے مشورہ کیا جو آپ کے

پاس موجود تھے۔ انہوں نے عرض کہ رُکنا خلاف مصلحت ہے، پیش قدمی کا حکم دیجئے اور خود بھی ادھر ہی تشریف لے چلئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ لڑائی اچھی معلوم نہیں ہوتی، کشمیر کی طرف جانا بھی ضروری ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) کو بغرض مشورہ بلا لیا جائے، نیز پائندہ خاں کو للہ فی اللہ سمجھایا جائے، اگر وہ مان گیا فھو المراد، ورنہ جیسا کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ (۱)

شاہ صاحب آئے تو سید صاحب نے فرمایا کہ ہم جس بات کا ارادہ کرتے ہیں، یہاں ایک نہ ایک مسلمان حارج ہو جاتا ہے اور وہ کام نہیں ہونے پاتا۔ مشورے کے بعد سید صاحب نے خود پائندہ خاں کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم کاروبارِ دین کے لئے آپ کی عملداری میں سے گذر کر جانا چاہتے ہیں، ہمارے ساتھ شرکت کیجئے۔ اگر شرکت ممکن نہ ہو تو کم سے کم مزاحمت نہ کیجئے، یہ بھی آپ کا احسان ہوگا۔ (۲) اس کا جواب بھی وہی آیا کہ میں فرمانبردار ہوں لیکن اس راستے سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، اگر آپ زور و قوت سے کام لیں گے تو لڑائی ہو جائے گی۔

اس کے بعد قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ مسلمانوں کی کتنی کم نصیبی تھی کہ سید صاحب نے سمہ میں جہاد کا جو انتظام کیا تھا وہ سردارانِ پشاور اور رئیس ہنڈ کی وجہ سے متوقع نتائج پیدا نہ کر سکا۔ کشمیر کی سمت پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو پائندہ خاں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ لطف یہ کہ وہ سید صاحب کی فرمانبرداری کا دعویدار تھا اور سکھوں کے ساتھ

---

(۱) یہ "وقائع" کا بیان ہے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ مولانا کو بلایا نہیں تھا بلکہ خط لکھ دیا تھا کہ پیش قدمی میں عجلت نہ کریں اور پائندہ خاں کو نرمی سے سمجھائیں۔ "منظورہ" کی عبارت ہے: "بذریعہ خط آں جناب مولانائے ممدوح حاضر پنجتار گردیدند۔" گویا اس سے "وقائع" کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۲) خط کی عبارت یہ تھی: "لشکر ما بہ سمت کشمیر می رود۔ راہ از ملک شما است و بجز تائید دین دیگر غرض ما نیست پس شما کہ دعوائے تابعداری ما مے کنید، مے باید کہ خود شریک حال ما باشید والا از رفتن آں طرف مزاحم نہ شوید۔ خیر دنیا و دین شما در ہمیں است۔"

اس کی جنگ جاری تھی۔

سید صاحب چنگئی میں

سید صاحب نے توپوں کو محفوظ مقام پر دفن کرایا۔(۱) بی بی صاحبہ اور بعض دوسرے غازیوں کی خواتین کو دکھاڑہ بھیج دیا، جو پنجتار سے اڑھائی تین کوس پر پہاڑوں میں زیادہ محفوظ مقام تھا۔ سید احمد علی اور رسالدار عبدالحمید خاں سے فرمایا کہ کھبل ہوتے ہوئے، پیر خاں کی جماعت کو ساتھ لے کر ستھانہ پہنچ جائیں، چنانچہ وہ ٹوپی اور کھبل ہوتے ہوئے ستھانہ گئے تو معلوم ہو گیا کہ پائندہ خاں لڑائی کی تیاری میں مشغول ہے۔ یہ اطلاع سید صاحب کو بھیج دی، سید اکبر شاہ نے دو روز تک پورے لشکر کی مہمانداری کی، پھر رسد بٹنے لگی، سید صاحب پابینی ٹھہرتے ہوئے، چنگئی پہنچے تو آپ کے ساتھ مندرجہ ذیل اصحاب بھی تھے:

شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن (رام پور منہاران)، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ عبدالحکیم پھلتی، ملا لعل محمد قندھاری، اخوند قطب الدین قندھاری، ملا عزت قندھاری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ علی محمد دیوبندی، صوفی نور محمد بنگالی، مولوی وارث علی بنگالی، مولوی امام الدین بنگالی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، سید اسماعیل رائے بریلوی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، مولوی عثمان علی عظیم آبادی، مولوی باقر علی عظیم آبادی، جعفر خاں ترین، میرزا احمد بیگ پنجابی، حاجی عبداللہ رام پوری، حافظ امام الدین رام پوری، امام خاں خیرآبادی، ابراہیم خاں خیرآبادی، حافظ مصطفیٰ کاندھلوی (نبیرہ مفتی الٰہی بخش)

---

(1) اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ پہلے مولوی احمد اللہ سے فرمایا کہ توپوں کو ٹیلے سے اتار کر پنجتار لے آئیں، مقام دفن خاص اصحاب کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ توپوں کو چرخوں سے اتارا اور اونٹوں پر لاد کر دفن کے مقام پر لے گئے، جن آدمیوں سے اتارنے چڑھانے میں مدد لی گئی، ان سے اخفا کا حلف بھی لیا گیا تھا اور ان کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔

قاضی علاؤ الدین بگھروی، میانجی چشتی بڑھانوی، خواجہ محمد حسن پوری، قاضی احمد اللہ میرٹھی، قاضی حمایت اللہ تھانوی، قاضی برہان الدین تھانوی، امان اللہ خاں خان خیل (عشرہ)، ناصر خاں بھٹ گرامی، قاضی سید محمد حبان، مدد خاں (برادر پایندہ خاں)۔

چھتی میں پہنچ کر شاہ اسماعیل کو لشکر کا امیر بنایا، ان سے کہا کہ آپ لڑائی میں پہل نہ کریں، فریق مخالف پیش دستی کرے تو آپ حفاظت کے لئے جو مناسب سمجھیں، عمل میں لائیں۔ پھر سارے قافلے کو دعائے خیر کے بعد مداخیل کی جانب روانہ کیا۔ مدعا یہ تھا کہ پایندہ خاں پر جنوب اور شمال مغرب دونوں سمتوں سے دباؤ ڈالا جائے، خود سید صاحب کے پاس صرف ساٹھ غازی رہ گئے۔

مولانا کی روانگی

شاہ اسماعیل نے چھتی سے رخصت ہو کر پہلا مقام کبائی میں کیا، جہاں کے باشندوں نے دستور کے مطابق کھانا کھلایا۔ مدد خاں ساتھ تھا، راستے میں باڑا نام ایک بستی آتی تھی، جو پایندہ خاں کی عملداری میں تھی، اگرچہ اس کے کنارے جانا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ پایندہ خاں کے آدمی تعرض نہ کریں، اس لئے مدد خاں کو پہلے سے باڑا میں بھیج دیا گیا کہ لوگوں کو سمجھا دیا جائے، پھر شاہ صاحب دیگوہ پہنچ گئے، اس وقت مقامی خوانین میں سے مندرجہ ذیل اصحاب آپ کے ساتھ تھے:

۱۔ رحمت خاں، رئیس تگری۔ ۲۔ سرور خاں، رئیس مداخیل
۳۔ غلام خاں، رئیس مداخیل۔

شاہ صاحب نے دو سو غازی دیگوہ میں چھوڑے، خود باقی غازیوں کو لے کر فروسہ چلے گئے، جو دیگوہ سے کوس سوا کوس کے فاصلے پر تھا۔

اٹھارہواں باب:

عشرہ اور امب کی جنگیں

مقامات کا نقشہ

اب سب سے پہلے مقامات کا نقشہ سامنے رکھ لینا چاہیے، جس کے بغیر فریقین کی جنگی تدابیر کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔

۱۔ امب اور ستھانہ دونوں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہیں، پہلے یہ موجودہ سطح سے بارہ تیرہ گز بلندی پر واقع تھے۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں زمین کھد گئی، امب آج کل چھوٹا سا گاؤں ہے، اسے امب قدیم کہتے ہیں۔ طغیانی کے بعد پایندہ خاں نے دو تین میل شمال میں نیا امب آباد کر لیا تھا، اس کا نام امب جدید ہے۔ پرانے امب اور ستھانہ کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہوگا۔

۲۔ عام پہاڑی علاقوں کی طرح اس مقام کے پہاڑوں میں بھی جا بجا چھوٹے بڑے نالے بہتے ہیں، نالوں کی گذرگاہیں ہی راستوں کا کام دیتی ہیں۔ ایک بڑا نالہ مہابن سے نکل کر مختلف مقامات کے چکر لگاتا ہوا امب اور ستھانہ کے عین وسط میں پہاڑ سے باہر نکل کر دریا میں ملا ہے، اس کا نام ''بھیٹ گلی'' ہے۔ یہ بارہ تیرہ میل سے کم لمبا نہ ہوگا۔

۳۔ بھیٹ گلی کے آغاز میں اس کے مغربی کنارے پر دیگوہ ہے اور اس سے دو تین میل نیچے فروسہ دریا میں داخل ہونے کے مقام پر، ٹیلے کے اوپر عشرہ آباد ہے، اس کا فاصلہ امب اور ستھانہ سے یکساں ہے۔

۴۔ عشرہ کے مقابل بھیٹ گلی کے مغربی کنارے پر درے کے اندر ایک اونچا

ٹیلہ ہے، جس کی حیثیت ایک برج کی سی ہے، یہ بارہ سو فٹ اونچا ہوگا، اس کا نام کوہ کنیر ڑی ہے، اور اس پر کنیر ڑی نام گاؤں آباد ہے۔

۵۔ عشرہ سے متصل شمالی جانب ایک اور اونچا ٹیلہ ہے، اس پر بھی ایک بستی آباد ہے، جس کا نام کوٹلہ ہے۔

۶۔ دریا کی جانب سے عشرہ کے مقام پر پہاڑوں میں داخل ہوں تو بھیٹ گلی سے ہوتے ہوئے فردسہ اور ڈیگرہ پہنچتے ہیں۔

۷۔ امب کے عین پیچھے ایک گلی ہے، جس سے ہوتے ہوئے بھیٹ گلی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اسے گلنگوی کہتے ہیں۔ گلنگری کا جو سرا بھیٹ گلی سے ملتا ہے، اس جگہ گوجر ہنیاں نام بستی آباد ہے، دوسرا سرا امب کے سر پر ہے، یہاں بھی پیدل آ جا سکتے ہیں۔

فریقین کی فوجیں

اب فریقین کے فوجوں کا نقشہ پیش نظر لایئے:

۱۔ غازیوں کی بڑی فوج ستھانہ میں تھی، اس کے سپہ سالار سید احمد علی (خواہر زادہ سید صاحب) تھے اور نائب سالار رسالدار عبدالحمید خاں۔

۲۔ پورے محاذ کی فوج کے سپہ سالار اعظم مولانا شاہ اسماعیل تھے، جو فردسہ میں مقیم تھے۔

۳۔ شاہ اسماعیل نے دو سو غازیوں کو ڈیگرہ میں ٹھہرا رکھا تھا، قندھاری غازی فردسہ سے نیچے بر جانب امب مقیم تھے۔

۴۔ پائندہ خاں کا مرکز امب میں تھا وہیں اس کی فوج رہتی تھی، لیکن فوج کا ایک حصہ اس نے عشرہ میں متعین کر رکھا تھا۔

جنگی اسکیمیں

پاینده خاں کی اسکیم یہ تھی کہ کچھ سپاہی بھیج کر کوہ کنیر زی پر مورچے قائم کر لئے جائیں۔ اس طرح عشرہ کے لئے حفاظت کا پورا بندوبست ہو سکتا تھا، نیز ستھانہ، فردسہ اور دیگروہ میں بیٹھے غازیوں کے درمیان رشتۂ اتصال منقطع کیا جا سکتا تھا، لیکن پاینده خاں کے بھائی مدد خاں اور دوسرے مقامی خوانین سے پورے حالات معلوم کر کے مولانا کوہ کنیر زی کی اہمیت کا اندازہ فرما چکے تھے، اس لئے انہوں نے غازیوں کی ایک جماعت کو اس پر قبضے کی غرض سے بھیج دیا۔ ارباب بہرام خاں تہکالی کو اس کا امیر بنایا، ساتھ ہی فرمایا کہ اگر ارباب کو کوئی ناگوار حادثہ پیش آ جائے تو شیخ بلند بخت دیوبندی امیر بنیں، ان کے بعد مولوی امیر الدین پھر امام خاں خیر آبادی، امام خاں کے بعد غازی جسے چاہیں امیر بنا لیں۔ مدد خاں کو اس جماعت کے ساتھ بھیجا۔

اس جماعت کو حکم دے دیا کہ کنیر زی پر قبضہ کر لینے کے بعد عشرہ کی جانب اتر جائے۔ سید احمد علی کو ستھانہ حکم بھیج دیا کہ صبح غازیوں کو لے کر عشرہ کے میدان میں پہنچیں، خود فردسہ سے پیش قدمی کا ارادہ فرمایا۔

اب آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی اسکیم کتنی عمدہ تھی، اگر پاینده خاں عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا کلنگوی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے، اگر وہ خود کلنگوی کے راستے فردسہ پر پیش قدمی کرتا تو ستھانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دو سمتوں سے امب پر بڑھتے۔ (۱)

---

(۱) جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ غازی محض علمائے دین تھے اور انہیں فنونِ حرب سے چنداں آگاہی نہ تھی، وہ محض اس جنگی نقشے کو دیکھ کر اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غازیوں کی مہارت حربیات کا درجہ کتنا بلند تھا، سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کو میں نے یہ تفصیلات سنائیں تو انہوں نے فرمایا کہ جو مقاصد مولانا کے سامنے تھے، ان کے حصول کے لئے اس سے بہتر نقشہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ بڑے سے بڑا جرنیل بھی ان مقاصد کے لئے وہی نقشہ جنگ بنائے گا، جو مولانا نے بنایا۔

فریب صلح

پائندہ خاں کو کھیر ڑی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اسے معلوم ہو گیا کہ اب ان کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے، گھبرا کر اس نے صلح کا جال بچھایا۔ مولانا کو پیغام بھیجا کہ میں تو فرمانبردار ہوں جو گستاخی ہوئی اس پر نادم ہوں، بہ صدق دل توبہ کرتا ہوں آپ بھی میرا قصور معاف فرمادیں۔ صبح پانچ سات غازی لیکر بانڈہ تشریف لے آئیں۔ (۱) میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا، پھر بات چیت کر کے آخری فیصلہ کر لیا جائے گا۔

مولانا اس پر بے حد خوش ہوئے، اس لئے کہ وہ پائندہ خاں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے، سید صاحب کا حکم بھی یہی تھا، ساتھ ہی آپ نے ایک حکم کوہ کھیر ڑی کے غازیوں کو بھیج دیا کہ پہاڑ پر ہوشیار بیٹھے رہیں اور روانگی ملتوی کر دیں۔ اگر روانہ ہو چکے ہوں تو واپس چلے جائیں اور ستھانہ میں ٹھہریں۔

سید احمد علی روانہ ہو چکے تھے، سپہ سالار اعظم کا حکم راستے میں ملا، انہوں نے وہیں سے گھوڑے کی باگ پھیر لی، رسالدار عبدالحمید خاں اور سید اکبر شاہ ستھانوی دونوں کی رائے تھی کہ مولانا کو جو خط پائندہ خاں نے بھیجا ہے وہ فریب پر مبنی ہے، اور پلٹنا نہیں چاہئے بلکہ عشرہ کے میدان میں پہنچ جانا چاہئے۔ اس لئے کہ پائندہ خاں کے لشکر کی تیاری صاف نظر آتی تھی، لیکن سید احمد علی نے فرمایا: میں سپہ سالار اعظم کے حکم سے مجبور ہوں، وہی کروں گا جو انہوں نے فرمایا ہے۔ (۲)

---

(۱) یہ مقام فردوسے قریب، امب کی سمت ہے۔

(۲) روایت میں ہے کہ سید اکبر شاہ نے فرمایا: میں اس معاملے میں پائندہ خاں کے فریب کو اسی طرح دیکھ رہا ہوں جس طرح اپنے ہاتھ کو۔ واپس نہ چلیں، دو چار گھڑی اس مقام پر ٹھہرے رہیں حقیقت خود بخود آشکارا ہو جائے گی۔ سید احمد علی نے جواب دیا: بھائی سید اکبر! آپ بجا فرماتے ہیں، میرے خیال میں بھی یہی بات ہے، مگر کیا کروں امر اطاعت سے ناچار ہوں۔

فریب کھل گیا

غرض پایندہ خاں کے فریب صلح کے باعث غازیوں کے ہر جیش کی ساری جنگی تدابیر معطل ہو گئیں۔(۱) اگلے روز مولانا دس بارہ آدمیوں کے ساتھ بانڈہ جانے کیلئے تیار ہو گئے، جہاں پایندہ خاں نے بھیت گلی کے رحمت خاں کو اس غرض سے بٹھا رکھا تھا کہ جس طور بھی ممکن ہو مولانا کو گرفتار کر لیا جائے۔ شیخ ولی محمد اور قاضی سید محمد حبان نے مولانا کو روک دیا اور کہا کہ ہم اتنے تھوڑے آدمیوں کے ساتھ آپ کو نہ جانے دیں گے، اگر پایندہ خاں بانڈہ پہنچ جائیگا تو آپ بھی چلے جائیں، ورنہ ہم سب آپکے ساتھ جائیں گے۔

پایندہ خاں نے رحمت خاں کو بانڈہ بھیج کر اپنا پورا لشکر تیار کر لیا، اس میں تقریباً ایک ہزار پیادے اور دو سو سوار تھے۔ کچھ متفرق لوگ بھی میں شامل ہو گئے تھے۔ اس نے تین زنبورکیں اونٹوں پر سوار کرائیں، گھوڑے پر نقارہ رکھوایا۔ یہ لشکر لے کر امب سے روانہ ہوا، پیادے عشرہ میں داخل ہو گئے، سوار ستھانہ کی جانب رُخ کر کے میدان میں کھڑے ہو گئے۔ کوہ کنیر ڑی کے غازی بلندی سے یہ پورے حالات دیکھ رہے تھے، مولانا کی طرف سے اطلاع مل چکی تھی کہ پایندہ خاں صلح پر آمادہ ہے، غازیوں کے سامنے جنگ کا نقشہ پیش ہو رہا تھا، مدو خاں کی بھی رائے تھی کہ پایندہ خاں نے دغا کی۔

کوہ کنیر ڑی پر حملہ

خان کو جب یقین ہو گیا کہ آمادگی صلح کے اظہار نے دیگوہ، فروسہ اور ستھانہ کے غازیوں کو مطمئن کر کے بٹھا دیا ہے، تو اس نے سوچا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوہ

---

(۱) پایندہ خاں کی آمادگی صلح کو بے توقف قبول کر لینے پر تعجب نہیں ہونا چاہئے، نہ یہ غلط فہمی مناسب ہوگی کہ غازی بہت سادہ لوح تھے، انتہائی مجبوری کی حالت میں جنگی تدابیر اختیار کرنی پڑیں تھیں، جب دیکھا کہ مقاصد بلا جنگ پورے ہو سکتے ہیں تو خطرات سے بالکل بے پروا ہو کر صلح پر راضی ہو گئے۔

کھیر ڑی کے غازیوں کو ختم کر دینا چاہیے اور اس پہاڑ پر قبضہ کر لینے کے بعد دوسرا قدم اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ دفعۃً اس کے پیادے اور سوار دو دو گروہوں میں بٹ گئے، سواروں کا ایک غول کھیر ڑی سے آگے بڑھ کر بھیٹ گلی میں فروسہ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، دوسرا غول ستھانہ کے راستے پر جم گیا۔ پیادوں کے ایک گروہ نے کھیر ڑی کے دائیں جانب سے پیش قدمی شروع کی، دوسرے نے بائیں جانب سے۔

کھیر ڑی کے غازیوں کو آٹا نہیں ملا تھا، صرف مکئی میسر آئی تھی۔ بعض مکئی بھون چکے تھے، بعض بھون رہے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانے سے فراغت پائی اور نماز ادا کر کے مقابلے کیلئے تیار ہو گئے۔ مصیبت یہ تھی کہ پیش آمدہ حالات کی اطلاع نہ فروسہ بھیج سکتے تھے اور نہ ستھانہ، اس لئے کہ سارے راستے بند ہو گئے تھے۔

جنگ

پائندہ خاں کے آدمی کھیر ڑی کے دونوں جانب سے اوپر چڑھنے لگے، غازی انہیں قدم قدم پر روکتے رہے، ابتدائی حملے ہی میں چھ غازی شہید ہو گئے، جن میں سے صرف چار کے نام معلوم ہو سکے: سید ظہور اللہ بنگالی، فیض الدین بنگالی، حاجی عبداللہ رام پوری اور سید مدد علی۔ غازیوں کی پوزیشن لحظہ بہ لحظہ نازک ہو رہی تھی، غور و فکر کے بعد مدد خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اجازت ہو تو میں بیس غازی لے کر چوٹی پر پہنچ جاؤں وہاں مورچے جما کر پائندہ خاں کے آدمیوں کو اوپر چڑھنے سے روکنا سہل ہوگا۔ ارباب بہرام خاں نے حسب عادت فرمایا: بسم اللہ۔

اس اثناء میں سید دلاور علی کے گولی لگی، وہ گرے تو غازیوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ نیچے پائندہ خاں کے آدمی پاؤں پکڑ کر کھینچنے لگے۔ امام خاں خیر آبادی نے ذرا آگے بڑھ کر بندوق سر کی معاً ایک گولی ان کی کنپٹی میں لگی اور وہ وہیں شہید ہو گئے، بڑے

شجاع اور باتدبیر غازی تھے۔ مولانا شاہ اسماعیل نے جنگ کے بعد فرمایا کہ دشمن کے ساتھ رزم و پیکار کے لیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں، بعض صاحب تدبیر ہوتے ہیں، بعض شجاع و دلاور، بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں، یعنی مدبر بھی اور شجاع بھی۔ محض باتدبیر لوگ ہمیں اس مقام پر کام نہیں دے سکتے، اس لیے کہ یہ مقام شجاعت کا ہے نہ کہ تدبیر کا۔ منشی محمدی انصاری بولے: امام خاں دونوں خصوصیتوں کے حامل تھے اور شیخ ولی محمد میں بھی دونوں جوہر موجود ہیں۔

غیبی امداد

امام خاں کی شہادت غازیوں کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی، بہ ظاہر لڑائی کا رنگ بگڑ گیا تھا۔ شیخ بلند بخت دیوبندی نے ارباب سے عرض کیا کہ آپ اپنی جگہ پر جمے رہیں اور مجھے اجازت دیں تو کچھ تدبیر کروں۔ ارباب نے فرمایا: بسم اللہ۔ شیخ چند غازیوں کو لے کر مولوی خیر الدین شیرکوٹی کے مورچے پر پہنچے، جو کنیرڑی کے بائیں جانب تھا، انہیں امام خاں کی شہادت کی خبر دی۔ ساتھ ہی کہا کہ کچھ غازی میں لایا ہوں کچھ آپ لیں اور پہاڑ سے نیچے اُتر کر پہلو سے پائندہ خاں کے لشکر پر حملہ کریں۔ مولوی صاحب تیار ہو گئے، چنانچہ دونوں نے نیچے اُتر کر حملہ کیا۔ اس اثناء میں نالے کی جانب سے قرابینیں چلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں قندھاری غازی نمودار ہوئے، پائندہ خاں کے جو سوار فروسہ کا راستہ روکے کھڑے تھے وہ بھاگ نکلے۔ ساتھ ہی وہ پیادے بھی میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے جنہوں نے دو جانب سے کنیرڑی پر حملہ کر رکھا تھا۔

قندھاریوں اور بعض دوسرے اصحاب کے وہاں پہنچنے کا قصہ یہ ہے کہ شیخ ولی محمد نے کنیرڑی کی طرف سے گولیوں کی آواز سنی تو مولانا سے عرض کیا کہ یہ تو جنگ کا نشان ہے، مولانا بولے کہ تنولی یونہی گولیاں چلایا کرتے ہیں، شیخ کو اطمینان نہ ہوا، وہ قاضی سید محمد

صاحبان کو ساتھ لے کر فردوسہ سے نیچے مولوی نصیرالدین کے پاس پہنچے، جن کے ساتھ پچاس ساٹھ پنجابی غازی تھے، پاس ہی قندھاری غازی ٹھہرے ہوئے تھے۔ شیخ ان سب کو لے کر گولیوں کی آواز پر چل پڑے، اس طرح خدا نے اپنی رحمت سے غازیان کنیر زی کے لئے کمک کا بندوبست کر دیا۔

عشرہ اور کوٹلہ پر قبضہ

پایندہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو للکار للکار کر لڑائی کا حوصلہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی عشرہ کو چھوڑ کر امب کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بچے کھچے آدمی اب زور شور سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے: ''خان جل گیا رے'' یعنی خان چلا گیا۔ جس کے کان میں یہ آواز پڑی وہ معاً بھاگ نکلا، غازیوں نے تھوڑی دیر میں عشرہ پر قبضہ جما لیا۔

پایندہ خاں کے لشکریوں میں عظیم موتراش بڑا نشانچی تھا، اس نے خان سے پچیس گولیاں لی تھیں اور کہا تھا کہ جنگ کے بعد اتنے ہی غازیوں کی لاشیں گن لینا۔ بھاگڑ پڑی تو وہ بھی جان بچا کر نکلا، اس نے بڑے گھیرے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ ایک کھیت کی خار بندی سے کودا، شلوار کا پائینچا خار بندی میں اُلجھ گیا اور وہ اوندھے منہ گرا، جو غازی تعاقب میں آ رہے تھے انہوں نے تلواریں مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔

عشرہ پر قبضہ ہو گیا لیکن کوٹلہ میں پایندہ خاں کے آدمی بیٹھے زور شور سے گولیاں چلا رہے تھے۔ شیخ ولی محمد نے غازیوں سے کہا بھائیو! اب کوٹلہ کا بھی فیصلہ کر لو۔ غازی شیروں کی طرح حملہ آور ہوئے۔ کوٹلہ چند لمحوں میں خالی ہو گیا۔ اس سلسلہ میں چند غازی زخمی ہوئے۔ خدا بخش رام پوری کو پنڈلی میں گولی لگی۔ حافظ صابر تھانوی کا ہاتھ زخمی ہوا۔ عبدالقادر بنگالی کے مونڈھے پر زخم آیا۔

شیخ ولی محمد کوٹلہ سے پہاڑ کے اوپر اوپر اسب کے قریب پہنچ گئے، پائندہ خاں انہیں دیکھتے ہی اسب کو چھوڑ کر چھتر بائی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔

ستھانہ کے غازی

شیخ ولی محمد گولیوں کی آواز سن کر کنیر ڑی کی طرف آئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف غازیانِ کنیر ڑی کو شدید مخمصے سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹلہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ جو غازی ستھانہ میں بیٹھے تھے وہ بھی برابر گولیوں کی آواز سن رہے تھے، عبد الحمید خاں رسالدار نے سید احمد علی سے کہا کہ لڑائی شروع ہو چکی ہے اور ہمیں جلد سے جلد پہنچنا چاہئے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ سید احمد علی کو بھی مولانا شاہ اسماعیل کی طرح یہی خیال آیا کہ تنولی یونہی گولیاں چلایا کرتے ہیں، کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہوگا، گولیوں کی آواز بدستور جاری رہی یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ رسالدار نے پھر عرض کیا کہ ہمارے بھائی کٹ رہے ہیں، ہمیں جلد سے جلد موقع پر پہنچ کر امداد دینی چاہئے، بلکہ گھوڑے پر سوار ہو کر باگ اٹھائی، دوسرے لوگ بھی ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن سید احمد علی نے آگے بڑھ کر رسالدار کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور مولانا کا امتناعی خط کھول کر سامنے کر دیا۔ رسالدار مجبوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور کہا: سید احمد علی! تعجب کی بات ہے، نہ آپ خود چلتے ہیں، نہ ہمیں جانے دیتے ہیں۔ وہاں جو غازی تلف ہوں گے، ان کے بارے میں جو مواخذہ ہوگا آپ جانیں، یہ کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

مغرب کے قریب شیخ ولی محمد کا بھیجا ہوا قاصد عشرہ سے آیا، اس نے لڑائی کی کیفیت بتائی، یہ بھی بتایا کہ عشرہ فتح ہو چکا تھا، امید ہے اب تک کوٹلہ بھی فتح ہو گیا ہوگا۔ اسی وقت سب عشرہ روانہ ہو گئے، مغرب کی نماز ستھانہ کی کمڑی سے گذر کر ادا کی، عین اسی وقت شیخ کا ایک قاصد فردوسہ میں مولانا کے پاس بھی پہنچ گیا۔

امب کی حوالگی

شیخ ولی محمد مغرب کے وقت امب پہنچ گئے تھے، پائندہ خاں اپنے آدمیوں کی صلاحیت مزاحمت سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ چھتر بائی سے نکل کر دریا کے پار بروٹی چلا گیا۔ ستھانہ کے غازیوں نے عشاء کی نماز عشرہ میں ادا کی، پھر سید احمد علی اور سید اکبر شاہ ستھانوی کچھ آدمیوں کے ساتھ امب چلے گئے۔ رسالدار عبد الحمید خاں جانے کے لئے بہت مضطرب تھا لیکن اسے یہی حکم ملا کہ رات عشرہ میں گزارو اور صبح امب پہنچو۔

مدد خاں کے آدمیوں نے امب پہنچ کر بعض مکانوں کو آگ لگا دی، شیخ ولی محمد اس حرکت پر سخت خفا ہوئے، اپنے آدمیوں کو آگ بجھانے کا حکم دیا اور مدد خاں کے آدمیوں کو تاکید کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا یہ سکھوں کا شیوہ ہے، مسلمانوں کے لئے ایسی حرکتیں ہرگز زیبا نہیں۔

مولانا کو یہ پیغام بھی بھیج دیا گیا تھا کہ رات کو سفر کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، صبح کو تشریف لے آئیں۔ سید صاحب کو چنگئی میں مفصل حالات لکھ بھیجے، بستی پر قبضہ ہو چکا تھا، گڑھی میں پائندہ خاں کے آدمی موجود تھے، مولانا طلوع آفتاب کے ساتھ پہنچ گئے، اس وقت گڑھی سے صلح کا جھنڈا بلند ہوا۔ مولانا نے شیخ ولی محمد اور شیخ بلند بخت کو آٹھ غازیوں کے ساتھ بھیجا کہ پوچھنے وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے امان طلب کی اور کہا کہ ہمیں اپنا سامان اور ہتھیار لے کر نکل جانے کی اجازت دی جائے۔ مولانا نے ان لوگوں کو ذاتی مال لے جانے کی اجازت دے دی، دروازہ کھلا، مولانا نے پورے سامان کا جائزہ لیا پھر پائندہ خاں کے آدمیوں کو جو تقریباً دو سو تھے، کشتیوں پر سوار کر کے دریا کے پار بھیج دیا۔ امب میں غازیوں کا بندوبست جاری ہو گیا، لشکر میں باقاعدہ رسد بٹنے لگی زخمیوں کو عشرہ میں رکھا گیا۔

چھتر بائی

پائندہ خاں ایک توپ دریا میں ڈلوا گیا تھا اسے نکلوا کر گڑھی کے دروازے پر رکھا گیا۔ اس اثناء میں خبر ملی کہ چھتر بائی کی گڑھی (۱) بھی خالی ہو چکی ہے۔ مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں کو فوراً چھتر بائی پہنچنے کا حکم دے دیا، خود اسب کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر ادھر گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ تخلیہ کی اطلاع درست تھی، لیکن چونکہ غازی اطلاع نہ ملنے کے باعث جلد نہ پہنچ سکے، اس لئے پائندہ خاں کے آدمی دوبارہ گڑھی میں جم کر بیٹھ گئے۔

اسب سے چھتر بائی کے دو راستے تھے: ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے کنارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالدار عبدالحمید خاں پہاڑی راستے سے گئے، مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے تینوں جانب مورچے بنا لینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جا بجا آٹھ مورچے بنا لئے گئے: تین شمالی و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں دو جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا، محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا، لیکن گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی، مولانا نے اسب سے توپ منگا کر گولہ باری بھی کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، آخر یہ سارے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے کہ آپ اسب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔

پنجتار سے توپیں منگائی گئیں

سید صاحب نے اسب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر بائی پر حملے کے لئے پنجتار سے توپیں

---

(۱) چھتر بائی کی بستی ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہہ گئی، پھر اس کی جگہ کوئی بستی آباد نہ ہوئی۔ اس بستی کا نشان اب تک بتایا جاتا ہے، اسب قدیم سے پانچ میل شمال میں دریا کے مغربی کنارے پر یہ واقع تھی۔

منگا لینی چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند بخت دیوبندی کو پچیس تیس غازیوں کے ساتھ چھتر بائی سے بلالیا، اور ضروری ہدایتیں دے کر پنجتار بھیج دیا۔ شیخ ستھانہ سے درہ برگ (۱) کے راستے گندف اور پابئی ہوتے ہوئے پنجتار پہنچے، دو غازیوں کو (امام الدین اور عنایت اللہ خاں توتالی والے) اس غرض سے گندف چھوڑ گئے کہ خان گندف سے مدد لے کر درے کا راستہ خوب درست کرالیں تاکہ اونٹ توپیں لے کر آسانی سے گذر سکیں۔ پنجتار پہنچ کر دفن شدہ توپیں نکلوائیں، دکھاڑا سے قوی اونٹ منگائے، توپیں لاد کر امب لے گئے، سید صاحب کے حکم سے میرزا حسین بیگ، شیخ ہمدانی اور شیخ مولا بخش نے انہیں چرخوں پر چڑھا کر گڑھی کے سامنے کھڑا کردیا۔ اس اثناء میں رن گڑھ تیار کرانے کا بھی حکم ہو گیا۔

ایک افسوسناک واقعہ

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ حملے میں عجلت نہ کی جائے اور محاصرہ جاری رہے۔ اچانک وہاں ایک افسوسناک واقعہ پیش آ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ غازی اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھے تھے، ایک روز حافظ عبداللطیف نے بطور خود مورچوں میں پھر پھر کر غازیوں سے کہہ دیا کہ نماز عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہوگا۔ مولانا اس سے قطعاً بے خبر تھے، حالانکہ وہی سالار لشکر تھے اور ان کے حکم کے بغیر کوئی حملہ ہو نہیں سکتا تھا۔ غازیوں نے سمجھا کہ حافظ عبداللطیف نے مولانا کے حکم کے مطابق پیغام پہنچایا ہوگا، اس لئے وہ بالکل تیار ہو گئے۔

گڑھی کے اردگرد دوہری خاربندی تھی، پھر دور دور تک میدان میں کانٹے بو دیے گئے تھے۔ اچانک غازیوں نے حملہ کیا، حافظ عبداللطیف خود تکبیر کہتے ہوئے سب سے

---

(۱) یہ درہ گیا اور ہال ژوبری (نزد ستھانہ) کے درمیان ہے، برگ بروزن چک ہے۔

آ گئے تھے۔ کانٹوں اور خاربندیوں سے گذرتے ہوئے دیواروں کے پاس پہنچے تو سیڑھیوں کی ضرورت پڑی، جو مولانا کے خیمے میں تھیں۔ مولانا حیران کہ حملہ کس کے حکم سے ہوا، سیڑھیاں دے دیں، انہیں دیواروں سے لگایا تو چھوٹی نکلیں اور غازی اوپر نہ پہنچ سکے۔ تاریکی پھیلی تو ناچار انہیں واپس ہونا پڑا، چند غازی شہید ہوگئے۔ ان میں شیخ بلند بخت کے بھائی شیخ علی محمد بھی تھے، کئی غازی زخمی ہوئے، مثلاً نہال خاں کے ہاتھ کی چار انگلیاں کٹ گئیں، اخوند زعفران کے سینگڑے میں آگ لگ گئی اور ان کا جسم جگہ جگہ سے جل گیا، ملا گلزار قندھاری کے بازو میں گولی لگی۔ رحیم بخش بنارسی کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان زخم آیا۔

غازیوں کی شانِ ایثار

جب مولانا کو معلوم ہوا کہ حافظ عبداللطیف نے بطور خود یہ حکم دیدیا تھا تو انہیں سخت ملامت کی اور فرمایا کہ شہیدوں اور زخمیوں کے نقصان کی ذمہ داری تم پر ہے۔ پھر سارا واقعہ تفصیل سے سید صاحب کو لکھ بھیجا۔ آپ نے بھی حافظ عبداللطیف کو بہت ڈانٹا۔(۱)

شیخ بلند بخت کو گندف میں معلوم ہو چکا تھا کہ غازیوں نے گڑھی پر یورش کی جو ناکام رہی۔ تھانہ پہنچے تو بھائی کی خبر ملی، اس پیکر صبر نے فرمایا: الحمدللہ ہمارا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا، وہ پوری ہوگئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔

شیخ اب پہنچے تو سید صاحب نے انہیں محبت سے پاس بٹھایا، کچھ دیر خاموش رہے، پھر شہید بھائی کی تعزیت کرتے ہوئے تسلی دی، آخر میں فرمایا:

---

(۱) حافظ عبداللطیف بڑے مخلص غازی تھے، لیکن من چلے تھے، میرا خیال ہے انہیں یقین تھا کہ گڑھی ایک یورش سے فتح ہو جائے گی اور محاصرے کو طول دینا مناسب نہیں۔ سید صاحب کے ارشاد کے بعد مولانا کو حملے پر راضی کرنا غیر ممکن تھا، اس لیے بطور خود ایک اسکیم طے کر کے حملہ کرا دیا۔ سوچا ہوگا کہ گڑھی فتح ہو جانے کے بعد اس خود رائی پر چنداں باز پرس نہ ہوگی اور قصور معاف کرا لیا جائے گا۔ یہ حرکت یقیناً سخت نامناسب تھی لیکن ان کی نیت پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔

> آپ کے بھائی جس مراد کو لے کر اللہ کی راہ میں وطن سے نکلے تھے وہ پوری ہوئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کر دے اور ہم سب سے راضی ہو۔ یہی ہم سب بھائیوں کی مراد ہے۔

یہ تھی روحِ ایثار و فداکاری جو سید صاحب کے فیضانِ صحبت میں پیدا ہوئی۔ شیخ نے وہی کلمات کہے جو سید صاحب کی زبان مبارک پر جاری ہوئے۔ بھائی کسے عزیز نہیں ہوتا؟ اور پھر ایسا بھائی جو دنیا میں خیر و سعادت کا قابلِ فخر پیکر تھا، وطن سے دور، عزیزوں سے الگ اور اقربا سے مفارقت کی حالت میں موت آئی، ہم لوگوں نے زندگی کے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں، شیخ بلند بخت ان سے فارغ نہ تھے۔ انہیں بھی ہر رشتہ ویسا ہی عزیز تھا، جیسا ہمیں عزیز ہے۔ لیکن ایک بلند تر جذبے اور رفیع تر نصب العین نے ان کی تمام محبتوں اور علاقہ بندیوں کو دوسرے ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

ذرا اپنے اسلام کا موازنہ ان بلند ہمت غازیوں کے اسلام سے کیجیے، ہمارے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے یا انگلی میں ہلکی سی خراش آ جائے تو درد سے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے دلوں پر برچھیاں چلتی تھیں، لیکن صبر سے جھیلتے تھے۔ اس لیے کہ جانتے تھے راہِ حق و صداقت میں قربانیوں سے مفر نہیں اور مومن صادق وہی ہے جس کا رشتہ رضائے باری کے تابع ہو۔ کیا یہی لوگ نہ تھے، جن پر ہندوستان کے بعض مسند آرایانِ علومِ دین سوا سو برس تک گوناگوں مطاعن کے تیر پھینک پھینک کر سمجھتے رہے کہ دینِ حق اور سنت خواجۂ بدر و حنین صلی اللہ علیہ وسلم کے حفظ و احیاء کا حق ادا ہو رہا ہے؟

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

غازی کھبل بائی میں

سید صاحب نے اس حادثے کے بعد حکم بھیجا کہ غازی چھتر بائی کا محاصرہ چھوڑ کر

کھبل بائی (۱) پہنچ جائیں اور وہاں قیام کریں۔ مولانا نے پہلے اڑھائی سو غازیوں کو مورچوں میں چھوڑا، باقی اصحاب کو کھبل بائی بھیج دیا، پھر خود باقی غازیوں کو لے کر اس طور روانہ ہوئے کہ دشمن ہجوم نہ کر سکے۔ پائندہ خاں کے آدمی دریا پار سے بھی گولیاں چلا رہے تھے، گڑھی کی فوج بھی حوصلہ پا کر یورش پر آمادہ تھی، ایک جمعدار کی کلائی پر اس زور سے گولی لگی کہ مولانا نے جو پاس کھڑے تھے، چٹاخ کی آواز سنی۔ اس بہادر نے کچھ خیال نہ کیا، رومال نکال کر کلائی پر باندھا اور مقابلہ کرتا رہا۔ بڑی احتیاط اور تدبیر سے غازیوں کو سلامت نکال کر لائے۔ مولانا بہ وجہ ضعف پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتے تھے، ایک قندھاری غازی نے انہیں پشت پر سوار کر کے اوپر پہنچایا۔ کھبل بائی میں ڈیرے لگ گئے، پہرے کھڑے ہو گئے، اس جگہ غازیوں نے کئی مہینے گزارے۔

پائندہ خاں کی اطاعت

جب پائندہ خاں کو معلوم ہو گیا کہ سید صاحب نے پنجتار سے توپیں منگائی ہیں، رن گڑھ بھی تیار ہو گئے ہیں تو اس نے سید حسن شاہ اور منشی محمد غوث کو وکیل بنا کر بھیجا تا کہ صلح ہو جائے، اور وہ یرغمال میں اپنا اکلوتا بیٹا بھی دینے کیلئے تیار ہو گیا۔ سید صاحب نے پہلے سید احمد علی کو بیس پچیس آدمیوں کے ساتھ بروٹی بھیجا، پائندہ خاں نے بڑے خلوص سے استقبال کیا لیکن کہا کہ لشکر کھبل بائی سے ہٹا لیا جائے۔ پھر شیخ ولی محمد، مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور مولوی محمد حسین پائندہ خاں کے پاس سفیر بن کر گئے اور سید صاحب کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں نہ چھتر بائی سے غرض ہے نہ اس کے بیٹے کو یرغمال میں لینے کا شوق ہے، ہمیں تو اپنے پروردگار کے کام سے کام ہے۔ اگر پائندہ خاں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانبردار بن جائے تو ہمارا بھائی ہے۔

---

(۱) یہ مقام چھتر بائی سے دو اڑھائی میل جنوب میں تھا۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں اس کا نشان بھی مٹ گیا۔

یہ لوگ واپس آئے تو پائندہ خاں نے اپنے بیٹے کو بھی بھیج دیا، وہ کئی روز امب میں رہا، جاتے وقت مدفون مال نکال کر لے گیا۔ ۲۷ رشوال ۱۲۴۵ھ (۱۹ر مارچ ۱۸۳۱ء) کو ایک اعلام سید صاحب نے شائع فرمایا کہ اگر پائندہ خاں اپنے عہد کے مطابق مدد خاں کا علاقہ اور مال اس کے حوالے کر دے تو گلی بدر ہال کی خانی اور نمبرداری پائندہ خاں کے لئے مسلم رہے گی۔

شرائط صلح

۲۹ رذی قعدہ کو ایک اور اعلام شائع ہوا، جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر پائندہ خاں خدمت دین کا راستہ اختیار کر لے، منافقوں اور کافروں سے موافقت ترک کر دے، لشکر اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی سے تائب ہو جائے، اپنے بھائی مدد خاں کے حقوق ادا کر دے، خان اگرور کا ملک چھوڑ دے تو وہ ہندوال تنولیوں کی سرداری پر قائم رہے گا اور کشمیر و پشاور کی فتح کے بعد اسے تیس ہزار کی جاگیر کشمیر میں اور دس ہزار کی جاگیر پشاور میں دی جائے گی۔ اسی تاریخ کو پائندہ خاں نے مندرجہ ذیل اقرار نامہ لکھا:

۱۔ مجھ سے جو قصور سرزد ہوئے، ان پر نادم ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

۲۔ شرع مبین کی خدمت و اتباع اور حضرت امیر المومنین کی امامت کو بہ دل قبول کرتا ہوں۔

۳۔ کبھی کفار کا ساتھ نہ دوں گا، نہ ان سے کوئی واسطہ رکھوں گا۔

۴۔ مدد خاں کے تمام حقوق ادا کر دوں گا۔

۵۔ کلکئی کے سوا اگرور کا سارا علاقہ چھوڑ دوں گا۔

۶۔ پلال تنولیوں کے ملک و ریاست سے کوئی غرض نہ رکھوں گا۔

۷۔ بالفعل ایک سو ساٹھ سوار مع شاہین برخوردار جہاں داد (پسر پائندہ خاں) کے

ہمراہ ملک سمہ میں بھیجوں گا۔

۸۔ دو ہزار پیادوں کا لشکر اکبر علی کے ہمراہ کشمیر روانہ کروں گا۔

۹۔ اگر ان امور کے خلاف کروں تو میری جان اور مال مسلمانوں کے لئے حلال ومباح ہوں گے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پائندہ خاں کو صلح پر آمادہ کرنے کا کام قاضی سید محمد حبان نے پورا کیا تھا۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے گفتگو کی، یہ طے کرایا کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا ملک جو غازیوں نے فتح کیا ہے، ان کے قبضے میں رہے۔ مشرقی سمت کا ملک پائندہ خاں کے پاس رہے، بشرطیکہ خدمت دین اور رفاقت مجاہدین میں کوتاہی نہ کرے اور اپنے بھائی کے حقوق ادا کرے۔

انیسواں باب:

جنگ پھولڑہ

پیش قدمی کے مقدمات

سید صاحب اسب کی طرف اس غرض سے آئے تھے کہ سکھوں کے خلاف پکھلی میں محاذ قائم کریں اور گردوپیش کے مسلمان امراء وعوام کو لے کر کشمیر کو سکھوں کے قبضے سے نجات دلائیں۔ جنگ بالکل ناخواستہ پیش آ گئی جب کہ پائندہ خاں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، اسب وعشرہ پر قبضے کے بعد سید صاحب نے آگے بڑھنے کی تدبیریں اختیار فرمالیں۔ سلیمان شاہ والیٔ چترال (کاشکار) دو برس پیشتر قول دے چکا تھا کہ اگر کشمیر کی طرف رُخ کریں تو میں گلگت کے راستے امداد کیلئے پہنچ جاؤں گا۔ کوائی (وادیٔ کاغان) کے سید ضامن شاہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا، وہ کشمیر کے پہلو میں تھا، اس بناء پر پورے حالات سے اسے آگاہی تھی۔ وہ خود ملاقات کی غرض سے سید صاحب کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ کشمیر کے گورنر دیوان رام دیال کے خلاف بے شمار شکایتیں والیٔ لاہور کے پاس پہنچی تھیں، اسے لاہور بلالیا گیا ہے، فی الحال کشمیر میں کوئی شخص گورنر مقرر ہو کر نہیں آیا، اگر اس جانب جلد پیش قدمی کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔

شوال ۱۲۴۵ھ (اپریل ۱۸۳۰ء) میں سید صاحب نے میاں جی نظام الدین چشتی اور منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو مظفر آباد کی جانب کھکھا بمبا نام قبیلوں میں دعوت وارشاد کی غرض سے بھیج دیا، وہاں کے بہت لوگ میاں جی صاحب کے مرید بن گئے۔

قادر آباد کا غیر مسلم قلعدار

قادر آباد(۱) کی گڑھی عشرہ کے عین سامنے دریا کے مشرقی کنارے پر واقع تھی، جس کا قلعدار رام سنگھ (یا رام سکھ) سید صاحب کا ہم وطن تھا۔ عشرہ کے لوگ گھاس کھودنے کیلئے دریا کی طرف نکلتے تھے اور قادر آباد کے باشندے پن چکیوں پر آٹا پسوانے کیلئے جاتے تھے۔ اگرچہ دریا بیچ میں حائل تھا لیکن کبھی کبھی گولیاں چل جاتی تھیں۔ رام سنگھ کو سید صاحب کے خاندان کی عزت و شرف کا حال بخوبی معلوم تھا، اس وجہ سے وہ ان کشمکشوں کو روکنا چاہتا تھا۔ ایک روز خفیہ خفیہ کشتی پر سوار ہو کر عشرہ میں مولوی مظہر علی عظیم آبادی کے پاس پہنچا اور کہا کہ باہم فیصلہ کر لیجئے۔

میں اپنے آدمیوں کو تاکید کر دوں گا کہ آپ کے کسی آدمی کو نہ چھیڑیں۔ آپ اپنے آدمیوں کو تاکید فرما دیں کہ میرے آدمیوں کو آزار نہ پہنچائیں۔ وہ سید صاحب کو خط بھی لکھتا رہتا تھا، جن میں سے صرف ایک محفوظ رہ گیا، اس پر ۲۱ شعبان ۱۲۴۵ھ کی تاریخ ثبت ہے۔(۲) اپنے ہاں کے مسلمانوں کو خود سید صاحب کی بیعت کیلئے وقتاً فوقتاً اسپ بھیجتا رہتا تھا۔ منشی محمدی انصاری خوش طبعی کے عالم میں فرمایا کرتے تھے، عجیب بات ہے کہ خود کافر ہے، لیکن مسلمانوں کو راہ راست دکھاتا ہے۔

پھولڑہ پر یورش کا فیصلہ

اس زمانے میں ملکی لوگ خصوصاً تنولی دریا سے گذر کر تین تین چار چار میل سکھ علاقے میں نکل جایا کرتے تھے۔ ان ترکتازوں سے مقصود یہ تھا کہ سکھوں کا قائم کردہ نظم

---

(۱) قادر آباد ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہہ گیا تھا، پھر اس جگہ نئی آبادی نہ بنی۔ سن رسیدہ لوگوں سے اس کی جگہ کا نشان اب بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

(۲) ملاحظہ ہو مجموعہ مکاتیب مولانا شاہ اسماعیل ص: ۲۷۹۔

ونسق درہم برہم ہو جائے اور وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹ جائیں۔ لیکن اس سلسلے میں مستقل اقدام لازم تھا، سید صاحب جلد کشمیر پہنچنا چاہتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ فاصلہ زیادہ ہے، لوگ نفاق پیشہ ہیں اور پہلے بیچ کے اہم مقامات پر قبضہ جمالینا چاہیے۔

غالباً ماہ شوال ۱۲۴۵ھ کے آخر یا ماہ ذی قعدہ کے اوائل میں مددخاں ہندوال اور سربلند خاں پلال نے یہ تجویز پیش کی کہ اب غازیوں کو پھولڑہ پر بڑھنا چاہیے، جو ضلع ہزارہ کے تنولی علاقے کا مرکز تھا۔(۱) سید احمد علی، سید اکبر شاہ ستھانوی، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن (رام پور منہاران) شیخ ولی محمد پھلتی نیز دوسرے اکابر نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کسے لشکر کا امیر بنا کر بھیجا جائے؟ سید احمد علی بولے کہ میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کیلئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھے ساتھیوں کے انتخاب کی اجازت دی جائے۔ سید احمد علی کی زبان سے پہلے کسی موقع پر ایسی بات نہیں نکلی تھی اور انہیں بھیجنے کا سید صاحب کو خیال بھی نہ تھا، لیکن جب وہ خود تیار ہو گئے تو اجازت دیدی۔

سید صاحب نے سواری خاصہ کا گھوڑا سید احمد علی کو دیا۔(۲) سیاہ قبا بھی دی جو آپ نے ۲۷ر رمضان کی شب کو عبادت کرتے وقت پہن رکھی تھی۔ جن غازیوں کو معیت کے لئے منتخب کیا، انہیں تیاری کا حکم دے دیا۔ اپنی بندوق کے لئے چقماق سید احمد علی نے اپنے فرزند سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ سے لیا۔

---

(۱) تاریخ تصریحاً مرقوم نہیں۔ میرے قیاس کے مبانی یہ ہیں: اول پکھلی پر پیش قدمی کے دوران میں مختلف لوگوں کو جو امان نامے دیے گئے، ان پر ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ درج ہے۔ دوسرے مولوی سید جعفر علی نقوی رمضان ۱۲۴۵ھ میں امب پہنچے تھے، تھوڑے ہی دنوں میں ان کی صلاحیتیں سب پر آشکارا ہو گئیں۔ سید احمد علی نے انہیں پھولڑہ ساتھ لے جانا چاہا تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ دور سے آئے ہیں، سفر کی ماندگی ابھی باقی ہوگی، کسی دوسرے بھائی کو لے لیجئے۔ تیسرے سید احمد علی جاتے وقت ایک سیاہ قبا سید صاحب سے عاریۃً لے گئے تھے، جو آپ نے (سید صاحب نے) ۲۷ر رمضان ۱۲۴۵ھ کی شب میں عبادت کرتے وقت پہنی تھی۔

(۲) اس کا نام اژدر تھا، یہ ارباب بہرام خاں نے بطور نذر سید صاحب کو دیا تھا۔

لشکر اسلام کی پیش قدمی

پورے لشکر کو ایک گھاٹ سے دریا کے پار اُتارنے میں بہت وقت صرف ہوتا، نیز اندیشہ تھا کہ سکھوں سے کنارہ دریا ہی پر مڈبھیڑ نہ ہو جائے، اس لیے لشکر کو تین حصوں میں بانٹ کر الگ الگ گھاٹ سے پار اترنے کا حکم دیا گیا۔ ایک حصہ کا سردار محمد خاں تھا، جو پہلے اٹک میں سکھوں کے ہاں ملازم تھا، پھر ملازمت چھوڑ کر سید صاحب کے پاس آ گیا۔ میر فیض علی گورکھپوری کو محمد خاں کا مشیر مقرر کیا گیا۔ دوسرے حصہ کا سردار سید نور الحسن تھا، جسے اہل لشکر بالعموم "ماما نور الحسن" کہتے تھے۔ تیسرا حصہ براہ راست سید احمد علی کی سالاری میں تھا۔

محمد خاں کا لشکر کرپلیاں کے گھاٹ سے پار اُترا، جو لسب کے سامنے تھا۔ اس حصے میں سکھوں کی طرف سے مزاحمت کا قوی اندیشہ تھا، اس لئے کنارہ دریا پر دو توپیں محفوظ جگہ نصب کر دی گئیں۔ جب کرپلیاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں تو محمد خاں کے حکم سے چکر توپ چلائی گئی، کسی سکھ کو گڑھی سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ محمد خاں کا پورا لشکر تین پھیروں میں سلامت پار اُتر گیا۔ سید نور الحسن کا لشکر غالباً تھانہ کے گھاٹ سے بلا مزاحمت پار اُتر گیا۔ سید احمد علی نے بھی کرپلیاں کے گھاٹ سے دریا عبور کیا، مولوی محمد حسن رام پوری سید احمد علی کے مشیر خاص تھے، مقامی خوانین میں سے مدد خاں ہندوال سربلند خاں پلال، امام اللہ خاں خان خیل اور جعفر خاں ترین بھی سید احمد علی ہی کے ہمرکاب تھے، ہر ایک کے ہمراہ تیس تیس چالیس چالیس آدمی تھے۔ (۱)

---

(۱) اس لشکر کے شرکا میں سے بعض اور اصحاب کے نام بھی مختلف روایتوں میں آئے ہیں۔ مثلاً سید عبدالرزاق نگرامی (برادر سید نور احمد مؤرخ اسلام)، مولوی کریم بخش سہارن پوری، رحیم بخش جراح شاملی کے، عبدالکریم عظیم آبادی، زبردست خاں رائے بریلوی، کالے خاں، جو پھیروں کے محافظ تھے۔ بعض کے نام آگے چل کر آئیں گے۔

پھولڑہ کا موقع

پھولڑہ پہاڑوں کے حلقے میں ہے، دامن کوہ کی زمین اونچی ہے اور اسی پر بستی آباد ہے۔ نیچے میدان میں کھیتی باڑی ہوتی ہے، مانسہرہ سے یہ دس میل ہوگا۔ سرن ندی بستی کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے سے گذرتی ہے، اس کے دونوں کنارے اتنے اونچے ہیں کہ ان پر کھڑے ہو جائیں تو مانسہرہ کی طرف چار میل تک ہر چیز بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ بستی کے پاس سے ایک نالہ گذرتا ہے، جس کا نام ''ٹھنڈا بہن'' ہے۔ اس سے پن چکیاں بھی چلتی ہیں اور کھیتوں کو پانی بھی ملتا ہے۔ مانسہرہ جانے والا راستہ مشرقی سمت میں ہے، اس کے علاوہ دو راستے جنوبی سمت میں ہیں: اول ترپی اور خیل کا راستہ، دوسرا گنڈوال کا راستہ۔ دونوں راستوں پر قبرستان ہیں۔

پھولڑہ بعد میں مدد خاں کو بطور جاگیر مل گیا تھا، اس کے اخلاف دیر تک اس پر قابض رہے۔ حال میں اس کا انتظام حکومت سرحد نے سنبھال لیا ہے۔ مقامی خان اس قبرستان میں دفن ہوتے تھے، جو گنڈوال سے آنے والے نالے کے کنارے پر ہے۔ سید احمد علی کو بھی یہیں دفن کیا گیا، باقی شہداء اس گنج شہیداں میں دفن ہوئے جو ترپی اور خیل کے راستے پر ہے۔ (۱)

سید احمد علی نے پھولڑہ جانے کیلئے غالباً وہ راستہ اختیار کیا تھا جسے آج کل لساں کا راستہ کہتے ہیں (۲) وہ شاہ کوٹ سے لساں پہنچے اور اس پر قبضہ جماتے ہوئے پھولڑہ میں داخل ہو گئے۔ راستے میں کہیں جدال وقتال کی نوبت نہ آئی، بستی سے باہر مانسہرہ والے

---

(۱) میں پھولڑہ کو نہ دیکھ سکا۔ یہ تفصیلات مختلف اصحاب سے معلوم ہوئیں، کہہ نہیں سکتا کہ میں انہیں ٹھیک ٹھیک بیان کر سکا ہوں یا نہیں۔

(۲) لساں پھولڑہ کے قریب ایک مقام ہے جو میدان میں واقع ہے، چونکہ راستہ اس میں سے گذرتا ہے اس لئے لساں کا راستہ نام پڑ گیا۔ پہاڑوں میں اس کا مدخل عشرہ کے سامنے ہے۔

راستے کی جانب خیمہ زن ہوئے۔ محمد خاں اور سید نورالحسن مختلف راستوں سے پہلے پھولڑہ پہنچ کر میدان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مقامی خوانین نے بستی میں قیام کیا۔

پاینده خاں کا اضطراب

پاینده خاں کے ساتھ اس وقت تک صلح نہیں ہوئی تھی، اسے غازیوں کی پیش قدمی کا حال معلوم ہوا تو بروئی سے نکل کر شیر گڑھ کی طرف بھاگا۔ سید صاحب کو یہ خبر ملی تو آپ نے مولانا شاہ اسماعیل کو غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بروئی بھیج دیا، وہ بروئی پہنچے تو پاینده خاں شیر گڑھ سے اگرور چلا گیا، اسے غالباً یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر ایک طرف سے مولانا اور دوسری طرف سے سید احمد علی بڑھتے ہوئے شیر گڑھ پہنچ گئے تو بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ مولانا بروئی سے نکا پانی اور شیر گڑھ ہوتے ہوئے پہلے شنگلئی، پھر شمدڑہ پہنچ گئے۔ پاینده خاں فرار کے اضطراب میں اپنے اہل و عیال کو شنگلئی میں ارسلان خاں (برادرزادہ خان اگرور) کے پاس چھوڑ گیا، انکے ساتھ مال و اسباب کے علاوہ دس بارہ ہزار روپے بھی تھے۔ مولانا نے سارا مال و اسباب اور روپے ارسلان خاں کے حوالے کر دیے، اہل و عیال کو بھی اسی کے پاس چھوڑا کہ جس طرح مناسب سمجھے، انہیں خان کے پاس پہنچا دے۔

شبخون کی افواہ

بعض روایتوں میں ہے کہ پھولڑہ پر غازیوں کی پیش قدمی کی خبر پاینده خاں نے مانسہرہ بھیجی تھی۔ ممکن ہے یہ درست ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بڑی فوج کا مختلف راستوں سے گذر کر آگے بڑھنا کسی حال میں بھی سکھوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ پاینده خاں کے علاوہ بھی سیکڑوں آدمی سکھوں تک ہر قسم کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

سید احمد علی کو پھولڑہ پہنچتے ہی اطلاع ملی کہ مانسہرہ میں ہری سنگھ نلوہ غازیوں پر شبخون مارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی موصوف نے مانسہرہ والے راستے پر پہرے بٹھا

دیے اور انہیں تاکید فرمادی کہ جب خطرہ نظر آئے تو فوراً بندوقیں سر کر دینا، ہم مقابلے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ دو راتیں غازیوں نے آنکھوں میں گزار دیں، جب کوئی نہ آیا تو انہیں خیال ہو گیا کہ شبخون کی افواہ کسی نے خواہ مخواہ اڑا دی۔ اس وجہ سے چوکی پہرے بھی چنداں چوکس نہ رہے اور پیش بندی کے انتظامات میں بھی پہلا اہتمام ختم ہو گیا۔

غازیوں کے ڈیروں کا مقام

سید صاحب نے سید احمد علی کو روانگی کے وقت جو وصیتیں فرمائیں تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ کسی بھی حالت میں دامن کوہ نہ چھوڑنا۔ آپ پھولڑہ پہنچے۔ وہاں محمد خاں اور میر فیض علی کا ڈیرہ دامن کوہ سے فاصلے پر میدان میں دیکھا تو فرمایا میدان سے اُٹھ کر دامن کوہ میں ٹھہرنا چاہیے۔ میر فیض علی نے کہا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہیں وہاں آس پاس مورچے بنا لیے ہیں۔ اب انہیں پیچھے ہٹانا مناسب نہ ہوگا۔ آپ بھی وہیں چلیں۔ میدان خاصا وسیع ہے۔ یہ سنا تو سید احمد علی کو سید صاحب کی وصیت بالکل فراموش ہو گئی اور وہ بھی دامن کوہ سے فاصلے پر میدان میں ڈیرہ لگا کر بیٹھ گئے۔ سید نور الحسن کا ڈیرہ بھی میدان میں ہی تھا۔

جنگ

غرض دو دن گذر گئے، تیسرے دن صبح کے وقت اذان ہوئی، غازی نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ بعض وضو کر رہے تھے اور بعض سنتیں پڑھ رہے تھے کہ دفعۃً پہریداروں کی بندوقیں سر ہوئیں۔ یہ سکھ لشکر کی آمد کا پہلا اعلان تھا۔ چونکہ وہ سب سوار تھے، اس لئے تیزی سے آ رہے تھے۔ درے کے پہرے پر زیادہ تر ملکی لوگ تھے، وہ درے سے ہٹ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے، مقابلہ کرنا بھی چاہتے تو کر نہیں سکتے تھے، سکھ سوار بگٹٹ میدان میں پہنچ گئے۔ اس طرح غازیوں کو اچانک لڑائی پیش آ گئی جس کا انہیں خواب وخیال بھی نہ

تھا، اور وہ دور دور تک میدان میں بکھرے پڑے تھے۔

سید احمد علی فوراً قبلہ رو کھڑے ہو کر دعاء میں لگ گئے، ساتھیوں کو بھی پکار کر کہا کہ دعاء میں شامل ہو جاؤ۔ دعاء ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ سکھ سوار سر پر آپہنچے۔ انہوں نے پہلے سے ایک اسکیم طے کر لی تھی، میدان میں پہنچتے ہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بکھر گئے، یہ دیکھ کر غازی بھی ان کے تعاقب میں دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں منقسم ہو گئے۔ غازیوں کے اس انتشار کو دیکھ کر سکھ سوار تیزی سے اکٹھے ہو گئے اور ایک ایک ٹکڑی کو یکے بعد دیگرے ہدف جرح و قتل بنانے لگے۔ غازی چونکہ پیدل تھے اس لئے جلد مجتمع ہو کر ان کے مقابلے پر جم نہیں سکتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ جا بجا شہادت پا کر بارگاہِ الٰہی میں پہنچ گئے۔

تاریخ تنولیاں کا بیان

سید مراد علی بن سید عنایت علی متوطن علی گڑھ سرحد میں "چوک منشی" بن گئے تھے اور انہوں نے خاصی مدت دربند کی چوکی میں گزار دی۔ ۱۸۷۸ء میں تاریخ تنولیاں مرتب کی جو مطبع کوہ نور میں چھپی۔ اس میں سید مراد علی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱۔ تنول میں سید صاحب کی حکومت چھ مہینے تک بلا خرخشہ جاری رہی، ایک فصل کے محاصل بھی لے لئے گئے۔

۲۔ پایندہ خاں نے ہری سنگھ نلوہ کو امداد کیلئے خط بھیجا۔ ہری سنگھ نے سوچا کہ دونوں دشمن ہیں، خلیفہ صاحب (سید صاحب) علاقہ تنول فتح کر چکے ہیں اور اب ان کی توجہ پکھلی کی طرف منعطف ہو گی، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ پایندہ خاں کو امداد دے کر دونوں کو لڑایا جائے۔ چنانچہ اس نے جواب میں لکھا:

نہیں ہے کمک سے تری انحراف　　دلے بات سن لے میری صاف صاف

کہ اپنے جہاں داد فرزند کو یہاں بھیج دے مدت چند کو
بہ رسم گرد وہ رہے میرے پاس کہ ہم تم رہیں روز و شب بے ہراس
یقیں جاننا جب وہ آیا یہاں اسی وقت کردوں گا لشکر رواں
پسر کو نہ بھیجا اگر اے نامدار تو پھر کس کی فوج اور کہاں اعتبار

آخر میں یہ بھی لکھا کہ جہانداد خاں آ جائے تو پھولڑہ کو آزاد کرا دوں گا۔

۳۔ پائندہ خاں نے اپنے بیٹے جہانداد خاں کو بطور یرغمال ہری سنگھ کے پاس بھیج دیا تو اس نے دو جنگی پلٹنیں مع سامان حرب پائندہ خاں کے پاس بھیج دیں، خود مہا سنگھ اور فوج کثیر کے ساتھ شباشب پھولڑہ روانہ ہوا تاکہ غازیانِ ہند سے جنگ کرے۔

۴۔ سید احمد علی نے سربلند خاں پلال، مدو خاں تنولی اور محمد عباس اتالیق کے مشورے کے مطابق دریائے سرن کی ناکہ بندی کی۔

۵۔ وہیں جنگ ہوئی اور ہندوستانی غازیوں نے دو مرتبہ مہا سنگھ کو مع لشکر پسپائی پر مجبور کر دیا، کچھ سکھ اس معرکے میں کام آئے۔

۶۔ یہ حالت دیکھ کر ہری سنگھ غضبناک ہوا اور اس نے خود حملہ کر دیا، بوجہ ہجوم و غلبہ سکھاں غازی دریائے سرن سے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔

۷۔ اب مشیروں یعنی سربلند خاں، مدو خاں اور محمد عباس نے بالاتفاق سید احمد علی کو مشورہ دیا کہ ہٹ جانا مناسب ہے، پھر کوئی تدبیر کریں گے، مگر سید احمد علی نے انکار کر دیا۔

۸۔ سکھوں کا لشکر سواروں اور پیادوں کو ملا کر چار ہزار سے کم نہ ہوگا، ہندوستانی کل پانسو تھے۔ سکھوں نے انہیں چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا اور سب شہید ہوئے، سکھ مقتولین کی تعداد ایک ہزار تھی۔(۱)

---

(۱) تاریخ تنولیاں مطبوعہ مطبع کوہ نور ص: ۵۱، ۵۲۔ بلاشبہ غازیوں کا بڑا نقصان ہوا لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب شہید ہوئے۔

شہداء

روایت ہے کہ سکھوں کے آنے کی ابتدائی اطلاع پاتے ہی بعض غازیوں نے سید احمد علی کو مشورہ دیا تھا کہ پیچھے ہٹ کر بستی کے قریب پہنچ جایئے، یا دامن کوہ میں ہو جایئے، سکھ خود بے بس ہو کر لوٹ جائیں گے۔ لیکن سید احمد علی نے فرمایا کہ اب انکے مقابلے میں سے ہم ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے، جو کچھ پیش آنے والا ہے یہیں دیکھ لیں گے۔

حملہ بالکل اچانک ہوا اور غازیوں کو تیغ و تفنگ کا ہدف بنا کر سکھ اس تیزی سے واپس چلے گئے کہ خوانین ان کے ہوتے ہوئے بستی سے نکل کر میدان تک نہ پہنچ سکے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کل کتنے غازی شہید ہوئے، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

سید احمد علی رائے بریلوی امیر لشکر، محمد خاں خیر آبادی (برادر امام خاں شہید کوہ کنیر ژی) سید عبد الرزاق نگرانی، مولوی کریم بخش سہارن پوری، رحیم بخش جراح، میرزا عبد القدوس کشمیری، امام خاں سہرامی، فیض الدین بنگالی، شیخ برکت اللہ گورکھپوری، میر فیض علی گورکھپوری، مولوی محمد حسن (رام پور منہاران)، میر احمد علی بہاری۔

راہِ حق کے ان فدا کاروں کی شانِ شجاعت کے بارے میں کیا عرض کیا جائے؟ ہمارے پاس اس خونچکاں داستان کے صرف چند اوراق پہنچے ہیں، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رائے بریلی کے بے نوا سید کی آغوشِ صحبت میں کیسے لوگ تیار ہوئے تھے، جن کی نظیر مسلمانانِ ہند کی ہزار سالہ تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔

سید احمد علی اور میر فیض علی

سید احمد علی امیر لشکر اور میر فیض علی گورکھپوری یکجا تھے، دونوں اپنی جگہ جمے ہوئے مردانگی سے لڑتے رہے۔ جیسیوں کو ٹھنڈا کیا، سید احمد علی کا سنگ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی تو خالی بندوق ہاتھ میں لے کر لٹھ کے طور پر

استعمال کرنے لگے۔ اس طرح بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا، آخر نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ گرتے ہی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ غور فرمایئے کہاں رائے بریلی اور کہاں پھولڑہ! پھر اہل و عیال کہیں، بھائی اور دوسرے اقربا کہیں، دو فرزند ہندوستان میں، ایک جگر بند امب میں، تنہا پھوڑہ میں جان دی۔ وقتِ رخصت نہ کسی عزیز کا چہرہ دیکھا نہ اپنا چہرہ کسی کو دکھایا، نہ کسی کی بات سنی نہ اپنی بات سنائی۔ نہ اس مبارک ساعت میں ایسا کوئی خیال دل میں گذرا۔ وہ جلیل المنزلت ماموں بھی دور بیٹھا تھا جس کی دعوتِ حق نے جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو سے دل کا گوشہ گوشہ معمور کر دیا تھا۔

راویوں نے بیان کیا ہے کہ بے شمار زخم لگے تھے لیکن سب جسم کے اگلے حصے میں تھے، پچھلے حصے میں خراش تک نہ آئی تھی۔ جن بزرگانِ ملت نے سو سو سال تک سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو نا قابلِ ذکر طعنوں کا ہدف بنائے رکھا، ان میں سے کتنے ہیں جن کی سرگزشتہائے حیات میں کلمہ حق کی سربلندی کیلئے اس نوع کے ایثار کی خفیف سی بھی جھلک مل سکتی ہے؟

میر فیض علی گورکھپور کے ایک رئیس ذوالفقار علی خاں کے فرزند ارجمند تھے۔ نقشی خانے میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب نے ایک مرتبہ نقشیوں کو بھاری بوجھ اٹھانے سے معاف کر دیا تھا، لیکن میر فیض علی نے اس معافی سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا اور احتیاطاً سب کے برابر جسمانی محنت کرتے رہے، وہ سید احمد علی کے ساتھ شہید ہوئے۔

مولوی محمد حسن، میرزا عبدالقدوس اور رحیم بخش جراح

مولوی محمد حسن اور رحیم بخش جراح کو سید احمد علی کی شہادت کا علم ہوا تو گھمسان کے رن میں گھس کر مردانگی سے لڑتے ہوئے قربان ہو گئے۔ ''منظورہ'' میں ہے کہ مولانا شاہ

اسماعیل کے بعد لشکر اسلام میں عجز، حلم، خاکساری اور قابلیت میں کوئی غازی مولوی محمد حسن کا ہمسر نہ تھا۔ (۱)

میرزا عبد القدوس کشمیری اگرچہ پیدل تھے، لیکن دیر تک سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی سکھ گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کی طرف آتا تو اس کے قریب پہنچتے ہی بجلی کی سرعت سے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے، ساتھ ہی تلوار سے سوار کا سر اڑا دیتے۔ کوئی سوار نیزہ لے کر حملہ کرتا تو اگر اس کا نیزہ دائیں جانب ہوتا، میرزا صاحب اچھل کر بائیں جانب ہو جاتے، نیزہ بائیں جانب ہوتا تو دائیں جانب ہو جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ پہلے سوار کا نیزہ کاٹا، پھر اس کا سر قلم کیا۔ اس طرح کئی سواروں کو موت کے گھاٹ اتارا، آخر خود بھی جامِ شہادت پی کر زندۂ جاوید گروہ میں شامل ہو گئے۔

میر احمد علی، امام خاں اور برکت اللہ

میر احمد علی بہاری نہایت خوش رو اور سرو قامت جوان تھے، بڑے دلیر و جوانمرد۔ تلوار اور بندوق چلانے میں انہیں یکساں مہارت تھی۔ بہت سے سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا، آخر سواروں کے ایک گروہ نے انہیں نرغے میں لے لیا۔ بولے: ٹھہر جاؤ۔ میں بھاگ نہیں جاؤں گا، مجھ پر گولی نہ چلاؤ اور ذرا میری شمشیر زنی کا رنگ دیکھ لو۔ (۲) پھر خاصی دیر تک تنہا تمام سواروں سے لڑتے رہے، جس پر ان کی تلوار پڑ جاتی، یا تو سر قلم ہو جاتا یا بازو کٹ جاتا یا پاؤں اڑ جاتا۔ آخر ایک سکھ نے انہیں گولی سے شہید کر ڈالا۔

امام خاں سہرامی کئی سکھوں کو مار کر گرے۔ شیخ برکت اللہ نے بڑے کمالات دکھائے، پھر ان کے سینگڑے میں آگ لگ گئی، جس سے سارا جسم جل گیا، اسی حالت

---

(۱) "منظورہ" ص ۷۷۵

(۱) "منظورہ" میں ہے: شمر راقم آفریدہ شناست کہ کسے بریں تفنگ سر نہ سازد، باز ہنر شمشیر زنی با یہ بجاید، ص: ۷۷۵

میں انہیں شہید کر ڈالا گیا۔

ایک غازی کے پاس لکڑیاں کاٹنے والے کلہاڑے کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ ایک پتھر پر کھڑا ہو گیا، جو سکھ سوار قریب سے گذرتا، کلہاڑے سے اس کا سر اڑا دیتا، ایک گھوڑے کے پٹھے پر کلہاڑا پڑا اور گوشت میں گڑ گیا۔ گھوڑا چند قدم پر جا کر گرا، میر احمد علی بہاری اس وقت تک زندہ تھے، انہوں نے سوار کا سر اڑا دیا۔

اژدر اور محمد خاں

سید احمد علی کی شہادت کے بعد اژدر گھوڑے کو سکھوں نے پکڑ لیا اور اسے ساتھ لے چلے۔ محمد خاں خیر آبادی نے یہ دیکھا تو غازیوں کو پکار کر کہا کہ بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے، اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ یہ کہتے ہی تنہا سکھوں کے گروہ پر حملہ کر دیا، جس جس غازی کے کان میں یہ آواز پہنچی وہ بھی محمد خاں کی معیت کے لئے دوڑ پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں اژدر کو چھڑا کر لے آئے، سکھوں نے دوبارہ جمع ہو کر حملہ کر دیا، اس حملے میں اژدر بھی مارا گیا، محمد خاں بھی شہید ہو گئے۔

اس اثناء میں جو غازی میدانِ جنگ سے ذرا فاصلے پر تھے، وہ پاس کے ٹیلوں پر چڑھ کر گولیاں چلانے لگے۔ ادھر بستی سے خوانین کا لشکر نکلا، یہ صورت دیکھی تو سکھ جس تیزی سے آئے تھے، اسی تیزی سے واپس چلے گئے۔ "منظورہ" میں ہے کہ مسلمانوں کا جو مال و اسباب لوٹ کر لے جا رہے تھے، وہ بھی چھوڑ گئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے سکھ مارے گئے، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ غازیوں کے مقابلے میں ان کا نقصان جانی بہت زیادہ تھا۔

غلط بیانات

"وقائع" میں ہے کہ جنگ پھولڑہ کے بعد سکھوں نے بستی میں آگ لگا دی۔

میرے نزدیک یہ روایت غلط فہمی پر مبنی ہے، حقیقت یہ ہے کہ سکھ بستی تک پہنچے ہی نہ تھے، میدان ہی سے واپس ہو گئے تھے۔ اس جنگ میں غازیوں کا نقصان بلاشبہ بہت ہوا، لیکن اسے لشکر اسلام کی شکست اور سکھوں کی فتح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ غازی بدستور میدانِ جنگ میں موجود تھے، سکھ واپس چلے گئے تو غازیوں نے اطمینان کے ساتھ اپنے شہیدوں کو دفن کیا۔

ہزارہ گزیٹر(۱) میں ہے کہ ۱۸۲۸ء میں ہری سنگھ کی لڑائی پھولڑہ میں ہندوستانی مجاہدوں سے ہوگئی، ہندوستانیوں کے ساتھ دو ہزار اہل ہزارہ بھی تھے، وہ لڑائی چھڑتے ہی بھاگ گئے، غازی ایک ایک کر کے کٹ گئے، ان میں سردار لشکر سید احمد علی شاہ بھی تھے، جو خلیفہ سید احمد کے بھانجے تھے۔

یہ بیان سراسر غلط ہے، نہ جنگ پھولڑہ کی تاریخ درست ہے نہ غازیوں کو شکست ہوئی، نہ ایک ایک غازی کٹا، نہ ان کے ساتھ دو ہزار اہل ہزارہ تھے۔

غم نامہ شہادت

پھولڑہ سے جو قاصد لڑائی کی خبریں لے کر حسب گیا تھا وہ دریا سے پار اُترا تو سید صاحب نے اسے دُور سے دیکھ لیا۔ قاصد پہلے میاں عبد القیوم کو ملا، وہ سید احمد علی کی شہادت کی خبر سنتے ہی وفورِ غم واندوہ سے زمین پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا: "قاصد کو جلد بلاؤ، وہ کیسی خبر لایا جسے سنتے ہی میاں عبد القیوم زمین پر بیٹھ گئے۔" قاصد پہنچا۔ محبوب بھانجے کی شہادت کی خبر سنی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اِنّا للّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون پڑھتے ہوئے فرمایا: "الحمد للہ، وہ جو مراد لے کر آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مراد کو پہنچایا۔" پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

---

(۱) ہزارہ گزیٹر، مطبوعہ ۱۹۰۷ء (ص: ۱۲۰)

''منظورہ'' میں ہے: جب قاصد نے بیان کیا کہ شمشیر و نیزہ کے تمام زخم سید احمد علی کے چہرے پر لگے تو پھر آنسو جاری ہو گئے۔ آپ ''الحمدللہ'' ''الحمدللہ'' کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

سید احمد علی اگرچہ بھانجے تھے لیکن سید صاحب ہمیشہ انہیں ''بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ عمر میں وہ سید صاحب سے دو برس بڑے تھے، ماموں بھانجے میں رضاعت کا رشتہ بھی تھا۔ تمام بھانجوں میں سے ان کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی۔ اس لئے کہ سید احمد علی بڑے ہی پاک طینت، پاک سیرت اور فدا کار حق وصداقت تھے۔ صلائے دعوت پاتے ہی اپنے دو جگر بندوں، ابوالقاسم اور موسیٰ کو سید صاحب کے ساتھ بھیج دیا، پھر خود آ گئے۔ سید صاحب نے ابوالقاسم کو کار خاص کے لئے ہندوستان بھیج دیا، موسیٰ بلند منزلت باپ کے بعد خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پسماندگانِ شہدا کی دلداری

سید صاحب دیر تک چپ بیٹھے رہے، نماز مغرب ادا کرنے کے بعد گڑھی میں چلے گئے۔ عشاء کی نماز ہو چکی تو سید موسیٰ (ابن سید احمد علی شہید) ابراہیم خاں (برادر محمد خاں شہید) نور بخش جراح (برادر رحیم بخش جراح شہید) اور دوسرے شہدا کے عزیزوں کو بلا کر دیر تک تسلی و تشفی دیتے اور نصیحتیں فرماتے رہے۔ پھر سب کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ سید صاحب کا عام طریقہ یہی تھا کہ شہدا کے اقربا کو کم از کم ایک وقت کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

مولانا شاہ اسماعیل کو سید احمد علی کے شہید ہو جانے کی خبر ملی تو انہوں نے بھی پیش قدمی ملتوی فرما دی۔ اس لئے کہ جس نظام کے مطابق غازی ہزارہ میں بڑھے تھے، اس میں کچھ عرصے کیلئے تعطل ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب

نے انہیں واپس بلا لیا تھا، وہ آس پاس کے خوانین سے خدمت دین اور رفاقت مجاہدین کا عہد لیتے ہوئے واپس ہو گئے۔

پائندہ خاں اور خوانین اگرور

یہاں اجمالاً یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مولانا کی مراجعت کے بعد پائندہ خاں پھر اگرور سے شیر گڑھ پہنچ گیا، اور اس نے ارسلان خاں سے مال و اسباب اور متعلقین کی واپسی کا مطالبہ کیا، متعلقین میں اس کی ہمشیر بھی تھی۔ جس کی نسبت ابتدا میں عبدالغفور خاں والیٔ اگرور سے ہو گئی تھی۔ لیکن جب پائندہ خاں طاقتور بن گیا تو شادی سے انکار کر دیا۔ ارسلان خاں کی والدہ نے کہا کہ یہ لڑکی تو نہیں بھیجی جا سکتی، باقی چیزیں اور تمام متعلقین واپس کر دیے جائیں۔

چنانچہ پائندہ خاں کی ہمشیر کا نکاح عبدالغفور خاں سے ہو گیا۔ یہی امر امب و اگرور کے درمیان انتہائی دشمنی کا باعث بن گیا۔ پائندہ خاں نے اس کے بعد ارسلان خاں کو بظاہر محبت سے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اپنی خیر خواہی کا انعام لے جاؤ۔ وہ موضع بجنا میں پائندہ خاں کا روپیہ لے کر پہنچا تو اس مسکین کو قتل کر دیا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد پائندہ خاں کی اسی دشمنی کے باعث عبدالغفور خاں اور اس کا بھائی کمال خاں بھی مارے گئے۔ تفصیلات موجودہ کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔

بیسواں باب:

امب میں قیام کے حالات

دینی احکام کا اجرا

امب کو مرکز بنا کر مشرقی سمت میں پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا گیا تو سید صاحب نے بی بی صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی دکھاڑہ سے بدلیا۔ اس زمانے میں بیسیوں افراد کو امان نامے اور بہ شرط خدمت دین عطا نامے لکھ کر دیے گئے، جن میں سے بعض مکاتیب میں محفوظ ہیں۔(۱)

علاقے کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی شرعی قوانین جاری ہو گئے۔ حافظ عبداللطیف کو احتساب پر مقرر کر دیا گیا، جو مرد نماز نہیں پڑھتے تھے امان خاں کنج پوری حسب احکام قاضی تازیانے لگاتے تھے۔ عورتوں کو خود سید صاحب حرم میں لے جا کر سزا دیتے تھے۔ راویوں نے لکھا ہے کہ قیامِ امب کے زمانے میں صرف دو عورتوں کو تازیانوں کی سزا دی گئی، ایک تارک صلوۃ تھی، دوسری نوپی سے آئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کیا تھا، لیکن تحقیق پر معلوم ہوا کہ اس کا شوہر موجود ہے۔ سید صاحب نے خود حرم میں اسے سیڑھی سے بندھوا کر تازیانے لگائے۔

اخوند عصمت اللہ سید صاحب کے معتمد علیہ مشیر تھے، ایک روز معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ نے ایک ملکی عورت کو طعنہ دیا کہ تو نے کالے کلوٹے ہندی سے شادی کر لی، سید صاحب اس پر بہت خفا ہوئے اور بہت سے آدمیوں کے روبرو اخوند سے فرمایا کہ اپنی

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل از ص۔ ۲۵۸-۲۶۷

اہلیہ کو ایسی حرکات سے روکئے، جو زوجین میں تکدر و تفریق کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ کار شیطان ہے۔ ورنہ میں اسے سزا دوں گا۔

اصلاحِ اخلاق

اس حصہ ملک میں عام رواج یہ تھا کہ لوگ دریا پر ننگے نہاتے تھے، سید صاحب نے حکم دے دیا کہ جو شخص ننگا نہاتا ہوا پکڑا جائے اس سے آٹھ آنے جرمانہ وصول کیا جائے، بعد میں جرمانے کی جگہ تازیانے کی سزا مقرر ہو گئی۔

قاضی سید محمد حبان ایک موقع پر کھبل گئے تو ایک شخص نے بڑے شوق سے تازہ مچھلی پکڑ کر قاضی صاحب کو کھلائی۔ اتفاق سے دوسرے یا تیسرے روز وہ ننگا نہاتا ہوا پکڑا آیا اور مقدمہ قاضی صاحب کے روبرو پیش ہوا۔ جرم ثابت ہو گیا تو قاضی صاحب نے حسب ضابطہ آٹھ آنے جرمانہ کر دیا۔ وہ جوش میں بولا کہ مچھلی معاف نہیں کروں گا، قاضی صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ مچھلی ہضم ہو چکی، اب تمہاری معافی کی احتیاج نہیں، لیکن جو ضابطہ جاری ہے وہ نہیں ٹل سکتا۔

جانوروں کی چرائی میں فصلوں کے نقصان کی شکایتیں موصول ہونے لگیں تو مختلف جانوروں کے لئے جرمانے مقرر کر دیے گئے۔ مثلاً بھینس چر جائے تو دو آنے وصول کئے جائیں گے، گائے، گھوڑا، یابو یا گدھا چر جائے تو ایک آنہ۔ بکری چر جائے تو دو پیسے، لیکن اس طرح فصل کے مالک کو جو نقصان پہنچ جاتا تھا اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا حکم دے دیا گیا کہ ہر نقصان کا صحیح اندازہ کر کے مالک کو پورا تاوان دلایا جائے۔

پکھلیہ ڈاکو

پکھلیہ نام ایک شخص ٹوپی کا رہنے والا، بڑا ظالم و مردم آزار تھا۔ لوگ اس کے ہاتھ سے اتنے تنگ آ گئے کہ اتفاق کر کے اسے بستی سے نکال دیا، وہ سکھوں کے پاس چلا گیا،

انہوں نے دریا کے کنارے اس کیلئے ایک برج بنادیا، پچاس ساٹھ آدمی ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے۔ جب موقع پاتا دریا سے گذر کر مسلمانوں کے دیہات میں ڈاکے ڈالتا، ایسے موقع پر اس کے ساتھ سو سو آدمی ہوتے تھے۔

دریائے سندھ کے وسط میں ایک جزیرہ تھا، جسے تہائی کا بیلہ کہتے تھے، اس میں مشوانی لوگ آباد تھے۔ جس زمانے میں مکھن سنگھ ہزارہ کا گورنر تھا، بھکلیلہ نے اس کی اجازت سے اس بیلے پر ڈاکہ مارا، سکھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مشوانیوں نے سخت مقابلہ کیا اور بھکلیلہ کے ساتھیوں میں سے تقریباً اسی مارے گئے، ان میں سے پندرہ سولہ سکھ تھے، مقتولوں میں بھکلیلہ کا بھائی احمد علی بھی شامل تھا، لیکن بیلے اور بستی پر بھکلیلہ کا قبضہ ہو گیا اور اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس جگہ سے وہ ٹوپی، میکنی، منارہ کھکل اور ارد گرد کے تمام بڑے بڑے مقامات پر یورشیں کرتا رہتا تھا۔ جب سید صاحب امب تشریف لائے تو لوگوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اس کے تدارک کی درخواست کی۔

سید صاحب کی سعی مشکور

سید صاحب نے اسے ایک خط لکھا کہ آپ مسلمان ہیں، اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، آپ کیلئے یہ کیونکر زیبا ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹیں اور ایذائیں دیں؟ ہمارے پاس آ جائیں، آپ کی زمینیں بھی دلا دیں گے اور بستی میں از سرِ نو آباد بھی کرا دیں گے۔

یہ دعوت نامہ پڑھتے ہی اس کی سوئی ہوئی اسلامی حمیت جاگ اٹھی اور وہ اپنے پچاس آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس امب پہنچ گیا۔ تین گھوڑے، تین تلواریں اور تین بندوقیں بطور نذر پیش کیں۔ سید صاحب نے ایک سبز دوشالہ، بہت سے کپڑے اور نقد روپیہ دیا نیز اس کے تمام ساتھیوں کو ایک ایک دستار اور ایک ایک لنگی عطا کی۔ ان

سب نے بیعت کر لی، پھر آپ نے ٹوپی کے رئیسوں کو بلا کر بھلیلہ کا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور اس کے تمام حقوق ولا دیے۔ کھبل کے پاس ایک بے چراغ گاؤں تھا جو ٹوپی، گندف اور گیارہ باڑہ والوں کی مشترکہ ملکیت میں تھا، سید صاحب کے ارشاد پر سب نے وہ گاؤں بھلیلہ کو دے دیا، اس طرح ایک مسلمان گمراہی سے بھی محفوظ ہو گیا اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بھی امن مل گیا۔

سکھوں کے قافلۂ رسد پر حملہ

کچھ مدت کے بعد بھلیلہ کو معلوم ہوا کہ سکھوں کی رسد سکندر پور سے دربند جا رہی ہے، اس نے سید صاحب کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اجازت ہو تو تماشا دکھاؤں۔ میں رسد کے قافلے پر حملہ کروں گا، کسی امداد کی ضرورت نہیں، البتہ اگر کوئی خاص مشکل پیش آ جائے اور سکھوں کا دباؤ ہم پر بڑھ جائے تو توپیں چلا کر ہماری اعانت فرما دیجئے۔ چنانچہ وہ دریا سے پار اترا اور اپنے آدمیوں کو لے کر ایک نالہ میں بیٹھ گیا۔ سید صاحب نے چند غازیوں کو دیکھ بھال کے لئے عشرہ کے اوپر کوٹلے میں بٹھا دیا، جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا۔

رسد بیلوں، خچروں اور گدھوں پر لدی ہوئی تھی اور اس کی حفاظت کے لئے پانسو سکھ ساتھ تھے۔ بھلیلہ نے اچانک گھات سے نکل کر حملہ کیا، چودہ سکھ مارے گئے، باقی رسد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پورا سامان بھلیلہ کے قبضے میں آ گیا۔ اس چپقلش میں اس کے تین ساتھی مارے گئے، اس کے امراہیوں میں سے ایک شخص شیخ محمد غازیوں میں شامل ہو گیا اور واقعہ بالاکوٹ کے بعد غالباً شیخ ولی محمد کے ساتھ ٹونک چلا آیا۔ محلہ قافلہ میں رہا اور غالباً ٹونک ہی میں فوت ہوا۔

کھیتی باڑی

غازی امب آئے تھے تو اشیائے خوردنی کی تنگی تھی، اس لئے کہ گندم کی فصل پکی نہیں تھی، چنانچہ سرکاری اونٹ دور دور سے جا کر غلہ لاتے تھے۔ سید صاحب نے عام اعلان کر دیا کہ جو لوگ امب چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں وہ واپس آ جائیں اور اپنی فصلیں سنبھال لیں۔ جو لوگ نہ آئے، سید صاحب نے ان کے کھیت غازیوں کے حوالے کر دیے۔ کچھ دنوں تک غازی بالیں بھون بھون کر کھاتے رہے، فصل پک گئی تو کاٹ کر غلہ نکالا، غلہ ابھی باہر پڑا تھا کہ اچانک بارش آ گئی۔ سید صاحب نے سب غازیوں کو حکم دے دیا کہ گٹھڑیاں باندھ باندھ کر غلہ اٹھالائیں، خود بھی عام غازیوں کی طرح بوجھ ڈھوتے رہے۔

گڑھی کے شمال میں دریا کے کنارے کچھ زمین غیر مزروعہ پڑی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اس میں تربوز بو دیے جائیں۔ اکثر غازیوں نے اپنے اپنے کھیت الگ کر لئے اور کم و بیش دس بیگھے زمین میں تربوز بوئے۔ فصل خوب ہوئی، ایک فصل ہو چکی تو سید صاحب نے فرمایا کہ بیلیں جڑ سے نہ اکھاڑی جائیں، پھر آپ پنجتار تشریف لے گئے، فصل دوبارہ بھی خوب ہوئی، شیخ ولی محمد اور شیخ بلند بخت نے بہت سے تربوز خچروں اور اونٹوں پر لاد کر پنجتار بھیجے۔

آم

دریا کے کنارے آم(۱) کا ایک بھاری درخت تھا۔ سید صاحب نے پوچھا یہ پھلتا بھی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب یہاں دیانت دار حاکم تھے تو پھلا کرتا تھا، اب مدت سے بے ثمر چلا آتا ہے۔ فرمایا اگر یہی بات ہے تو ہم

---

(۱) غالباً اسی کی وجہ سے اس مقام کا نام امب پڑ گیا، پنجاب اور ہزارہ کی بولی میں آم کو "امب" کہتے ہیں۔

پروردگار سے اس کی ثمرداری کے لئے دعاء کریں گے۔ ہمارے غازی بھائی اپنے گھر بار اور خویش وتبار کو چھوڑ کر صرف اللہ کی رضا کے لئے یہاں آئے ہیں، کیا عجب ہے ان کی نیک نیتی کی برکت سے یہ درخت پھل دینے لگے۔

بعد نمازِ مغرب آپ نے درخت کے پاس جا کر ننگے سر بہ کمالِ عجز والحاح دعا کی، میانجی سید محی الدین پھلتی قرآن پڑھایا کرتے تھے، ان سے فرمایا کہ کل سے اپنے شاگردوں کو اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کریں۔

اللہ کے فضل سے آم خوب پھلا اور غازی کیریوں کی چٹنی کھانے لگے۔ پھر سید صاحب پنجتار چلے گئے تو شیخ ولی محمد نے درخت پر پہرے لگادیے، آم ٹپکے تو بی بی صاحب کو کھلائے اور پال ڈال کر کئی ٹوکرے سید صاحب کے پاس پنجتار بھیجے۔ حضرت نے بھی کھائے اور غازیوں کو بھی کھلائے۔

دو حادثے

گڑھی کے دروازے پر ایک برج تھا جو بارش میں ٹپکنے لگا، اس میں دس بارہ غازی رہتے تھے، باقی سب تو دوسرے مکانوں میں چلے گئے لیکن داؤد خاں، حفیظ اللہ دیوبندی اور پیر خاں شاہ جہاں پوری وہیں رہے۔ برج سے مٹی گرنے لگی تو حفیظ اللہ اور پیر خاں بھی نکل گئے، داؤد خاں بیمار تھے، انہیں بھی نکالنا چاہا، وہ بولے کہ میں تکلیف میں ہوں یہیں پڑا رہنے دو، برج گرنے والا نہیں کہ کوئی خطرہ ہو۔ سوءِ اتفاق سے برج اچانک گر گیا، سید صاحب کو خبر ملی تو فوراً غازیوں کو لے کر ملبہ ہٹایا۔ داؤد خاں زندہ نکل آئے، انہیں دھنی ہوئی روئی میں رکھا، لیکن ڈیڑھ دو پہر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح قلعہ امب کے جنوبی ومغربی گوشے میں ایک برج تھا، جس کا کچھ حصہ گر گیا اور دو آدمی دب گئے۔ سید صاحب فوراً خود کدال لے کر مٹی ہٹانے لگے، چونکہ برج

کے بقیہ حصوں کے بھی گر جانے اندیشہ تھا اس لئے بعض لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا، لیکن آپ ہر خطرے سے بالکل بے پروا ہو کر کام میں لگے رہے اور ایک آدمی جو ٹانک کا باشندہ تھا، سلامت نکل آیا۔ فرمایا: ''اگر میں آپ کے روکنے سے رک جاتا تو ایک مسلمان کی جان بچانے کے ثواب سے محروم ہو جاتا۔(۱)

دریا سے پانی لانے کا واقعہ

ایک رات بارش ہو رہی تھی کہ مداخیلوں اور حسن زئیوں کے دس آدمی بے وقت آ گئے، سید صاحب نے انہیں عزت سے ٹھہرایا۔ میاں عبداللہ سے کہا کہ ان کے لئے کھانا تیار کرا دیجئے۔ میاں صاحب نے باورچی خانہ میں دیکھا تو پانی نہیں تھا، نیز عرض کیا کہ دونوں سقے بیمار ہیں، آپ نے فرمایا کہ کوئی بھائی دو چار مشکیں دریا سے لے آئے۔ غازی بالعموم اس قسم کے مواقع پر سبقت کے درپے رہتے تھے لیکن اس روز سوءِ اتفاق سے سب اپنی اپنی جگہ سمجھتے رہے کہ کسی ایک بھائی نے اس حکم کی تعمیل کر دی ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں عبداللہ نے پھر عرض کیا کہ پانی ابھی تک نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا مشک لے آئیے، مشک آ گئی تو آپ بسم اللہ کہہ کر اٹھے اور مشک کندھے پر ڈال کر دریا کی طرف چل پڑے۔ (۲) یہ دیکھ کر تمام غازی بے تابانہ اٹھے، مشک، پکھال، ڈول، بدھنا، گھڑا جو چیز جسے ملی لے کر سید صاحب کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دریا ایک کوس کی زد پر تھا، اس سارے فاصلے میں آدمیوں کا تار بندھ گیا۔

---

(۱) ''منظورہ'' ص ۶۶۔

(۲) یہ وقائع کا بیان ہے، منظورہ میں ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل پاس بیٹھے تھے، ان سے فرمایا چلو پانی لائیں۔ مولانا مشک نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن کہا کہ چند سبو تو ضرور لے آؤں گا۔

اطاعت امام

واپس آکر سید صاحب نے حمد وثناء کے بعد اطاعت امام کا مضمون چھیڑا، اور فرمایا کہ ہمارے بعض بھائی:

> اب تک اطاعت کا مضمون نہیں سمجھے ہیں اور دعویٰ للٰہیت کا کرتے ہیں۔ بھائیوں کو اس بات کا خیال ضرور کرنا چاہئے کہ جو کام کریں خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اطاعت سمجھ کر کیا کریں، کسی آدمی کی رواداری اور خوشامد کا خیال نہ کریں۔
>
> جب میں نے کہا کہ کوئی جا کر پانی لے آئے، اپنی سادہ مزاجی اور غفلت طبیعت سے کوئی نہ گیا اور جب میں مشک لے کر چلا تو ہر ایک میری خاطر داری سے ساتھ ہولیا، سو ایسی بات نہ چاہئے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سب بھائی یہاں اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے آئے ہیں، بہ مقتضائے بشریت ایسی بات ہو جاتی ہے، مگر اس کو خیال میں رکھنا چاہئے۔ (۱)

ممکن ہے کسی صاحب کے دل میں خیال پیدا ہو کہ ایک یا زیادہ غازیوں کا نام لے کر کیوں حکم نہ دیا؟ "منظورۃ" کا بیان ہے:

> آں جناب را منظور بود کہ حکم علی العموم باشد و مسلماناں براں سبقت کنند بالخصوص کسے را حکم دادہ نہ شود۔ (۲)
>
> **ترجمہ**: سید صاحب کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ حکم علی العموم دیا جائے تا کہ ہر مسلمان اس کی تعمیل میں سبقت و پیش قدمی کرے اور تخصیص و تعیین کے ساتھ کسی کو حکم نہ دیا جائے۔

---

(۱) وقائع ص: ۱۲۸۹—۱۲۹

(۲) "منظورۃ" ص: ۷۶۳

لاہوری سائیس اور عنایت اللہ کا معاملہ

قاضی مدنی بنگالی کا سائیس لاہوری، غازی پور کا باشندہ تھا، شکل وصورت چنداں اچھی نہ تھی، لیکن حسن اخلاق میں اس کا پایہ بڑا بلند تھا۔ عنایت اللہ ساکن منڈھیاؤں شجاعت خاص کا آدمی اور سید صاحب کے ابتدائی ہمراہیوں میں تھا، حج بھی ساتھ کیا تھا اور حضرت کو اس سے بڑی محبت تھی۔ وہ لاہوری کے ڈیرے سے ایک طاس آٹا گوندھنے کے لئے اٹھا لایا۔ ابھی آٹا گوندھا نہ تھا کہ لاہوری نے آ کر پوچھا طاس پوچھے بغیر کیوں لائے؟ عنایت اللہ ذرا تند مزاج تھا، بولا:

”طاس سرکاری ہے تمہارا کیوں کر ہوا؟“

لاہوری: بے شک سرکاری ہے لیکن قاضی مدنی کی تحویل میں ہے، انہوں نے ہمیں سونپ رکھا ہے۔ ایک تو بغیر پوچھے طاس لے آئے، اس پر گرم ہوتے ہو! ہم طاس لے جائیں گے۔

لاہوری نے آٹا کپڑے میں ڈالا اور طاس اٹھا لیا۔ عنایت اللہ نے دو گھونسے رسید کر دیے اور طاس چھین لیا۔ لاہوری گر پڑا، آواز سن کر لوگ آ گئے، اُسے اٹھایا، پانی پلایا اور تسلی دی۔ سید صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو دونوں کو بلا کر حالات پوچھے، عنایت اللہ نے انتہائی راست گفتاری سے لاہوری کے بیان کی حرفاً حرفاً تصدیق کر دی، سید صاحب عنایت اللہ کی حرکت پر کمال ناخوش ہوئے اور فرمایا:

> آپ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ ہم سید کے پرانے رفیق ہیں، اس کے پلنگ کے پاس ہمارا پہرہ رہتا ہے۔ یہ خیال نہ آیا کہ آپ یہاں اللہ کے واسطے آئے ہیں اور کام ایسے نکمے کرتے ہیں؟ ہمارے نزدیک آپ اور لاہوری بلکہ سب بھائی برابر ہیں، قاضی کا سائیس جان کر اور کم رو دیکھ کر مارا، سخت غلطی کی، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔

پھر حافظ صابر تھانوی اور شرف الدین بنگالی سے فرمایا کہ مقدمہ قاضی سید حبان کے پاس لے جائیے، زیادتی عنایت اللہ کی ہے۔

مقدمہ قاضی کی عدالت میں

عنایت اللہ پھلت والوں کی جماعت میں تھا، وہ سب بہت پریشان ہوئے، لاہوری کی منت سماجت کرنے لگے کہ عنایت اللہ نے برا کیا، لیکن لاہوری نہ مانا اور بولا: بھائیو! اب تو امیر المومنین نے جو فرمایا ہے وہی ہوگا، یعنی مقدمہ قاضی صاحب کے پاس جائے گا۔

قاضی صاحب مسجد میں بیٹھے تھے، گھڑی ڈیڑھ گھڑی دن باقی تھا، آپ نے فریقین کے بیانات سنے پھر کہا کہ اب تو دیر ہوگئی ہے، کل بعد نماز اشراق اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

عنایت اللہ کی زیادتی میں کسی کو بھی شبہ نہیں رہا تھا، لیکن سب کی آرزو تھی کہ لاہوری معاف کردے۔ شیخ عبدالرحمن رائے بریلوی نے قاضی صاحب سے کہا کہ کسی طرح لاہوری کو راضی کرنے کا انتظام کردیجئے۔

دوسرے دن قاضی صاحب نے عنایت اللہ کو بہت ملامت کی اور کہا کہ تم نے بہت بری حرکت کی جو مستوجب سزا ہے، پھر لاہوری سے مخاطب ہوکر کہا:

> بھائی صاحب! تم بہت نیک بخت اور باشعور آدمی ہو، سب ہندوستان سے اپنا اپنا گھر بار اور خویش و تبار چھوڑ کر محض واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے آئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو اور آخرت میں ثواب ملے۔ کارخانۂ دنیا تو واسطے چند روز کے مانند خواب و خیال کے ہے، سراسر بے اصل اور بے بنیاد، عنایت اللہ تمہارا بھائی ہے اور اس سے بہ سبب شامت نفس کے یہ قصور ہوگیا، معاف کرو، اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر پاؤ گے۔

لاہوری کی شانِ اخوت

لاہوری نے عرض کیا کہ قاضی صاحب! اگر میں عنایت اللہ کو معاف کر دوں تو اجر پاؤں، عوض لے لوں تو برابر، گناہ تو نہیں؟ فرمایا: نہیں۔ لاہوری نے کہا: میں تو اپنا حق چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب نے چند لمحے سکوت کیا پھر فرمایا کہ بھائی لاہوری حق تمہارا تو یہ ہے کہ عنایت اللہ کے اسی جگہ دو گھونسے مارو۔

لاہوری بولا: جو بھائی حاضر ہیں گواہ رہیں کہ قاضی صاحب نے ہم کو ہمارا عوض دلایا، لیکن ہم نے اسے رضائے الٰہی کے لئے چھوڑ دیا، اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر عنایت اللہ کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

اس واقعہ پر سب بے حد خوش ہوئے۔ سید صاحب نے بھی لاہوری کو پاس بٹھا کر کہا کہ آپ نے بڑے دیندار مردوں کا کام کیا۔

ایک لطیفہ

گڑھی کے جس مکان میں سید صاحب رہتے تھے، اس کے سامنے شیشم کا ایک بڑا درخت تھا۔ پاس کے دالان میں جن غازیوں کے بستر تھے، ان میں شیخ منور علی قدوائی بھی تھے، کسی کے لئے جگہ مقرر نہ تھی، جو جہاں چارپائی ڈال لیتا، سو رہتا۔

ایک روز شیخ منور علی کہیں گئے ہوئے تھے، وہ جس جگہ روزانہ چارپائی بچھاتے تھے، وہاں ان کی غیبت میں کسی دوسرے غازی نے بچھالی۔ شیخ صاحب آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو میری جگہ تھی، جواب ملا کہ جگہ مقرر تو ہے نہیں، میں خالی جگہ پا کر سو گیا، اب آپ کو جہاں جگہ ملے انتظام فرما لیجئے۔

شیخ صاحب کے دل میں خدا جانے کیا سمائی کہ فوراً چارپائی کو ایک رسا باندھا، اس کا

ایک سرا پکڑ کر درخت پر چڑھ گئے۔ اوپر کھینچ کر چارپائی ایک شاخ پر جمائی، رسے سے اسے باندھ کر وہیں لیٹ گئے۔ اب سب غازیوں نے اٹھ کر منت سماجت سے انہیں راضی کرنا چاہا، مگر وہ غصے میں تھے، نہ مانے۔ سید صاحب باہر تشریف لائے تو معاملہ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا، آپ نے پوچھا: شیخ بھائی آپ نے چارپائی درخت پر کیوں بچھائی؟ عرض کیا: ”حضرت اب میرے لئے زمین پر جگہ نہیں رہی، آج آسمان کی طرف پہلی منزل ہوئی ہے، کل جو کچھ پیش آئے گا دیکھ لوں گا۔“

یہ لطیفہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ سید صاحب نے فرمایا: شیخ بھائی! اُتر آیئے، آپ کیلئے زمین ہی پر جگہ نکل آئے گی۔ چنانچہ وہ اُتر آئے اور سید صاحب نے ان کی چارپائی ایک جگہ ڈلوا دی۔

حقِ سیادت

ایک روز سکھ علاقے کے ایک آدمی نے آکر سید صاحب سے خیرات مانگی۔ آپ نے اسے جہاد کی ترغیب دی، وہ بولا: میں ضعیف ہوں اور اندیشہ ہے کہ سکھ میرے بال بچوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ آپ نے فرمایا: ہم اپنا لشکر بھیج کر آپ کے اہل و عیال کو یہاں منگا لیتے ہیں کہ اطمینان ہو جائے۔ اس نے کہا: اس طرح جانیں تلف ہوں گی اور اگر دشمن کامیاب رہا تو مصیبت پیش آئے گی۔ بالآخر سید صاحب نے فرمایا کہ اسے دو روپے دے دیے جائیں۔ یہ حکم سن کر اس نے کہا کہ میں سید ہوں، زیادہ رقم ملنی چاہئے، یہ سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، فرمایا:

> وقتیکہ بہ شما کارے فرمودم کہ بہ دیگراں واجب و بہ سادات اوجب است، عذر کردید، اکنوں برائے یک دو روپیہ سیادت خود را می فروشید۔ ایں عجب است کہ شخصے برائے بجا آوردن احکام الٰہی اظہار سیادت خود نہ کند اگرچہ

اقدام وسبقت در امور عبادت شایان سیادت است ودر مقام طمع اظہار سیادت خود ے نماید۔

ترجمہ : جب میں نے ایک ایسے کام کے لئے کہا جو دوسروں کے مقابلے میں سادات پر بدرجہ اولیٰ واجب ہے، تو عذر کرتے رہے، اور اب ایک دو روپے کی خاطر سیادت کو فروخت کرنے لگے۔ یہ عجیب بات ہے کہ احکام الٰہی کی بجا آوری میں سیادت کا اظہار نہ کیا حالانکہ امور عبادت میں سبقت واقدام شایان سیادت ہے، لیکن طمع کی خاطر سیادت جتانے لگے۔

پائندہ خاں کی زنبورکیں

پائندہ خاں جب بروٹی کو چھوڑ کر اگرور چلا گیا تھا تو اطلاع ملی کہ اس کی چھ زنبورکیں بروٹی سے آگے راستے میں پڑی ہیں۔ شیخ بلند بخت کو حکم ہوا کہ ان زنبورکوں کو لانے کا انتظام کیجئے، وہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کی تلاش میں آئے، سید جعفر علی نقوی نے بتایا کہ شیخ صاحب گھی خریدنے کے سلسلے میں دن بھر فروسہ کی طرف پھرتے رہے، شام کو واپس آئے تھے، نمازِ عشاء جلد پڑھ کر سو گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ بہت تھک گیا ہوں، طبیعت بھی اچھی نہیں، مجھے نہ جگانا۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے فرمایئے۔

شیخ صاحب نے فرمایا کہ کام بڑا اہم ہے، یا تو شیخ صاحب اسے انجام دے سکتے ہیں یا آپ خود تیار ہو جائیں، اور کسی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ سید جعفر علی تیار ہو گئے، شیخ بلند بخت نے کہا کہ اپنی جماعت میں سے چار پانچ آدمی لے لیجئے، چالیس آدمی میں دیتا ہوں، انہیں لے کر آدھی رات سے قبل چھتر بائی میں مولانا خیر الدین شیر کوٹی کے پاس پہنچ جایئے۔ وہ زنبورکیں لانے کے متعلق جو مشورے دیں، ان پر عمل کیجئے۔

مولوی جعفر علی نقوی کی عزیمت

چنانچہ سید جعفر علی اسی وقت روانہ ہو کر چھتر بائی پہنچ گئے۔ مولوی خیر الدین نے فرمایا کہ صرف پانچ آدمی آپ لے لیجئے اور چھٹا رہبر میں دیتا ہوں، سید جعفر علی کے علاوہ چار اصحاب کے نام یہ تھے: امام خاں، اللہ داد خاں، پیر محمد خاں اور شرف الدین۔

یہ چھ آدمی جالے میں بیٹھ کر دریا سے پار اترے اور ایک گاؤں میں پہنچے۔ رہبر نے گاؤں والوں کو آواز دی اور سید جعفر علی کے کہنے کے مطابق بتا دیا کہ یہ امیر المومنین کے آدمی ہیں، پائندہ خاں کے تعاقب میں جا رہے ہیں اور آدمی بھی آ رہے ہیں۔ چپ چاپ بیٹھے رہو اگر معاندانہ حرکت کی تو گاؤں نذر تاراج ہو جائے گا۔

وہاں سے سخت گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے یہ ایک مقام پر پہنچے جہاں اونٹ اور زنبورکیں تھیں۔ پائندہ خاں کے آدمی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ چھ زنبورکیں بتائی گئی تھیں، لیکن انکے پاس صرف چار تھیں۔ بقیہ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک چھتر بائی ہی میں ہے اور ایک بگڑ گئی، اسے مرمت کے لئے پاس کے گاؤں میں دے آئے ہیں۔

سید جعفر علی نے پائندہ خاں کے آدمیوں کو بتایا کہ جو کچھ تم کو خان سے ملتا تھا، وہی ہم دیں گے، ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔ کہنے لگے ہم حقہ پیتے ہیں، سید جعفر علی نے بتایا کہ حقہ کشی پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی، البتہ ہم اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ لیکن بھنگ وغیرہ مسکرات کے لئے سزا ہے۔ غرض انہیں راضی کر کے چاروں زنبورکیں اونٹوں پر سوار کرائیں، پانچویں کیلئے دو آدمی اس گاؤں میں بھیج دیے جہاں وہ مرمت کیلئے دے رکھی تھی۔

چھتر بائی کا گھاٹ دربند سے قریب تھا جہاں سکھوں کی چوکی تھی، سید جعفر علی نے حکم دیا کہ اگر سکھوں کی گڑھی سے کوئی باہر نکلے تو فوراً زنبورکیں سر کی جائیں۔ گھاٹ پر پہنچے تو مولوی خیر الدین شیر کوٹی سامنے کے میدان میں نماز عید الاضحیٰ ادا کر رہے تھے، نماز سے

فارغ ہو کر انہوں نے جالے بھیجے تو سب لوگ سوار ہو کر چھتر بائی پہنچے۔ رات بھر سخت زحمتیں برداشت کی تھیں، سید جعفر علی کو بخار آ گیا لیکن بیماری کی حالت میں بھی چھتر بائی میں نہ رکے اور لمب پہنچ کر زنبورکیں پیش کر دیں۔

غازیوں کی شانِ سبقت بالخیرات

غازیوں کے ایثار اور جذبۂ سبقت بالخیرات کا اندازہ فرمایئے کہ اتنی سخت مشقت کا کام تھا، جس میں ہر قدم پر جان کا خوف تھا، لیکن یہ کام بہ طیب خاطر اپنے ذمے لے لیا اور شیخ محمد اسحاق کو زحمت نہ دی، اگرچہ حکم ان کے نام تھا۔ شیخ محمد اسحاق بیدار ہوئے اور سارے حالات سنے تو سخت ناراض ہوئے۔ سید جعفر علی سے بار بار جھگڑتے تھے کہ جب حکم میرے نام تھا تو مجھے کیوں نہ جگایا اور خود کیوں اس کام کو سنبھال بیٹھے؟

اسی طرح جب پھولڑہ لشکر بھیجا جا رہا تھا تو سید احمد علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ میر فیض علی گورکھپوری کو میرے ساتھ نہ بھیجا جائے، وہ تجربہ کار شخص ہیں اور مرکز میں ہر وقت ان کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ سید جعفر علی نقوی کو بھیج دیجئے۔ سید صاحب نے دونوں کو بلا کر فرمایا کہ جو بھائی چاہے، چلا جائے۔ دونوں نے عرض کیا کہ جسے حکم ہو، جانے کے لئے تیار ہے۔ بالآخر سید صاحب نے میر فیض علی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کا یہ بھائی دور سے آیا ہے، سفر کی ماندگی ابھی تک باقی ہوگی، مناسب یہ ہے کہ آپ چلے جائیں۔ عرض کیا: بسر و چشم۔ چنانچہ میر فیض علی چلے گئے اور پھولڑہ میں سید احمد علی کے ساتھ شہید ہوئے۔

شاہ اسماعیل کا واقعہ

سید صاحب، مولانا شاہ اسماعیل اور دوسرے اکابر کا عام شیوہ تھا کہ خود شدائد کی برداشت میں پیش قدمی کرتے اور اس طرح دوسروں کو ترغیب و تعلیم دیتے۔ سید جعفر علی

نقوی بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر سکھوں نے چھتربائی کا قصد کیا، ایک زنبورک کو امب سے چھتربائی پہنچانا منظور تھا، مولانا نے مجھے طلب فرمایا اور کہا آؤ اسے اٹھائیں، اٹھائی اور سینے تک پہنچی تو مولانا نے اپنے کندھے پر رکھوانی چاہی، میں نے عرض کیا کہ بھاری ہے، مجھے اٹھانے دیجئے۔ فرمایا: مصلحت یہی ہے کہ میرے کندھے پر رکھو، اس حکم کی تعمیل کردی گئی۔ بوجھ کی زیادتی سے مولانا کے پاؤں لڑکھڑانے لگے، آس پاس کے لوگوں نے دیکھا تو بھاگے آئے اور زنبورک سنبھال لی، مولانا نے فرمایا کہ تین کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے، باری باری اٹھاؤ۔

منشی مہتاب رائے کی حق گوئی

ہری سنگھ کے مشیروں میں ایک صاحب منشی مہتاب رائے بڑے مہذب، وضع دار اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ زمانہ قیام امب میں معلوم ہوا کہ ایک روز کسی نے ہری سنگھ کی مجلس میں سید صاحب کا نام بے تمیزی سے لیا، یہ سنتے ہی منشی مہتاب رائے نے ہری سنگھ سے کہا: ''اب آپ کی مجلس شرفا کے قابل نہیں رہی، اس میں رذیل گھس آئے ہیں، جو شرفا کا نام کمینگی سے لیتے ہیں۔ اگر ایسی باتیں ہوتی رہیں تو میں نوکری چھوڑ دوں گا اور سید صاحب کے پاس چلا جاؤں گا، جو میرے ہم وطن ہیں۔''(۱)

ہری سنگھ معاً متنبہ ہوا اور منشی مہتاب رائے کو سراہتے ہوئے بولا: لڑنا بھڑنا سپاہیوں کا کام ہے، لیکن فحش و دشنام پاجیوں اور رذیلوں کا شیوہ ہے۔ یاد رکھو ہماری مجلس میں آئندہ کوئی شخص خلیفہ صاحب کا نام بے تمیزی سے نہ لے۔

ہری سنگھ ایک مرتبہ سکندر پور سے تنول کے دورے پر نکلا، پانچ ہزار آدمی ساتھ

---

(۱) ''منظورہ'' کے الفاظ یہ ہیں: مجلس سرکار شامجلس شرفا نیست۔ مردم اراذل در حضور مجلس مے مانند و نام ہر دو سادات شرفا بہ بے تمیزی بر زباں مے آرند و سفلگی خود اظہاری نمایند۔ اگر کسے خاک برآفتاب مے اندازد روئے خود را آلودہ مے سازد۔ (ص۶۶۰)

تھے۔ قادر آباد میں ٹھہرا پھر ہزار بارہ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر کرپلیاں کے عقب سے در بند گیا، چھتر بائی پر کچھ گولے بھی پھینکے۔ واپس ہوا تو میرزا حسین بیگ نے اس کے سواروں پر تاک کر گولے مارے، پہلے گولے سے ایک سوار اڑ گیا، دوسرے گولے سے ہری سنگھ کا چتر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا پھر سارے سکھ پراگندہ ہو گئے۔

کاروبارِ جہاد اور ملاّ و سادات

سید عبد الرؤف ساکن بابزہ (ضلع ہشت نگر) نے ایک روز سید صاحب سے شکایت کی کہ میں گھر چلا گیا تھا، واپس آیا تو مولانا نے مجھ پر سخت عتاب فرمایا۔ مولانا بھی اس وقت موجود تھے، وہ بولے: دنیاداروں کے نوکر بھی افسر سے اجازت لئے بغیر ادھر اُدھر نہیں ہوتے، یہ کیوں بے اجازت چلے گئے؟

پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> تجویز عہدہ کہ فلاں کس قابل فلاں کار راست ایں امر امام را می سزد، اما کسانیکہ ہمراہ ما خواہند بود ما در گرفتن کاروبار جہاد، مولوی باشد خواہ ملا رعایت نخواہیم کرد، زیرا کہ تمام کاروبار لشکر اسلام عبادت است ودر کار عبادت ملا وسادات را مسابقت تمام مے باید۔ پس شکایت من از ایشاں عبث محض قابلِ شکایت خود شاں اند کہ بے اجازت امیر بہ خانہ خود رفتند۔
>
> **ترجمہ:** عہدے کی تجویز کرنا یعنی یہ فلاں شخص فلاں کام کے لائق ہے، یہ امام ہی کو زیبا ہے۔ لیکن جو لوگ میرے ساتھ ہوں گے مولوی ہوں یا ملا، میں ان سے کام لینے میں رعایت نہ کروں گا۔ لشکر اسلام کا سارا کاروبار عبادت ہے اور عبادت میں ملاؤں اور سیدوں کو سبقت کرنی چاہئے۔ پس میرے بارے میں ان کی شکایت بالکل بے اصل ہے، بلکہ شکایت ان سے ہونی چاہئے کہ امیر کی اجازت کے بغیر گھر چلے گئے۔

ایک دلچسپ مناظرہ

ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ بعض دل دیوانے ہوتے ہیں، مجھے بہشت کی بھی خواہش نہیں، محض اللہ کی رضا پر نظر ہے۔ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے راضی رہے، خواہ بہشت سے جدا رکھے۔ خواہ بہشتیوں کا خدمت گزار بنائے، میرا دل تو رضا سے وابستہ ہے۔

مولانا نے یہ سن کر کہا کہ یہ بڑا اونچا مرتبہ ہے، لیکن بہشت سے بے پروائی کا ذکر زبان پر نہ لائیں۔ اس لئے کہ بہشت سے مراد حق اور دوزخ سے مراد باطل ہے، پس مومن کیلئے حق سے بے پروائی مناسب نہیں۔

سید صاحب: میاں صاحب! جب خدا راضی ہوگا تو بندے کو خود بہشت میں بھیجے گا۔ اصل بہرحال اس کی رضا ہے، بہشت محض رضا کی ایک شاخ ہے۔

مولانا: ایسا نہیں بلکہ بہشت کی بہترین شاخوں میں سے رضا ایک شاخ ہے۔

مولوی عبدالوہاب قاسم نگر نے معاً یہ آیت پڑھی:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ. وَرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ اَكْبَرُ. ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (سورہ توبہ)

ترجمہ : مومن مردوں اور عورتوں کیلئے اللہ کی طرف سے (نعیم ابدی کے) باغوں کا وعدہ ہے، جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ان سب سے بڑھ کر نعمت یہ کہ اللہ کی خوشنودی کا ان پر نزول ہوگا، اور یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

اور کہا کہ اس سے ظاہر ہوا کہ رضا دوسری چیز ہے، جس کا ایک ثمرہ بہشت بھی ہے۔

مولانا: چونکہ بہشت کی بہترین شاخ رضا ہے، اس لئے اسے شرف و برتری کے باعث الگ بیان کیا گیا۔

سید صاحب: میں تو نہ تکلیف کا خواہاں ہوں نہ راحت کا، دل سراسر رضا کے خیال سے لبریز ہے۔

تفسیر ''صبر''

مولانا نے ایک روز صبر کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی دو قسمیں ہیں: بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں: ایک فعلی دوسری انفعالی۔ فعلی یہ ہے کہ انسان اعمال شاقہ بہ طیب خاطر ادا کرے، انفعالی یہ کہ اگر اس پر شدائد و مصائب آئیں تو ثابت قدم رہے۔ نفسانی کے بہت سے پہلو ہیں مثلاً:

۱۔ اگر انسان بطون و فروج کی شہوتوں سے محفوظ رہے تو اسے عفت کہتے ہیں۔

۲۔ اگر طلب فضول سے پرہیز کرے تو اسکا نام زہد و قناعت ہے۔

۳۔ اگر مصیبت کے وقت جزع فزع کرے تو یہ معروف صبر ہوگا۔

۴۔ اگر حالت جنگ میں فرار سے باز رہے تو اسے شجاعت کہا جائے گا، یہ بھی صبر نفسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔

۵۔ اگر غضب کی حالت میں انسان دوسرے کو مارنے یا برا بھلا کہنے سے باز رہے تو یہ حلم ہوگا۔

۶۔ کسی مہم کے سرانجام میں تحیر و اضطراب سے محفوظ رہنے کو وسعت حوصلہ قرار دیں گے۔

۷۔ اظہار اسرار میں ضبط و صبر کو رازداری سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح ثابت کر دیا کہ انسان کے اکثر محاسن و فضائل دراصل صبر ہی کے مختلف شیون و مظاہر ہیں۔

شیخ داراب کا واقعہ

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ میں ایک روز سید صاحب کے پاس بالا خانے میں تھا، شیخ داراب میری تلاش میں نکلے، مغرب کے بعد ذرا اندھیرا ہو چکا تھا، انہیں معلوم نہ تھا کہ راستے میں ایک کوٹھری کی چھت ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ سیدھے آئے اور نیچے گر گئے، سید صاحب نے گرنے کی آواز سنی تو عجلت سے باہر تشریف لائے اور پوچھا: ''بھائی! کون ہے؟'' شیخ نے آواز دی کہ داراب ہوں اور فلاں افسر کے ہمراہیوں میں سے ہوں۔ پھر پوچھا: ''بھائی! چوٹ تو نہیں لگی؟'' داراب نے عرض کیا کہ آپکی دعا سے محفوظ رہا۔

حروفِ مقطعات اور مسئلہ عشر

قابل اخوندزادہ نے ایک روز مولانا شاہ اسماعیل سے حروفِ مقطعات کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فوراً یہ آیت تلاوت فرما دی:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ
وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ. (سورۂ آل عمران)

ترجمہ: پس جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ (محکم آیتوں کو چھوڑ کر) متشابہ ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی تاویل معلوم کریں، حالانکہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

مسئلہ عفوِ حقوق

حسن زئی ایک موقع پر آئے اور سید صاحب سے عفوِ عشر کی درخواست کی، آپ نے غالباً بغرض تالیفِ قلوب یہ درخواست قبول فرمالی۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہوا تو مولانا نے رؤسائے قوم کو طلب کر کے فرمایا:

> عشر مثل زکوٰۃ وخمس من جملہ حقوق است وامام را در معاف نمودن آں اختیار نیست بلکہ اگر خود امام زراعت کند عشر از غلہ او در بیت المال رسانیدن واجب شود۔
>
> **ترجمہ** : عشر بھی خمس وزکوٰۃ کی طرح منجملہ حقوق شرعی ہے اور امام کو اس کی معافی کا اختیار نہیں، بلکہ امام بھی اگر زراعت کرے گا تو لازم ہوگا کہ غلے کا عشر بیت المال میں پہنچائے۔

جب ان پر ثابت ہوگیا کہ یہ شرعی امر ہے اور معاف نہیں ہوسکتا تو انہوں نے قبول کرلیا۔

اکیسواں باب:

سکھوں کا پیغامِ مصالحت

پیغامِ مصالحت

رنجیت سنگھ کو ابتدا میں خیال ہوگا کہ سید صاحب بھی ویسے ہی جاہ طلب آدمی ہیں جیسے مغلوں کے زوال پر ہندوستان میں جا بجا پیدا ہو گئے تھے، اور ان میں سے بعض نے ریاستیں بھی قائم کر لی تھیں۔ خود رنجیت سنگھ بھی انہیں میں سے تھا، اس وجہ سے اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ دو چار شکستوں کے بعد وہ دل برداشتہ ہو کر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سید صاحب جس طرف جاتے ہیں فضا کو جلد از جلد سازگار بنا کر زبردست جنگی محاذ پیدا کر لیتے ہیں، نیز اسے غازیوں کی بے غرضی، شانِ ایثار اور راہِ حق میں بے مثال شجاعت کا صحیح اندازہ ہو گیا تو اس نے صلح کے ذریعے سے سید صاحب کو رام کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک فوج کنور شیر سنگھ، دنتورا اور ایلارڈ کے زیرِ سرکردگی علاقہ میں سرحد میں بھیج دی، فوج کے ساتھ ہی ایک سفارت بھی سید صاحب کی خدمت میں اب پہنچ گئی، جو وزیر سنگھ اور فقیر عزیز الدین پر مشتمل تھی۔ (۱) سفیر یہ پیغام لائے کہ مہاراجہ ماورائے دریائے سندھ کا پورا علاقہ حوالہ کرنے کیلئے تیار ہے، بشرطیکہ اس پر قناعت کی

---

(۱) روایتوں میں ہے کہ وزیر سنگھ، رنجیت سنگھ کے اقربا میں سے تھا، مجھے اس کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ فقیر عزیز الدین، حضرت عبداللہ المومن انصاری کے اخلاف میں سے تھے، اسی بزرگ کی اولاد میں میرے عزیز دوست حکیم احمد شجاع ہیں جو علم و فضل میں شہرت عام کے باعث تعارف کے محتاج نہیں۔ فقیر عزیز الدین، رنجیت سنگھ کے طبیب خاص، مشیر، معتمد اور کفیل امور خارجہ تھے، انکی گفتگو بڑی دلکش ہوتی تھی۔ ان کے دو حقیقی بھائی فقیر نور الدین اور فقیر امام الدین بھی سکھوں کے عہد میں بلند عہدوں پر فائز تھے۔ فقیر عزیز الدین کے دو صاحبزادے تھے، شہاب الدین اور چراغ الدین۔

جائے اور دریا کے مشرقی و جنوبی کناروں کے علاقوں پر حملے ترک کر دیے جائیں۔ رنجیت سنگھ نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ خلیفہ صاحب فقیر ہیں، میں امیر ہوں، امیروں کا فرض ہے کہ فقیروں کی خدمت کریں، فقیروں کا کام دعا گوئی ہے۔ اگر خلیفہ صاحب زیادہ قصد کریں گے تو حریص اور دنیادار سمجھے جائیں گے، نیز یہ امر لڑائی کا موجب بنا رہے گا، جس میں فریقین کا نقصان یقینی ہے۔

وکیل بھیجنے کا فیصلہ

سید صاحب نے سفیروں کی مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔ ان کے ساتھ گفتگو کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ قرائن یہ ہیں کہ سید صاحب نے اپنے مقاصد تفصیل سے بیان فرما دیے ہوں گے، پھر فیصلہ ہوا کہ آپ اپنے وکیل کنور شیر سنگھ، دنتورا اور ایلارڈ کے پاس گفتگو کے لئے سمہ بھیج دیں۔ اس کی ضرورت غالباً یوں پیش آئی کہ سفیر چاہتے تھے کہ سید صاحب کا نقطۂ نگاہ کنور اور بڑے سالاروں کے ذریعے سے بھی رنجیت سنگھ تک پہنچ جائے۔

سید صاحب نے سفیروں کو عزت کے ساتھ رخصت کیا، روایتوں میں ہے کہ وزیر سنگھ سید صاحب کے پاکیزہ اوضاع و اطوار اور پاکیزہ افکار دیکھ سن کر مسلمان ہو گیا۔ مصلحتاً اس نے اپنا اسلام مخفی رکھا، ہر نازک موقع پر وہ سید صاحب کو خیر خواہانہ ضروری خبریں بھیجتا رہا، اکا دکا آنے والے غازیوں کی بھی امداد کرتا رہا۔

سید صاحب نے اپنی طرف سے مولوی خیر الدین شیرکوٹی (۱) اور حاجی بہادر شاہ خاں کو وکیل بنا کر پنجتار بھیج دیا تا کہ وہاں سے سمہ جا کر شیر سنگھ، دنتورا اور ایلارڈ سے

---

(۱) "منظورہ" میں ہے کہ شروع میں سید صاحب کو مولوی شیرکوٹی کا خیال نہ تھا، اچانک وہ سامنے آ گئے تو سید صاحب نے فرمایا: مولانا آپ کا خیال مجھے بالکل نہیں رہا تھا، تین روز سے حاجی بہادر شاہ کو ضروری باتیں بتا رہا ہوں اور دل مطمئن نہیں، آپ جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ملاقات کریں۔ خرچ راہ کے لئے انہیں دس روپے بیت المال سے دیے گئے، آپ نے بڑی بڑی سفارتوں کے حالات پڑھے اور سنے ہوں گے، ان کے مقابلے میں سید صاحب جیسے درویش باصفا کی سفارت بظاہر آپ کی نظروں میں کیا جچے گی، جس کے خرچ کے لئے کل دس روپے کافی سمجھے گئے؟ تاہم ان درویش سفیروں کی شانِ اداءِ فرائض سب سے ممتاز نظر آئے گی۔

ملاقات

مولوی خیر الدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے پنجتار سے سلیم خاں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع سکھ لشکر میں بھیج دی، وہاں سے پانچ سوار پیشوائی اور رہنمائی کے لئے آئے، لشکر میں پہنچے تو ان کے لئے جو قیامگاہ تجویز ہو چکی تھی وہاں اترے۔ چاول، آٹا، گھی، بکرا اور بیس روپے بطور دعوت ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ دوسرے روز وزیر سنگھ انہیں دنتورا اور ایلارڈ کے پاس لے چلنے کی غرض سے آیا۔ دنتورا نے کہہ دیا تھا کہ سفیر چاہیں تو ہتھیاروں سمیت آئیں۔ اس ملاقات میں ایلارڈ کے علاوہ وزیر سنگھ اور فقیر عزیز الدین بھی دنتورا کے پاس موجود تھے۔ ایک اخبار نویس اس غرض سے بلا لیا گیا کہ گفتگو کی تفصیل لکھتا جائے۔ دنتورا بے تکلف فارسی بولتا تھا، اس نے سب سے پہلے پوچھا کہ آپ دونوں صاحبوں میں سے علومِ دین کا زیادہ ماہر کون ہے؟ حاجی بہادر شاہ خاں نے مولوی خیر الدین کی طرف اشارہ کیا۔ دنتورا نے کہا کہ میں کچھ علمی گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی خیر الدین بولے کہ اگر دینی گفتگو منظور ہے تو سخت جواب سے رنجیدہ نہ ہوں۔ دنتورا نے کہا کہ جو مناسب سمجھیں کہیں، لیکن گفتگو عالمانہ ہونی چاہیے، میں خود بھی مذہب اسلام کا مطالعہ کر چکا ہوں اور اسلامی تاریخ کی کتابیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ (۱)

---

(۱) روایتوں میں ہے کہ دنتورا نوجوان تھا اور ایلارڈ قدرے معمر۔ دورانِ ملاقات میں ایلارڈ زیادہ تر خاموش رہا۔

غلط فہمی کا ازالہ

اس کے بعد یوں گفتگو ہوئی:

دنتورا: ہمارا ڈیرہ جب حضرو میں تھا تو ایک فقیر صورت آدمی ہمارے پاس آیا تھا، کہتا تھا کہ میں خلیفہ صاحب کا آدمی ہوں، اس نے تجویز پیش کی تھی کہ اگر مہاراجا رنجیت سنگھ علاقہ یوسف زئی کی مال گزاری خلیفہ صاحب کی معرفت وصول کر لیا کریں تو فوج کشی کی ضرورت نہ رہے اور ملک تاخت وتاراج کا ہدف نہ بنے۔ یہ تجویز مجھے پسند آئی، اسلئے کہ اس میں فریقین کی بھلائی ہے، کیا یہ درست ہے؟

مولوی خیر الدین: یہ بالکل غلط ہے، معلوم نہیں وہ کون شخص تھا، اس نے افسوسناک سخن سازی سے کام لیا۔ ہمارے حضرت کو کفار کا فرمانبردار بننے اور انہیں مالیہ دینے سے کیا واسطہ؟ وہ ملک وجاگیر کے لئے اس دور دست سرزمین میں نہیں آئے۔

ارکانِ اسلام

دنتورا: اگر ملک وجاگیر کی طمع نہیں تو بے سروسامانی کے باوجود اس فرمانروا سے جنگ کا قصد کیوں رکھتے ہیں، جو خزائن وممالک کا مالک ہے، اور جس کے جھنڈے تلے بہت بڑا لشکر جمع ہے؟

مولوی صاحب: آپ نے سنا ہوگا کہ امیر المومنین ہندوستان میں بڑی عزت ووجاہت کے مالک ہیں، لاکھوں آدمی ان کے مرید ہیں۔ وہاں امیروں کی طرح عیش وآرام کی زندگی میسر تھی، اسے چھوڑ کر پہاڑوں میں سرگردانی کی ضرورت نہ تھی، انہیں ہر قسم کی راحت حاصل تھی۔ حکام ان کی توقیر کرتے تھے، اس زندگی سے کنارہ کش ہو کر اس کوہستان کے اندر رات دن محنت ومشقت برداشت کرنا اور بے سروسامانی کے باوجود ایک قوی اور صاحب ملک وفوج دشمن کے مقابلے کا ارادہ رکھنا کسی بھی عقلمند کے نزدیک

بے سبب نہیں ہو سکتا۔

غور سے سنئے! سبب یہ ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں، جنہیں بجالانے کی اشد تاکید ہے۔ اول نماز جو ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ غنی ہو یا فقیر، یہی حالت روزے کی ہے۔ زکوۃ صرف دولت مندوں کے لئے ہے، جب ان کے مال پر ایک سال گذر جائے تو اس کا چالیسواں حصہ خدا کی راہ میں دے دینا چاہئے۔ حج ان تینوں سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر چہ یہ عبادت صاحب استطاعت کو عمر بھر میں ایک مرتبہ ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن اس میں سمندر کے سفر کی تکلیفیں ہیں، جان کیلئے خطرات وبہالک ہیں، گھر بار سے جدا ہونا پڑتا ہے، دوسرے شدائد بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اکثر مالدار بھی اس رکن کی بجا آوری میں سستی کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے حضرت نے بے سروسامانی کے باوجود سیکڑوں آدمیوں کے ساتھ حج کیا اور ہزاروں روپے خرچ کئے۔ کسی مالدار میں بھی آج ایسی ہمت نہیں۔

ونتورا: بے شک موجودہ زمانے میں اس طرح کسی نے حج نہیں کیا۔

جہاد فی سبیل اللہ

مولوی صاحب: جہاد حج سے بھی مشکل تر عبادت ہے، یہ عبادت محض مال کی کثرت کے بل پر بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ ہاں اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو سب کچھ ممکن ہے، مشکلات کی وجہ سے عبادت جہاد کا ثواب بھی سب سے زیادہ ہے، اس لئے کہ اس عبادت میں جان و مال اور عیال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ جہاد محض ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر فرض نہ تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام وغیرہ پر بھی فرض تھا۔ یہ حقیقت آپ پر تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوگی۔

ونتورا: بے شک۔

مولوی صاحب: ہمارے حضرت خدا کی عنایت سے بارگاہ الٰہی کے مقبول، صاحب ارادہ اور صاحب عزم ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ عبادت بھی ادا فرمائیں۔ اس کی دو شرطیں ہیں: اول وجودِ امام جسے عرف میں سردار کہا جاتا ہے۔ دوم جائے امن۔ ہندوستان میں جائے امن نہ تھی، سنا جاتا تھا کہ قوم یوسف زئی کو سکھوں سے جہاد درپیش ہے اور انکے پاس سردار نہیں، لہٰذا ہمارے حضرت چھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں تشریف لے آئے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ترغیب و تحریص سے اس کار خیر پر آمادہ کیا، حضرت کے دستِ مبارک پر بیعتِ امامت ہوئی، اسی دن سے سب آپ کو امام، امیر المومنین یا خلیفہ کہنے لگے۔

یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جہاد کا مطلب جنگ اور ملک گیری نہیں، اس لفظ کے معنی ہیں اپنی طاقت و قوت کے مطابق اعلاءِ کلمۃ اللہ میں سعی و کوشش۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کا سامان اعدا کے برابر ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ دین کی ترقی میں انتہائی سعی کی جائے، اس سلسلے میں اگر جنگ بھی پیش آجائے اور مصلحت کا اقتضا یہی ہو تو حرب و ضرب میں بھی توقف نہ کیا جائے۔ لیکن اصل مطلب محض ترقی دین ہے، فتوحات اس کا محض ثمرہ ہیں۔ سب سے بڑی فتح یہی ہے کہ انسان زندگی بھر مجاہد فی سبیل اللہ بنا رہے۔ غازیوں کے درجے قرآن مجید میں واضح کر دیے گئے ہیں، اگر وہ شہید ہو جائیں تو اس رتبے پر پہنچ جاتے ہیں کہ رسالت کے بعد اس سے بڑا رتبہ کوئی نہیں، اگر فتح پائیں اور ملک ہاتھ آئے تو نورٌ علیٰ نور۔

سامان اور بے سامانی

ونتورا: بے شک آپ کے مذہب میں جہاد اور شہادت کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

مولوی صاحب: یہ عجیب بات ہے کہ ابھی آپ مان چکے ہیں کہ دوسرے پیغمبروں نے بھی جہاد کیا، پھر "آپ کے مذہب" کی قید کا کیا مطلب؟ کہنا چاہئے کہ اس عبادت کا درجہ سب پیغمبروں کے نزدیک بہت اونچا ہے۔

دنتورا: میں مانتا ہوں، لیکن یہ بات خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا آدمی یہ ارادہ کرے، جس کے پاس نہ فوج ہے نہ توپیں ہیں۔ نہ مال و متاع ہے، نہ ملک ہے۔

مولوی صاحب: اہل دنیا کو فوجوں، توپوں اور خزانوں پر اعتماد ہے، ہمارا بھروسا صرف خدائے قادر و توانا کی قدرت و قوت پر ہے۔ نہ ہمیں فتح کا دعویٰ ہے اور نہ شکست کا غم۔ یہ دونوں چیزیں خدائے قادر کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ.

بسا اوقات چھوٹے گروہوں نے خدا کے حکم سے بڑے گروہوں پر غلبہ پایا۔

اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو تاریخ دانی کا دعویٰ غلط ہے، اس لئے کہ تاریخوں سے ثابت ہے بہت سی جبار و سرکش قومیں فقیروں اور کمزوروں کے ہاتھ سے پامال ہوئیں، خصوصاً پیغمبروں کو ہر جگہ ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ ان میں سے کسی کے پاس خزانہ یا توپیں یا فوجیں نہ تھیں، اپنے مسکین و فقیر ہمراہیوں میں سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں لے کر اٹھے اور بڑے بڑے جابروں کے سر توڑ ڈالے۔ نائبوں نے بھی ان کی پیروی میں بڑی بڑی سلطنتوں کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

ایلارڈ: ایسا نہیں ہو سکتا کہ بے سر و سامان اہل سامان پر اور بے سلاح ارباب سلاح پر غالب آ جائیں۔

دنتورا: (ایلارڈ سے) مولوی صاحب سچ فرماتے ہیں کہ بڑے چھوٹوں کے ہاتھ سے بھی تباہ ہوتے رہے۔

تجویز مصالحت

(پھر دتورا مولوی صاحب سے مخاطب ہوا) ہم بات کچھ کر رہے تھے بیچ میں اور ذکر چھڑ گیا، ہمیں خلیفہ صاحب سے محبت ہے، جس کی وجہ سے سرکار خالصہ میں بدنام ہوگئے ہیں، یہ محبت جنگ کے موقع پر کسی کام نہ آئے گی؟

مولوی صاحب: یہ درست ہے کہ آپ اپنی سرکار میں نمک حرام ٹھہریں گے۔

دتورا: میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحائف وہدایا کی رسم جاری ہو جائے، پہلے میں کوئی چیز بھیجتا ہوں پھر خلیفہ صاحب بھیجیں تاکہ مجھے واپس جانے کیلئے عذر ہاتھ آجائے، بعد میں خلیفہ صاحب یوسف زئیوں کے باب میں جو چاہیں کریں، اس ملک پر خالصہ فوج نہیں آئے گی۔

مولوی صاحب: ہمارے حضرت صاحب کو آپ کی دوستی اور محبت سے کوئی غرض نہیں، اگر آپ کو غرض ہے تو پہلے خود سلسلہ جنبانی کریں۔ ہمارے حضرت بڑے عالی حوصلہ اور بلند ہمت بزرگ ہیں۔ آپ کے تحائف کے معاوضے میں ضرور تحائف بھیجیں گے، مگر ان کی سرکار کے تحفے کیا ہیں؟ کسی کو سربند کلاہ یا جبہ عنایت فرما دیا، حضرت کے پاس عمدہ ہتھیار بھی ہیں، ممکن ہے کوئی ہتھیار بھیج دیں۔

دتورا: ہمیں سربند و کلاہ و سلاح کی حاجت نہیں، ہاں گھوڑا مرحمت فرمائیں تو بات بھی ہے۔

مولوی صاحب: میں آپ کا مطلب سمجھ گیا، گھوڑا ہم کبھی نہ دیں گے۔(۱)

---

(۱) سکھوں کا عام دستور تھا کہ اہل سرحد سے گھوڑے، باز اور شکاری کتے خراج میں لیتے تھے، اور گھوڑا دے دینے کو نشانِ اطاعت سمجھا جاتا تھا۔ دتورا بہ لطائف الحیل گھوڑا لے کر سید صاحب کو دربار لاہور کا مطیع ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب پر یہ حقیقت آشکارا تھی اس لئے بہ شدومد انکار کیا۔ باڑے کے چاول بہت مشہور تھے، سکھ یہ چاول بھی کثیر مقدار میں درانی سرداروں سے سال بہ سال وصول کرتے تھے۔

دنتورا: اپنی طرف سے انکار نہ کیجئے، خلیفہ صاحب کو لکھیے وہ بڑے عاقل اور معاملہ فہم ہیں، امید ہے اس بات کو خوشی سے مان لیں گے۔

گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے

اس موقع پر فقیر عزیز الدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے بھی مولوی خیر الدین سے کہا کہ جرنیل صاحب کی یہ تجویز مان لینے میں مضائقہ نہیں۔ لیکن مولوی صاحب بولے: ''جو شخص ملک و جاگیر کا طلب گار ہو، اس کے لئے یہ چیز اچھی ہوگی، جو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی نیت سے نکلا ہے، اس کیلئے یہ بہت بری ہے۔ چنانچہ جو شخص نماز، روزہ یا دوسرے نیک کام محض خلق خدا میں بزرگی حاصل کرنے کی غرض سے کرتا ہے وہ کام اس شخص کیلئے عذاب وخسران کا باعث بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جہاد بھی فسادِ نیت سے باعثِ وبال ہو جاتا ہے کہ ہم نے انہیں امام بنایا ہے اور امام کے بغیر جہاد ہو نہیں سکتا، لیکن جو شئے ثوابِ جہاد میں افساد کا باعث ہے، اس سے انکار میں ہم اور حضرت برابر ہیں۔

دنتورا نے دو تین مرتبہ اصرار کیا، مولوی صاحب بولے کہ اصرار بے سود ہے، ہم آپ کو گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ آپ سے خراج و جزیہ لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہیں، آپ کو کس طرح دیں؟

ختمِ ملاقات

دنتورا: اچھا اگر خلیفہ صاحب باوجود بے سروسامانی مہاراجہ جیسے صاحب لشکر و جاہ وحشمت کے مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہم ان کی اطاعت قبول کر لیں گے۔

مولوی صاحب: میں حضرت کا حال آپ سے کیا کہوں؟ آپ نے انہیں دیکھا نہیں، اگر ایک دفعہ مل لیں تو یقین ہے کہ ان کی باتیں سن کر آمنا وصدقنا کے سوا کچھ آپ کی زبان پر نہ آئے گا۔

دنتورا: اچھا! اگر آپ یہ تجویز لکھ کر خلیفہ صاحب کے پاس نہیں بھیج سکتے تو زبانی بات کرلیں۔

مولوی صاحب: اطمینان رکھیے ایک ایک بات حضرت کی خدمت میں پہنچے گی۔

دنتورا: جو جواب دیں ہمیں حضرو کے مقام پر پہنچا دیا جائے۔

مولوی صاحب: جواب بھیجنا میرے اختیار میں نہیں، یہ حضرت کے اختیار میں ہے۔

دنتورا: جو کچھ آپ نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے، کیا آپ ہمارے کنور صاحب (شیر سنگھ) کے سامنے بھی بیان فرمائیں گے۔

مولوی صاحب: ان شاء اللہ تعالیٰ مع شے زائد۔

قصدِ حملہ اور مراجعت

مولوی صاحب پنجتار ہوتے ہوئے امب پہنچے اور مفصل گفتگو سید صاحب کو سنائی۔ جب اس بات پر پہنچے کہ ہم گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دیں گے، تو سید صاحب نے خوش ہوکر فرمایا: اسی غرض سے میں نے آپ کو بھیجا تھا، دوسرے شخص سے ایسی صاف گوئی ممکن نہ تھی۔ سید صاحب نے جواب بھیجنے کے متعلق مشورہ طلب فرمایا تو مولوی صاحب نے کہا کہ فضول باتوں کے جواب کی ضرورت نہیں، اسی وجہ سے میں نے جواب بھیجنے کا اقرار نہیں کیا تھا۔

اب صرف دو سوال رہ گئے، اول یہ کہ گفتگو کب ہوئی؟ میرا اندازہ ہے کہ یہ مئی ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔ دوم یہ کہ دنتورا جب پہلے مولوی خیر الدین سے مل چکا تھا تو گفتگو میں سابقہ معرفت کا حوالہ کیوں نہ دیا؟ میرا خیال ہے کہ یہ فروگزاشت راوی سے ہوئی، جس نے صرف خاص مطالب کا بیان کافی سمجھا۔

بائیسواں باب:

سمہ میں انتظامِ عشر

قاضی سید محمد حبان کی تجویز

پائندہ خاں سے مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سید محمد حبان نے یہ تجویز پیش کی کہ علاقہ سمہ میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے خود بخود ادائے عشر کا اقرار کیا تھا وہ بھی بے پروا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو میں وعظ و نصیحت سے سارے اہل سمہ کو حلقہ بگوش بنا دوں، جو نہ مانیں انہیں بہ زور راضی کر دوں، لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیے جائیں۔ اس لئے کہ میں مقامی آدمی ہوں اور اپنے اہل وطن کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں، ایسا آدمی یہاں اور کوئی نہیں۔ مولانا شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسولؐ کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو مولانا روک دیں۔

قاضی صاحب کی روانگی

سید صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ پکھلی کی سمت پیش قدمی رک گئی تھی اور معلوم نہ تھا کہ کب تک حالات سازگار ہوں۔ اس اثناء میں سمہ کے اندر نظامِ شریعت کو مستحکم بنا لینا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے تین سو سوار اور اڑھائی سو پیادے قاضی صاحب کے ساتھ کر دیے۔(۱)

---

(۱) ''منظورہ'' میں ہے: قریب شش صد سوار و پیادہ و نقارہ شتری و زنبورک ہمراہ کردہ شد۔ ایک روایت میں ہے کہ پائندہ خاں نے بھی کچھ آدمی ساتھ کر دیے تھے۔

سب کو ہدایت فرمادی کہ قاضی صاحب کے احکام بہ دل و جان مانیں، چھ ضرب زنبورکیں بھی دے دیں، ایک اونٹ پر نقارہ تھا، مولانا شاہ اسماعیل کے علاوہ رسالدار عبدالحمید خاں کو قاضی صاحب کے ساتھ کر دیا۔ رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ یہ کام خدا اور رسول کا ہے، ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش دخیل ہو جائے۔

قاضی صاحب گندف ہوتے ہوئے پابلئی پہنچے۔(۱) غازی جہاں جہاں ٹھہرے دستور کے مطابق لوگوں نے کھانا بھی کھلایا اور گھوڑوں کے لئے چارے کا انتظام بھی کر دیا۔ چارے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شخص کے ہاں سے باری باری ایک بوجھ کاٹا جاتا۔ ایک کھیت والے نے کہا کہ میری باری ہو چکی ہے، کالا باغ کے دو غازی گل شیر خاں اور شہباز نہ رکے، رسالدار تک یہ بات پہنچی تو سخت خفا ہوئے بلکہ گل شیر کے کندھے پر اُلٹی تلوار ماری، پھر لوگوں نے انہیں روک دیا۔

پنجتار پہنچ کر دیوان شاہ کے باغ میں اُترے۔ دو روز تک فتح خاں نے مہمانداری کی، پھر ارد گرد غلے کے لیے حکم بھیج دیا گیا اور دستور کے مطابق رسد تقسیم ہونے لگی۔

خوانین کا اتفاق

ایک روز قاضی صاحب نے فتح خاں سے کہا کہ سکھوں نے سمہ کا جو علاقہ دبا رکھا ہے، ہماری غرض یہ ہے کہ اسے آزاد کرائیں۔ فتح خاں نے کہا کہ میں تو فرمانبردار اور ہر حال میں شریک کار ہوں، لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ان تمام خوانین سے بھی مشورہ کر لیا جائے، جو سکھوں کے تصرفات کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑ کر باہر بیٹھے ہیں۔ مثلاً زیدہ کے خان فتح خاں اور ارسلان خان، کھلابٹ کے خان ابراہیم خاں اور اسماعیل خاں، مرغز کے خان سرفراز خاں وغیرہ۔ وہ اگر اس بارے میں متفق ہو جائیں تو اصل مدعا آسانی

---

(۱) ایک روایت ہے کہ گیارہ باڑو کے راستے گئے۔

سے پورا ہو سکے گا۔

ملاؤں سے گفتگو

چنانچہ تمام مہاجر خوانین کو خط لکھوائے گئے، سب نے قاضی صاحب کی تجاویز سے اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے اپنی بستیوں کے ملاؤں اور عالموں کو بھی بلا کر بات چیت کی۔ جب سب ایک رائے پر متفق ہو گئے تو فتح خاں نے کہا کہ میں تو اپنی قوم سے قاضی صاحب کو عشر دلانے کا فیصلہ کر چکا ہوں، آپ کو بھی چاہئے کہ جب اپنے علاقوں پر قابض ہو جائیں تو باقاعدہ ادائے عشر کا انتظام کریں۔ یہ تجویز خوانین نے تو بخوشی قبول کر لی، لیکن ملاؤں میں کچھ قیل وقال شروع ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عشر کی رقمیں ملاؤں کو ملتی تھیں اور نئے انتظام کی رو سے اصل زد براہ راست انہیں پر پڑتی تھی، لہٰذا وہ متذبذب تھے۔

مولانا شاہ اسماعیل اور قاضی حبان نے دوسرے دن ملاؤں اور عالموں کو جمع کر کے مفصل گفتگو کی، مستند کتابوں سے ثابت کیا کہ عشر صرف امام کا حق ہے، ملاؤں کا دعویٰ اس بارے میں بالکل غلط اور بے دلیل ہے۔ انہیں اس کار خیر میں معاون و مددگار ہونا چاہئے، نہ کہ رکاوٹ پیدا کریں۔ وہ بظاہر تو مان گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دل سے اس پر راضی نہ تھے، یہی نفاق آمیز صورت حال آئندہ چل کر ہولناک واقعات کی صورت اختیار کر گئی۔

جو روایتیں میری نظر سے گذری ہیں، ان میں کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ مولانا شاہ اسماعیل یا قاضی سید حبان نے ملاؤں اور عالموں کے گزارے کی کوئی دوسری صورت تجویز کر دی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ انہوں نے عشر وصول کرنے کے بعد بیت المال سے ان کے لئے مشاہروں کا انتظام سوچ لیا ہوگا۔ یہ بات خیال میں نہیں آتی کہ اس گروہ کو صدیوں کے وسائل معاش سے محروم کر کے تسکین وتلافی کے لئے کوئی متبادل ذریعہ تجویز نہ کیا ہو۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ سرحدی ملاؤں اور عالموں کے دلی اختلاف کا

اولین سرچشمہ یہی واقعہ بنا۔

یہ مقدمات مکمل ہو گئے تو قاضی صاحب نے علماء اور خوانین کو اس نصیحت کے ساتھ رخصت کیا کہ اپنی اپنی بستیوں کے ہر ملک، خان اور عالموں کو سکھوں کی اطاعت سے نکال کر غازیوں کے شریکِ حال ہو جانے کی ترغیب دو، اگر وہ مان جائیں تو خیر، ورنہ ہم خود سمجھائیں گے۔

دورہ شروع ہو گیا

اسی طرح تھوڑی سی مدت میں پیش نظر مقاصد کی اشاعت کا کاروبار بظاہر وسیع پیمانے پر جاری ہو گیا اور کم سے کم وقت میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود قاضی صاحب کو تفہیم و تذکیر کے لئے کہاں کہاں جانا پڑے گا۔

علماء و خوانین نے اپنے اپنے حلقوں میں کیا کیا؟ یہ معلوم نہیں، لیکن تیسرے چوتھے روز ملا صاحب کوٹھا کا ایک خط قاضی صاحب کو ملا، جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں یہاں کے لوگ محض وعظ و نصیحت سے سیدھے راستے پر آ جائیں گے، اور صلح و مدارات سے احکامِ خدا اور رسولؐ کے روبرو جھک جائیں گے، تو یہ دشوار ہے۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ زور و قوت سے انہیں مغلوب کیا جائے۔ یہ اطلاع بھی دے دی کہ کھلابٹ کے لوگ آپ کے مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

قاضی صاحب نے یہ خط خوانین کو سنایا، پھر خود تجویز پیش کی کہ ہمیں فوراً کھلابٹ پہنچ جانا چاہئے اور مخالفوں کو فراہمیٔ قوت کی مہلت نہ دینی چاہئے۔ چنانچہ قاضی صاحب تیسرے روز کھلابٹ کی طرف روانہ ہو گئے، جو پنجتار سے تقریباً سات کوس تھا۔ اس وقت تک آپ کے ساتھ ہندوستانی اور ملکی غازی ملا کر ساڑھے نو سو افراد ہوں گے، ساڑھے چار سو سوار اور پانسو پیادے۔

ٹوپی سے چار میل جپہ اوتمان نامہ میں اطلاع ملی کہ دو تین ملا مخالفت میں کام کرر ہے ہیں، ایک ٹوپی کے آس پاس کا باشندہ تھا، دوسرا شیخ جانا کا اور تیسرا تواکلئی کا۔ قاضی صاحب انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لائے، بری رسمیں بند کرادیں، روپے لے کر نکاح کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا اور باہمی عداوتیں مٹا دیں۔

کھلابٹ سے ایک کوس پر نمازِ ظہر ادا کی، جب بستی پاؤ کوس پر رہ گئی تو قاضی صاحب نے حکم دے دیا کہ سب ٹھہر جائیں، پھر رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ آپ یہاں تیار کھڑے رہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب ہماری طرف سے بندوق چلے تو فوراً باگیں اٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے حملہ کر دیں۔

قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زنبورک لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ اس اثناء میں رسالے کے ایک سوار موسن خاں کو پیشاب کی حاجت ہوئی، وہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا، گھوڑے کی باگ پاؤں کے نیچے دبا کر پیشاب کے لئے بیٹھ گیا، دفعۃً گھوڑا بھڑکا اور اس کی باگ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا، رسالدار نے آواز دی کہ لینا جانے نہ پائے۔ دو دو چار چار سوار اس کے تعاقب میں نکلنے لگے، قاضی صاحب نے سمجھا کہ سواروں نے ہلّہ بول دیا، چنانچہ انہوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہوگئی، سواروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلابٹ فتح ہوگیا۔ بعد میں معلوم ہوا وہاں مقابلے کے لئے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔

صلح واطاعت

کھلابٹ کے اصلی خان ابراہیم خاں اور اسماعیل خاں تھے، قاضی صاحب نے

ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا، چار سوار اس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسماعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلابٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سنتے ہی مطیع ہو گئے، وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خان سرفراز خاں کے حوالے کر دیا، چار سوار اس کی حفاظت کیلئے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوئی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹھنڈ کوئی اور اس کے بعد کدا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی، یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بے چون و چرا فرمانبرداری کا عہد کر لیا۔ مغرب کی نماز قاضی صاحب نے زیدہ اور کدا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اسی جگہ پنج پیر کے خان نے خود آ کر اطاعت کا اقرار کیا، اس طرح ایک دن میں کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کدا اور پنج پیر زیرِ فرمان آ گئے۔

رسالدار کی تجویز

ہنڈ وہاں سے تقریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے سوار اور چار ضرب زنبورک لے کر ہنڈ چلا جاؤں، اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آ جائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔

مولانا اور قاضی صاحب دونوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا، چنانچہ رسالدار بے توقف ادھر روانہ ہو گیا۔ جب ہنڈ ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنہنائے، تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں برجوں پر اتنی روشنی ہوئی کہ ارد گرد کی ہر شے دور دور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا، پھر آہستہ آہستہ انہیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا، وہاں زنبورک لگا کر قلعے پر چار

پانچ گولے پھینکے۔ بعد ازاں سارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکرگاہ میں پہنچ گئے۔

ہنڈ پر قبضہ

صبح صادق نمودار ہوئی تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سنائی کہ ہنڈ خالی پڑا ہے، آپ قلعے کے انتظام کے لئے وہاں تشریف لے چلیں۔ پھر ایک ملا آیا اور اس سے ہنڈ کے تخلیے کی تصدیق ہوگئی۔ تخلیے کی تفصیل یہ ہے کہ کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈکوئی، کدا اور پنج پیر کے مطیع ہو جانے کی خبریں ہنڈ پہنچیں تو وہاں جو سکھ فوجی بیٹھے تھے، بہت پریشان ہوئے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اب ساری بستیوں کے مسلمان متحد ہوکر ہنڈ پر چڑھائی کر دیں گے، اور بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے آہستہ آہستہ سارا ضروری سامان اٹھا کر دریا کے کنارے پہنچایا، پھر کشتیوں میں بیٹھ کر واپس چلے گئے، وہ تقریباً سات سو آدمی تھے۔

مجاہدین ہنڈ پہنچے تو وہاں رسد بہ مقدارِ کثیر جمع تھی، مثلاً گیہوں کے تین کوٹھے، آٹے کے دو کوٹھے، ان کے علاوہ گھی، گڑ اور میوے کے بہت سے کنستر اور بوریاں تھیں۔

قلعہ ڈھانے کی تجویز

ہنڈ کا قلعہ بہت مستحکم اور جائے وقوع کے لحاظ سے بڑا اہم تھا۔ کہتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں اسے بیربل نے تعمیر کرایا تھا، چونکہ یہ دریائے سندھ کے بڑے گھاٹ پر واقع تھا، اس لئے اس کے استحکام کا خاص اہتمام کیا گیا۔ قاضی صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل، فتح خاں پنجتاری، فتح خاں اور ارسلان خاں (زیدہ)، اسماعیل خاں (کھلابٹ) اور رسالدار عبدالحمید خاں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ اسے منہدم کر دینا چاہیے، اگر یہ باقی رہا تو فسادات کا سرچشمہ بنا رہے گا۔

خادے خاں کے بھائی کبھی خود قلعے میں بیٹھ کر اردگرد کی بستیوں کو لوٹتے تھے، کبھی

سکھوں کو لا کر اس میں بٹھا دیتے تھے۔ چونکہ قلعہ بہت مضبوط تھا، اس لئے کسی کو ان پر حملے کا حوصلہ نہ تھا۔ انہدام کا فیصلہ ہوتے ہی مانیری، صوابی، کالا درہ، شاہ منصور، پنج پیر، زیدہ، کدا، ٹھنڈ کوئی، کھلابٹ، مرغز، یاجا، بام خیل، منارہ، کندوہ وغیرہ دیہات سے کم وبیش پانچ ہزار آدمی بلا لئے گئے، وہ پھاوڑے کدال لیکر آئے اور سات روز تک قلعے کو ڈھانے میں لگے رہے۔ جب دیکھا کہ اس کا ڈھانا سخت مشکل ہے تو ارادہ ترک کر دیا۔ (۱)

توسیع حلقہ اطاعت

اس کے بعد قاضی صاحب نے فتح خاں پنجتاری، اسماعیل خاں کھلابٹ، فتح خاں اور ارسلان خاں زیدہ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا:

> یہ ملک فضل الٰہی اور امیر المومنین کی دعا سے سکھوں کے قبضے سے چھوٹا مستحق لوگ اپنے حق کو پہنچے اور عشر شرعی سب نے قبول کیا۔ اب خلاصہ تقریر کا یہ ہے کہ فتح خاں اور ارسلان خاں دونوں بھائی زیدہ کو آباد کریں، نیز اس قلعے (ہنڈ) کو بخوبی زیر نظر رکھیں۔ چونکہ قوم رزڑ اب تک پھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اسے سیدھا کرنا ضروری ہے، اس لئے ہم غازیوں کو لے کر اس طرف کو جائیں گے۔

قاضی صاحب ہنڈ سے زیدہ گئے، دو روز وہاں گزارے پھر شیوہ پہنچ گئے۔ بستی کے باہر مغربی جانب درختوں کا ایک جھنڈ تھا، وہاں ٹھہرے۔ آنند خاں اور مشکار خاں نے معمول کے مطابق لشکر کو کھانا کھلایا اور جانوروں کے لئے دانے چارے کا بندوبست کیا۔

---

(۱) ''وقائع'' میں ہے کہ آٹھ دس روز تک بلا ناغہ کھودا گیا، سو کسی طرف کی منڈیر ایک ہاتھ بھر کھدی اور کسی طرف سے ایک بالشت۔ کھودنے والے تنگ آ گئے اور ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ اس لئے کہ وہ زمیندار تھے، سنگ تراش نہ تھے، ورنہ کچھ تو کھد جاتا، لیکن اس کی ہیئت اور رونق بگڑ گئی۔ (ص: ۱۳۴۳) ''منظورہ'' میں ہے: بسعی وزاری بسیارے از مردم چیزے نقصان آنگ نمودہ شد۔ چنانچہ امیر خاں برادر خادے خاں از ان طرف دریا آں را خراب و بے رونق دیدہ بسیار گریست۔

وہیں تو اکھنی اور شیخ جانا کے آدمیوں کو بلایا گیا، ان کا جواب آیا کہ فصل کے درو کا موسم ہے، ہم بہر صورت فرمانبردار ہیں، لیکن عشر کی تکلیف سے ہمیں معاف رکھا جائے۔ قاضی صاحب یہ جواب سن کر سخت خفا ہوئے اور بولے جب تک ان پر شریعت کا تازیانہ نہیں پڑے گا، یہ سیدھے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ سید صاحب کے پاس قاضی صاحب نے مزید آدمیوں کے لئے درخواست بھیجی۔ دہاں سے مولوی مظہر علی ایک سو غازیوں کے ساتھ امداد کے لئے آ گئے۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ قاضی سید محمد حبان نے ایک روز وعظ میں فرمایا کہ اہل رسوم خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں، شریعت کا حکم انہیں سنایا جائے تو نہیں مانتے، وہ لوگ عملاً کافر ہیں۔

قاضی صاحب کا ایک شاگرد اس پر پکا ہو گیا، لیکن جب اس نے ایک روز ایک شخص سے یہ بات کہی تو وہ بولا کہ قاضی حبان جھوٹ کہتا ہے۔ یہ بات قاضی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے اس شخص کو بلا کر پوچھا کہ کیا واقعی تو نے کہا کہ قاضی حبان نے جھوٹ بولا؟ وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا ایسا تو نہیں کہا، البتہ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اہل رسوم کافر نہیں۔ قاضی نے پوچھا کس کتاب میں؟ اس نے جواب دیا: ''منیۃ المصلی'' میں۔

قاضی صاحب یہ سنتے ہی جوش میں آ گئے، اسے زمین پر گرا کر گھونسوں سے مارنے لگے کہ نامعقول پڑھتا ہے منیۃ المصلی اور مسئلہ بیان کرتا ہے اہل رسوم کا۔ جن کتابوں میں اہل رسوم کے مسائل ہیں وہ تو تیرے استادوں نے بھی نہ پڑھی ہوں گی، توبہ کر کے کلمہ پڑھے گا تو تجھے چھوڑوں گا۔ چنانچہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑا۔

احمد خاں کمال زئی کا انحراف

بہر حال قاضی صاحب نے چند روز میں شیوہ، چار گلئی، سدم، گھڑیالی، نواکلئی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی وغیرہ کے لوگوں کو جمع کر کے وعظ فرمایا اور کہا کہ آپ بھائیوں نے بہ رضا و رغبت عشر دینا منظور کیا تھا، پھر خود ہی موقوف کر دیا، اب بتاؤ کیا مرضی ہے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ وہیں انکار کر دیں، لیکن اکثریت نے کہا کہ ہمیں باہم مشورہ کر لینے دیجئے۔ بعد مشورہ انہوں نے متفقہ فیصلہ قاضی صاحب کے پاس پہنچا دیا کہ ہم نے ادائے عشر اور اعانتِ مجاہدین کا جو عہد و پیمان کیا تھا، دل سے اس کے پابند ہیں، کاٹ لنگ اور لوند خوڑ کے لوگوں نے بھی سب شرطیں مان لیں۔

ہوتی مردان کے رئیس احمد خاں کو بھی بلایا گیا۔(۱) اس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اسے کوئی ضروری کام ہوگا۔ اس اثناء میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیر الدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود درانیوں سے فوجی مدد لینے کے لئے پشاور چلا گیا ہے، دو تین روز میں پے در پے اس خبر کی تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان حالات میں مردان کو بہ زور مسخر کر لینے کے سوا چارہ نہیں، چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔ غازیوں کو حکم دے دیا گیا کہ دو روز کے لئے روغنی روٹیاں پکا کر تیار ہو جائیں۔

ناظموں کا تقرر

مناسبتِ مضمون کا تقاضا یہ ہے کہ انتظامِ عشر کے سلسلے میں جو اصحاب مختلف مقامات

---

(۱) مجھے معلوم ہوا کہ احمد خاں کے کئی بھائی تھے اور احمد خاں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق "ہوتی" کی سرداری اس کے بھائی محمد خاں کو مل گئی۔ دونوں کے اخلاف کا سرسری نقشہ یہ ہے۔

کے لئے مقرر ہوئے، ان کی فہرست بھی یہاں درج کر دی جائے۔ اگرچہ یہ تقررات جنگ مردان کے بعد عمل میں آئے:

ناظم	علاقہ
حاجی بہادر شاہ خاں	تپہ امان زئی (یعنی گڑھی امان زئی اور آس پاس کا علاقہ)
حاجی محمود خاں رام پوری	ضلع سدم
مولوی نصیر الدین منگلوری	تپہ اوتمان نامہ (یعنی ٹوپی، مینئی، گندف، باجا، بام خیل، پانجئی، کھلابٹ، مرغز، دونوں منارے، کدا، زیدہ، پنج پیر، شاہ منصور، کنڈوہ، ہنڈ)
فتح خاں پنجتاری	خدو خیل

---

(۱) مجھے معلوم ہوا کہ احمد خاں کے کئی بھائی تھے اور احمد خاں کو کوئی بھی اچھا نہ سمجھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ہوتی کی سرداری اس کے بھائی محمد خاں کو مل گئی۔ دونوں کے اخلاف کا سرسری نقشہ یہ ہے:

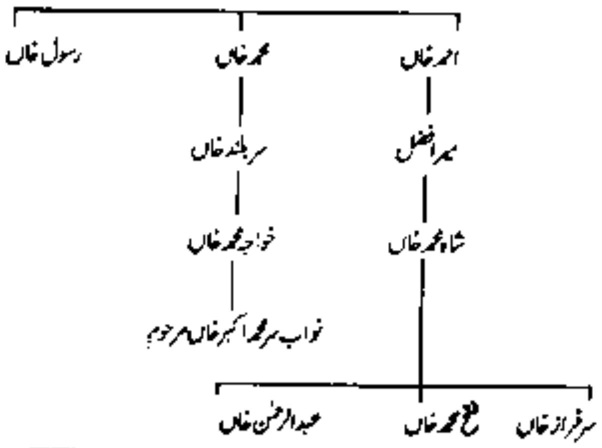
احمد خاں
محمد خاں
رسول خاں
میر افضل
سر بلند خاں
شاہ محمد خاں
خواجہ محمد خاں
نواب سر محمد اکبر خاں مرحوم
سرفراز خاں
فتح محمد خاں
عبدالرحمٰن خاں

ہر شخص کے ساتھ کچھ غازی مقرر ہو گئے۔ مولوی نصیر الدین کے ساتھ تیس یا چالیس غازی تھے، رسالدار کو حکم دے دیا گیا کہ دیہات میں دورہ کرتے رہیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب کی مجلس شوریٰ بنا دی گئی:

شیخ عبدالحکیم پھلتی، شیخ ناصر الدین پھلتی، شیخ ضیاء الدین پھلتی، حافظ عبدالرحمٰن پھلتی، شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی، نورداد خاں (لوہانی پورہ، رائے بریلی) عبدالحکیم خان (لوہاری)، ملا عزت قندھاری، ملا نور قندھاری، ملا قطب الدین قندھاری، عبدالغفار قندھاری، ملا لعل محمد قندھاری۔

رسالدار کی حق شناسی

سید صاحب کو اس بات کا خاص خیال تھا کہ عوام کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو، اس لئے یہ تجویز پیش کی کہ آٹھ آٹھ دس دس سوار مختلف علاقوں میں بکھر جائیں۔ رسالدار کو اس تجویز سے بدیں وجہ اختلاف تھا کہ لشکر بکھر جائے گا تو ضرورت کے وقت اسے یکجا کرنا مشکل ہوگا۔ خود دوروں میں اس درجہ احتیاط کا طریقہ اختیار کیا کہ ہر بستی سے پاؤ کوس باہر ٹھہر جاتے، وہیں بعض اکابر کو بلا کر حالات پوچھ لیتے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو اسی جگہ منگا لیتے۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔

ایک مرتبہ شیخ لکھمیر نے ڈاگئی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی، رسالدار تک یہ بات پہنچی تو بہت ناراض ہوئے۔ خود بستی والوں نے کہا کہ معمولی معاملہ ہے، لیکن رسالدار نے شیخ لکھمیر سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو تمام ضابطوں کی پابندی لازم ہوگی، پابندی منظور نہیں تو جائیے امیر المومنین کے پاس چلے جائیے۔

ایک مرتبہ منارہ خورد سے پیغام آیا کہ عشر کی جنس منگا لیجیے، رسالدار نے مستقیم خاں

اور سلطان خاں کو بھیج دیا۔ انہوں نے جنس لدوائی، ناشتا کر کے چلنے لگے تو کسی سے شکر مانگی، اس نے کہا کہ شکر نہیں گڑ موجود ہے، ابھی لائے دیتا ہوں۔ ان پر نفسانیت غالب آگئی، ناراضی کے جوش میں رسالدار کے پاس گاؤں والوں کے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں کہیں۔ رسالدار کو سخت غصہ آیا، آدمی بھیج کر کیفیت پوچھی، حقیقت حال معلوم ہوئی تو حیران رہ گئے۔ مستقیم خاں اور سلطان خاں نے اپنی غلطی کا اقرار کرلیا، بایں ہمہ رسالدار نے ان کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔

تیئیسواں باب:

جنگِ مردان

مردان کی جانب پیش قدمی

مردان پر حملہ کے لئے تیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سید محمد حبان نے دو ملکی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کیلئے بھیج دیا۔ وہ خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی میں بیس پچیس اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے۔ رسول خاں موجود ہے اور احمد خاں پشاور گیا ہوا ہے۔ حملے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا؟ اگر انتظار کیا جاتا تو درانیوں کا لشکر آ جاتا۔

بہر حال غازی حسب الحکم دو روز کیلئے روغنی روٹیاں پکا کر تیار ہو گئے۔ نمازِ عشاء کے بعد قاضی صاحب نے ننگے سر ہو کر کمال گریہ و زاری سے دعاء کی اور مردان کی طرف روانہ ہو گئے۔ جو ملکی مردان سے پہلے خبریں لے کر آئے تھے انھیں رہبر بنا لیا۔ پیادے آگے تھے اور سوار پیچھے۔ گمریالی کے میدان میں گھوڑوں نے خلاف معمول زور سے ہنہنانا شروع کیا۔ روکنے کی ہر چند کوشش کی، مگر وہ نہ رکے۔ جب مردان صرف ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر رہ گیا تو نقارہ بجنے کی آواز آئی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ دشمن کو حملے کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ مقابلے کیلئے تیار ہو چکا ہے یا تیار ہو رہا ہے۔

قاضی صاحب نے سارے لشکر کو ٹھہرا کر اکابر سے مشورہ کیا۔ مولانا شاہ اسماعیل اور رسالدار عبدالحمید خاں نے کہا کہ قاضی صاحب! یہاں تک تو اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا ہے، اب پیچھے ہٹنا مناسب نہیں۔ اگر دشمن خبردار ہو چکا ہے اور شبخون کی صورت باقی نہیں رہی تو

مضائقہ نہیں، ہم دن کے وقت لڑائی کریں گے۔ امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فتح وظفر سے سرفرازی بخشے گا۔

حملے کی اسکیم

قاضی صاحب اس مشورے پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میرے دل میں بھی یہی بات تھی۔

رہبروں کو آگے بھیج دیا تا کہ وہ پورے حالات دیکھ کر مزید خبریں لائیں اور بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کوس پر رہ گیا تو مخبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور وغل بھی سنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنہنا رہے تھے۔ اس اثناء میں مخبر خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بہ سمت جنوب کھلیان ہیں۔ وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لیے بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے پر بھی کافی جمعیت ہے۔ البتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان بالکل خالی ہے اور شمالی سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

قاضی صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کہا: آپ جیش کو لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالحمید کو حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب کھلیانوں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے بستی پر حملہ کر دیں۔ خود دروازہ کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ ملکیوں کو قاضی صاحب نے صف اول میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صف دوم میں۔ دعاء کے بعد تینوں جیش اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔

مولوی مظہر علی کی شانِ صبر وہمت

مولوی مظہر علی صاحب چپ چاپ کھلیانوں کے قریب پہنچے تو ادھر سے ایک باڑھ آئی، اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے ہلہ بول دیا۔ یہ اس زور کا تھا کہ کھلیانوں

والے بندوقچی بھاگ نکلے۔ مولوی صاحب ذرا آگے بڑھے تو ان کی ران کے بالائی حصے میں گولی لگی، جس کے باعث وہ زمین پر گر پڑے۔ (۱) لیکن اس شیر دل مجاہد نے اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہ ہونے دی کہ مبادا غازیوں کے اقدام میں توقف ہو جائے، اور بعض بھائی اپنے محبوب سردار کو سنبھالنے کی بے تابی میں اصل کام سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب سنبھل کر زمین پر بیٹھ گئے، جو غازی پاس سے گذرتا وہ حال پوچھتا، بلند آواز سے فرماتے: "تم چلو میں ابھی آتا ہوں"۔ بلند آواز سے اس لئے کہ کسی کو زخمی ہونے کا شبہ نہ ہونے پائے۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ غالباً پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے، جسے نکالنے کی غرض سے دم بھر کے لئے ٹھہر گئے ہیں۔ رات کی تاریکی میں کسی کو نظر بھی نہیں آسکتا تھا کہ ان پر کیا گذر چکی ہے۔ مولانا شاہ اسماعیل ان کے پاس پہنچے اور حال پوچھا تو بولے: آپ میرا خیال نہ فرمائیں۔ پہلے گڑھی کا فیصلہ کرلیں فتح حاصل ہو جائے گی تو دیکھ لیجئے گا کہ میں کس حال میں ہوں۔

ہوتی پر حملہ

بہر حال مولوی مظہر علی کا جیش کھلیانوں سے آگے بڑھ کر دروازے پر پہنچا۔ ادھر سے قاضی صاحب بھی آگئے اور سب متفقہ طور پر ہلّہ کر کے بستی میں داخل ہو گئے۔ اس اثناء میں گڑھی کے اندر سے آواز آئی کہ "بھائیو! تم میں ہندوستانی بھی ہیں؟" جب پوچھا گیا کہ مدعا کیا ہے تو آواز آئی کہ آپ لوگوں کے قول و قرار کی سچائی زمانے بھر پر آشکارا ہے، ہم امان چاہتے ہیں۔ اس طرح انیس بیس آدمی گڑھی کی دیوار پھاند کر سواروں کی پناہ میں آگئے۔

مردان پر ہجوم

غازی دوسری سمت سے گڑھی کے اندر داخل ہو چکے تھے، مولانا اور قاضی صاحب

---

(۱) یہ "منظورہ" کا بیان ہے۔ "وقائع" میں ہے کہ گولی مولوی صاحب کی کمر میں لگی تھی اور گوشت میں رہی، کسی بڑی کو نقصان نہ پہنچا۔

ملا نور محمد قندھاری کو پچیس آدمیوں کے ساتھ ہوتی کے انتظام کیلئے چھوڑ کر مردان جا چکے تھے۔ جب سواروں کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی مردان کی طرف چلے گئے۔ ہوتی اور مردان کے درمیان انہوں نے صبح کی نماز ادا کی۔

مردان میں بندوقیں چل رہی تھیں، سوار بستی کے باہر مولانا شاہ اسمٰعیل کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، تا کہ باہر سے کوئی کمک اندر نہ جا سکے۔ قاضی صاحب پیادوں کے ساتھ گڑھی کی تسخیر میں مصروف تھے، اس اثناء میں چار ملکی آدمی مولانا مظہر علی کو چار پائی پر ڈال کر لائے۔ وہیں مولانا نے ان تمام آدمیوں کو رہا کر دیا، جنہیں سوار ہوتی کی گڑھی سے امان دے کر ساتھ لائے تھے اور فرمایا کہ مسلمان کی جان، عزت اور مال ہر مسلمان پر حرام ہے، سوائے اس حالت کے کہ وہ باغی یا محارب ہو۔

قاضی حبان کی شہادت

دو گھڑی دن چڑھا ہوگا کہ چار پانچ آدمی بستی سے دوڑے آئے اور مولانا کو یہ غم انگیز خبر سنائی کہ قاضی سید محمد حبان شہید ہو گئے۔ تفصیل یہ بتائی کہ بستی میں گھسے تو گڑھی والوں کی گولیاں غازیوں پر برسنے لگیں، اس وجہ سے غازی خانہ بخانہ ہو کر گڑھی کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ جس گھر میں گھستے، اس کی دیوار توڑ کر گڑھی سے قریب تر ہو رہے تھے، ایک دیوار توڑی تو سامنے چوڑی گلی آ گئی، جہاں دشمن کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں، چار پانچ غازی تیزی سے سلامت نکل گئے، پھر ایک ملکی کے گولی لگی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے ریلے میں بھی کچھ بچ نکلے، اور ایک نے شہادت پائی۔ پھر ایک ہندوستانی غازی شہید ہوا، اس پر قاضی صاحب خود چند آدمیوں کو لے کر آگے بڑھے، ان کے سارے ساتھی بچ نکلے لیکن قاضی صاحب کے سر میں گولی لگی، ساتھ ہی دم پورا ہو گیا۔

مولانا نے یہ خبر سنتے ہی انا للہ...... کے بعد فرمایا: ''الحمد للہ قاضی القضاۃ نے اپنی دلی مراد پالی۔'' لیکن اس واقعہ کو علی الاعلان بیان نہ کرو تا کہ دشمنوں پر یہ ظاہر نہ ہو کہ لشکر کا

امیر شہید ہو گیا۔

سرحد کا مخلص ترین عالم

قاضی صاحب کی شہادت کا واقعہ حقیقتاً بہت المناک تھا، وہ بڑے دیندار اور مخلص مجاہد تھے۔ سرحدی علماء میں جتنے لوگ سید صاحب کے رفیق اور ارادت مند بنے، ان میں سے ایک بھی علم و فضل، غیرت و حمیتِ دین اور زہد و تقویٰ میں ان کا مثیل نہ تھا۔ اعلائے کلمۃ اللہ میں بڑے جری اور بے باک تھے۔ سمہ میں انہیں کی ہمت و کوشش سے عشر کا پختہ انتظام ہوا تھا، وہ کانڑا غور بند کے رہنے والے تھے، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے فارغ البال بلکہ امیر گھرانے کے فرد تھے۔ محض اللہ کے لئے سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، پھر آپ کا دامن اس مضبوطی سے پکڑا کہ تادمِ واپسیں نہ چھوڑا۔ ان کے ایک حقیقی بھائی بھی ساتھ تھے، وہ جنگِ مردان کے بعد قاضی صاحب کی میت کو اپنے وطن لے گئے اور وہیں انہیں دفن کیا۔

مردان کی حوالگی

مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سواروں کو بستی میں بھیج دیجئے وہ گھوڑے چھوڑ دیں، شاہینیں لے کر پیدل جائیں اور شاہینوں سے گڑھی کے برجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ گڑھی مردان کے چھ برج تھے، سب پر گولہ باری شروع ہو گئی، دو شاہینیں صرف اس برج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سید حبان اور دوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔

بہرحال شاہینوں نے دشمن کا عزمِ مزاحمت مضمحل کر کے رکھ دیا، گڑھی کے پانچ برجوں پر خاموشی چھا گئی، صرف ایک باقی رہ گیا جس سے گولیاں آ رہی تھیں۔ اس اثناء میں ملا لعل محمد قندھاری اس برج کے نیچے پہنچ گئے اور بہ آواز بلند پشتو میں پکارے:

''اندر پائی راوڑا، اندر پائی راوڑا''

یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔

حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سن کر برج والوں پر ہراس طاری ہو گیا اور انہوں نے حوالگی کی درخواست پیش کر دی۔ قرارداد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیے، پھر ایک ایک کر کے اتر آئے۔

مولانا شاہ اسماعیل سے متعلق بیان ہے کہ جنگ کے بعد آپ نے دو غازیوں کے کارناموں کو بڑا قابل قدر بتایا، اول مولوی مظہر علی صاحب جن کی مجروحیت کا واقعہ عرض کیا جا چکا ہے، دوم ملا لعل محمد قندھاری، جنکے حسن تدبیر سے گڑھی کا آخری برج خالی ہوا۔

مولانا کے انتظامات

جب ساری مزاحمت ختم ہو گئی تو احمد خاں کا بھائی رسول خاں بھی گڑھی کے تہ خانے سے باہر نکل کر امان کا خواستگار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اثناء جنگ میں مجرا ستار رہا تھا، مولانا شاہ اسماعیل نے جو قاضی سید محمد حبان کی شہادت کے بعد امیر لشکر بن گئے تھے، فرمایا کہ اپنے تمام آدمی لیکر گڑھی سے باہر نکل جاؤ، تمہیں امان دی جاتی ہے، تمہارا اور ساری رعایا کا مال و اسباب بالکل محفوظ رہے گا اور کوئی غازی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیگا۔ لیکن احمد خاں کے مال و اسباب میں سے کوئی چیز نہ چھیڑنا، وہ باغی ہے اور اسکی ہر چیز لے لی جائے گی۔

جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو رسول خاں کو خانی کی مسند پر بٹھا دیا گیا، شہدا کو مردان ہی میں دفن کیا گیا، حملے کے دوران میں جو مال غازیوں کے ہاتھ آیا تھا وہ سارا مالکوں کو لوٹا دیا گیا اور فرمایا کہ امان دینے کے بعد کسی کا مال و اسباب لینا حرام و ناروا ہے۔ ہمارے تمام مسلمان بھائی یہ مسئلہ یاد رکھیں۔ بعد ازاں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہم سب عاجز بندوں سے اپنی رضا کے کام لے، توفیق خیر دے اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے۔

امان زئی، پنجتار اور امب

اس روز ہوتی میں مقام کیا۔ سو سوار احمد خاں کا سامان جمع کرنے کے لئے مقرر کر دیے۔ اگلے دن ظہر کے وقت روانہ ہو کر مغرب کی نماز گڑھی امان زئی میں ادا کی۔ سوار اور اکثر پیادے بستی کے باہر نالے پر اترے۔ خود مولانا نے سرور خاں کی مسجد میں قیام کیا جو بستی کے ایک کنارے پر تھی۔ وہاں تین روز ٹھہرے، آس پاس کے خوانین ملاقات کے لئے آئے۔ مولانا نے اس جگہ بھی قاضی سید محمد حبان کی مغفرت کے لئے دعا کی۔ اسی موقع پر حاجی بہادر شاہ خاں کو گڑھی امان زئی میں تحصیلِ عشر کا کام سپرد کیا اور چندرہ آدمی ان کے ساتھ مقرر کر دیے۔ پھر سدم پہنچ کر حاجی محمود خاں کو وہاں کا تحصیل دار بنایا، بعد ازاں شیوہ ہوتے ہوئے پنجتار تشریف لے گئے۔

چند روز کے بعد سید صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا تو زخمیوں اور بیماروں کو پنجتار میں چھوڑا اور پہلی منزل کالا درہ کے پاس نالے پر کی، پھر کوٹھا اور کھبل ہوتے ہوئے امب پہنچ گئے اور سید صاحب کی خدمت میں انتظامِ عشر، جنگ مردان اور شہادت قاضی حبان کی تفصیلات پیش کیں۔ سید صاحب بھی قاضی القضاۃ کی شہادت پر بیحد متالم ہوئے۔(1)

---

(1) یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ہوتی اور مردان کی حیثیت اب بالکل بدل چکی ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں ان مقامات کی جو حالت تھی وہ موجودہ سے بالکل مختلف تھی۔ اب یہ دونوں مقام مل کر ایک بڑا شہر بن گئے ہیں۔ مرحوم خان اکبر خاں (ہوتی) سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوانین ہوتی کے مورث اعلیٰ کا نام محمد خاں تھا، پھر اس خاندان میں لشکر خاں نے بلند حیثیت حاصل کر لی، اس کے پانچ لڑکے تھے۔ بڑا احمد خاں تھا، اس کا چلن اچھا نہ تھا، اس لئے لشکر خاں نے از روئے وصیت اسے محروم کر دیا تھا اور اپنے دوسرے بیٹے محمد خاں کو جانشین بنایا تھا۔ احمد خاں کی رشتہ داری اہلیہ کی جانب سے سلطان محمد خاں کے ساتھ تھی۔ محمد خاں کا شجرہ یوں ہے:

محمد خاں
|
سربلند خاں
|
خواجہ محمد خاں
|
نواب سر اکبر خاں

چوبیسواں باب:

سردارانِ پشاور کا نیا فتنہ

سلطان محمد خاں

جنگِ زیدہ کے بعد سید صاحبؒ کی دلی خواہش یہ تھی کہ سلطان محمد خاں کے ساتھ دوستی کے تعلقات استوار ہو جائیں اور یار محمد خاں کی افسوسناک حرکات کے باعث جو ناگوار حالات پیش آ گئے تھے، ان کی تلخیاں مٹ جائیں۔ معلوم ہے کہ سلطان محمد خاں خود اپنے بھائی کی حرکات کو ناپسند کرتا تھا، لیکن وہ کمزور طبیعت کا آدمی تھا، اس کی والدہ بار بار طعنے دے رہی تھی کہ ایک فقیر نے تیرے بھائی کو مار ڈالا، تو لاؤ لشکر کا مالک ہونے کے باوجود بدلہ نہیں لے سکا۔ پہلے والدہ ہی کے طعنوں نے اس سے ہنڈ پر حملہ کرایا تھا، پھر پنجتار کا قصد کیا، جب معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ کے غازی پشاور پر شبخون مارنے میں بھی تامل نہ کریں گے تو خوفزدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

سید صاحبؒ امب کی طرف گئے تو اس کی والدہ اور مشیروں نے مخالفت پر اُبھارا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اب تک اس کی تمام معاندانہ حرکات میں نیم دلی صاف نمایاں رہی، اس کا کوئی بھی اقدام یار محمد خاں کی طرح متصلب دشمن کا اقدام نہ تھا کہ اس کا دل زہرِ عناد سے لبریز ہو، بلکہ ایسے آدمی کا اقدام تھا جسے خواہش و آرزو کے خلاف کسی کام پر مجبور کر دیا گیا ہو۔

احمد خاں کمال زئی کی حرکت

اس اثناء میں احمد خاں کمال زئی کا واقعہ پیش آ گیا جس نے ادائے عشر کے عہد

و پیمان کو بالائے طاق رکھا اور ہر اقرار سے منحرف ہو گیا۔ باز پرس ہوئی تو فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے پشاور پہنچ گیا، اس پر جنگ مردان پیش آئی جس میں قاضی سید محمد حبان شہید ہوئے اور رسول خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا گیا۔ یار محمد خاں اور خادے خاں کے خون کا بدلہ لینے کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی تھی، احمد خاں نے اسے مشتعل کرنے کے لئے نیا ایندھن فراہم کر دیا۔

سلطان محمد خاں اور اس کے بھائیوں کی مجالس میں پھر اس قسم کی باتیں شروع ہو گئیں کہ اگر اسی طرح یکے بعد دیگرے ایک ایک رئیس کی امارت و خانی کے دیے گل ہونے لگے تو خود درانی سرداروں کی ریاست کا چراغ کب تک روشن رہ سکے گا؟ چنانچہ سلطان محمد خاں، اس کے بھائیوں سید محمد خاں اور پیر محمد خاں نیز اس کے بھتیجے حبیب اللہ خاں (ابن عظیم خاں) نے متفق الرائے ہو کر ایک لشکر فراہم کیا اور احمد خاں کمال زئی کی امداد کو دستاویز بنا کر سید صاحبؒ سے لڑنے کیلئے چمکنی پہنچ گئے۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو دیہات کا دورہ کرتے ہوئے یہ اطلاعات ملیں، وہ پنجتار پہنچے تو حاجی بہادر شاہ خاں نے امان زئی سے اس بارے میں مفصل روئیداد بھیج دی۔ فتح خاں پنجتاری اور دوسرے غازیوں نے مشورہ کر کے پورے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے، ساتھ ہی درخواست کی کہ آپ کا بہ نفس نفیس تشریف لے آنا مناسب ہوگا۔

سید صاحب کے انتظامات

سید صاحب امب سے پنجتار جانے کیلئے تیار ہو گئے، روانگی سے پیشتر آپ نے مندرجہ ذیل انتظامات فرمائے:

۱۔ قلعہ امب کا انتظام شیخ بلند بخت دیوبندی کے حوالے کیا، لیکن تمام انتظامات میں سید اکبر شاہ تھانوی کو اس طرح شریک رکھا، گویا ان کی حیثیت شریک منتظم کی تھی۔

۲۔ قلعے سے باہر جتنا اسلامی لشکر تھا، اس کا امیر و سالار اعظم مولانا شاہ اسماعیل کو بنایا، شیخ ولی محمد پھلتی کو ان کا مشیر نامزد کیا۔ سید جعفر علی نقوی اس سمت میں میر منشی کے منصب پر مامور ہوئے۔

۳۔ چھتر بائی کے قلعہ دار مولوی خیر الدین شیر کوٹی تھے، حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو ان کا نائب بنایا۔ اسب میں پچاس کے قریب مستورات تھیں، ان میں سید صاحب کی بی بی صاحبہ بھی تھیں، انہیں اور بچوں کو وہیں چھوڑا۔ چند مقام ستھانہ میں گئے، چند روز کھبل میں ٹھہرے۔ غازیوں کے بڑے حصے کو منیئی کے راستے پنجتار بھیج دیا، خود تھوڑے سے غازیوں کے ساتھ منارہ کلاں گئے، جہاں حافظ دراز نام ایک مجذوب سے ملاقات منظور تھی۔ اس مجذوب کا ایک شیوہ بے حد عجیب تھا، وہ روزانہ دریائے سندھ میں نہانے جاتا اور اس مقام پر نہاتا جہاں پانی کی دھار بے حد تیز رہتی تھی، یہاں تک کہ کسی توانا آدمی کو بھی وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ مجذوب بہ اطمینان جاتا، اپنی لاٹھی پانی میں گاڑ کر اس پر کپڑے رکھتا، خوب دلجمعی سے نہا کر واپس آتا۔ اسے وہی جگہ پسند تھی۔

منارہ سے سید صاحب چلے تو کلابٹ اور مرغز کے بیچ میں سے نکلے، دونوں بستیوں کے سرداروں نے کھانے کیلئے اصرار کیا۔ سید صاحب نے معذرت کردی کہ کار ضروری درپیش ہے۔ تو تالی میں فتح خاں پنجتاری نے استقبال کیا، عصر کی نماز پنجتار کے سامنے نالے پر ادا کی۔ رسالدار عبد الحمید خاں دورے پر نکلے ہوئے تھے، انہیں حکم بھیج دیا کہ ضروری تیاری کرلیں اور جتنی رقم مطلوب ہو، حاجی بہادر شاہ خاں سے لے لیں۔

مخالفوں کے ہنگامے

پنجتار پہنچ کر درانیوں کے بارے میں مشورہ کیا تو سب نے یہ رائے دی کہ لشکر لے کر گڑھی امان زئی یا تورو تک جانا چاہئے، اگر درانی اپنا لشکر واپس لے جائیں تو خود بھی

واپس آجانا چاہئے، اگر آگے بڑھیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ جنگ ہوگی۔

سید صاحب پنجتار آئے تو خبر پہنچی کہ پائندہ خاں اور سکھ امب و عشرہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قادر آباد کے قلعدار رام سنگھ (یا رام سکھ) نے غازیوں کے ساتھ خفیہ خفیہ سمجھوتا کر لیا تھا، جب ہری سنگھ لشکر لے کر اس طرف آیا تو رام سنگھ نے بھی پیغام بھیج دیا کہ اب میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ کبھی کبھی گولیاں چلواتا رہوں، چنانچہ قادر آباد اور دریا پار کی دوسری سکھ گڑھیوں سے گولیاں آنے لگیں۔ مولانا بھی جواب میں توپیں لگا کر گولے پھینکنے لگے۔ ایک روز غازی عشرہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ چند گولیاں مسجد کی دیواروں میں آ کر لگیں، مولانا کے حکم سے خدا بخش نے ایک جزائل مسجد کے ستون سے باندھ کر گولے پھینکے۔

مولانا اس زمانے میں ہر جمعہ کے وعظ میں سورۂ فتح کی تفسیر رکوع بہ رکوع سنایا کرتے تھے، آخری رکوع کی تفسیر سنا رہے تھے کہ سکھوں کی طرف سے گولیاں چلیں۔ مولانا نے غازیوں کو بکھر جانے کا حکم دیا اور جن غازیوں کے پاس رائفلیں یا لمبی زد کی بندوقیں تھیں، انہیں حکم دیا کہ گولیاں چلائیں۔ دریا کے کنارے اور قلعہ امب کے پاس مناسب مقامات پر مورچے بھی بنا لئے تھے، قلعے کے شمال میں ایک خندق کھودی گئی جس کی کھدائی میں خود مولانا بھی شریک رہے۔ چھتر بائی کے لئے سب سے بڑھ کر خطرہ تھا، پائندہ خاں حملہ کرتا تو چھتر بائی ہی پر کرتا، شیخ ولی محمد روزانہ صبح کو سو سوا سو غازی لے کر چھتر بائی جاتے، دن وہاں گزارتے رات کی تاریکی میں واپس آجاتے۔

سید صاحب کا فرمان

یہ حالات دیکھ کر سید صاحب نے فرمان بھیجا کہ عورتوں اور بچوں کو امب سے نکال کر ستھانہ پہنچا دیا جائے۔ مولانا کے نزدیک یہ طریقہ مناسب نہ تھا، اندیشہ تھا کہ اس طرح

اردگرد کے علاقے میں سراسیمگی پھیل جائے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ غازی ڈر گئے ہیں، چنانچہ مولانا نے لکھ بھیجا کہ تھانہ امب سے زیادہ محفوظ نہیں اور میں مسلمانوں میں ہراس نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ اس وقت سکھوں پر ہراس طاری ہے، لاہور سے گورنر کشمیر کے نام فرمان پہنچا ہے کہ خلیفہ صاحب سے ڈرتے رہو اور کشمیر کے راستوں کی خوب حفاظت کرو، جس طرح ملکیوں نے خلیفہ صاحب کو امب پہنچایا، ایسا نہ ہو کہ اسی طرح انہیں کشمیر پہنچا دیں۔(۱)

سید صاحب نے دوبارہ لکھا کہ سید اکبر شاہ سے مشورہ کر لیجئے۔ مولانا نے مشورہ کیا اور لکھا کہ میں اپنی پہلی رائے پر قائم ہوں، حکم و اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے خیر خواہی کی بنا پر اپنی رائے بے تکلف عرض کر دی، اس لئے کہ آپ اکثر مجھ سے مشورہ فرماتے رہتے ہیں، لیکن اگر آپ کا حکم بحال رہے تو لاریب اس کی تعمیل ہوگی۔

> دگر از ارسال زنان خصوصاً حرم محترم آنجناب نقصانے در شوکت اسلام راہ خواہد یافت جواب دہی آں عند اللہ بہ ذمہ آنجناب خواہد افتاد۔ ایں قدر بالیقین باید دانست کہ وقتیکہ سر برتن ہائے سہ صد مردم خواہد بود، آں وقت خدا نخواستہ نوبت بہ حرم محترم آنجناب خواہد رسید۔(۲)
>
> **ترجمہ**: اگر عورتوں خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو (امب سے نکال کر تھانہ) بھیجنے کے باعث شوکت اسلام کو نقصان پہنچا تو اس کیلئے خدا کے پاس آپ جواب دہ ہوں گے۔ یہ بھی یقین رکھئے کہ جب تک تین سو غازیوں کے سر بدنوں سے الگ نہ ہو جائیں گے، خدانخواستہ آپ کے حرم محترم تک نوبت نہ آسکے گی۔

سید صاحب نے یہ تحریر دیکھی تو فرمایا کہ یہ تو میرے بھانجے سید احمد علی جیسی تحریر

---

(۱) ''منظورہ'' ص ۸۳۲- (۲) ''منظورہ'' ص: ۸۳۲

ہے، جو سچی بات کہنے میں مراعات ادب کی بھی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ (۱)

دو تصریحات

سید صاحب کے فرمان اور مولانا شاہ اسماعیل کے واشگاف جواب کے سلسلے میں دو باتوں کی توضیح ضروری ہے:

۱۔ سید صاحب کا فرمان اپنی بی بی کی حفاظت کے خیال پر مبنی نہ تھا، اگرچہ خواتین کی حفاظت بہرحال ضروری تھی۔ جو بزرگ ہستی اس دنیا کی ہر متاع راہِ حق میں لٹا دینے پر ہمہ تن تیار تھی اس کے متعلق اس قسم کا وسوسہ بھی گناہ ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر حملہ ہوا تو عورتوں اور بچوں کی موجودگی غازیوں کیلئے دورانِ جنگ میں موجب تشویش واضطراب بنی رہے گی، اور وہ یکسو ہو کر فرائض فداکاری بجا نہ لا سکیں گے۔

۲۔ مولانا کی تحریر منافی مراعاتِ ادب نہ تھی، سچی بات کو چھپانا یا حقیقت حال کے اظہار میں متامل ہونا اصولاً غلط اور ادائے فرائض میں کوتاہی کا نشان ہے۔ ادب کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان کسی بزرگ کے حکم کو خلافِ مصلحت جانتے ہوئے ادائِ فرض سے بچ نکلنے کی دستاویز بنا لے۔ سید صاحب کا ادب کیوں ضروری تھا؟ اس لئے کہ اہم دینی فرض کی بجا آوری کی خاطر انہیں قائد وامام مانا گیا تھا، لہٰذا ہر معاملے میں اصل فرض کی مصلحتیں ہی مدارِ کار تھیں اور شخصیت امام کے ادب کا تقاضا ہرگز یہ نہ تھا کہ اس کی مصلحتیں واضح کرنے میں تامل کیا جاتا۔ مولانا نے یہی کیا اور سید صاحب نے اپنے عمل سے اس پر مہر تصدیق لگائی، قولاً اس کی تحسین فرمائی۔ ہمارے ہاں ادب کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بزرگ شخصیت کی زبان پر جو کچھ جاری ہو، بے چون و چرا اس کے سامنے سر تسلیم خم رکھا جائے، اگرچہ وہ کتنا ہی غلط ہو۔

---

(۱) "منظورہ" ص: ۸۳۳

سلطان محمد خاں کو خط

سید صاحب نے حکم دے دیا تھا کہ ہر ضلع کا غلۂ عشر مرکزی مقام پر جمع ہو جائے اور مختلف دیہات میں نہ بکھرا رہے۔ پھر چار سو غازیوں کے ساتھ پنجتار سے نکلے، شیوہ اور اسماعیلہ ہوتے ہوئے گڑھی امان زئی پہنچ گئے اور احمد خاں کاکا کی مسجد میں قیام فرمایا۔ وہیں اطلاع ملی کہ درانیوں کا لشکر چمکنی سے چل کر چارسدہ ہوتا ہوا اوتمان زئی پہنچ گیا ہے۔ یہ عزمِ جنگ کا واضح اعلان تھا۔ فتح خاں پنجتاری اور منصور خاں (چارگلئی) نے مشورہ دیا کہ اب گڑھی امان زئی میں ٹھہرے رہنے کے بجائے تورو میں پہنچنا چاہئے۔

سید صاحب نے اس موقع پر سلطان محمد خاں کو ایک دردانگیز خط لکھا جس میں دیرینہ تعلقات کی یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم مسلمان محض خدمت دین اور احیائے سنن سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غرض سے وطن چھوڑ کر آئے تھے، کلمہ گویوں کو جہاد کی ترغیب دے رہے تھے، مسلمانوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے، یار محمد خاں کو اپنے لاؤ لشکر پر ناز تھا، وہ بلاوجہ ہم پر چڑھ آیا۔ ہر چند سمجھایا، نہ سمجھا۔ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ ہم ویسے ہی عاجز و ناچار ہیں، ہمارا مولا پہلے کی طرح اب بھی مالک الملک اور قادر و مختار ہے، ہم لوگوں سے ڈرنے کی کچھ ضرورت نہیں لیکن خدا کی بطشِ شدید سے ڈرتے رہنے۔

اوست سلطاں ہرچہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند
ہست سلطانی مسلم مرورا نیست کس را زہرۂ چون و چرا

احمد خاں کمال زئی کی خطاکاری بھی واضح فرمائی۔ یہ خط تورو کے عبدالرحمٰن کے ہاتھ بھیجا اور لکھا کہ باقی حالات قاصد کی زبانی معلوم ہوں گے۔

مزید نامہ و پیام

لیکن جو لوگ سلطان محمد خاں کو پشاور سے اٹھا کر لائے تھے، وہ اوتمان زئی پہنچ

جانے کے بعد کیونکر اسے صحیح راستے پر آنے کا موقع دے سکتے تھے؟ سلطان محمد خاں کے ہاتھ سے خیر خواہیِ اسلام کی حبل المتین نکل چکی تھی اور وہ ہر دینی و قومی مصلحت کی طرف سے آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس کا جواب سراسر واہی طعنوں کا مرقع تھا، مثلاً یہ کہ جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں، تم لوگوں کا عقیدہ برا اور نیت فاسد ہے۔ بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے، ہم نے خدا کے نام پر کمر باندھ لی ہے کہ تمہیں قتل کریں تاکہ زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔ ملا عبدالرحمٰن نے زبانی بھی بتایا کہ جو حالات میں دیکھ آیا ہوں، ان کے پیش نظر صلح کی کوئی امید نہیں۔

سید صاحب نے بردباری سے کام لیتے ہوئے اجراءِ نامہ و پیام اور رفع خصومت کا ایک پہلو نکال لیا۔ دوبارہ لکھا کہ آپ کی زبان سے خدا کا نام سن کر بڑی خوشی ہوئی، مہربانی فرما کر یہ تو بتا دیجئے کہ ہمارے اعمال میں آپ کو کون سی چیز احکم الحاکمین کے امر و رضا کے خلاف نظر آئی؟ اگر آپ کچھ بتا دیں تو ہم اس سے تائب ہو جائیں گے اور آپ کو لشکر کشی کی ضرورت نہ رہے گی۔

ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ

خدا کے نام پر کمر باندھنے کا مدعا یہی ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں سے جنگ مقصود ہے ان کے اعمال میں کوئی چیز باری تعالیٰ کی رضا کے خلاف موجود ہے۔ پھر جب وہ خود اسے چھوڑنے کا اقرار کر رہے تھے تو لڑائی کی کیا ضرورت تھی؟ صرف خلافِ شریعت بات یا باتیں بتا دینی چاہیے تھیں، لیکن سلطان محمد خاں الزام تراشی کے جواب میں کونسی چیز پیش کر سکتا تھا؟ کیا بتاتا؟ کیا کہتا؟ کیا یہ کہتا کہ مسلمانانِ سرحد کو احکامِ شریعت حقہ کا پابند بنانا رضائے ایزدی کے خلاف ہے؟ یا یہ کہتا کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کی کوشش مقاصد اسلامی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، اسے ترک کر دینا چاہیے؟

یا یہ کہنا کہ افغانیت کے جاہلانہ رسوم کا انسداد تقاضائے ایمانی کے منافی ہے؟ وہ بالکل لا جواب ہو گیا اور صرف یہ پیغام بھیج سکا کہ اس خط کا جواب شمشیر وسناں سے دیا جائیگا۔

اندازہ فرمائیں کہ یہ حالات دیکھ کر اس پاک باطن اور پاک نفس سید کے دل پر کیا گذری ہوگی، وہ اور ان کے رفیق گھر بار، اقربا اور راحت بار زندگیاں چھوڑ کر اس غرض سے سرحد پہنچے تھے کہ اسلام کا پرچم سر بلند ہو، مسلمان مصیبتوں سے نجات پائیں، ان کا اعزاز واکرام، ان کی آزادی، ان کی اسلامیت بحال ہو جائے۔ لیکن خود دعویداران اسلام ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں کی جو تلواریں اور جو تیرے غیر مسلموں کے خلاف نہ چل سکے، وہ ان مجاہدین اسلام کے خلاف پے بہ پے اچھلنے لگے، جو اپنے خونِ حیات کا آخری قطرہ مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے لئے بہا دینے کا عزم لئے سرحد پہنچے تھے۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا دردناک ترین منظر

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک دو نہیں بیسیوں واقعات موجود ہیں کہ مسلمانوں نے جوع الارض کی خاطر مسلمانوں کے گلے کاٹے۔ کلمہ گویوں نے کلمہ گویوں کا خون بہایا۔ لیکن ایسی مثال آپ کو شاید ہی مل سکے کہ دعویداران اسلام نے ان غازیوں کو خونریزی وخوں آشامی کا ہدف بنایا، جنہیں رضائے حق کے سوا دنیا وآخرت کی کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ جن کے دلوں میں صرف ایک آرزو اور ایک تڑپ تھی کہ مسلمان سچے مسلمان بن جائیں، عزت وسربلندی کی زندگیاں بسر کریں، کوئی معاند انہیں آزار نہ پہنچا سکے، کسی بدخواہ کا ہاتھ ان کی طرف بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ مکروہ اور گھناؤنا کام صرف پشاور کے درانی سرداروں نے اپنے لئے پسند کیا:

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
إن کان فی القلب اسلام وایمان

سلطان محمد خاں نے سید صاحب کو یہ طعنہ بھی دیا تھا کہ تم لوگ شبخون مارتے ہو، دن کے وقت لڑو تو تمہاری بہادری اور مردانگی کا بھرم کھل جائے۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم آپ سے یا کسی مسلمان سے نہ دن کو لڑنا چاہتے ہیں، نہ رات کو۔ البتہ اگر آپ زیادتی اور تعدی پر تلے رہیں گے تو ہم مجبور ہوں گے۔ ہمیں امید ہے خدا نے جس طرح آپ کے بھائی پر ہمیں رات کو فتح عطا کی تھی، اسی طرح آپ پر دن کو فتح یاب کرے گا۔ خدا سے ڈریئے اور ناحق پر اصرار نہ کیجئے۔

سید صاحب کا یہ قول بھی حرف بہ حرف پورا ہوا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

مولانا کی تشریف آوری

غرض سید صاحب گڑھی امان زئی سے تورو پہنچ گئے، مولانا اسماعیل کو بھی امب سے بلالیا۔ منشی محمدی انصاری نے اپنی طرف سے مولانا کو لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجئے، اسلئے کہ آپکی شجاعت اس دیار کے خاص وعام پر روشن ہے۔ کیا عجب ہے کہ دشمن آپکا نام سنکر مرعوب ہوجائیں اور اسی طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

مولانا نے امب کے سارے معاملات شیخ بلند بخت دیوبندی کے حوالے کیے، خود شیخ ولی محمد اور دو سو غازیوں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ کشتیاں امب کے بجائے ستھانہ میں پہنچادیں، دوپہر کا کھانا ستھانہ میں کھایا، رات کھبل میں گزاری، جہاں پیر محمد مورائیں کی جماعت موجود تھی۔ اس میں سے بھی ستر غازی ساتھ لئے۔ ٹوپی، پنج پیر اور دھوبیاں ہوتے ہوئے تورو پہنچ گئے۔ راستے کے خوانین وعلماء بھی اپنے آدمی لے کر ساتھ ہوگئے تھے، ان میں سے اخوند سید امیر صاحب (ملا صاحب کوٹھا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید صاحب نے تورو سے باہر نکل کر استقبال کیا اور تمام غازیوں سے معانقہ فرمایا۔

غازیوں کے درجات

راوی کہتے ہیں کہ ایک روز سید صاحب اپنے مخلص فداکاروں کے گروہ میں تشریف

فرماتے، باتیں کرتے کرتے فرمایا: ہمارے جو بھائی یہاں بیٹھے ہیں، بارگاہ الٰہی کے ستودہ ہیں، اور رحمت نامتناہی کے مورد۔ میں اگر ان کے ایمان پر سوگند شرعی کھاؤں تو انشاء اللہ حانث نہ ہوں گا اور اگر ان کی مقبولیت پر قسم اٹھاؤں تو وہ جھوٹی نہ ہوگی۔(۱)

ایمان کی پختگی اور اخلاص و برگزیدگی کے استحکام کی اس سے بڑی شہادت کیا ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا کی ہر شئے رضائے خدا کے لئے وقف کر چکے تھے اور زندگی کے ہر محبوب رشتے کو اسلام کی سربلندی کے لئے توڑ چکے تھے۔

ایک انوکھا واقعہ

تورو میں اتفاقیہ ایک واقعہ پیش آگیا، جس سے سید صاحب کی دینی عظمت و اخلاص کا ایک دلکشا منظر سامنے آتا ہے۔ آپ کے باورچی خانے کا انتظام مولوی عبدالقیوم کے سپرد تھا، قادر بخش گنج پوری کھانا پکاتا تھا، جو پخت و پز میں یگانہ استاد مانا جاتا تھا۔ میاں عبداللہ اور بعض دوسرے اصحاب وقتاً فوقتاً قادر بخش کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔

ایک روز گوشت کی ہنڈیا چولھے پر تھی اور اس میں پانی کم رہ گیا تھا کہ مغرب کا وقت آگیا۔ قادر بخش نے میاں عبداللہ سے کہا کہ ذرا خیال رکھنا میں نماز کی تیاری کرلوں، اذان ہوئی میاں عبداللہ نے آگ چولھے سے باہر نکال دی اور خود بھی نماز میں شریک ہوگئے۔ اس اثناء میں گوشت کو داغ لگ گیا، قادر بخش نماز سے فارغ ہوکر آیا تو داغی بوٹیاں الگ کیں، شوربا پک کر سید صاحب کے سامنے آیا تو اس میں جلنے کی بو باقی تھی۔ آپ نے پوچھا: آج کیسا پکایا کہ داغ کھا گیا، قادر بخش نے کہا کہ میں نماز کے لئے اٹھا اور میاں عبداللہ سے کہا کہ ہنڈیا کا خیال رکھنا، وہ بھی نماز کیلئے چلے گئے اور ہنڈیا چولھے سے نہ اُتاری، اس طرح داغ لگ گیا۔ آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ آپ اس کے

---

(۱) منظورہ ص: ۸۴۷

سپرد کر گئے، اس "مردود" نے خبر نہ لی اور گوشت کھانے کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ آپ نے دال سے روٹی کھائی۔

انتباہ اور معافی

اس موقع پر میاں جی نظام الدین چشتی، قاضی علاؤالدین، مولوی وارث علی، مولوی امام الدین، حافظ صابر وغیرہ موجود تھے۔ سب چپ رہے، لیکن عشاء کی نماز کے لئے نکلے تو آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت کی زبان سے عادت شریف کے خلاف نادانستہ سخت لفظ نکل گیا، اس کی اطلاع آپ کو ضرور کرنی چاہئے۔ آپ خود کئی مرتبہ فرما چکے ہیں کہ میں بشر ہوں، اگر کسی وقت کچھ بے جا اور خلاف شریعت بات میری زبان سے صادر ہو تو ضرور مجھے آگاہ کرنا، ورنہ قیامت کے روز سب کا دامن پکڑوں گا۔

نماز سے فارغ ہو کر ڈیرے پر آئے تو میاں جی نظام الدین چشتی نے یاد دلایا کہ آپ نے میاں عبداللہ کو آج "مردود" کہا، یہ کلام کسی مسلمان کو کہنا کیسا ہے؟ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا، پھر کہا کہ یہ لفظ کسی مسلمان کو نہ کہنا چاہئے۔ میری زبان سے بے اختیاری میں نکل گیا، سخت قصور ہوا۔ پھر آپ نے میاں عبداللہ کو بلایا اور پاس بٹھا کر کہا کہ بھائی ہم آپ کے قصور وار ہیں، غصے میں نادانستہ سخت لفظ زبان سے نکل گیا، اللہ معاف کر دیجئے۔ میاں عبداللہ کو ذرا اونچا سنائی دیتا تھا، اس نے سمجھا کہ شام والے واقعہ کا ذکر ہے۔ بولا: حضرت! آپ کا سالن مجھ سے جل گیا ہے، سخت نادم ہوں، مجھے معاف فرما دیجئے۔ سید صاحب نے بلند آواز سے دوبارہ کہا کہ آپ کی کچھ خطا نہیں، خطا میری ہے، مجھے معاف کر دو۔ میاں عبداللہ نے سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں نے معاف کیا، آپ میرے لئے دعا فرمائیے، خدا مجھے معاف کرے۔ سید صاحب نے پھر بہ آواز بلند فرمایا کہ بھائیو! میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں، اس کے بعد دیر تک وعظ فرماتے رہے، مولانا شاہ اسماعیل آئے تو خود پورا واقعہ اور اپنے معافی مانگنے کا حال انہیں سنایا۔

پچیسواں باب:

جنگِ مایار (۱)

میدانِ جنگ

سید صاحب اس وجہ سے گڑھی امان زئی کو چھوڑ کر تورو پہنچے تھے کہ درانیوں کا رخ مردان کی طرف تھا اور وہ لڑائی پر تلے ہوئے نظر آتے تھے۔ تورو مردان سے چار میل جنوب میں ہوگا، دونوں کے عین وسط میں مایار ہے، جس کی مغربی سمت کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی، لہٰذا یہ مایار کی جنگ کہلائی۔ بعض اصحاب نے اسے ضلع تورو کی جنگ کہا۔(۱) یقیناً اس لئے کہ مایار کے مقابلے میں تورو زیادہ مشہور و ممتاز مقام تھا، اور میدانِ جنگ سے قریب واقع تھا، یا اس لئے کہ سید صاحب نے جنگِ مایار کے لئے تورو کو بوجہ قرب مرکز بنایا تھا۔

سید صاحب خود تو غازیوں کے بڑے جتھے کیساتھ تورو میں مقیم ہوئے قندھاریوں اور ننگرہاریوں کی ایک جماعت کو گڑھی مایار میں بٹھا دیا، درانی اگر ہوتی مردان سے تورو پر پیش قدمی کرتے تو مایار کے غازی انہیں روک سکتے تھے، جا بجا پہروں کا انتظام بھی کر دیا۔

پہلی جھڑپ

مولانا شاہ اسماعیل کے پہنچنے سے دوسرے دن سید صاحب کے طلایہ گرد سواروں نے اطلاع دی کہ درانیوں کی فوج گڑھی مایار پر حملے کے ارادے سے نکلی ہے، سید

---

(۱) وصایائے نواب وزیر الدولہ مرحوم حصہ دوم ص: ۱۷

صاحب اس وقت مسجد میں بیٹھے ہوئے فرما رہے تھے:

> "اللہ تعالیٰ کا کارخانہ دیکھیے، ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے کہ مسلمانوں کو متفق کر کے کافروں سے جنگ کریں، بڑے افسوس کی جگہ ہے کہ کفار تو درکنار یہ مسلمان ہی ہمارے مخالف اور دشمن جانی بن گئے اور ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم تو ہرگز نہیں چاہتے کہ ان سے لڑیں۔ چنانچہ سلطان محمد خاں کو بارہا سمجھایا، لیکن نفس و شیطان نے اس کو شر و فساد پر اس درجہ آمادہ کر دیا کہ کچھ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ خیر مشیت اگر یونہی ہے تو ہم ناچار ہیں، جو کچھ ہوگا دیکھ لیں گے۔"

درانیوں کے نکلنے کی خبر سنتے ہی سید صاحب نے شتری نقارہ بجا کر کوچ کا حکم دے دیا۔ میدان میں پہنچے تو خضر خاں مایار سے یہ خبر لایا کہ درانیوں نے کچھ آدمی بھیج کر گڑھی پر گولیاں چلوائی تھیں، جب گڑھی سے جواب میں باڑھیں ماری گئیں تو درانی واپس چلے گئے۔ سید صاحب دیر تک میدان میں ٹھہرے رہے کہ ممکن ہے درانیوں کی مراجعت جنگی چال پر مبنی ہو اور بے خبر پا کر وہ دوبارہ حملہ کر دیں، جب یقینی طور پر اطلاع مل گئی کہ فوری حملے کا کوئی اندیشہ نہیں تو سید صاحب پہروں کا انتظام کر کے تورو چلے آئے۔

صبح جنگ

آپ نے حکم دے دیا تھا کہ پیادوں اور سواروں میں سے باری باری آدھے سوئیں اور آدھے جاگتے رہیں۔ اس حکم پر پورے اہتمام سے عمل ہوا۔ دوسرے روز نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد سید صاحب نے ننگے سر ہو کر عاجزی سے دعا کی۔ پھر غازی کھانا پکانے میں لگ گئے، عین اس حالت میں ملا لعل محمد قندھاری کے ایک آدمی نے یہ خبر پہنچائی کہ درانی فوج میں کوچ کا پہلا نقارہ بج چکا ہے، اس کے پیچھے مایار سے ایک اور آدمی آ گیا کہ درانی فوج میں دوسرا نقارہ بھی بج چکا ہے۔ غازی کھانے سے بے پروا ہو کر فوراً تیار

ہو گئے، اس وقت سید صاحب کے پاس مندرجہ ذیل ملکی خوانین و علماء موجود تھے:

۱۔ فتح خاں (پنجتار) ۲۔ منصور خاں (گھڑیال) ۳۔ آنند خاں (شیوہ)
۴۔ مشکار خاں (شیوہ) ۵۔ اسماعیل خاں (کھلابٹ) ۶۔ سرور خاں (امان زئی)
۷۔ خواص خاں (اکوڑہ خٹک) ۸۔ شہباز خاں (اکوڑہ خٹک برادر زادہ خواص خاں)
۹۔ فتح خاں (زیدہ) ۱۰۔ دلیل خاں (تورو) ۱۱۔ نسیم خاں (لونڈخوڑ) ۱۲۔ قاضی
سید امیر (کوٹھا) ۱۳۔ ملا بہاء الدین (ٹوپی) ۱۴۔ ملا باقی (ڈاگئی)۔

فریقین کی جنگی قوت

میں جس حد تک تحقیق کر سکا ہوں درانی فوج اس وقت بارہ ہزار تھی۔ چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار۔ ان کے پاس دو بڑی اور چار چھوٹی توپیں تھیں، سید صاحب کے پاس غازیوں کے علاوہ ملکی آدمی بھی تھے، ان سب کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نہ تھی، سوار صرف پانسو تھے توپ کوئی نہ تھی، سید صاحب لڑنے کے خواہاں بھی نہ تھے اور انہیں لڑائی کا خیال بھی نہ تھا۔ جب لڑائی ناگزیر ہو گئی تو امب کے محاذ سے توپیں اٹھوا کر لانے کا کوئی موقع ہی نہ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید صاحب نے اس امر کو مشرقی خطِ دفاع کی مصلحتوں کے خلاف سمجھا ہو۔(۱)

مایار اور تورو کے درمیان نالہ بہتا ہے جس کا نام ”جھلپانی“ ہے۔ سید صاحب نے پیادوں کی صف بندی شروع میں کر دی تھی، نالہ عبور کرتے وقت صف بندی قائم نہ رہ

---

(۱) ”وقائع“ میں ہے کہ درانی فوج تخمیناً بیس ہزار تھی اور سید صاحب کے پاس ملکیوں سمیت بارہ ہزار آدمی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مبالغہ آمیز شنید یا سرسری تخمینہ ہے، اس کے مقابلے میں مجھے ”منظورہ“ کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ”وقائع“ میں یہ بھی ہے کہ مایار کی طرف بڑھتے ہی توپوں کے گولے آنے لگے تو اکثر ملکی ادھر ادھر چھپ گئے اور سید صاحب کے ساتھ تخمیناً دو ہزار آدمی رہ گئے۔ خوانین نے ایک لمحے کے لئے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ حلیم نے لکھا ہے کہ پیادے پانسو تھے اور سب کے سب ہندوستانی تھے۔ سوار پندرہ سو تھے، اور ان میں زیادہ ملکی تھے۔ یہ بیان بھی صحیح نہیں۔

سکی۔ پانی کمر تک آیا، دوسرے کنارے پر پہنچ کر صفیں پھر درست کر لی گئیں۔ تین صفیں تھیں، اگلی اور پچھلی صف میں ہندوستانی غازی تھے، بیچ کی صف میں ملکی تھے۔ سواروں کو پیادوں کی صفوں کے بائیں جانب پیچھے رکھا تھا، ان سے آگے شاہین داروں کا جیش تھا، جس کے سر عسکر شیخ عبداللہ رام پوری تھے۔ سواروں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ جب تک حکم نہ ہو قطعاً حملہ نہ کریں۔ قندھاری اور ننگر ہاری یا تو مایار میں تھے، یا مچھلپانی کے کنارے جا بجا پہروں پر۔ غازیوں نے پیش قدمی کی تو ندی والے غازی بھی ساتھ مل گئے ہوں گے۔

کالے خاں شمس آبادی

شمس آباد مئو کے کالے خاں ایک نہایت مخلص غازی تھے، کئی لڑائیوں میں شریک رہے، چھتر بائی پر جو حملہ حافظ عبداللطیف نے بطور خود کرادیا تھا، اس میں بھی شامل تھے۔ یاد ہوگا کہ اس حملے میں سیڑھی بھی استعمال کی گئی تھی جو چھوٹی تھی، اتفاق سے جو غازی اس سیڑھی پر سب سے پہلے چڑھا اس کا قد چھوٹا تھا۔ اول سیڑھی چھوٹی، دوسرے غازی کا قد چھوٹا، چھتر بائی کی دیوار تک پہنچنا مشکل ہوگیا اور حملہ ناکام رہا۔ کالے خاں خوب لمبے قد کے تھے، انہیں خیال ہوا کہ اگر میں پہلے چڑھتا تو ہاتھ بڑھا کر منڈیر پکڑ لیتا اور میرے چڑھ جانے کے بعد دوسرے غازیوں کے لئے اوپر جانے کی کوئی صورت نکل آتی۔ بس اسی واقعہ سے دل برداشتہ ہوکر واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ غازیوں نے بھی سمجھایا، سید صاحب نے بھی نصیحت فرمائی، کالے خاں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

لاہور یا امرتسر میں ان کا ایک پرانا رفیق ملا، اس نے سارا قصہ سن کر کہا کہ ہم تو سید صاحب کے پاس پہنچنے کیلئے دعائیں مانگ رہے ہیں، تم بڑے کم نصیب ہو کہ انہیں چھوڑ کر چلے آئے۔ کالے خاں پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً ایک یابو خریدا اور واپس ہوگئے، سید صاحب امب سے پنجتار آگئے تھے کہ کالے خاں بھی پہنچ گئے۔ جاتے ہی عرض کیا کہ یابو

کسی بھائی کو دے دیجیے، میں سارا وقت آپ ہی کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے ان سے وعدہ فرمایا کہ جنگ ہوئی تو گھوڑا دوں گا، چنانچہ جنگِ مایار کے دن عبداللہ والیا کا گھوڑا کالے خاں کو دے دیا۔ انھوں نے رکاب میں پاؤں رکھا تو بولے کہ ضرورت پڑی تو اپنا سر بھی دشمن کی توپ کے منہ میں دے دوں گا۔

پیادوں اور سواروں میں ادل بدل

مولوی فتح علی سواروں میں شامل تھے، اچانک انہیں خیال آیا کہ مقابلہ بڑا سخت ہے، خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں پیادوں میں شامل ہو جاؤں تاکہ سید صاحب کے پاس رہوں، چنانچہ فوراً خدمت والا میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں سواری کے فن میں زیادہ مشاق نہیں، میرا گھوڑا کسی ایسے بھائی کو دے دیجیے جو میدان جنگ میں اس سے بہتر کام لے سکے اور ساتھ ہی میرے بھیلے دار سید اسمٰعیل رائے بریلوی سے فرما دیجیے۔ سید صاحب نے مولوی فتح علی کی درخواست منظور فرمائی، پھر سب غازیوں کو حکم دے دیا کہ جو بھائی سواری میں زیادہ طاق نہ ہو، وہ اپنا گھوڑا دوسرے کو دے دے، چنانچہ فتح علی عظیم آبادی کے علاوہ، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، مولوی قمرالدین عظیم آبادی، مولوی عثمان علی عظیم آبادی اور مولوی مدد علی غازی پوری نے گھوڑے چھوڑ دیے۔ ان کے گھوڑے، بہادر خاں بناری، شمشیر خاں بناری، حسن خاں بنارسی، دین محمد عظیم آبادی اور عبداللہ خاں (وطن معلوم نہیں) کو دیدیے گئے۔

سید صاحب کا لباس

سید صاحب نے اس روز جو لباس زیب بر کیا اور جو ہتھیار لگائے ان کی تفصیل راویوں نے یہ بتائی ہے: چندیری کی سفید دستار، بادامی گمٹی کا سفید پاجامہ، بہت باریک چکن کا دوہرا انگرکھا، کمر میں سفید پٹکا، اس کے اوپر سرخ کناروں اور سیاہ دھاریوں کی

پشاوری لنگی۔ لنگی کے سوا تمام پارچے شیخ غلام علی الہ بادی کے نذر کیے ہوئے تھے، وہ وقتاً فوقتاً سید صاحب کے لئے خاص جوڑے تیار کرا کر کے بھیجتے رہتے تھے، تنچوں کی ہشت پہلو ولایتی جوڑی، فولادی چھری، جس کا دستہ شیر ماہی کا تھا اور میان **کیمختی** ساتھ لی، آپ کے ہمراہ دونوں بازوؤں پر آپ کے دو رفل بردار تھے، ایک حافظ صابر تھانوی، دوسرا اشرف الدین بنگالی۔ ایک ولایتی رفل تھوخان قندھاری نے لکھنؤ میں بطور نذر پیش کی تھی، دوسری رفل آپ عرب سے خرید کر لائے تھے۔

جنگ کا آغاز

درانی ہوتی سے نکلے تو انہوں نے گذرگاہ عام پر ایک جگہ دائیں بائیں دو نیزے گاڑے اور دروازہ سا بنا لیا۔ بیچ میں قرآن شریف لٹکا دیا، تمام پیادوں اور سواروں کو اس کے نیچے سے گزارا۔ یہ گویا ایک قسم کا حلف تھا کہ وہ جنگ سے منہ نہ موڑیں گے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے سید صاحب کے غازیوں پر توپوں سے گولوں کی بارش کریں، اس کے ساتھ ساتھ پیادے گڑھی مایار پر حملہ کر دیں، اور سوار غازیوں کے جیوش کو درہم برہم کر ڈالیں۔ سید صاحب نے ٹھپونی سے گذر کر صف بندی کی، آگے بڑھے تو درانی توپوں کے گولے پے بہ پے آرہے تھے، کالے خاں شمس آبادی سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھے، سب سے پہلے سقائے لشکر اسلام شہید ہوا، جو ندی سے مشکیزے میں پانی بھر بھر کر غازیوں کو پلاتا تھا۔

علاقہ میدانی تھا اور چھپنے یا مورچہ پکڑنے کی کوئی جگہ نہ تھی، اس اثناء میں ایک گولہ آیا اور کالے خاں سے تھوڑے فاصلے پر گرا۔ پھر اچھلا اور بہادر غازی کے پہلو میں لگا۔ ان کے مہلک زخم لگا۔ سید صاحب نے سنا تو فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ انہیں اٹھا کر مایار پہنچا دیا جائے۔

قلندر کابلی بھی ساتھ تھا۔ وہ جب خوش ہوتا تو بڑی دلکش لے میں "مرحبا سید مکی مدنی العربی" گایا کرتا تھا۔ صفوں میں سے چار قدم آگے اچھلتا کودتا اور گاتا جا رہا تھا، ایک گولہ اس کے قریب آ کر گرا، گرد و غبار کا ایسا طوفان اُٹھا کہ قلندر نظروں سے اوجھل ہو گیا، سب سمجھے کہ اس نے شہادت پائی۔ غبار چھٹا تو کیا دیکھتے ہیں کہ قلندر دلق کا ایک سرا پکڑے بے تکلفی سے سر کے گرد گھما رہا ہے اور وفورِ مسرت سے ناچ رہا ہے۔ مایار تک پہنچتے پہنچتے چند غازی شہید ہوئے۔

رجز خوانی

دو غازی "رجز خوانی" کر رہے تھے: ایک امان اللہ خاں ملیح آبادی، دوسرے شیخ ریاست علی موہانی۔ امان اللہ اگرچہ خاصے سن رسیدہ تھے لیکن ہمت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بزدل بھی انکی باتیں سن سن کر شیر دل بن جاتے، انکی لے بڑی پر تاثیر تھی شیخ ریاست علی بھی بڑے خوش گلو تھے، مولوی خرم علی بلہوری کا منظوم جہادیہ پڑھتے جا رہے تھے:

جسکے پیروں پہ گرے گرد صف جنگ جہاد
وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر تو حدیث نبوی کو سن لے
باغ فردوس ہے تلواروں کے سائے کے تلے
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر
آج جو اپنی خوشی جان خدا کو دو گے
پھر تو کل شوق سے جنت کے مزے لوٹو گے(۱)

"منظورہ" کا بیان

اسی طرح غازی مایار کے باغ تک پہنچ گئے جو غالباً بستی کے جنوب مشرق میں تھا،

---

(۱) مولوی خرم علی نے فضائل جہاد کی آیات و احادیث فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بہ طریق مثنوی نظم کر دی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظمیں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ روایتوں میں اردو نظم کے پڑھے جانے کی تصریح صرف جنگ مایار کے ذکر میں ہوئی ہے، میں نے اس باب کے آخر میں جہادیہ (اردو) کو بطور ضمیمہ درج کر دیا ہے۔

اس کے بعد جنگ کی تفصیلات کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے۔ ”منظورہ“ کا بیان ہے کہ پیادوں کی صفوں میں صرف سید صاحب گھوڑے پر سوار تھے، ایک غازی نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور ادب سے عرض کیا کہ یا تو گھوڑے سے اُتر جائیے۔ آپ سب میں نمایاں ہیں مبادا دشمن تاک کر آپ پر گولے پھینکے۔ سید صاحب فوراً اتر گئے اور گھوڑا ایک غازی کو دے کر سواروں میں شامل ہونے کا حکم دے دیا۔ پھر فرمایا کہ سب سے پہلے توپوں پر قبضہ کرنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے دوڑ کر توپوں کے مقام پر پہنچنا مناسب نہیں۔ دوڑنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ صف بندی قائم رکھتے ہوئے تیز پیش قدمی لازم ہے۔

جب توپیں ایک گولی کے فاصلے پر رہ گئیں تو ایک گولہ غازیوں کے عین سامنے گرا، اس سے میاں جی محی الدین کی ایڑی زخمی ہو گئی، اسی زخم کے باعث وہ کچھ مدت بعد پنجتار میں فوت ہوئے۔ سید صاحب تکبیر پڑھتے ہوئے بدستور آگے بڑھتے گئے، صفوں کا نظم بھی باقی رہا، ایک گولہ صفوں میں گرا جس سے تین غازی شہید ہوئے۔ اس اثناء میں ایک توپ کے پائے ٹوٹ گئے اور وہ چرخ سے نیچے گر پڑی۔ غازی قریب پہنچ گئے تو درانی توپچی بھاگ نکلے، غازیوں نے توپوں پر قبضہ کر لیا تو درانی سواروں نے شدید حملہ کر دیا۔ پھر پے بہ پے ان کے کئی گروہ آئے لیکن تھوڑی دیر میں سب درہم برہم ہو کر بھاگ گئے۔ راوی کہتا ہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مکھیاں تھیں، جو بار بار شیروں پر گرتی تھیں اور غائب ہو جاتی تھیں۔ (۱)

---

(۱) معمول کے مطابق سید صاحب نے جنگ چھڑنے سے پیشتر فرمایا تھا کہ جس بھائی کو سورۂ قریش یاد ہو گیارہ مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، نیز یہ دعا پڑھے: اللّٰھم اھزمھم وزلزل اقدامھم وشتت شملھم وفرّق فی جمعھم وخرّب بنیانھم وخلعھم اخذ عزیز مقتدر (یہ دعا سید صاحب ہر نماز کے بعد بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے)۔

''وقائع'' کا بیان

''وقائع'' کا بیان زیادہ مفصل اور واضح ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ درانی فوج کے چار غول تھے: ایک پیادوں کا اور تین سواروں کے۔ کالے خاں کے زخمی ہونے کے بعد سید صاحب نے ننگے سر ہو کر بہ کمال عجز و زاری جناب باری میں دعاء کی کہ الٰہی! ہم عاجز اور ضعیف بندے ہیں۔ تیرے سوا اور کوئی حامی و مددگار نہیں جو ہم کو بچائے۔ ہم نے بہتیرا ان کو سمجھایا کہ ہم مسلمانوں سے نہ لڑو مگر وہ نہ مانے، تو دانا و بینا ہے۔ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اگر تیرے علم میں ہم حق پر ہوں تو ہم ضعیفوں کو فتح یاب کر اور اگر وہ حق پر ہوں تو ان کو فیروز مندی عطا فرما۔

اس اثناء میں سواروں کا ایک غول باگیں اٹھائے تیزی سے آیا، سب کی زبان پر تھا: ''سید کجاست؟ سید کجاست؟'' (سید کہاں ہے؟ سید کہاں ہے؟) سید صاحب کا حکم تھا کہ کوئی بھائی ہماری اجازت کے بغیر بندوق نہ چلائے۔ سوار جب چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو سید صاحب نے رفل اٹھائی اور بلند آواز سے تکبیر کہہ کر سر کی، ساتھ ہی غازیوں نے باڑھ ماری، پھر تو انہیں بھرماریوں پر دھر لیا۔ قرابین چی قرابینیں مار رہے تھے، بندوقچی بندوق، تلواروں اور گنڈاسوں والے اپنے ہتھیاروں سے کام لے رہے تھے۔ درانی سوار لوٹے تو سید صاحب نے فرمایا کہ اب ہمارے سوار تعاقب کریں لیکن سید صاحب کے سوار پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے۔

سواروں کا انتشار

درانی سواروں نے حملہ کیا تو چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سید صاحب غازیوں سمیت ان کے نرغے میں آ گئے ہیں۔ اس وقت حاجی عبدالرحیم خاں، جو سید صاحب کے خاص جاں نثاروں میں سے تھے، بے تاب ہو گئے۔ آس پاس کے رفیقوں سے کہا کہ اگر حضرت نہ رہے تو ہماری زندگی کس کام آئے

گی۔ آؤ ان پر دائیں جانب سے حملہ کریں۔ یہ کہتے ہی باگیں اٹھا کر سرپٹ چل دیے۔ آس پاس کے سوار بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

رسالدار عبدالحمید خاں نے دیکھا تو سمجھے کہ حملے کا حکم ہو گیا، چنانچہ وہ بھی پورے رسالے کو لے کر بڑھے، ان کا حملہ بڑا سخت تھا، لیکن سوار بکھر گئے۔ بعض اکا دکا دشمنوں میں گھر کر شہید یا زخمی ہوئے، بعض پیچھے ہٹتے ہٹتے دور تک نکل گئے۔ سواروں میں سے ارباب بہرام خاں اور فتح خاں پنجتاری اپنے آدمیوں سمیت جگہ پر جمے رہے، انہوں نے سید صاحب کے حکم کے مطابق حملہ کرنا چاہا لیکن چونکہ تعداد میں بہت کم تھے اس لئے انہیں روک دیا گیا۔

توپوں پر یورش

اس موقع پر مولانا شاہ اسماعیل نے شیخ ولی محمد سے کہا کہ اب توپوں پر قبضہ کرنا چاہیے، چنانچہ وہ ڈیڑھ سو غازیوں کو لے کر بھگے والے سواروں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اس اثناء میں توپچی اپنے سنبے لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مولانا نے توپوں پر قبضہ کر لیا۔ نواب خاں لنتری کھتے والے کے پاس ایک لٹھ سنبے جیسا تھا، اسے لے کر توپ بھری، شیر محمد خاں سے توڑا لے کر درانیوں پر داغی، چار مرتبہ فائر کیے تو درانی منتشر ہو گئے۔ پھر سید صاحب نے مولانا کو اپنے پاس بلایا، مولانا توپیں کھینچتے ہوئے سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

درانیوں کا دوسرا حملہ

درانی سواروں کا ایک غول تتر بتر ہو چکا تھا، مولانا اور شیخ ولی محمد توپوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اس اثناء میں درانیوں کے دوسرے غول نے حملہ کر دیا، وہ بھی پہلے غول کی طرح ''سید کجاست؟'' ''سید کجاست؟'' کہتے ہوئے آئے۔ سید صاحب کے پاس اس وقت زیادہ سے زیادہ پانسو غازی ہوں گے، آپ کے رفل بردار باری باری بندوقیں بھر

بھر کر دے رہے تھے اور آپ داہنے بازو والے کی بندوق دائیں جانب اور بائیں بازو والے کی بائیں جانب پر رکھ کر چلاتے جاتے تھے۔ ہر فائر کے بعد فرماتے: ''سید ہمیں است''۔ تھوڑی دیر میں یہ غول بھی بکھر گیا اور میدان صاف ہو گیا، کچھ غازی انکے تعاقب میں ادھر ادھر نکل گئے، سید صاحب کے پاس صرف پچاس ساٹھ کی جمعیت رہ گئی۔

تیسرا حملہ

اس اثناء میں چھ سات سو سواروں کا ایک اور ہلہ آ گیا۔ سید صاحب دوسری طرف مشغول تھے، ایک غازی نے خبردار کرنے کے لئے پکار کر کہا: حضرت ادھر سے ہلہ آرہا ہے۔ دوسرے غازیوں نے روک دیا کہ حضرت کا ذکر نہ کرو، دشمن کو خبر ہو جائے گی، اس غول کو بھی ناکام و نامراد بھاگنا پڑا۔ جب سارا درانی لشکر بندوقوں کی زد سے باہر نکل گیا تو آتش باری موقوف کی۔ پہلے حملے چونکہ بڑے بڑے غولوں نے کئے تھے، اس لئے گرد وغبار کی وجہ سے فضاء پر تاریکی سی چھا جاتی رہی۔ تیسرے حملے کے سوار چونکہ کم تھے، اس لئے غبار زیادہ نہ اڑا۔ سید صاحب کی ہر گولی سے سوار گرتا اور گھوڑا بھاگ جاتا۔

آخری حملے کے متعلق ''منظورہ'' کا بیان یہ ہے کہ درانیوں کا ایک رسالہ غازیوں کے سواروں کا تعاقب کرتا ہوا تورو کی طرف نکل گیا، وہ واپس ہوا تو اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ لڑائی کا نقشہ منقلب ہو چکا ہے۔ وہ غازیوں کو اپنے آدمی سمجھتے ہوئے بے تکلف چلے آئے، قریب پہنچے اور غلط فہمی دور ہوئی تو پیچھے ہٹے۔ غازیوں نے ان پر حملہ کر دیا، توپیں آ گئیں تو سید صاحب نے خود شست دیکھ کر چند فائر کرائے، ان کی وجہ سے بھی درانی خائف ہو کر جلد بھاگ گئے۔

مولانا خطرے میں

مولانا شاہ اسماعیل کی انگلی پر جب سے سنگباری میں زخم لگا تھا وہ جلد جلد بندوق

بھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس حملے میں بھی کئی درانی سواروں کو انہوں نے مار گرایا، پھر ایک سوار ان کے بالکل قریب آ گیا، وہ بندوق بھر نہ سکے۔ خود بعد میں فرماتے تھے کہ شہادت کا یقین ہو گیا۔ اس اثناء میں حافظ وجیہ الدین پھلتی کی نظر پڑی، انہوں نے فوراً سوار پر بندوق سر کی وہ گولی لگتے ہی گرا، اس طرح مولانا کی جان بچی۔ اگر دو چار لمحے کی بھی تاخیر جاتی تو مولانا کا زندہ بچنا بظاہر بالکل مشکل تھا۔

بہت سے درانی سوار مارے گئے ان میں اسرائیل خاں بھی تھا جو پہلوانی میں بہت مشہور مانا جاتا تھا اور نشانچی بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ یار محمد خاں کی شادی اس کی بہن سے ہوئی تھی، غالباً سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں کے ساتھ بھی رشتہ تھا۔ شیخ ولی محمد فرماتے تھے کہ اس پر میں نے اور بعض دوسرے غازیوں نے ایک دم گولیاں چلائیں، معلوم نہیں وہ کس کی گولی سے ہلاک ہوا۔

جنگ کا خاتمہ

میدان درانیوں سے صاف ہو چکا تھا، سلطان محمد خاں دن کے وقت لڑائی کا طلب گار تھا، اس کی یہ طلب پوری ہو چکی تھی۔ سید صاحب دیر تک میدان میں ٹھہرے رہے کہ مبادا درانی پھر پلٹ کر حملہ کر دیں۔ غازیوں نے صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا، گرمی کا موسم پیاس لگی ہوئی تھی، میدان میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا، اسی کا گرم پانی پیتے رہے، پھر مایار کی عورتیں گھڑوں اور بدھنوں میں پانی لے آئیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ اب درانی نہیں آئیں گے تو سید صاحب مایار کی مشرقی سمت کے باغ میں جا ٹھہرے، چہرے پر گرد وغبار کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ ارباب بہرام خاں نے رومال نکال کر پونچھنا چاہا تو فرمایا:

> ”خان بھائی! ابھی ٹھہر جائیے یہ غبار بڑی برکت والا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔“

جن غازیوں کے پاس روٹی تھی، انہوں نے روٹی کھائی، بعض نے ستو گھول کر پی

لئے۔ پھر مایار سے کچھ روٹیاں آگئیں۔

زخمیوں اور شہیدوں کے متعلق ہدایات

سید صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو حکم دیا کہ چند غازیوں کو ساتھ لے کر پورے میدان میں پھریں، زخمیوں کو پہلے مایار پھر تورو پہنچائیں اور شہیدوں کو دفنانے کا انتظام کریں۔ گھوڑے بھی زخمی پڑے تھے، سید صاحب نے فرمایا کہ جن گھوڑوں کے زخم زیادہ سخت نہ ہوں اور ان کا علاج ہو سکے، انہیں پکڑ کر تورو لے چلو۔ جن کا علاج نہ ہو سکتا ہو، انہیں ذبح کر ڈالو۔

مولوی مظہر علی صاحب نے پھر پھر کر تمام لاشیں جمع کرائیں، غازیوں کی کل اٹھائیس لاشیں انہیں ملیں، جنہیں دو قبروں میں دفن کرایا۔ اتنی لاشیں درانیوں کی تھیں، ان کی تدفین ملکیوں کے ہاتھ سے عمل میں آئی، زخمیوں کو تورو پہنچا دیا۔ سید صاحب نے ظہر کی نماز مایار کے باغ میں پڑھی۔ (۱) پھر آپ تورو تشریف لے گئے۔

بقیہ لاشیں

جو غازی مایار اور تورو کے درمیان شہید ہو کر گرے تھے ان کی لاشیں تورو پہنچا دی گئیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہیں زندہ اٹھایا گیا لیکن صرف رمق باقی تھی اور جلد جاں بحق ہو گئے، ان کے نام "منظورہ" کے بیان کے مطابق یہ ہیں:

۱۔ مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورو، جو ابتدا سے سید صاحب کے ساتھ رہے، بارہا سفارتی خدمات انجام دیں، ان کا سر تن سے الگ ہو چکا تھا۔

۲۔ شیخ عبدالحکیم پھلتی، ان کا سر بھی تن سے الگ تھا۔ بڑی مشکل سے سر ڈھونڈ کر لائے اور تن سے ملا دیا گیا۔

---

(۱) "منظورہ" میں ہے کہ میدان جنگ میں تالاب کے پاس پڑھی۔

۳۔ کریم بخش گھاٹم پوری، ادھر لڑائی شروع ہوگئی ادھر انہوں نے جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کیلئے روٹیاں پکا کر کمر میں باندھیں اور میدانِ جنگ کی طرف چلے۔ راستے میں درانی سوار سید صاحب کے سواروں سے لڑتے بھڑتے آرہے تھے، کریم بخش ان میں گھر گئے، کسی نے تلوار مار کر انہیں شہید کر ڈالا۔

۴۔ فضل الرحمٰن بردوانی۔

۵۔ لعل محمد: ان کا وطن معلوم نہ ہوسکا، یہ سید صاحب کے باورچی خانے سے متعلق تھے۔

۶۔ حاجی عبدالرحیم پھلتی والے۔

۷۔ شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی، یہ سخت زخمی ہوئے تھے، تورو لا کر ان کے زخم سیے گئے، کچھ باتیں بھی کیں، پانی بھی پیا، پھر جاں بحق ہوگئے۔ غازیوں میں سے یہی تھے جنہیں غسل بھی دیا گیا اور کفن بھی پہنایا گیا۔

۸۔ میر رستم علی چل گانوی، ان کو اٹھا کر لایا گیا تو سسک رہے تھے، راستے میں یا تورو پہنچ کر فوت ہوئے۔

۹۔ سید ابو محمد نصیر آبادی۔ ان کے مفصل حالات آگے چل کر بیان ہوں گے۔ دو اور صاحب تھے، جن کے نام راوی کو یاد نہ رہے۔

تورو میں تدفین

شاہ اسماعیل نے تورو سے باہر شمالی و مشرقی کونے میں ایک بڑی قبر کھدوائی اور تمام لاشوں کو مندرجہ ذیل ترتیب سے رکھا: سب سے آگے قبلہ رخ حاجی عبدالرحیم پھلتی والے، ان کے ساتھ سید ابو محمد نصیر آبادی، پھر میر رستم علی، شیخ عبدالحکیم پھلتی، فضل الرحمٰن مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورو، کریم بخش اور باقی حضرات۔ سب کے بعد عبدالرحمٰن رائے

بریلوی کی لاش رکھی گئی، جنہیں کفن بھی پہنایا گیا تھا۔ باقی تمام اصحاب کو بلا غسل و کفن ان کے لباسوں میں بہ دستور رکھ دیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کے عماموں کا ایک سرا لے کر منہ ڈھانپ دیے جائیں۔

بعد تدفین مولانا نے غازیوں سمیت دیر تک شہدا کے لیے مغفرت کی دعا کی، سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، ہر ایک کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ یہ بھائی تو جس مراد کو آئے تھے حاصل ہو گئی، خدا ہم لوگوں کو بھی اسی طرح شہادت نصیب کرے۔

دعاء

تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی، سید صاحب نے خود نماز پڑھائی، پھر بجز والحاح سے دعا کی کہ:

> اے ہمارے پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ یہ سب لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے اپنے گھر بار، خویش و تبار، اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ کر یہاں آئے تھے، اور صرف تیری راہ میں انہوں نے اپنی جانیں صرف کیں۔ ان کے گناہوں کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لے، فردوس میں جگہ دے اور ان سے راضی ہو۔ ہم جو چند ضعفا اور غربا تیرے عاجز بندے باقی ہیں، ان کو بھی اپنی رضامندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے سینوں میں شیطانی خطرات اور نفسانی وساوس خطور کرتے ہیں، ان کو دور کر دے۔ دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور رکھ۔ اپنے دین کو قوت اور ترقی بخش۔ جو لوگ اس دین کے دشمن اور بدخواہ ہیں، انہیں ذلیل و رسوا کر۔ جو مسلمان شریعت کے راہِ راست سے ہٹ کر بادیۂ ضلالت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں، انہیں ہدایت دے اور پکے مسلمان بنا دے، تا کہ اس کار خیر میں جان و مال اور اہل و عیال سے شریک ہوں۔

چھبیسواں باب:

جنگِ مایار (۲)

غازیوں کی شجاعت کے چند مناظر

جنگ مایار کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہو سکا، اسے گزشتہ باب میں ترتیب کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ لیکن بعض غازیوں کے ایثار و شجاعت کی کچھ تفصیلات بھی مختلف رواتیوں میں بیان ہوئی ہیں، جنہیں اس غرض سے پیش کرنا ضروری ہے کہ اس سے آپ کو سید صاحب کی شانِ تربیت اور درجۂ مردم گری کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔ یہ جاننے کا موقع مل جائے گا کہ اب سے صرف سوا سو سال پیشتر رائے بریلی کے ایک مسکین سید نے اس سرزمین سے انسانیت کے کیسے کیسے روشن چاند اور ستارے جمع کر کے رضائے خدائے قدوس کی راہ میں کھڑے کر دیے تھے۔ یہ بھی واضح ہو سکے گا کہ جہاد فی سبیل اللہ اتنا سہل اور آسان نہیں جتنا کہ آج کل کے مدعیانِ دین و سیاست نے سمجھ رکھا ہے، اور وقتاً فوقتاً تقریروں میں اس کا ذکر فرما کر سمجھ لیتے ہیں کہ وظیفہ ادا ہو گیا اور سامعین اللہ اکبر کے نعرے لگا کر بجا آوری فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔

کیا عجب ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنے والے خوش نصیبوں کی یہ چند داستانیں عبرت و تنبہ حقیقی کا دعوت نامہ بن جائیں۔ **وما ذالك على اللّٰه بعزيز.**

فذكر ان الذكرى تنفع المومنين۔

کالے خاں شمس آبادی

کالے خاں شمس آبادی کے حالات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یعنی ایک مرتبہ روٹھ کر چلے گئے، چونکہ فطرت سعید تھی، اس لئے راستے سے لوٹ آئے۔ مایار کی جنگ میں گھوڑا اڑا کر سب سے آگے نکل گئے۔ چھلا پانی سے گذرنے کے بعد غازیوں کی صفیں پھر پھر کر درست کر رہے تھے کہ گولہ لگا، بری طرح زخمی ہو کر گرے تو سید صاحب کے حکم سے انہیں مایار کی مسجد کے حجرے میں لے گئے۔ ان پر جانکنی کی حالت طاری تھی، لیکن جب لب کھلتے تو تیمارداروں سے پوچھتے: ''بھائیو! لڑائی کا کیا حال ہے؟'' درانیوں کے پہلے اور دوسرے حملے کے دوران میں انہیں بتایا گیا کہ ابھی جنگ جاری ہے اور فریقین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ یہ سن کر چپ رہے اور اللہ اللہ کہتے رہے۔

جب درانیوں کا آخری غول بھی شکست کھا کر میدان میں سے بھاگ نکلا اور بتایا گیا کہ بھائی کالے خاں! اللہ تعالیٰ نے حضرت کو فتح یاب کیا تو یہ بشارت سنتے ہی بولے: ''الحمد للہ''۔ بس ساتھ ہی دم نکل گیا۔ کتنی قابل رشک زندگی تھی، جس میں آخری سانس تک زبان پر خدا کا ذکر تھا اور دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہ تھی کہ راہِ حق کے غازیوں کی فتح کا مژدہ سن لیں، اور کتنی قابلِ رشک موت تھی کہ دم رضائے خدا میں پورا ہوا۔

راویوں نے لکھا ہے کہ شروع میں ٹھوڑی منڈاتے تھے، سید صاحب نے کبھی نہ ٹوکا اور عادت شریفہ یہی تھی کہ بات بات پر ٹوکتے نہ تھے، اور جزئیات میں لوگوں کو حسن تربیت سے پابند شریعت بناتے تھے۔ ایک روز کالے خاں نے ٹھوڑی منڈائی۔ اتفاق سے سید صاحب ان کے پاس سے گذرے، اچانک کالے خاں کی ٹھوڑی دست مبارک سے پکڑ کر فرمایا: خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔ کالے خاں چپ رہے، آٹھویں دن حجام خط بنانے کے لئے آیا تو اسے لوٹا دیا کہ اب میری ٹھوڑی کو حضرت کا ہاتھ لگ چکا ہے، تیرا ہاتھ نہ لگنا چاہئے۔

سید ابو محمد نصیر آبادی

سید ابو محمد سید صاحب کے ہم خاندان تھے، آپ کی پہلی بی بی سیدہ زہرہ سے قریبی رشتہ تھا۔ لشکر اسلام میں شامل ہونے کا حال ہم بہ سلسلہ سفر ہجرت بیان کر چکے ہیں، بڑے خوبرو جوان تھے۔ نصیر آباد کے بانکوں میں شمار ہوتے تھے۔ برسوں لکھنؤ میں اہل اللہ کیدان کی بٹالین میں ملازم رہے، سپہ گری کے علاوہ مختلف فنون میں طاق تھے، جنگ مایار کے لئے نکلنے لگے تو گھوڑا اتھان پر چھوڑ کر سید صاحب کے پاس پہنچے اور بولے:

> میاں صاحب(۱) جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، یہی سمجھتا رہا کہ آپ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں، آپ کو عروج ہوگا تو میرے لئے بھی ترقی اور بہبود کی صورت بنے گی، نہ میں خدا کے واسطے ساتھ رہا اور نہ ثواب جان کر کسی لڑائی میں شامل ہوا۔ اب میں اس فاسد خیال سے توبہ کرتا ہوں، رضائے باری تعالیٰ کیلئے از سر نو بیعت جہاد کیلئے حاضر ہوا ہوں، آپ مجھ سے بیعت لیں اور دعاء کریں کہ خدا اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔

سید صاحب نے بیعت لی اور دعاء کی، سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دعاء سے فراغت کے بعد سید ابو محمد نے سید صاحب سے مصافحہ کیا اور گھوڑے کی طرف چلے تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ بسم اللہ کہہ کر دایاں پاؤں رکاب میں رکھا تو بآوازِ بلند پکار کر کہا: بھائیو! گواہ رہنا، اب تک ہم صرف شان و شوکت اور خواہش کے لئے سوار ہوتے تھے۔ خدا کا اس میں کچھ واسطہ نہ تھا، مگر اس وقت ہم محض خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے بہ نیت جہاد سوار ہوتے ہیں۔

شہادت

چھیدا ان کے گھر کا آدمی تھا، وہ کہتا ہے کہ جب درانیوں نے ہمارے سواروں پر

---

(۱) سید ابو محمد ہی نہیں بلکہ خاندان کے تمام لوگ سید صاحب کو "میاں صاحب" ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

یورش کی اور ہمارے سوار پیچھے ہٹے تو سید ابو محمد بھی چلے، کچھ دور جا چکے تھے کہ میں درانی سواروں میں گھر گیا، گھبرا کر انہیں مدد کیلئے آواز دی، انہوں نے آواز سنتے ہی باگ موڑی اور آ کر درانی سواروں سے لڑنے لگے۔ میں موقع پا کر نکل گیا اور وہ لڑتے رہے، میں دور سے دیکھ رہا تھا، دو سواروں کو انہوں نے مارا، پھر خود بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے۔

قاضی گل احمد الدین پوٹھوواری کا بیان ہے کہ میں موضع شیوہ سے سوار ہو کر سید صاحب کے پاس تو رو جا رہا تھا، توپوں کی آواز سنی تو میں نے جانا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑائی میں شریک ہونے کی غرض سے گھوڑے کو ایڑ لگائی، مایار پہنچا تو درانی شکست کھا کر میدان سے جا چکے تھے۔ مولوی مظہر علی صاحب کو مجروحین و شہدا کی لاشیں اٹھوانے کا حکم ہوا، سید صاحب نے مجھے بھی فرمایا کہ مولوی صاحب کے ساتھ جاؤ۔ میں نے میدان میں پھرتے پھرتے ایک جگہ سید ابو محمد کو زخمی پڑے ہوئے دیکھا۔ زخم ایسے کاری کہ جان تو ان میں تھی، لیکن ہوش حواس بجا نہ تھے۔ میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا! ”سید ابو محمد! حضرت امیر المومنین کو فتح حاصل ہوئی۔“ وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور ”الحمد للہ“ ”الحمد للہ“ کہہ رہے تھے۔ مجھے کچھ جواب نہ دیا، میں نے ساتھیوں کو آواز دی، کمبل میں رکھ کر انہیں اٹھایا، کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔

عبد الرحمٰن دکنی

عبد الرحمٰن دکنی سواروں میں تھے، یہ اعلیٰ درجے کے پھکیت اور بھرمار تھے۔ جب سید صاحب کے سوار درانیوں کے ہجوم میں بکھر کر پیچھے ہٹے تو عبد الرحمٰن اپنی جگہ پر جمے ہوئے ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ کچھ دیر تک گھوڑے پر بیٹھے بندوق کے فائر کرتے رہے، پھر اتر بیٹھے اور پیدل ہو کر قواعد بھرماری سے بندوق مارنے لگے۔ آٹھ نو درانی سواروں نے انہیں نرغے میں لے لیا، آخر بہادر عبد الرحمن نے بندوق چھوڑ کر

تلوار سنبھال لی، تنہا نو دس سواروں کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے رہے کہ اکثر کو زخمی کیا اور خود محفوظ رہے۔ ایک درانی سوار نے تاک کر پیچھے سے نیزہ مارا، یہ گرے تو اس نے تلوار سے سر قلم کر ڈالا۔

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

شیخ محمد اسحاق پیدل تھے، ایک درانی سوار نیزہ تان کر آپ کی طرف بڑھا۔ نیزے کا رخ سینے پر تھا، شیخ دائیں جانب جھک گئے، نیزہ بائیں شانے پر پڑا اور انی ٹوٹ کر اندر رہ گئی۔ اس حالت میں بھی شیخ نے تلوار مار کر حملہ آور کا سر تن سے الگ کر دیا۔ پھر اور درانی آ گئے اور ہر طرف سے شیخ پر تلواریں پڑنے لگیں۔ ایک ضرب سے دستار کٹ گئی اور سر پر گہرا خط بن گیا، ایک اور وار سے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں، بے بس ہو کر شیخ نے اپنی رائفل سعدی خاں کو دے دی، تلوار ایک اور غازی کے حوالے کی جس کے پاس تبر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا، اور خود مایار کی طرف لوٹ پڑے۔ راستے میں دیکھا کہ میاں جی محی الدین کی ایڑی زخمی ہے اور وہ چلنے سے معذور ہیں، شیخ نے اپنے انگشت بریدہ ہاتھ کا سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور آہستہ آہستہ ساتھ لے کر چلے، تھوڑی دور گئے تھے، غش کھا کر گر پڑے، ہوش آیا تو پھر اٹھے اور میاں جی کو پہلے کی طرح سہارا دے کر ایک درخت کے سایے میں پہنچایا، پھر چلنے کی سکت نہ رہی اور لیٹ گئے۔

ارشادِ نبویؐ کی تصدیق

سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ ختم جنگ کے بعد میں ان کے پاس پہنچا تو سب سے پہلے یہ پوچھا کہ لڑائی کا نتیجہ کیا نکلا؟ میں نے فتح کا مژدہ سنایا تو بہت خوش ہوئے اور بولے: ”آؤ بھائی، گلے سے لگ جاؤ۔“

دیکھئے اس حالت بے چارگی میں بھی نہ اپنی تکلیف کا کوئی خیال تھا، نہ یہ خیال تھا

کہ بال بچوں کے لئے کوئی وصیت کر دیں۔ دل و دماغ پر صرف ایک آرزو چھائی ہوئی تھی کہ جس مقصد کے لئے گھربار چھوڑا، وہ پورا ہوا یا نہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد پھر بولے کہ بھائی حدیث نبویؐ برحق ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شہیدوں کے سکرات موت کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی کو چیونٹی کاٹے، میرا جسم شدید زخموں سے چور ہے، بائیں شانے میں نیزے کی انی ٹوٹی ہوئی ہے، سر پر گہرا زخم ہے، ہاتھ کی انگلیاں کٹ چکی ہیں، لیکن تکلیف اتنی ہے کہ جیسے انگلی میں کانٹا چبھ گیا ہو۔

شیخ امیر اللہ تھانوی

شیخ امیر اللہ تھانوی کی ران اور دایاں بازو بری طرح زخمی ہو چکے تھے، آپ نے خون آلود تلوار بائیں ہاتھ میں لے لی اور پھر پکڑ کر پوچھنے لگے کہ یہ کسے دوں؟ اسے دوں گا جو آج اس کا حق ادا کر سکے۔

تورو پہنچے اور زخموں کی مرہم پٹی ہونے لگی تو نور بخش جراح نے مزاحاً کہا: شیخ صاحب آپ ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ یہاں آئے تو کیا حاصل کیا، ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی، بتائیے اب نکسیر پھوٹی یا نہیں؟ فرمایا: ''الحمد للہ، اللہ تعالیٰ قبول کرے۔''

رسالدار عبدالحمید خاں

رسالدار عبدالحمید خاں کو بلا حکم حملے کی اجازت نہ تھی، جب حاجی عبدالرحیم خاں نے سید صاحب کے ساتھ محبت وعقیدت کے جوش میں خود حملہ کر دیا اور ان کے آس پاس کے سوار بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے پیچھے چلے تو مولوی احمد اللہ ناگپوری، محمد سعید خاں عظیم آبادی، قاضی مدنی وغیرہ جو رسالدار کے قریب کھڑے تھے، سمجھے کہ حملے کا حکم ہو چکا ہے، اس پر رسالدار نے بھی حملہ کر دیا۔ ان کے پاس دو گھوڑے تھے: ایک سبزہ رنگ، دوسرا

سمند۔ دونوں پر باری باری سوار ہوتے تھے۔

جنگِ مایار کے دن سمند کی باری تھی، جس طرف باگ اٹھا کر جاتے، صفوں کو چیر کر رکھ دیتے۔ پاس کے لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ بار بار کہتے تھے: کاش! آج سبزہ گھوڑے کی باری ہوتی تو دل کا ارمان نکل جاتا۔ تین چار مرتبہ ساتھیوں کو لے کر درانیوں میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے ان کی صفوں سے پار نکل گئے۔ رسالدار کے بھی کئی ہلکے سے زخم لگے، لیکن آپ نے کچھ خیال نہ کیا اور برابر حملے کرتے رہے۔ جب زخموں سے چور ہو گئے تو گھوڑے سے گر پڑے، جسم ذرا فربہ تھا، زرہ کی کڑیاں گوشت میں گھس گئی تھیں۔ راوی کا بیان ہے کہ انہیں میدان سے اٹھا کر مایار لائے تو جس کی نظر محبوب رسالدار پر پڑتی، بے اختیار اشکبار ہو جاتا، لیکن خود رسالدار بالکل صابر و شاکر تھا۔ ایک مرتبہ بھی تکلیف کا کوئی کلمہ زبان پر نہ آیا، پھر تورو میں وفات پائی۔ (۱)

سید موسیٰ

سید موسیٰ (جن کا دوسرا نام سید حسن مثنیٰ تھا) سید احمد علی شہید پھولڑہ کے صاحبزادے تھے۔ جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے، بہت غمگین رہتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں اور آشناؤں سے کہا کرتے تھے کہ اگر کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ بیچ کھیت کے مجھے دیکھ لینا، میں بھی لڑ کر شہید ہو جاؤں گا۔

سید صاحب کو بھی اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کی یہ کیفیت معلوم تھی۔ وہ سواروں میں تھے، جب لشکر تورو سے مایار کی طرف چلا تو سید صاحب نے سید موسیٰ سے فرمایا کہ اپنا گھوڑا کسی بھائی کو دے دو اور خود ہمارے ساتھ پیادوں میں رہو۔ عرض کیا کہ آپ مجھے

---

(۱) ایک روایت میں ہے کہ تورو سے انہیں پنجتار پہنچا دیا گیا تھا اور وہاں فوت ہوئے۔ سبز رنگ گھوڑے کو انہوں نے خوب سدھا رکھا تھا وہ برچھی، تلوار، بندوق پر خوب لگا ہوا تھا۔ سمند گھوڑا سید صاحب نے انہیں رسالدار بناتے وقت عطا کیا تھا، حملے کے وقت سبز رنگ گھوڑا ان کے سائیس کے پاس تھا، جس کا دم کالیا تھا۔

سواروں ہی میں رہنے دیں، میں رسالدار صاحب کے پاس رہوں گا۔ سید صاحب نے ان کی خواہش دیکھ کر اجازت دیدی۔ جب سواروں نے ہلّہ کیا تو یہ بھی ساتھ تھے، مردانگی سے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور خوب لڑے، آخر زخموں سے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے، کئی زخم سر میں لگے اور بے بس ہو کر گر گئے۔ خادے خاں قندھاری انہیں پشت پر اٹھا کر سید صاحب کے پاس لائے، انہیں جو غازی دیکھتا بے اختیار رو پڑتا۔

خادے خاں کا بیان

خادے خاں قندھاری کہتے ہیں کہ میں زخمیوں اور شہیدوں کو تلاش کر رہا تھا، ایک جگہ دور سے سنا کہ کوئی اللہ اللہ کہہ رہا ہے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو سید موسیٰ کو پایا، سر کے زخموں سے خون بہتے بہتے آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں نے کہا: ''اٹھا کر لے چلوں؟'' پوچھا: ''کون ہے اور فتح کس کی ہوئی؟'' میں نے نام بتایا اور عرض کیا کہ سید بادشاہ کو خدا نے فتح دی۔ یہ سن کر بولے: ''الحمد للہ'' اور کسی قدر ہوشیار بھی ہو گئے۔ ساتھ ہی کہا: ''لے چلو'' چنانچہ میں پشت پر سوار کر کے لے آیا، سید صاحب نے فرمایا کہ انہیں دیار کی مسجد کے حجرے میں لے جاؤ۔ احمد سندھی اور الٰہی بخش کوزپشت ان کے خاص رفیق تھے، انہیں تیمارداری کے لئے ساتھ بھیج دیا، پھر دوسرے زخمیوں کے ساتھ انہیں بھی تورو پہنچا دیا گیا۔

سید صاحب کے ارشادات

تورو میں سید صاحب شہید بھانجے کے بہادر جگر بند کو دیکھنے گئے تو فرمایا: یہ فرزند توفیق الٰہی سے بڑا بہادر نکلا، مالک حقیقی کا حق خوب ادا کیا۔ پھر سید موسیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> بیٹا! لکھنؤ میں دیکھا ہوگا کہ لوگ شیطان کے اکسانے سے فاحشہ عورتوں کے لئے یا کسی کے سامنے متکبرانہ کھانس کر یوں ہی لڑائی چھیڑ لیتے ہیں، اور اس

میں اپنے ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں، اس طرح ان کا ثمرہ دنیا میں حمیت جاہلیت اور عقبیٰ میں عذاب الیم ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں راہِ مولیٰ میں کام آئے، خدا نے تمہاری مساعیٔ جمیلہ کو مشکور فرمایا۔

اب اگر دیکھو کہ کوئی شخص خوش رفتار گھوڑے پر سوار، اسے دوڑاتا کداتا ہوا لے جا رہا ہے تو کبھی یہ حسرت دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بارگاہِ ربانی میں قبول ہوئے خوش نصیب ہیں وہ ہاتھ پاؤں جو رضائے مولا میں قربان ہوں اور اس ذات پاک کی خاطر کٹیں جو جہانوں کی پناہ گاہ ہے۔ اگر کسی کو شمشیر برہنہ کے ساتھ پٹہ بازی کرتے ہوئے دیکھو تو یہ غم دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں ہوتے تو ایسے ہی جوہر دکھاتا۔ تمہارے دست و پا کو بڑا رتبہ ملا، ان زخموں کے عوض میں ثواب عظیم حاصل ہوا۔ سالم ہاتھ پاؤں والے کو ہر روز مظنہ گناہ در پیش ہے، تمہارے جوارح کو پروردگار حکیم کی بارگاہ میں بہت شاندار اجر ملا۔ حضرت علی مرتضیٰ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کے بازو جنگ موتہ میں کٹ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بہشت بریں میں انہیں ذی الجناحین کے لقب سے مشرف فرمایا اور زمرد جنت سے دو بازو عطا کرکے طیور بہشت میں جگہ دے دی۔

سید موسیٰ کی شانِ صبر

سید موسیٰ نے صابرانہ عرض کیا: میں ہزار زبان سے اللہ کی رضا پر راضی اور شاکر ہوں۔ الحمدللہ کہ میری ہستی نیک ترین عبادت میں صرف ہوئی، خدا اسے قبول کرے، لیکن آپ سے ایک آرزو ہے:

> ہر روز خود تکلیف اٹھا کر اپنے جمال مبارک سے آنکھیں منور فرماتے رہیے۔ میں معذور ہو چکا ہوں، خود آپ کی مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس کے

سوا نہ مجھے کوئی رنج ہے اور نہ حسرت۔ (۱)

سبحان اللہ، آج سے صرف سو برس پیشتر انسانیت کے یہ بے بہا گوہر اسی سرزمین کی سطح پر موجود تھے۔ کون سی قوم ہے جو ایسے افراد کے وجود کو اپنے تاج عزت اور اکلیل عظمت کے لیے باعث ہزار افتخار جاننے میں تامل کرے گی؟ لیکن ہم میں سے سیکڑوں، ہزاروں اصحاب نے یہ پوری مدت ان فدا کارانِ حق کے خلاف طعن و ملامت کے نئے نئے خدنگ تیار کرنے میں بسر کردی: اِنَّ ھٰذا من اعاجیب الزّمن.

ایک ملکی غازی

ایک ملکی نوجوان چودہ پندرہ برس کا ہوگا، اس کے پاس نہ نیزہ تھا نہ تلوار اور نہ بندوق۔ سید صاحب نے کچھ گنڈاسے تیار کرائے تھے، جن کی نوکیں، ذرا خمدار تھیں، بڑے تیز تھے، ان میں لمبے دستے لگوا دیے تھے۔ جس غازی کو کوئی ہتھیار نہ مل سکتا، اسے گنڈاسے دیدیے جاتے۔ ملکی لوگ انھیں ''کفر چٹ'' کہتے تھے۔ جنگ مایار کے دن اس نوجوان کو بھی کفر چٹ مل گیا تھا۔ دشمن کا جو سوار قریب آتا وہ پورے زور سے کفر چٹ کا وار کرتا۔ ایک سوار کے کفر چٹ لگا تو اس کی خمدار نوک زرہ کی کڑی میں اٹک گئی، سوار بھاگا، تو جوان دونوں ہاتھوں سے دستہ پکڑے پیچھے پیچھے جارہا تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا: زما کفر چٹ یوڑ، زما کفر چٹ یوڑ (یعنی یہ شخص ہمارا کفر چٹ لئے جارہا ہے) یہ سن کر کئی غازیوں نے سوار پر بندوقیں سرکیں، وہ گرا تو نوجوان نے کفر چٹ مار کر اس کا سر الگ کردیا۔

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۸۷۳-۸۷۵

للّٰہیت

پھر آپ غازیوں کی للّٰہیت پر ایک نظر ڈالئے، صرف ساڑھے تین ہزار کے قافلۂ حق نے باوجود بے سروسامانی بارہ ہزار کے لشکر کو شکستِ فاش دی، جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھا۔ لیکن کسی شخص کے دل میں احساس تک نہ تھا کہ یہ ان کے اپنے کمالِ شجاعت کا نتیجہ ہے۔ سب یہی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قوت وقدرت سے زورآوروں پر فتح عطا کی، جو ملک وخزائن کے مالک تھے۔ اطمینانِ قلب کا یہ حال تھا کہ زدوخوردِ جنگ میں غازی اس طریق پر شریک ہوئے جیسے لوگ کسی کے ہاں دعوتِ طعام کے لئے جاتے ہیں۔ (۱)

مرہم پٹی

تورو پہنچ کر زخمیوں کی مرہم پٹی شروع ہوئی۔ نور بخش اور عبدالرحیم دونوں جراح موجود تھے، دوسرے آدمی انکی امداد کیلئے حاضر ہو گئے، لیکن زخمیوں کے زخم سینے، دوا پکانے اور لگانے میں آدھی رات بسر ہو گئی۔ خود سید جعفر علی نقوی نے چراغ پکڑ کر مولوی احمد اللہ ناگپوری اور شیخ محمد اسحاق کی مرہم پٹی کرائی۔ اکثر غازیوں نے سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا دن بھر کی تگاپو سے تھک کر چور ہو چکے تھے، کئی تورو پہنچ کر کھائے پئے بغیر ہی سو گئے۔

اس جنگ نے درانیوں پر اتنا ہراس طاری کر دیا تھا کہ بعد میں سید صاحب پشاور پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ بعض آدمی جو جنگِ مایار سے بچ کر آئے تھے، رات کو دو دو تین تین مرتبہ ڈر کر چونک اٹھتے تھے۔

---

(۱) ”منظورہ“ ص:۸۷۴-۸۷۵

﴿ ضمیمہ ﴾

رسالہ جہادیہ

اس نظم کے سلسلے میں شعریت کا چنداں خیال نہ رکھنا چاہیے، صرف شاعر کے جوشِ حمیت، حسن جذبات اور آرزوہائے ترقی اسلام کو دیکھنا چاہیے۔

بعد تحمید خدا، نعت رسولِ اکرمؐ
یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا، نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیٔ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا، اسے کرلو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانوں جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد، اگر ہو دیندار
جسکے پیروں پہ پڑے گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلد بریں ہوگیا واجب اُس پر
اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے
باغ فردوس ہے تلواروں کے سایے کے تلے
دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر
اور اگر مال بھی خرچا ولگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اسکے عوض سات ہزار
جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنادے اسباب
اسکو بھی مثل مجاہد کے خدا دے گا ثواب
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال
جو راہِ حق میں ہوے ٹکڑے، نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں، جنت میں خوشی کرتے ہیں
زندگی بھر کے گناہِ شہدا مٹتے ہیں
کیوں نہ ہو؟ راہِ خدا انکے تو سر کٹتے ہیں
فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں کچھ بھی خبر
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیِ جہاد　　چلو اب اسکی طرف، مت کرو گھر بار کو یاد
مال و اولاد کی جورو کی محبت چھوڑو　　رہِ مولیٰ میں خوش ہو کے شتابی دوڑو
مال و اولاد ترے قبر میں جانے کے نہیں　　تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کے نہیں
گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے　　اور گئے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے
دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے　　غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
پیشوا لوگ اسی طور نہ کرتے جو جہاد　　ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آباد
زورِ شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام　　سستی اگلے جو کہیں کرتے تو ہوتا گمنام
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے　　اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو　　سید احمد کو ملو جلد سے، کافر مارو(۱)
بارہ سو سال کے بعد ایسے ارادے والا　　ہوا پیدا ہے مسلمانو، کرو شکر خدا(۲)
تھے مسلمان پریشان بغیر از سردار　　ہوا سردار ہے از آلِ رسولِ مختار(۳)
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو　　وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو
حضرت مولوی اب طاق میں رکھ دیجئے کتاب　　لیجئے تلوار و میدان کو چل دیجئے شتاب
وقتِ جانبازی ہے تقریروں کو مت اب چھانٹو　　غیر شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو
ہادیٔ دین ہو تم، تم کو ہے سبقت لازم　　تم چلو گے تو بہت ساتھ چلیں گے خادم
اے گروہِ فقراء، نفس کشی کے استاد　　عملِ نفس کشی کون ہے بہتر ز جہاد

---

(۱) اس کے آگے ایک اور شعر دیکھا:

بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے　　حیف اس دولت بیدار سے محروم رہو گے

(۲) اس کے بعد ایک اور شعر بعض نسخوں میں دیکھا:

تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب　　شکر سب تو نے دیا اے مرے رب الارباب

(۳) اس سے آگے ایک اور شعر تھا:

یعنی اسباب لڑائی کو جو کچھ تھا درکار　　سب دیا تو نے ہمیں اور دیا پھر سردار

مت گھسو کونے میں اے پیر جی مانند چپا
چھوڑو اب چلہ کشی وقتِ جہاد آ پہنچا
اے جوانانِ اسد حملہ ورستم قوت
کام کس دن کو پھر آوے گی تمہاری جرأت
اُن کا سر کاٹ لیا یا کہ کٹا اپنا سر
دونوں صورت میں جو سمجھو تو تمہیں ہو بہتر
یعنی گر مار لیا ان کو تو پھر بن آئی
اور گئے مارے تو پھر خاص شہادت پائی
ایک دن تجھ سے یہ دنیا کا مزا چھوٹنے کا
لشکرِ موت ترا ملکِ بدن لوٹنے کا
دوستو جب تمھیں مرنا ہی مقرر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خدا
سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں
سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں
موت کا وقت معین ہے تو سن اے غافل
پھر بھلا موت سے ڈرنے سے تجھے کیا حاصل؟
جب تلک موت نہیں ہے تو نہیں مرتے ہیں
موت جب آئی تو گھر میں بھی نہیں بچتے ہیں
تم اگر ڈرتے ہو تکلیف سفر سے، نہ ڈرو
مرد ہو خطرہ و آلام کو دل سے کھو دو
جیسی عادت کرے انسان، سو ہو سکتا ہے
عیش و آرام کی عادت کو بھی کھو سکتا ہے
طمع دنیا کے لئے دیکھو ہزاروں یہ سپاہ
چھوڑ گھر سر کو کٹاتے ہیں، نہیں کرتے آہ
ہے عجب یہ کہ مسلمان بھی کہلاتے ہو
جھوٹے حیلے رہِ اللہ میں بتلاتے ہو
تم تو اس طور سے دنیا میں بہت بھول گئے
جورو لڑکوں کی محبت میں خدا بھول گئے
جورو لڑکوں کیلئے گھر میں چھپو گے کب تک؟
پنجۂ موت سے بتلاؤ بچو گے کب تک؟
آج اگر اپنی خوشی، جان خدا کو دو گے
پھر تو کل چین سے جنت میں مزے لوٹو گے
چھوڑ دو گے لذتِ دنیا کو اگر بہر خدا
پھر تو جنت میں ہمیشہ ہی اڑاؤ گے مزا
سر پٹک، پیر رگڑ گھر میں کا مرنا بہتر؟
یا رہِ حق میں فدا جان کا کرنا بہتر؟
گر رہِ حق میں نہ دی جان تو پچھتاؤ گے
اور پیمبرؐ کو یہ منہ کیا بھلا دکھلاؤ گے
ایک ہے شرط کہ تم مانو بہ دل حکمِ امام
ورنہ تلوار لگانا بھی نہیں آوے گا کام

جو کہ خود رائی سے لڑنے لگے در راہِ جہاد
انکا ناحق بہا خوں اور ہوئی محنت برباد
خوب اللہ و محمدؐ کو جو پہچانتے ہیں
اپنے سردار کے کہنے کو بہ دل مانتے ہیں
اہلِ ایمان کو کافی ہے دلا اتنا پیام
اب مناجات سے بہتر ہے کہ ہو ختم کلام
اے خداوندِ سماوات و زمیں، ربِ عباد
اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد
اپنا دے زور، مسلمانوں کو زور آور کر
وعدۂ فتح جو ہے ان سے، اسے پورا کر
ہند کو اس طرح، اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

ستائیسواں باب:

پشاور کی جانب اقدام

مردان جانے کا حکم

فتح مایار کے بعد سید صاحب نے اپنے رفقاءِ خاص سے آئندہ طریق کار کے متعلق مشورہ کیا۔ اس مشورے میں مولانا شاہ اسماعیل، شیخ ولی محمد، خواجہ محمد (حسن پوری) مولوی مظہر علی (عظیم آبادی)، ارباب بہرام خاں، فتح خاں پنجتاری وغیرہ شریک تھے۔ غور وخوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ پشاور پر پیش قدمی ضرور ہونی چاہیے۔ ادھر مردان سے چند ملا صاحبان آئے، انھوں نے درانیوں کے بارے میں بتایا کہ جنگ سے پیشتر لاف وگزاف اور فواحش کے ارتکاب میں غرق تھے، اب سب کچھ چھوڑ کر سراسیمگی کی حالت میں فرار ہو گئے ہیں۔ ان کا متروکہ مال موجود ہے۔ سید صاحب نے اس مال کو سنبھالنے کی غرض سے مولانا شاہ اسماعیل کو فوراً ایک سو آدمیوں کے ساتھ مردان بھیج دیا۔

واضح رہے کہ ایسے غازی بھی تھے جنھوں نے چوبیس تیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا، نہ آرام کیا تھا، لیکن مولانا نے اتنا توقف بھی مناسب نہ سمجھا کہ سب غازی کھانا کھالیں۔ مولوی جعفر علی نقوی کو بھی مولانا کے ساتھ جانے کا حکم ملا تھا، وہ اپنی حالت بتاتے ہیں کہ میں نے رات کو کچھ نہیں کھایا تھا، دن کے وقت ایک خشک ٹکڑا ملا، اسی کو کھا کر پانی پی لیا۔ مولانا سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو جلدی جلدی دو نوالے کھالوں۔ انھوں نے فرمایا کہ روٹی ساتھ لے لو، تورو سے باہر نکل کر کھانا۔ درانیوں کے خیمے اور اسلحے وغیرہ پڑے ہیں، اگر انھیں کوئی نقصان پہنچا تو بستی والے پکڑے جائیں گے، دوہری پریشانی پیدا ہوگی:

اول نقصانِ مال، دوم شبہات کی بنا پر لوگوں کی گرفتاریاں اور ان پر سختی۔

مردان کے حالات

غرض مولانا ہوتی کے قریب پہنچے تو وہاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں، اس پر مولانا نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے، پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں بڑے بڑے درخت تھے اور اس کی زمین ذرا نشیبی تھی، اس میں جا بیٹھے۔ گڑھی مردان کے برجوں سے گولیاں آنے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔

ایک گھڑی کے بعد گولیاں مدھم پڑ گئیں اور چند ملا صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلا کر ختم کر دیں؟ خبردار ہو جائیے، جو توپیں درانیوں سے غنیمت میں ملی ہیں، انھیں ابھی منگا لیتا ہوں، ان کے آتے ہی گڑھی کو مسمار کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے جو جاہل ہیں، انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو خان نمک حرامی کا طعنہ دے گا۔ ادھر مولانا نے سید صاحب کے پاس آدمی بھیج کر شاہینیں منگا لیں۔

ادھر جب بستی والوں کو معلوم ہوا کہ توپیں آرہی ہیں تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ احمد خاں کے بھائی رسول خاں نے پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہوں، البتہ درانیوں کی آمد کے باعث بے بس ہو گیا تھا۔

مصالحت

غرض رسول خاں نے اس شرط پر صلح کی پیش کش کی کہ غازی قصبے سے باہر ٹھہریں،

اندر داخل نہ ہوں۔ مولانا نے یہ شرط منظور فرمالی، لیکن کہا کہ حضرت امیر المومنین دوران قیام مردان میں گڑھی میں ٹھہریں گے اور مولوی عبدالوہاب قاسم غلہ ہمراہیوں سمیت مسجد میں قیام کریں گے۔ اس کے بعد مرزا احمد بیگ پنجابی کو پچاس غازیوں کے ساتھ گڑھی پر قبضہ کرنے کیلئے بھیج دیا اور تاکید کردی کہ تمام برجوں پر پہرے بٹھا کر بندوقیں چلادینا تاکہ معلوم ہوجائے کہ قبضہ مکمل ہوچکا ہے۔ اس اثناء میں ارباب بہرام خاں شاکمنسا لے کر مردان پہنچ گئے۔

مولانا نے رسول خاں کو سید صاحب کی خدمت میں تورو کی طرف بھیج دیا۔ اس کے ساتھ اپنے جو سوار بھیجے، انھیں تاکید کردی کہ حضرت کو صلح کی شرطوں سے آگاہ کردینا۔ پھر نجابت علی سوار نے سید صاحب کی روانگی کی خبر پہنچائی تو مولانا نے ملا فیض محمد کو آگے بھیج دیا کہ حضرت سے عرض کریں، آپ قصبے سے باہر تشریف رکھیں، اندر تشریف نہ لائیں، صلح کی شرط یہی ہے۔ آپ کیلئے آبادی سے باہر شمال مغرب میں مناسب فرودگاہ تجویز ہوچکی ہے، قصبے سے باہر ادھر تشریف لے جائیں۔

سید صاحب کی روانگی

سید صاحب نے روانگی سے پیشتر تورو سے توپیں اور دوسرا فالتو سامان پنجتار بھیج دیا۔ جن غازیوں کے سخت زخم لگے تھے، انھیں بھی پنجتار روانہ کردیا۔ نور بخش جراح کو ان کے ساتھ بھیجا۔ جن کے زخم ہلکے تھے، انھیں ساتھ لے لیا۔ حاجی جانی ایٹھوی بہت ماہر جراح تھے، وہ پہلے سے پنجتار میں موجود تھے، جن زخمیوں کو پنجتار بھیجا گیا ان کے نام یہ ہیں: سید موسیٰ، عبدالکریم خاں (ساکن آنولہ) نور محمد اور ان کے بھائی حاجی چاند (ناگور، بنگال) اللہ بخش بانھتی، میاں جی محی الدین پھلتی، محمد سعید خاں رائے بریلوی، قاضی مدنی، مولوی عبدالحکیم بنگالی، مولوی احمد اللہ ناگپوری، عبدالرحمٰن دکنی، اعتباری، پیر محمد پانی پتی،

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری۔ جن زخمیوں کو ساتھ لیا تھا وہ یہ تھے: سید اسماعیل رائے بریلوی، شیخ نصر اللہ خورجوی، امام الدین پانی پتی، کریم بخش پنجابی، اسماعیل خاں خان پوری، بعض کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

سید صاحب چلے تو آگے پیچھے سواروں اور پیادوں کا ہجوم تھا، ملکی لوگ اپنے طریقے کے مطابق تلواریں بے نیام کیے، ناچتے اور اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ نہ وہ سوار سید صاحب تک مولانا کا پیغام پہنچا سکے جو رسول خاں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ نہ ملا فیض محمد کو سید صاحب تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر آئی۔ مولانا کے نزدیک شرطِ صلح کی پابندی بھی لازم تھی اور احتیاط کے خیال سے یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ گڑھی اور قصبے کے کونے کونے کی چھان بین کر لینے کے بعد سید صاحب کو اندر بلائیں۔

غازیوں کا پاسِ عہد

سید صاحب شرطِ صلح سے بے خبر تھے، مولانا اس بات پر مطمئن تھے کہ دو مرتبہ پیغام بھیج چکے ہیں۔ وہ مغربی سمت کے باغ میں تھے، جب ایک شخص بھاگا بھاگا پہنچا اور بتایا کہ آپ کا لشکر قصبے کے اندر داخل ہو گیا۔ مولانا کو یقین نہ آیا، فرمایا: ممکن ہے کوئی آدمی بھول کر اندر آ گیا ہو، فکر نہ کرو، کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر چند آدمی آئے اور کہا آپ کے لشکر نے بد عہدی کی اور قصبے میں گھس آیا۔ یہ سنتے ہی مولانا غصے میں آ گئے، تلوار گلے میں ڈالی، ڈنڈا ہاتھ میں لیا، نجابت علی سوار کا گھوڑا تیار کھڑا تھا، اس پر سوار ہو کر دوڑاتے ہوئے قصبے میں پہنچے۔ مشرقی دروازے کے قریب ایک سوار ملا، اس سے پوچھا تم کیوں اندر آئے؟ جاؤ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھو۔ پھر ایک پیادہ ملا جس نے چارپائی سر پر اٹھا رکھی تھی۔ مولانا نے اسے سخت سست کہا، بلکہ دو ڈنڈے بھی رسید کیے، دو چار اور غازیوں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکالا۔ سید جعفر علی نقوی جنوبی دروازے کی طرف بھاگے اور وہاں پہنچ

کر غازیوں کو روکا۔

سید صاحب اور مولانا

اس اثناء میں مولانا کو خبر ملی کہ خود سید صاحب اندر آ گئے، مولانا غصے کی حالت میں ادھر چلے اور جاتے ہی عرض کیا:

> جناب خود خلاف شرع امر کے مرتکب ہوئے، لشکر اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفا بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا، لیکن آپ نے میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا اور قصبے میں داخل ہو گئے؟ یہ لشکر ہے، اسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے، پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے۔(۱)

یہ ''منظورہ'' کا بیان ہے۔ ''وقائع'' میں ہے کہ مولانا قصبے میں مختلف مقامات کی تلاشی لے رہے تھے کہ کہیں بارود تو نہیں بچھا دی گئی، اس اثناء میں کسی ملکی نے سید صاحب سے کہہ دیا کہ مولانا آپ کو قصبے میں بلاتے ہیں۔ سید صاحب آ گئے، مولانا نے بہ حالت غیظ کہا کہ آپ نے فرمایا تھا بلانے پر اندر آئیں گے، نہ میں نے آپ کو بلایا، نہ آپ نے مجھ سے پچھوایا۔ رعایا کا سامان باہر نکلوایا جا رہا ہے، اگر کوئی شے گم ہو جائے تو نقض عہد ہو، بہتر یہی ہے کہ آپ تشریف لے جائیں، یہ بات بہ تکرار کہی، سننے والوں کو اس کا انداز پسند نہ آیا، لیکن کسی نے دم نہ مارا۔

سید صاحب پیکر حلم تھے، فرمایا: مجھ سے کہا گیا تو آیا، ورنہ کاہے کو آتا۔ میں ابھی جاتا ہوں، یہ فرما کر مشرقی دروازے سے باہر نکلے اور ندی کے مشرقی کنارے پر توت کے درختوں کے سایے میں جا بیٹھے۔

مولانا کو جب شیخ ولی محمد کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب کو کوئی پیغام بھی نہیں پہنچا

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۸۸۳، ۸۸۴۔

تھا تو سارے انتظامات سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت میں پہنچے اور سر جھکا کر سامنے دو زانو جا بیٹھے۔ اس وقت سید صاحب نے اہل قصبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ نے میاں صاحب (۱) سے ہماری شکایت کی اور ہم سے ناراض کر دیا۔ ہمارے لشکری کسی کی کوئی چیز نہیں لیتے یا سونے کیلئے چارپائیاں لے لیتے ہیں یا پکانے کیلئے ہنڈیاں، جاتے ہیں تو ہر چیز مالکوں کو لوٹا جاتے ہیں۔ پھر مولانا سے مخاطب ہو کر فرمایا: مجھے آپ کے عہد کی اطلاع کسی نے نہ دی، ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ مولانا نے ادب سے حقیقتِ حال عرض کی، اہل قصبہ نے لشکرِ اسلام کے سرداروں کی حق شناسی کا یہ رنگ دیکھا تو بہت معذرت کی اور خود بہ اصرار سید صاحب کو گڑھی میں۔ لے گئے۔

پیش قدمی

سید صاحب نے رسالدار عبد الحمید خاں کی جگہ حمزہ علی خاں لوہاری والے کو رسالداری کا عہدہ دے دیا تھا، حاجی بہادر شاہ خاں کو ایک سو آدمیوں کے ساتھ مردان میں چھوڑا، بعض زخمیوں کو بھی ان کے حوالے کیا۔ اس اثناء میں مختلف خوانین مع لشکر لیکر پہنچ گئے۔ ملا کر چھ سات ہزار نبرد آزما جمع ہو گئے۔ نمازِ عصر کے بعد اس لشکر کے ساتھ پشاور کی جانب کوچ کیا، مغرب وعشاء کی نمازیں راستے میں ادا کیں، سارا سفر میدانی علاقے میں سے تھا، راستے میں ایک کنوئیں پر پانی پیا تھوڑی دیر آرام کر کے وہیں فجر کی نماز پڑھی، پاس کے ایک گاؤں والے تواضع کیلئے چھاچھ لے آئے، ایک گھڑی دن چڑھا تھا کہ سید صاحب چارسدہ پہنچ گئے۔

اہل چارسدہ نے مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، وہاں سے پشاور پندرہ سولہ میل تھا لیکن دریا سے گذرنے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ درانی جاتے جاتے ساری کشتیاں

---

(۱) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سید صاحب مولانا کو ہمیشہ "میاں صاحب" کہہ کر پکارتے تھے، اور یہی مولانا کا خاندانی لقب تھا۔

ڈبو گئے تھے یا توڑ کر چلا گئے تھے، دور دور تک کوئی کشتی نہ مل سکی تو فیصلہ کیا کہ تنگی پہنچیں جہاں سے دریا کو کشتی کے بغیر عبور کر لینا ممکن تھا۔

منزلیں

چارسدہ سے تنگی، وہاں سے مٹ اور شبِ قدر ہوتے ہوئے مچنی پہنچے، راستے میں ہر مقام پر لوگ درانیوں کی شکایتیں لے کر آتے اور کہتے کہ وہ ہم سے پیداوار کا نصف حصہ لیتے تھے اور انتظام کا سارا خرچ بھی ہم پر ڈالتے تھے۔ اس طرح بہ مشکل ایک تہائی آمدنی ملتی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ فی الحال ہمیں ایک تہائی دیتے جانا، اسی میں سارا خرچ بھی چلائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس سندیں تھیں، انھیں بحال رکھا، اس سلسلے میں ترنگ زئی کے رسول خاں کی سند کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔

مچنی سے ناگمان کو عبور کرنے کے لیے کشتی بانوں کے ساتھ دو سو روپے اجرت کے طے ہوئے۔ سید صاحب نے میر عبدالرحمٰن عرف رحمٰن علی، ملا قطب الدین ننگرہاری اور ملا لعل محمد قندھاری کی جماعتوں کو آگے بھیج دیا تا کہ وہ دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے مورچے بنالیں اور اگر دشمن بہ سلسلہ عبوری حملہ کرے تو اسے روک سکیں، سواروں نے گھوڑوں کو تیرا کر پار اتارا، جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے انھوں نے گھوڑے تیراکوں کے حوالے کر دیے۔ فرج اللہ عرب نے جو لشکر اسلام کا ایک نشان بردار تھا، سترہ گھوڑوں کو پار پہنچایا، درانی ایک مرتبہ قریب پہنچے لیکن انھیں حملے کا حوصلہ نہ ہوا اور واپس چلے گئے۔

کھانے کی تنگی

مچنی کی آبادی اس زمانے میں جھونپڑیوں پر مشتمل تھی، ہر جھونپڑی الگ الگ۔ مولانا نے دیکھا تو مزاحاً فرمایا کہ انھیں خدائے تعالیٰ نے دوزخ میں بھیجا تو یہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہوں گے۔ ان کا گزارا صرف نان و نمک اور دودھ پر تھا، ایک ایک

پھر پڑ کر مر جاتے تھے۔

مچنی میں سید صاحب نے دو مقام کیے، ایک روز غلہ نہ مل سکا تو ایک گائے ذبح کی، اس کا گوشت کسی کو ملا کسی کو نہ ملا۔ غلہ آیا تو سب سے پہلے ان لوگوں کو بھیجا گیا جو دریا کے دوسرے کنارے پر گذرگاہ کی حفاظت کیلئے بھیجے گئے تھے، باقی لشکر انتظار میں رہا۔ سید صاحب کیلئے کھانا پک کر آیا تو فرمایا: معاذ اللہ میں تنہا کھاؤں اور باقی بھائی فاقے میں رہیں؟ یہ کبھی نہ ہوگا۔ ہرچند لوگوں نے اصرار کیا، آپ نے انکار فرما دیا۔ جب غلہ آیا، سب میں تقسیم ہوا اور سب کھانا پکا چکے تو آپ نے بھی کھایا۔(۱)

دریا سے گذر کر آپ رنگی پہنچے جو ارباب بہرام خاں کی قوم یعنی خلیل کا گاؤں تھا، وہاں ارباب جمعہ خاں آ گئے اور یہ خبر پہنچائی کہ درانی پشاور کو خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں، اہل و عیال کو انھوں نے کوہاٹ بھیج دیا ہے۔ وہاں سے کمت فردسہ میں گئے جس کے قریب پیر تاریک کی قبر تھی۔(۲) وہیں ارباب فیض اللہ خاں مہمند ساکن ہزار خانی سلطان محمد خاں کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا۔

---

(۱) "منظورہ" ص: ۸۸۸۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ قندھار کا بلی کی پکائی روٹی لیتا تھا، غلے کی تنگی دیکھ کر بولا کہ مجھے آٹا دو، اسے آٹا دے دیا گیا تو لے کر سید صاحب کے پاس پہنچا کہ اسے کیا کروں۔ سید صاحب نے فرمایا اس سے روٹی پکوا دو۔

(۲) اس کا نام بایزید تھا۔ تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آیا، جالندھر میں شادی کی، پھر ایک نیا مذہب پیدا کیا اور اپنا نام پیر روشن رکھا۔ دیندار لوگوں نے اسے پیر تاریک کا خطاب دیا۔ اخوند درویزہ نے اس کے فتنے کو ختم کرنے کے لئے بڑی ہمت کی۔ آخر بایزید بری حالت میں مرا۔ اس کے بیٹوں نے فتنہ اٹھایا، وہ بھی مارے گئے۔

اٹھائیسواں باب:

درّانیوں سے مصالحت

پیغامِ مصالحت

سلطان محمد خاں نے ارباب فیض اللہ خاں کو مشورے کیلئے بلایا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ مصالحت قرین صواب ہے۔ جب میدانی علاقے میں جنگ نہ ہو سکی تو اب شہر میں لڑنے کی کون سی صورت ہے؟ اس پر سلطان محمد خاں کے بھائی جوش میں آگئے اور بولے کہ ہم کبھی صلح کے لئے تیار نہیں ہو سکتے، بلکہ برابر لڑتے رہیں گے۔ لیکن سلطان محمد خاں نے تمام حالات پر غور و فکر کے بعد ارباب ہی کے مشورے کو پسند کیا، چنانچہ ارباب نے سید صاحب کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ سلطان محمد خاں توبہ کیلئے تیار ہے، اس کی تقصیریں معاف کر دیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی کافر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہے کہ میں ایمان لانا چاہتا ہوں تو کیا اسے حلقۂ اسلام میں داخل نہیں فرمائیں گے؟ میں تو مسلمان ہوں اور مسلمان زادہ ہوں، پھر میری خطاؤں پر خطِ عفو کھینچنے میں کیوں تامل ہے؟ میرا ملک مجھے دیجئے، مدت العمر اطاعت گزار رہوں گا۔

ارباب نے یہ بھی کہہ دیا کہ صلح کا محرک میں ہوں، میرے نزدیک قومی مصلحت صلح ہی کی متقاضی ہے۔ درانیوں سے بھی میرا پرانا تعلق ہے، آپ کی خدمت میں بھی ارادت کا شرف حاصل ہے۔ بے شک آپ فتح حاصل کر چکے ہیں، لیکن سرداروں کے پاس اب بھی خاصا لشکر اور ساز و سامان ہے، اگر صلح نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ باہمی رزم و پیکار کا لا متناہی سلسلہ جاری ہو جائیگا اور جو مقصد ہم سب کو عزیز ہے وہ یقیناً خطرے میں پڑ جائیگا۔

سید صاحب کا جواب

یہ گفتگو فارسی میں ہوئی تھی، غازیوں میں سے جو اصحاب فارسی جانتے تھے، انھیں یہ باتیں اچھی معلوم نہ ہوئیں لیکن سید صاحب عادت شریفہ کے مطابق انتہائی نرمی اور ملائمت سے جواب دیتے رہے، آپ نے فرمایا:

> ہم دین کی تائید کے لئے یہاں آئے تھے، مسلمانوں کو کاروبار جہاد میں شریک کرنے کی کوشش کی، آپ کے سردار نے کج فہمی سے کام لیتے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیر مسلموں سے اتفاق کرلیا۔ اس کے بڑے بھائی نے خواہ مخواہ ہمارے ساتھ جنگ کی اور اپنی جان گنوائی۔ پھر ہم نے آپ کے سردار کو خطوں کے ذریعے سے نصیحت کی کہ وہ دین اسلام کی حمایت کے لئے تیار ہو جائے اور غیر مسلموں کا ساتھ چھوڑ دے، یہ نصیحت اس پر اثر انداز نہ ہوئی اور جنگ کی نوبت آئی، خدا کی مدد سے اسے شکست ہوئی اور ہمارا لشکر اس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گیا۔

گویا جو امور درانیوں کے خلاف جنگ کا باعث ہوئے تھے، وہ انتہائی صفائی سے پیش کر دیے۔ ارباب نے کہا کہ میں وکیل بن کر صلح کرا رہا ہوں، اگر سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی اس کے بعد بھی اپنے پرانے وطیرے پر قائم رہے تو ارباب بہرام خاں کی طرح میں بھی ان کی رفاقت چھوڑ دوں گا اور آپ کے ساتھ مل جاؤں گا۔

آخری فیصلہ

اس روز کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ارباب فیض اللہ خاں واپس چلا گیا۔ عصر کے وقت آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا گئی، ساتھ ہی خبر ملی کہ درانیوں کا لشکر جھکال میں جمع ہو چکا ہے اور غازیوں سے لڑنے کیلئے آ رہا ہے۔ غازی مسلح ہو کر اپنی لشکر گاہ کے جنوبی و مغربی گوشوں

میں کھڑے ہو گئے، درانی انھیں راستوں سے آ سکتے تھے، یکا یک تیز ہوا چلی اور گھٹا چھٹ گئی۔ پھر اطلاع پہنچی کہ درانی شام کے وقت تہکال کو خالی کر کے واپس چلے گئے، اس لئے کہ انھیں غازیوں کے شبخون کا خوف تھا۔

دوسرے روز غازی تہکال پہنچ گئے، ارباب فیض اللہ خاں نے دوبارہ حاضر ہو کر سلطان محمد خاں کی طرف سے عجز و اطاعت کا اظہار کیا۔ سید صاحب نے فرمایا:

> جایئے، میں نے ملک اسے دے دیا، شرط یہ ہے کہ وہ برے افعال سے خلوص کے ساتھ توبہ کرے، غیر مسلموں کی اعانت سے دست کش ہو جائے اور جب ہمیں غیر مسلموں سے مقابلے کی نوبت آئے تو جان و مال اور لشکر سے ہمارا ساتھ دے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سید صاحب نے اچانک ارباب کی رائے قبول کر لی، انھوں نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر خوب غور کیا ہوگا، ممکن ہے بعض رفیقوں سے مشورہ بھی کیا ہو، تاہم یقین ہے کہ ارباب کے آنے سے پیشتر وہ قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو بحکم اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اس کا خیر مقدم کریں گے۔

پشاور میں داخلہ

ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہم فاتحانہ نہیں بلکہ بطور مہمان پشاور جائیں گے اور سردار سے عہد و پیمان مستحکم کر کے واپس چلے جائیں گے۔ درانی چاہتے تھے کہ سید صاحب پشاور نہ جائیں، انھیں خیال ہوگا کہ اگر ایک مرتبہ پشاور میں داخل ہو گئے تو ممکن ہے پھر اسے چھوڑنے پر راضی نہ ہوں۔ اس بناء پر فیض اللہ خاں کی آمد و رفت جاری رہی، تہکال پہنچنے سے تیسرے دن درانیوں نے رضامندی کا اظہار کیا، ظہر کے وقت غازی پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ پیادے سب سے آگے تھے، سوار سب سے پیچھے۔ سید

صاحب پیادوں کے ساتھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار تھے، ہر جماعت کے ساتھ اس کا نشان تھا، بندوقچیوں نے فتیلے روشن کر لئے تھے کہ مبادا اتفاقیہ کوئی ناگوار صورت سامنے آ جائے۔ روانگی سے پیشتر سید صاحب نے عاجزی کے ساتھ دعا کی، عصر اور مغرب کی نمازیں راستے میں ادا کیں، کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔

سید صاحبؒ کی قیام گاہ

سید صاحب کے قیام کیلئے پہلے سے سرائے گورکھتری تجویز ہو چکی تھی، جس کی حیثیت قلعے کی سی تھی۔ اس کے جنوبی و مغربی گوشے میں ایک تہ خانہ دار دو منزلہ حویلی تھی، جس میں تین طرف اکہرے اور ایک طرف دوہرے دالان تھے۔ اس حویلی میں سید صاحب ٹھہرے، مشرقی جانب کی کوٹھری میں آپ کا پلنگ بچھایا گیا، باقی دالانوں میں جماعت خاص کے آدمی مقیم تھے۔ اس جماعت خاص کے چار بہیلوں سے آٹھ آدمی سید صاحب کی خواب گاہ پر باری باری پہرہ دیتے تھے، ان میں سے دو آدمی سید اسماعیل رائے بریلی والے کے بہیلے میں سے تھے، دو مولوی امام الدین بنگالی کے بہیلے میں سے، دو مولوی عبدالحکیم پھلتی کے بہیلے میں سے اور دو مولوی صلاح الدین پھلتی کے بہیلے میں سے(۱) آپ نے حویلی میں پہنچ کر سب سے پہلے دعا کی۔

حویلی کے دروازے کے سامنے جو مکان تھا، اس میں مولانا شاہ اسماعیل ساتھیوں کے ہمراہ اُترے۔ حویلی کی پشت پر اس سے ملا ہوا جو مکان تھا، اس میں شیخ ولی محمد پھلتی نے مع جماعت قیام کیا۔ ارباب بہرام خاں سرائے کے دروازۂ کلاں میں اقامت پذیر ہوئے۔ جو لوگ سید صاحب سے ملنے کیلئے آتے، وہ پہلے ارباب سے ملاقات کرتے۔ خوانین سمہ سرائے کے مشرقی دروازے کے باہر مختلف مکانوں میں اُترے۔ فتح خاں

---

(۱) اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اس وقت جماعت خاص کے چار بہیلے تھے۔

(پنجتاری)، فتح خاں (زیدہ) اور ابراہیم خاں (کھلابٹ) دروازے کی جانب جنوب، منصور خاں (چاگلئی)، اسماعیل خاں (اسماعیلہ)، مشکار خاں اور آنند خاں (شیوہ) اور سردار خاں (امان زئی) دروازے کے جانب شمال، ارباب جمعہ خاں (برادر ارباب بہرام خاں) کو کابلی دروازے کے باہر ٹھہرایا گیا۔

غازیوں کی حق شناسی

سید صاحب نے پشاور میں داخل ہونے سے پہلے سب غازیوں پر واضح فرما دیا تھا کہ ہم بہ طور مہمان جا رہے ہیں، اس لئے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ غازی بھوکے تھے، لیکن امام کے حکم کی پابندی میں کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا، رات اسی حالت میں گزار دی، صبح بازار سے کھجوریں خرید کر سب کو ناشتے کیلئے دیں، پھر ارباب بہرام خاں نے بنیوں کو بلا کر رسد کا انتظام کیا۔ گھوڑے اور اونٹ بھی رات بھر بھوکے رہے، صبح کو ان کے چارے کیلئے تگ و دو شروع ہوئی۔ اس وقت ارباب فیض اللہ خاں نے بتایا کہ آس پاس کے کھیت سرکاری ہیں، ان سے مکئی کاٹ کر کھلائی جائے۔ غازیوں نے کاشتکاروں کو بلا کر فصل تقسیم کرائی، پھر جانوروں کیلئے چارہ لائے۔

سرائے کے بعض کوٹھوں کی منڈیریں خراب ہو چکی تھیں، سید صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ سب منڈیروں کی مرمت کر دیں۔ جس مکان میں ارباب بہرام خاں ٹھہرے ہوئے تھے، اس کی ایک دیوار شکستہ تھی، سید صاحب نے اسے بھی درست کرا دیا۔ سرائے کے جنوبی و مغربی کونے میں ایک مسجد تھی، جو صاف نہ تھی، سید صاحب نے اس کی صفائی کرا دی اور وہیں نماز پڑھنے لگے۔

اگرچہ احتیاطاً اعلان کر دیا گیا تھا کہ داخلے کے وقت سب لوگ دکانیں بند کر دیں، لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو معلوم تھا کہ غازی کسی چیز کو نہیں چھیڑتے، اس لئے دکانیں عام

طور پر کھلی رہیں۔ بعض دروازوں میں چراغاں کا انتظام تھا، ہزاروں مرد و زن کوٹھوں پر جمع تھے، غازیوں کی نظریں نیچی تھیں، سب خدا کی حمد و ثناء اور شکر کے پیکر بنے ہوئے تھے، سرائے کے دروازے پر پہنچ کر بعض نے بندوقیں سر کرنی چاہیں، سید صاحب نے انھیں منع فرما دیا۔ ارباب بہرام خاں نے سید صاحب کے حکم سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ سب لوگ اطمینان سے اپنا کاروبار جاری رکھیں، کسی کو قطعاً کوئی آزار نہ پہنچے گا اور ایک حبے کا بھی نقصان نہ ہوگا، البتہ بھنگ خانے اور فواحش خانے بالکل بند ہو جانے چاہئیں۔

گفتگوئیں اور مشورے

اگرچہ مصالحت کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ عہد نامہ نہیں ہوا تھا۔ سید صاحب پشاور پہنچے تو اس بارے میں بات چیت شروع ہوگئی، پہلے کی طرح اب بھی ارباب فیض اللہ خاں ہی درانیوں کی طرف سے وکیل تھے، ان کی تجویز تھی کہ:

۱۔ چالیس ہزار روپے سید صاحب کی خدمت میں پیش کیے جائیں: بیس ہزار پشاور میں، دس ہزار چارسدہ میں اور دس ہزار پنجتار پہنچنے پر۔

۲۔ اطاعت اور اعانت فی الجہاد کا پختہ اقرار کیا جائے۔

سلطان محمد خاں ان شرطوں پر راضی تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے پیر محمد خاں اور حبیب اللہ خاں کو یہ منظور نہ تھیں۔ ارباب نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو انھیں شرطوں پر فیصلہ کرا سکتا ہوں، اگر یہ منظور نہیں تو گفتگو ختم سمجھنا چاہیے۔ اس پر وہ جھک گئے۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فرمایا:

> ہماری نیت تو محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ پر متفق کریں، کفر مغلوب ہو جائے، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو، دین اسلام ترقی کرے، نہ ہمیں پشاور سے غرض ہے نہ کابل سے۔

ان گفتگوؤں کے دوران میں سید صاحب وقتاً فوقتاً خوانین سمہ کے علاوہ مولانا شاہ اسماعیل، مولوی مظہر علی، شیخ ولی محمد، ملا لعل محمد قندھاری، ملا قطب الدین ننگر ہاری اور ارباب بہرام خاں تہکالی سے مشورے بھی کرتے رہتے تھے۔

مسئلہ حوالگی پشاور

جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا، سید صاحب کے تمام رفقاء خاموش تھے، جب انھیں معلوم ہو گیا کہ پشاور کو درانیوں کے حوالے کر دینے کا فیصلہ ہو گیا ہے تو بعض مخلصوں کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ ان کے سامنے درانیوں کی بدعہدیاں اور خود غرضیاں تھیں، وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ مجبور ہو جائیں تو ہر شرط قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جب مطلب نکل جائے تو انھیں نہ خدا اور رسولؐ کا خوف رہتا ہے، نہ دنیا کی شرم۔ ان سب نے مولانا شاہ اسماعیل کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت کو اس ارادے سے روکا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں امیر المومنین کا تابع فرمان ہوں، خود کچھ نہیں کہوں گا، البتہ مجھ سے پوچھا جائے گا تو جو کچھ رائے ناقص میں آئے گا، عرض کر دوں گا۔ آپ حضرات کو جو کچھ کہنا ہے، براہِ راست امیر المومنین سے کہو۔

ہندوستانی غازیوں کے علاوہ خوانین سمہ، غازیان قندھار و ننگر ہار اور ملکی لوگوں کو بھی حوالگی پشاور سے اختلاف تھا۔ چنانچہ فتح خاں پنجتاری، اسماعیل خاں، جعفر خاں ترین، ملا لعل محمد، ملا قطب الدین، ملا نور محمد، ملا عزت وغیرہ ارباب بہرام خاں کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت کو اس مصلحت سے روکا جائے، اس پر نہ اہل لشکر راضی ہیں، نہ اہل شہر۔ ارباب نرم دل آدمی تھے، انھوں نے سب کو تسلی دی کہ ہم ضرور حضرت سے بات کریں گے۔

سید صاحب کا ارشاد

چنانچہ ارباب نے سید صاحب سے بات کی، درانیوں کے ظلم و ستم اور بدعہدیاں ایک ایک کر کے جتائیں۔ یہ بھی عرض کیا کہ سب کو سرداروں کے مکر و فریب کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیں، نیز اکثر لوگ خصوصاً مردانِ دو آبہ اس مصالحت کے سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے شاہ زماں اور شاہ شجاع سے کیا سلوک کیا کہ آپ کو بھلائی کی امید ہو؟ سید صاحب نے فرمایا:

> خان بھائی! اگر موت یونہی لکھی ہے تو میں ناچار ہوں، بے شک سرداروں کی مکاری اور غداری کا مجھے علم ہے، لیکن ہم گھر بار چھوڑ کر اس نیت سے یہاں آئے ہیں کہ وہ کام کریں جس میں پروردگار کی خوشنودی اور رضا مندی ہو۔ مخلوق کی خوشی اور ناخوشی سے کچھ غرض نہیں۔ نادان سمجھتے ہیں کہ ملک گیری اور دنیا طلبی ہمارا مقصد ہے، حالانکہ حب و بغض محض للہ فی اللہ ہے، اس جہاد میں نہ نفسانیت ہے نہ جنبہ داری۔ باقی رہا رعایا کی خرابی اور تکلیف کا معاملہ تو اول تو رعایا کو آرام دینا ویسے ہی سب کا فرض ہے، پھر جب ہم خود ان سرداروں کو حاکم بنا کر بٹھا دیں گے تو امید ہے کہ کسی پر سختی اور تعدی نہ ہوگی۔
>
> رضائے حق کے سامنے ہفت اقلیم کی تاجداری ہیچ ہے، اب سلطان محمد خاں تائب ہے، دل کا حال خدا جانے، حکمِ شریعت کا مدار تو ظاہر پر ہے، ہم کیوں اس کا عذر نہ مانیں؟ ہمارے پاس اس پر کون سی دلیل اور حجت ہے؟ اگر کوئی دیندار اور خدا پرست عالم دلیل شرعی سے سمجھا دے کہ ہماری رائے غلط ہے تو ہم مان لیں گے۔(۱)

---

(۱) ایک روایت میں سید صاحب کا ارشاد یوں منقول ہے: ہمارا بھروسا ناصر حقیقی پر ہے، اس مالک الملک نے سرداروں کی کثرت تعداد و کثرت سامان کے باوجود ہمیں غلبہ عطا کیا۔ اگر وہ لوگ ہم فقیروں کی طرف سے ان مراعات کے باوجود غدر کریں گے تو خدا اس پر قادر ہے کہ تعزیراً انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ .....

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

یہ ارشاد سن کر سب کے آنسو نکل آئے، ارباب نے عرض کیا، مجھ سے غلطی ہوئی، معافی چاہتا ہوں، آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔

ارباب کی پیشکش

ایک روایت ہے کہ (غالباً خود عرض کرنے سے پہلے) ارباب بہرام خاں نے کسی ذریعے سے عرض کرایا تھا کہ ملک کسی کو دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں:

۱۔ میں اس کی حفاظت کروں گا، سردار لشکر لے کر آئیں گے تو امیر المومنین سے مدد طلب کیے بغیر ان کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ میری قوم خاصی بڑی ہے، اس کی امداد میرے لئے کافی ہوگی۔

۲۔ چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہمرکاب کردوں گا، ان کی تنخواہ اور خرچ کا سارا بوجھ مجھ پر ہوگا۔

۳۔ میں اس اعزاز کو دینی خدمات کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں نہ کہ دنیوی عیش کا، میں اہل ملک کے حالات و عادات سے واقف ہوں، عام لوگ مجھ سے راضی ہیں۔

سید صاحب نے یہ سنا تو مسکراتے ہوئے فرمایا:

> ارباب نے ہمارا مقصد نہیں سمجھا، ہمارے اور ارباب کے درمیان قطعاً مغایرت نہیں، ملک کو ارباب کے حوالے کرنے کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ اس پر ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ   چھینئے اور دنیوی فلاح سے بھی ان کی امید منقطع ہو جائے، نیز ہمیں اپنے پروردگار کے نام کا ادب ہے جس کا وسیلہ لوگوں سے ڈھونڈا اور از سرنو توبہ کا اظہار کرنے لگے۔ دنیا پر ہمارا حسن نیت بھی آشکار ہو جائے گا، ہم نے محض فی اللہ اس عبادت (جہاد) کا بار گراں اٹھایا ہے، ان نادانوں نے الا ماشاء اللہ گمان فاسد کی بناء پر سمجھ رکھا ہے کہ ہم ملک و جاہ کے طالب ہیں۔ (منظورہ ص: ۹۱۳۱)

بعض روایتوں میں سید صاحب کا جواب یوں مرقوم ہے: سردار اطاعت کا اقرار کرتا ہے، عذر نہ مانیں تو کیا کریں شریعت کا حکم ظواہر پر لگتا ہے، ہم اس سے وہی معاملہ کریں گے جو ظاہر شریعت کے مطابق ہے۔

ظاہر ہے کہ سید صاحب کی یہ رائے یقیناً درست تھی۔

ایک سیٹھ کا معروضہ

پشاور میں بدھ رام نام ایک مشہور سیٹھ تھا، وہ سید صاحب کی خدمت میں آیا تو نقد روپے کے علاوہ انگور، انار، پستہ، بادام، ناشپاتی اور بہی کی ٹوکریاں اور تھیلے لایا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ پشاور کو نہ چھوڑیے، روپے کی ضرورت ہو تو جتنا درکار ہو، اس کا انتظام میں کر دیتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ زمیندار اور کاشتکار ہی نہیں بلکہ تاجر اور دوکاندار بھی حالات کی ابتری کے باعث پریشان تھے۔ سب دیکھ چکے تھے کہ سرداروں کے ہوتے ہوئے کئی مرتبہ سکھوں نے یورشیں کیں اور جو کچھ مل سکا جبراً اٹھا کر لے گئے۔ خود سرداروں کی یہ حالت تھی کہ جب اطمینان سے بیٹھنے کا موقع پاتے، دیہاتیوں اور شہریوں کو ہر ممکن ذریعے سے لوٹتے۔ سید صاحب اور ان کے غازیوں کی حق شناسی معروف عوام تھی، اس لیے سب چاہتے تھے کہ معاملات کی باگ ڈور براہ راست ان کے ہاتھ میں رہے تاکہ بیرونی یورشوں کا بھی سدباب ہو اور اندرونی اخذ وسلب کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔

سید صاحب نے بدھ رام کی باتیں سن کر فرمایا:

> یہ مشورہ ملک گیروں کے کام کا ہے، ہم ان حاکموں میں سے نہیں ہیں، جو خطا کار عذر کرے اور معافی مانگے، اسے معاف کر دینا چاہیے۔

زمان شاہ درانی کی رائے

سید جعفر علی نقوی واقعہ بالاکوٹ کے بعد جب وطن آئے تھے تو لدھیانہ میں زمان شاہ درانی سے بھی ملے تھے، شاہ نے دوران گفتگو میں ان سے کہا:

وقتیکہ آں جناب آں ملک (پشاور) را بہ حرام نمکاں (سرداران پشاور)

دادند، دل ما از بس رنجید، دانستیم کہ حضرت امیر المومنین مسلمان کامل اند کہ در فریب منافقاں درآمدہ، آں ملک را بہ آنہا دادند و آں منافقاں خانۂ سلطنت مابدولت خراب ساختند، بادیگرے چہ وفا خواہند کرد؟ قابل عطائے آں ملک ما بودیم، بہ تقدیر الٰہی آں وقت وکیل ما حاضر نہ بود، خیال ما از خاطر مبارک امیر المومنین ذاہل شد۔ (۱)

ترجمہ : جب سید صاحب نے وہ ملک (پشاور) ان نمک حراموں کو دے دیا تو ہمیں سخت رنج ہوا، ہم نے سمجھ لیا کہ حضرت امیر المومنین کامل مسلمان ہیں، ان منافقوں کے فریب میں آگئے اور ملک انھیں دے دیا، ان منافقوں نے ہماری سلطنت تباہ کر ڈالی، دوسرے کے ساتھ یہ کیا وفا کر سکتے تھے؟ یہ ملک ہمیں ملنا چاہیے تھا، تقدیر الٰہی سے ہمارا وکیل اس وقت حاضر نہ تھا اور امیر المومنین ہمارا خیال بھلا چکے تھے۔

معاملے کی حقیقت

غرض پشاور کی حوالگی سے سید صاحب کے زمانے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا اور ہمارے زمانے میں بھی مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی نے سید صاحب کے اس عمل کو ہدف اعتراض بنایا۔ میں جس حد تک تحقیق کر سکا ہوں ہندوستانی غازیوں میں سے حافظ امام الدین رام پوری کے سوا کسی کو اختلاف باقی نہیں رہا تھا، سید صاحب کا نقطۂ نگاہ سنتے ہی سب مطمئن ہو گئے، مولانا شاہ اسماعیل نے نہ اس وقت اپنی رائے ظاہر کی اور نہ بعد میں کچھ فرمایا۔ منشی محمدی انصاری ابتدا سے سید صاحب کی رائے کو بہ ہمہ وجوہ درست و محکم مانتے تھے اور آخر وقت تک ان کا عقیدہ یہی رہا۔ ارباب بہرام خاں کو حقیقت حال کا علم ہو گیا تو اعتراف کر لیا کہ جو تجویز انھوں نے پیش کی تھی، وہ غلط تھی۔

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۱۲۲۷۔ اصل رائے بھی غلط ہے اور استدلال بھی قطعاً صحیح نہیں، تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی۔

سارے حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ سید صاحب کا فیصلہ بالکل درست تھا:

۱۔ وہ سرحد اس غرض سے نہیں گئے تھے کہ مقامی رئیسوں اور امیروں کی گدیاں تہ و بالا کریں، ان کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو متحد کر کے راہِ حق پر لگائیں۔

۲۔ مسلمانوں سے جنگ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، جو کش مکش ناخواستہ پیش آ گئی وہ اس درجہ ناگزیر ہو گئی تھی کہ سید صاحب کے لئے امرِ حق کو ترک کیے بغیر اس سے بچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔

۳۔ پشاور پر پیش قدمی کی غرض یہ نہ تھی کہ پشاور اور گرد و نواح کا علاقہ لے لیا جائے، اصل غرض یہ تھی کہ سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی مخالفت کا راستہ چھوڑ کر موافقت اختیار کر لیں۔ جنگ مایار سے پیشتر بھی سید صاحب نے اپنا سفیر بھیج کر سلطان محمد خاں کو راہِ راست پر لانے کی سعی فرمائی تھی۔ اگر مقصود قبض و تصرف ہوتا تو مصالحت پر بار بار زور دینے کی کیا ضرورت تھی؟

۴۔ جب سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی توبہ کا اقرار کر رہے تھے اور سید صاحب کی تمام شرطوں کو قبول کرنے پر آمادہ تھے تو مصالحِ قومی کا تقاضا یہی تھا کہ انھیں ساتھ ملا کر قدم آگے بڑھایا جاتا، حق و انصاف کا حکم بھی یہی تھا، قرآن مجید کی رہنمائی بھی یہی تھی: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔

۵۔ اگر سید صاحب پشاور لے کر بیٹھ جاتے یا اس کا انتظام ارباب بہرام خاں کے حوالے کر دیتے تو نتیجہ اسکے سوا کیا نکلتا کہ درانیوں اور سید صاحب کے درمیان لامتناہی سلسلۂ جنگ جاری ہو جاتا، جیسا کہ اس سے پیشتر سدوزئیوں اور بارک زئیوں میں یا دونوں برادریوں کے مختلف گروہوں میں جاری تھا، اور سید صاحب کی ساری فرصت انھیں مجادلات کی نذر ہو جاتی۔ یہ بھی بعید نہ تھا کہ ایک طرف سے کابل کی قوت، دوسری

طرف سے پنجاب کی قوت سلطان محمد خاں کی امداد کے لیے پہنچ جاتی اور نہ صرف سید صاحب پسپتے، بلکہ پورا سرحد پامال ہوتا۔ اس وقت یہ فرمایا جاتا کہ سید صاحب نے سلطان محمد خاں کی طرف سے اطاعت کی پیش کش قبول نہ کرنے میں سخت غلطی کی۔

۶۔ پشاور لے کر بیٹھ جاتے تو ساری دنیا یہ کہتی کہ سید صاحب ملک گیری کی غرض سے سرحد آئے تھے، جمع کلمۂ مسلمین اور جہاد پیش نظر نہ تھا، حالانکہ آپ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سب کچھ للہ فی اللہ کر رہے تھے، کوئی دنیوی غرض یا حب منصب پیش نظر نہیں تھی اور یہ دعویٰ سراسر خلوص پر مبنی تھا۔

صحیح راہِ عمل

غرض جس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سید صاحب کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ انھوں نے خادے خاں کو سمجھایا، وہ نہ مانا تو لڑائی ہوئی اور خادے خاں مارا گیا۔ پھر ساتھ ہی سید صاحب ہنڈ کو خادے خاں کے بھائی امیر خاں کے حوالے کرنے پر آمادہ تھے، لیکن اس کی دورخی پالیسی نے بات نہ بننے دی۔ پھر یار محمد خاں کو سمجھایا، وہ نہ سمجھا، لڑائی ہوئی اور یار محمد خاں مارا گیا۔ اگر پشاور لینا منظور ہوتا تو سید صاحب زیدہ سے سیدھے پشاور پر پیش قدمی نہ کر دیتے؟ لیکن انھوں نے یہ نہ کیا بلکہ سلطان محمد خاں کو سمجھاتے رہے، اس نے بھی لڑائی ضروری سمجھی بلکہ پشاور سے مردان پہنچ کر سید صاحب پر باقاعدہ حملہ کیا، مجبوراً سید صاحب کو لڑنا پڑا۔

جب سلطان محمد خاں کی طبیعت درست ہوگئی اور اس تے بیعت و اطاعت اور اعانت فی الجہاد پر آمادگی ظاہر کی تو لڑائی جاری رکھنے کی کون سی وجہ ہو سکتی تھی؟ اگر بعد کے حالات توقع اور امید کے خلاف پیش آئے تو اس بنا پر سید صاحب کے فیصلۂ حوالگیٔ پشاور اور سعیٔ اصلاح بین المسلمین کو کس بنا پر ہدفِ اعتراض بنایا جا سکتا ہے؟ کسی کا دل چیر

کر دیکھنا اور اس پر خلوص یا عدم خلوص کا حکم لگانا خارج از بحث ہے۔ فیصلہ بہر حال ظاہر حالات اور اقرارات ہی کی بناء پر ہوگا۔ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کے متعلق تو شروع میں بھی سب کہتے تھے کہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے، لیکن خادے خاں کے خلاف تو ایک شخص کی زبان بھی نہیں کھلی تھی؟ پھر اس نے موافقت کے بعد مخالفت اور اطاعت کے بعد بغاوت کا جو اقدام کیا، اس کے باب میں کیا کہا جائے گا؟ باقی خوانین میں سے بھی عملاً سب ایک رویے پر نہ رہے، کیا سید صاحب ان میں سے کسی کے دعوائے اطاعت کو رد کر سکتے تھے؟ نظم عساکر اور ملک داری کے معاملات میں کم حوصلگی سے کام نہیں چل سکتا، سید صاحب خدا کے فضل سے کم حوصلہ نہ تھے، انھوں نے جو مسلک اختیار کیا وہی درست تھا۔ بلاشبہ اس میں مضرتوں کے احتمالات بھی موجود تھے اور کس مسلک کو ایسے احتمالات سے کاملاً محفوظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ لیکن دوسرا راستہ یقینی مضرتوں کا تھا، سید صاحب اسے کسی بھی حالت میں اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا عبید اللہ مرحوم کا اعتراض

مولانا عبید اللہ مرحوم کے اعتراض پر بحث کی ضرورت نہیں، انہیں سید صاحب کی امامت سے بھی اختلاف تھا، فرماتے ہیں:

> جس دن سے امیر شہید افغانوں کے امیر بنے، اسی وقت سے بغاوت کی چنگاری اجتماع میں چمکتی رہی۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر افغانوں کو بناتے اور اسے امیر شہید کے بورڈ کا ممبر بنا دیتے۔(۱)

حوالگی پشاور کے متعلق لکھتے ہیں کہ "حزب ولی اللہ" کو ایک صوبے کی حکومت مل گئی تھی، لیکن امیر شہید نے واپس کر دی:

---

(۱) شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص: ۱۲۰

> اس موقع پر جماعت مجاہدین کے خواص و امام سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے، مولانا اسماعیل اور ہندوستانی اور افغانی اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں، مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی۔(۱)

یہ دونوں رائیں متضاد ہیں، سلطان محمد خاں کے اقرار اطاعت و اعانت پر پشاور کو اس کے حوالے کر دینے کا مطلب یہی تھا کہ سید صاحب نے "افغانوں" کا امیر "افغان" کو مان کر اسے اپنے "بورڈ" کا ممبر بنا لیا۔ لیکن مولانا کو یہ بھی منظور نہ ہوا، یہ بالکل غلط ہے کہ مولانا اسماعیل یا افغانی و ہندوستانی اہل الرائے یا جماعت مجاہدین کے خواص و عوام سید صاحب کے فیصلے کو غلط قرار دینے میں متفق الکلمہ تھے۔ بلاشبہ متفرق اصحاب کو ابتدا میں اس سے اتفاق نہ تھا، لیکن سید صاحب کے ارشادات سُن کر سب اس سے متفق ہو گئے۔ میرے علم کے مطابق صرف حافظ امام الدین رامپوری کو آخری وقت تک اس سے اختلاف رہا، مولانا شاہ اسماعیل سے ایک حرف بھی منقول نہیں جسے دلالۃً بھی سید صاحب کے فیصلے سے اختلاف کی تائید میں پیش کیا جا سکے۔ پھر مولانا کے اختلاف کی بنیاد دورِ حاضر کے سیاسی اوضاع و اطوار ہیں، لیکن سید صاحب کی تحریک کا مبنیٰ دین کے سوا کچھ نہ تھا۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص: ۱۶۹

انتسواں باب:

پشاور میں مشغولیتیں

سرداروں کا پیغام

مراتب صلح طے ہو چکے تو ارباب فیض اللہ خاں یہ پیغام لائے کہ سردار سید صاحب سے ملاقات کے آرزومند ہیں تاکہ بے واسطہ بیعت کر لیں۔ سید صاحب نے حسب عادت شریفہ یہ معاملہ اپنی مجلس شوریٰ میں پیش کیا، وہاں فیصلہ ہوا کہ پہلے مولانا شاہ اسماعیل سلطان محمد خاں سے ملیں، پھر سید صاحب سے ملاقات کا وقت اور مقام طے کر لیا جائے۔ ارباب فیض اللہ خاں نے عرض کیا کہ میری بستی ہزار خانی (۱) ابتدائی ملاقات کے لئے بہت موزوں ہے۔ مولانا اس کے لئے تیار ہو گئے، جو غازی مولانا کے ساتھ جانے کے لئے منتخب ہوئے ان کے نام یہ ہیں: حافظ وجیہ الدین (باغپت)، انور خاں، شیر محمد خاں، خدا بخش رام پوری، مولوی لعل محمد خاں، سید چراغ علی (پٹیالہ)، محمود خاں (پٹیالہ)، محمود خاں (انبالہ) طالب خاں (بنارس)، فتح علی (عظیم آباد) کریم بخش (بنارس)، سلو خاں (دیوبند)، ولی داد خاں، نصر اللہ خاں (خواجہ) کریم بخش شیر انداز خاں پنجابی، نظام الدین "اولیا"، احمد کشمیری، شیخ نصرت (بانس بریلی)، کریم بخش (سہارن پور)، مستقیم خاں (جہان آباد)، نور محمد (قندھار) خان بہادر اور مستقیم۔

مولانا سے ملاقات

اگرچہ مولانا کو سید صاحب نے گھوڑا دے رکھا تھا، لیکن آپ کی عادت تھی کہ اکثر

---

(۱) یہ بستی پشاور کے قریب ہے۔

پیدل چلتے اور اپنے گھوڑے پر کسی دوسرے بھائی کو سوار کرا دیتے۔ نیت یہ ہوتی تھی کہ خدا کا کام ہے، اس کے سرانجام میں جتنی زیادہ مشقتیں برداشت کریں گے اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ ہزار خانی بھی پیدل گئے، سلطان محمد خاں کی خواہش تھی کہ مولانا سے گڑھی میں ملاقات ہو اور میں دروازے تک استقبال کے لئے جاؤں، لیکن ارباب نے گڑھی کے دروازے کے سامنے باغ میں فرش بچھوا کر ملاقات کا انتظام کیا۔ مولانا نے پندرہ سولہ غازیوں کو اس مقام پر ٹھہرا دیا، جہاں سے سلطان محمد خاں کا لشکر آ سکتا تھا، خود جائے ملاقات پر پہنچ گئے (۱) شام ہو چکی تھی اور چاند نکل آیا تھا، ارباب نے ایک شمع روشن کی، ایک مشعلچی کو مشعل دے کر کھڑا کر دیا، سلطان محمد خاں آیا اور مولانا سے معانقہ کیا، فارسی میں باتیں ہوتی رہیں، سردار نے نیا پٹہ مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی، نیز اقرار کیا کہ دین کی خدمت میں سرگرم رہوں گا اور غازیوں کی اعانت میں بھی کوتاہی نہ ہوگی۔

اس اثناء میں بندوق چلنے کی آواز آئی، سردار کا رنگ فق ہو گیا، اس نے گھبرا کر پوچھا: ”خیر باشد، خیر باشد“ مولانا دلجمعی سے بیٹھے رہے اور فرمایا: آپ بالکل نہ ڈریں، ارباب سے کہا کہ کاکا! دیکھو کیا معاملہ ہے؟ (۲) تھوڑی دیر میں ایک شخص پکڑا آیا، وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میری بندوق بھری ہوئی تھی اور انگلی لبلبی پر تھی، پاس کے ایک شخص کا ہاتھ میرے بازو پر لگا اور بندوق چل گئی۔

پہلی ملاقات معمولی بات چیت پر ختم ہو گئی، مولانا نے اجازت لی، ارباب نے عرض کیا کھانا کھا کر جایئے۔ مولانا نے فرمایا: میرا جلد چلے جانا ہی مناسب ہے، ارباب نے چار بہنگیوں پر کھانا پشاور بھجوا دیا۔ سردار نے کہا کہ کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں، دوسرا دن جمعہ کا تھا، اسے چھوڑ کر ہفتے کا دن دوسری ملاقات کیلئے مقرر ہو گیا۔ مولانا نے پشاور

---

(۱) راویوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر مولانا کے پاس دو ہتھیار تھے، تلوار اور بندوق۔

(۲) ارباب سن رسیدہ شخص تھا، سب اسے کاکا (یعنی چچا) ہی کہتے تھے۔

پہنچ کر کھانا ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا، صبح کو سید صاحب کی خدمت میں ملاقات کی کیفیت عرض کی، جس میں بتایا کہ پچاس ہزار روپے دیتے ہیں: تیس ہزار پشاور میں، دس ہزار چارسدہ میں اور دس ہزار پنجتار پہنچنے کے بعد۔(۱)

ہفتے کے دن مولانا دوبارہ ہزار خانی گئے، اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے سید صاحب سے ملنے کی آرزو ظاہر کی، مولانا نے فرمایا کہ یہ بات خود حضرت کی رائے پر موقوف ہے، ان سے پوچھ کر بتا دیا جائے گا۔ اس مرتبہ بھی ہزار خانی سے کھانا مولانا کے ساتھ پشاور بھیجا گیا۔

سید صاحب سے ملاقات

سید صاحب سے ملاقات کے لئے پشاور اور ہزار خانی کے درمیان کا میدان تجویز ہوا، یہ بھی کہہ دیا گیا کہ سردار اپنا لشکر لے کر آئے اور سید صاحب کا لشکر ساتھ آئے گا۔ مولانا اور ارباب نے ایک روز پیشتر احتیاطاً پورے میدان کا معائنہ کیا، سید صاحب نے روانہ ہوتے وقت اخوند درویزہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی، ظہر کی نماز میدان میں ادا فرمائی۔ جب جائے ملاقات سو۔ سوا سو قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو لشکر کو روک دیا اور صرف بیس آدمی لے کر آگے بڑھے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل اور ارباب بہرام خاں سید صاحب کے آگے آگے تھے، تھوڑی دور جا کر باقی آدمیوں کو بھی ٹھہرنے کا حکم دے دیا، صرف مولانا اور ارباب بہرام خاں ساتھ رہے۔ سلطان محمد خاں کے ساتھ ارباب فیض اللہ خاں اور مردان علی آئے، تقریباً آدھ گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔

---

(۱) ''منظورہ'' میں ہے کہ پہلے دن مولانا ملاقات کے لئے پہنچے تو سلطان محمد خاں غازیوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور ملاقات کے لئے نہ آیا۔ دوسری شام کو ملاقات ہوئی۔ سنا ہے کہ اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ غازیوں نے ایک پوشیدہ مقام پر توپ لگا رکھی ہے، مولانا کے کان تک یہ افواہ پہنچی تو فرمایا: یہ لوگ کیسے نادان ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ توپ لگا رکھی ہوتو آخر میں بھی تو سلطان محمد خاں کے ساتھ اڑوں گا، میرے نزدیک صحیح روایت وہی ہے جو متن میں درج ہے۔

اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریطے سے نکال کر سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، اس پر بہت سی مہریں ثبت تھیں۔ محضر میں خوانین سمہ سے خطاب تھا، مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں، وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ ان کا فریب ہے، وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں، ایک نیا دین انہوں نے نکالا ہے، کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو برا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے، ان کی باتوں میں نہ آنا، عجب نہیں تمہارا ملک چھڑوا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، انہیں تباہ کرو، اگر اس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔

صحیح یا غلط، سلطان محمد خاں کا عذر یہ تھا کہ ہم لوگ اس محضر کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ سید صاحب نے محضر دیکھ کر صرف اتنا فرمایا کہ یہ سراسر بہتان ہے اور اسے شاہ اسماعیل کے حوالے کرتے ہوئے تاکید فرما دی کہ کسی کو نہ دکھائیں، ممکن ہے غازیوں میں سے کوئی بھائی اسے دیکھ کر جوش میں آجائے اور کوئی غیر مناسب حرکت کر بیٹھے۔

سلطان محمد خاں نے تاوان کا مسئلہ چھیڑا، سید صاحب نے فرمایا: آپ ہمارے بھائی ہیں، تاوان یا جرمانے کا کوئی معاملہ اب باقی نہیں رہا، اس پر ملاقات ختم ہوگئی۔

محضر کا مسئلہ

کچھ معلوم نہیں کہ فتویٰ یا محضر کہاں تیار ہوا؟ کس نے تیار کرایا اور کس ذریعے سے سلطان محمد کے پاس پہنچا؟ چونکہ اس میں سید صاحب پر تہمت لگائی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے فرستادہ اور مخبر ہیں، اس لئے اغلب ہے یہ لاہور میں رنجیت سنگھ کے کہنے پر تیار ہوا ہو اور اسی کے ذریعے سے سلطان محمد خاں کے پاس پہنچا ہو۔

شاہ اسماعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں جو پشاور کے دس علماء کے نام بھیجے گئے۔ (۱)

پہلا ۹؍ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو، دوسرا ۱۷؍شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱؍اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علماء کی طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقا پر کئی الزام لگائے گئے تھے، مثلاً:

۱۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں، ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں، نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذاتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلا وجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

---

(۱) ان علماء کے نام اور مختصر حالات ذیل میں درج ہیں:

۱۔ مولانا حافظ محمد احسن بن محمد صدیق، معروف بہ حافظ دراز پشاوری، متبحر عالم، علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، سرحد سے سمرقند تک ان کے علم کا چرچا تھا۔

۲۔ مولانا محمد عظیم: علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں شیخ وقت، صحاح ستہ کے اسانید زبانی یاد تھے۔ روتے بہت تھے، آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ جب اخوند سید امیر عرف ملا صاحب کوٹھا پر معاندوں نے کفر کا فتویٰ لگایا تو انہوں نے علی الاعلان خلاف رائے دی۔ ملا صاحب کوٹھا انہیں کے شاگرد تھے۔ ۲؍جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ (۲۶؍دسمبر ۱۸۵۸ء) کو وفات پائی۔

۳۔ مولانا غلام حبیب: بڑے عالم تھے، انہوں نے ملا صاحب کوٹھہ کے خلاف فتویٰ تکفیر کی مخالفت کی تھی، ان کے فرزند مولانا غلام جیلانی مرحوم نے کتب خانہ اسلامیہ کالج پشاور کو دے دیا تھا۔

۴۔ مولانا مفتی محمد احسن بن مولانا مفتی محمد احمد، متبحر عالم تھے، مکان محلہ کوٹلہ رشید خاں علاقہ گنج پشاور میں تھا۔

۵۔ مولانا مفتی حافظ احمد۔

۶۔ مولانا عبدالمالک اخوندزادہ۔

۷۔ مولانا مراد اخوندزادہ۔

۸۔ مولانا قاضی سعد الدین۔

۹۔ مولانا قاضی مسعود۔

۱۰۔ مولانا عبداللہ اخوندزادہ۔ علماء کے حالات مجھے مولانا عبدالرحیم مرحوم پوپلزئی سے معلوم ہوئے۔

۴۔ سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے، مولانا اسماعیل اور بعض دوسرے لوگوں نے انہیں مہدی موعود قرار دیا، انگریزوں نے انہیں ملک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے براہِ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو ملا عبدالغفور (اخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کرادیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً ''جدید الاسلام'' ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں۔

ان الزامات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ سراسر بے اصل ہیں، ممکن ہے یہ الزامات بھی اسی محضر سے ماخوذ ہوں جو سلطان محمد خاں نے پیش کیا۔

متفرق واقعات

قیامِ پشاور کے متفرق واقعات بھی سن لیجئے:

۱۔ جمعہ، مسجد مہابت خاں میں ادا کیا جاتا تھا، مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے خطبوں میں سورۂ صف کی تفسیر بیان کی، لوگوں نے بے حد پسند کی اور مولوی صاحب اہل پشاور میں بہت ہر دلعزیز ہوگئے۔ چنانچہ جب قاضی کے تقرر کا معاملہ سامنے آیا تو مولوی صاحب موصوف کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اہل پشاور انہیں پسند کرتے تھے۔

۲۔ ابھی درانیوں کے ساتھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ خواص خاں خٹک پانسو سوار لے کر حاضر ہوا اور بولا کہ سکھوں نے ہمارا ملک خراب کر ڈالا، دریائے سندھ کے دونوں طرف میری قوم آباد ہے، ان کا علاقہ مجھے جاگیر میں دے دیجئے، سکھوں کو روکنے کا ذمہ اٹھاتا ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ابھی مصالحت کی بات چیت ہو رہی ہے، اگر یہ کامیاب

نہ ہوئی تو آپ سے معاملہ کر لیا جائے گا۔

۳۔ حافظ عبداللطیف اور خضر خاں قندھاری کو حکم دیا گیا کہ شہر میں پھر پھر کر لوگوں کو نماز کی تلقین کیا کریں۔ حافظ کی ملاقات ایک روز ملا عظیم اخوندزادہ سے ہوگئی جو سلطان محمد خاں کا استاد تھا، اس سے پوچھا کہ حضرت سے ملاقات کیوں نہ کی؟ اب چلو۔ ساتھ لے کر چلے تو راستے میں پوچھا کہ درّانیوں نے مجاہدین کی تکفیر کا جو فتویٰ تیار کرایا تھا، کیا آپ نے بھی اس پر دستخط کیے تھے؟ اخوندزادہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مہر ان کے سامنے پھینک دی تھی۔ حافظ نے کہا آپ عالم ہیں، کیا مسلمانوں خصوصاً مجاہدین کی تکفیر آپ کیلئے زیبا تھی؟ قیامت کے دن اس کی سزا کبائر سے بڑھ کر ہوگی، بہتر یہ ہے کہ اسی دنیا میں سزا تجویز کر لیجئے۔ پھر ان کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیے۔ ارباب بہرام خاں نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔ سید صاحب تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا ابھی حافظ کو پکڑ کر لاؤ، اخوندزادہ کو عزت سے پاس بٹھایا اور کہا کہ مجھے کسی عالم سے عداوت نہیں۔ پھر مولانا کی سفارش پر حافظ عبداللطیف کا قصور معاف ہوا۔ اخوندزادہ نے خود بھی معافی دے دی۔ (۱)

۴۔ سید بادشاہ گل، سید صاحب کے پرانے دوست تھے، لیکن وہ ملاقات کے لئے نہ آئے۔ کہتے تھے کہ سلطان محمد مجھے جبراً اپنے ساتھ جنگ مایار میں لے گیا تھا، میں روسیاہ ہوں، اب کس منہ سے ملاقات کروں؟ سید صاحب نے اپنا خاص آدمی بھیج کر بلایا اور فرمایا کہ آپ دل سے راضی نہ تھے تو مضائقہ نہیں، لیکن وہ نہ آئے۔

---

(۱) ایک روایت میں ہے کہ جب سید صاحب نے فرمایا کہ پکڑ کر لاؤ اور ارباب بہرام خاں نے حافظ کو دیکھا تو کہا کہ معلوم نہیں کیا سزا ملے۔ حافظ بولے: وہ ہمارے پیر و مرشد ہیں، ان کی سزا بسر و چشم منظور ہے، لیکن ملاؤں کے ہاتھ پھر اول کا بدلہ ہے، جوش یہ نکال لیا۔

مراجعت

صلح کی شرطیں طے ہو گئیں اور ملاقاتیں ہو چکیں تو سید صاحب نے مولوی مظہر علی کو پشاور کا قاضی مقرر کیا۔ مولوی قمر الدین عظیم آبادی (۱) اور چند اور غازیوں کو ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا، پھر سید صاحب جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ ارباب فیض اللہ خاں نے ہزار خانی میں دعوت کا انتظام کیا اور پورے لشکر کیلئے دنبوں کا پلاؤ پکوایا۔ سید صاحب دو پہر کے وقت ہزار خانی پہنچے، عصر کے وقت وہیں سے براہ مردان پنجتار روانہ ہو گئے۔

مغرب کے وقت چکنی پہنچے، جہاں شیخ عمر نام ایک بزرگ کا مقبرہ تھا، ان کی اولاد میں سے ایک بی بی مقبرے کی متولیہ تھی۔ اس نے پورے لشکر کیلئے کھانا پکوایا، کھچڑی بھی تھی، گوشت بھی اور تنوری روٹیاں بھی۔ بعد نماز مغرب کشتیوں پر دریا کو عبور کیا اور چارسدہ پہنچ گئے، وہاں سے مولوی مظہر علی کو رفقاء سمیت رخصت کر دیا۔

مسئلہ انتظام عشر

چارسدہ میں انتظامِ عشر کا مسئلہ پیش ہوا، پہلے اس کام پر حاجی بہادر شاہ خاں اور حاجی محمود خاں کو مقرر کیا گیا تھا، مولانا شاہ اسماعیل کی رائے تھی کہ یہ نیا کام ہے اور دونوں صاحب ناواقف ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ کسی مدبر، واقف کار اور متحمل مزاج آدمی کو یہ کام سونپا جائے۔ غور و فکر کے بعد مولوی خیر الدین شیرکوٹی کا نام تجویز ہوا، وہ چھتر بائی میں تھے، فوراً حکم بھیج دیا گیا کہ گڑھی کا انتظام حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کے حوالے کر کے خود چلے آئیے۔ حاجی بہادر شاہ خاں اور حاجی محمود خاں نے عرض کیا کہ اگر ہم اطمینان کے مطابق کام نہ

---

(۱) مولوی قمر الدین، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ماموں رکن الدین حسین (بن رفیع الدین حسین ناظم بہار) کے فرزند تھے۔ ان کی شادی مولوی الٰہی بخش مرحوم کی صاحبزادی جمیلۃ النساء سے ہوئی تھی۔ وہ بارہ برس کی ہوئی تھی کہ مولوی قمر الدین جہاد کے لئے روانہ ہو گئے۔ پشاور میں ان کی شہادت کے بعد جمیلۃ النساء کا نکاح ثانی مولانا ولایت علی سے ہوا، مولانا کے سب سے چھوٹے بیٹے شمس العلماء، مولانا محمد حسن (ذبیح) جمیلۃ النساء ہی کے بطن سے تھے۔

کر سکتے تو بے شک ہٹا دینا مناسب تھا، لیکن کام دیکھے بغیر ہی معزول کر دینا ہمارے لئے باعثِ خفت ہے۔ مولانا بے توقف بولے: بے شک مروت کا تقاضا یہی ہے، لیکن پیش نظر کام میں سرگرمی اور بہادری کی ضرورت نہیں، ہوشیاری اور تجربہ کاری کی ضرورت ہے، جس میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی اسے خوانین سمہ کبھی عشر نہ دیں گے۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ جب تک مولوی خیر الدین نہ پہنچیں، حمزہ علی خاں رسالدار کو شیوہ میں ٹھہرا دیجئے تا کہ ان دونوں کا ہاتھ بٹاتے رہیں۔

اصلاحِ معاشرت

سید صاحب چارسدہ سے روانہ ہوئے تو گڑھی امان زئی میں ٹھہرے، وہاں کا کا احمد خاں ایک سن رسیدہ مخلص تھا، اس نے عرض کیا کہ یہاں لڑکیوں کی شادیاں گرانقدر رقمیں لے کر کی جاتی ہیں، رقمیں مقرر کر کے نکاح کر دیے جاتے ہیں، جب تک دولہا کی طرف سے رقم پوری نہیں ہو جاتی، دلہنوں کی رخصتی عمل میں نہیں آتی، وہ گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ سنا ہے خود عورتوں نے بھی سید صاحب کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ آپ سب کی اصلاح فرماتے ہیں، ہمارے حالِ زار پر بھی توجہ مبذول فرمائیے۔

سید صاحب نے حسبِ عادتِ شریفہ اگلے روز بستی والوں کو بلا کر وعظ و نصیحت فرمائی، لوگوں نے آپ کا حکم قبول کر لینے کا اقرار کیا، تو فرمایا کہ جن لڑکیوں کے نکاح ہو چکے ہیں اور ان کے شوہر چار چار کوس کے اندر ہیں، انہیں آٹھ روز کے اندر اندر رخصت کر دیا جائے۔ جن لڑکیوں کے شوہر دور گئے ہوئے ہیں، ان کی رخصتی کے لئے ایک ماہ کی مہلت مناسب ہوگی۔ جو شوہر غیر ممالک میں ہیں، ان کی بیویوں کو تین ماہ میں شوہروں کے گھر بھیج دیا جائے۔

مولانا کا واقعہ

گڑھی امان زئی میں سید صاحب نے دس بارہ مقام کیے، ایک روز درانیوں کی طرف سے ایک لڑکا انگور اور سردے بطور پیش کش لایا۔ سید صاحب نے اسے انگرکھا اور بعض دوسرے پارچہ جات بہ طور خلعت دیے۔ اس نے کہا کہ میں تو افغانی پارچے لوں گا۔ سید صاحب بالا خانے پر تھے، اوپر جانے کی سیڑھی لکڑی کی تھی، وہ سیڑھی پر کھڑا ہو گیا اور اس طرح چڑھنے اترنے والوں کا راستہ رک گیا، اسے نرمی سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ زور زور سے رونے لگا۔ مجبور ہو کر مولانا شاہ اسماعیل نے اس کے دو تین طمانچے مارے۔ ایک مرتبہ مولانا کا ہاتھ سیڑھی میں لگا، لکڑی کا ایک باریک ریشہ ہتھیلی میں چبھا اور خون جاری ہو گیا۔ عین اس حالت میں سید صاحب باہر نکل آئے، مولانا کے ہاتھ پر نگاہ پڑی تو پوچھا: میاں صاحب! یہ خون کیسا؟ مولانا سر جھکائے خاموش کھڑے رہے، منشی محمدی انصاری نے مختصراً واقعہ عرض کیا۔ سید صاحب نے فرمایا: ”میاں صاحب! آپ کا غصہ ان دنوں بڑھ رہا ہے، اسے دور کرنا چاہیے۔“

بعد میں مولانا منشی خانے میں گئے تو منشی محمدی سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج بڑی ندامت ہوئی، بے شک امیر المومنین نے سچ فرمایا۔ منشی جی نے کہا کہ مولانا عبدالحیؒ کو بھی غصہ آتا تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ وہ کبھی جادۂ شرع سے ادھر اُدھر نہ ہوئے۔ غصے کے باوجود دلائل شرعیہ ان کی تمام باتوں پر غالب رہتے تھے، لیکن آپ کو غصہ آتا ہے تو زبان پر بھی قابو نہیں رہتا۔

مولانا حقانی و ربانی آدمی تھے، اپنے عیوب کا صاف اقرار کر لیتے تھے، بولے: بھائی صاحب! مولانا عبدالحیؒ کا غصہ ”آورد“ ہوتا تھا، وہ امور شرعیہ پر بہ قصد و ارادہ غصہ لاتے تھے، لہٰذا شریعت سے تجاوز کا کون سا موقع تھا، میرا غصہ ”آمد“ ہے، جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر غلبہ پا لیتا ہے، زبان کیا کسی عضو پر بھی قابو نہیں رہتا۔

قاضی القضاۃ کا تقرر

سید صاحب گڑھی امان زئی سے ڈاگئی پہنچے تو مولوی خیر الدین شیر کوٹی آ گئے انہوں نے عرض کیا کہ مجھے جس بستی میں اترنے کا اتفاق ہوا، وہاں کے لوگوں کو قاضیوں کا شکوہ گزار پایا۔ وہ بعض اوقات معمولی خطاؤں پر زیادہ جرمانہ لے لیتے ہیں۔ سید صاحب نے خود مولوی صاحب کو قاضی القضاۃ بنانا چاہا، موصوف نے معذرت کر دی۔ سید صاحب نے اصرار فرمایا تو مولوی صاحب بولے، اصرار سے مجھے گناہ گار نہ بنائیں، میں اس خدمت کو قبول نہ کروں گا، عدالتی اور مالی کاموں میں اکثر لوگوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔

پنجتار پہنچے تو سید صاحب نے مولوی محمد رمضان کو قاضی القضاۃ مقرر فرما دیا، کاٹ لنگ، لوند خوڑ اور ڈاگئی وغیرہ کے انتظامات مولوی خیر الدین شیر کوٹی کے حوالے کیے، قندھاری اور ہندوستانی غازیوں کی ایک جماعت ان کے ہمراہ کر دی۔ ان میں سے سید جعفر علی نقوی، میاں ضیاء الدین پھلتی، حافظ وجیہ الدین باغپتی اور کریم بخش دہلوی کے نام روایتوں میں مذکور ہیں۔

سفارتِ باجوڑ

اس اثناء میں خان باجوڑ کی طرف سے سفیر آ گئے، انہوں نے فتح پشاور پر مبارک باد عرض کرتے ہوئے درخواست کی کہ ہمارے ہاں بھی احکامِ شریعت کے اجرا کا بندوبست فرما دیجیے۔ سید صاحب نے مشورے کے بعد مولانا اسماعیل کو ایک سو غازیوں کے ساتھ باجوڑ بھیج دیا، مولانا اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی پنجتار سے اکٹھے روانہ ہوئے، پہلا مقام گڑھی امان زئی میں کیا، دوسرا لوند خوڑ میں۔

لوند خوڑ میں دو رئیس قابلِ ذکر تھے: اول نسیم خاں، دوم حافظ پشم، جس کا نام مولانا نے حافظ ریشم مقرر کر لیا تھا۔ وسط دیہ میں ایک بلند، وسیع اور خوبصورت مسجد تھی، مولانا

اس میں ٹھہرے وہیں کاٹ لنگ کے خوانین حاضر ہو گئے۔ ایک روز مولانا نے بستی والوں کی درخواست پر فارسی میں وعظ فرمایا، اخوند فیض محمد نے اس کا ترجمہ پشتو میں کیا۔

مولانا نے روانگی سے پیشتر مولوی خیر الدین کو نصیحت فرمائی کہ نسیم خاں رواوار آدمی معلوم ہوتا ہے، اس کے ساتھ ظاہرداری خوب نبھائی جائے۔ حافظ با اخلاص ہے، اس کے ساتھ محبت کے تعلقات بڑھائے جائیں، لیکن یہ امر نسیم خاں پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

حافظ سے علمی گفتگو

حافظ اگرچہ نابینا تھا، لیکن فقہ و اصول کا ماہر تھا، مولانا نے ایک روز تفریحاً اس سے علمی گفتگو فرمائی۔ پوچھا: حافظ صاحب افغانوں میں جو ''اسقاط'' رائج ہے، یعنی نماز کا فدیہ، اس کی بنیاد کیا ہے؟

حافظ: قیاس۔

مولانا: مقیس علیہ کیا ہے؟

حافظ: مسئلہ شیخ فانی در باب فدیہ صوم۔

مولانا: یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ دونوں کا حکم یکساں نہیں۔ قیاس کی تعریف شرع کے رو سے حمل النظیر علی النظیر ہے۔ ''اسقاط'' اس پر ٹھیک نہیں اترتا، اس لئے کہ مسئلہ صوم، مسائل صلوٰۃ سے الگ ہے، نماز میں قصر ہے، روزے میں قصر نہیں، بلکہ قضا ہے۔ حائضہ و نفسہ کو نماز معاف ہے، روزہ معاف نہیں۔

حافظ: خیر، آپ اسے صدقہ سمجھ لیں، جو بہر حال مردے کے لئے مفید ہے۔

مولانا: مجھے اسقاط پر اعتراض ہے، صدقے پر نہیں۔ صدقے میں حساب کی حاجت نہیں۔

حافظ: اس میں قباحت کیا ہے؟

مولانا: اول یہ اصولِ اربعہ سے باہر ہے، اس لحاظ سے بدعت ہے۔ دوم بعض مقامات پر اموالِ موتیٰ کے وارث یتیم ہوں گے، آپ لوگوں نے رواجاً اسے لازم قرار دے لیا ہے اور اس کا ترک بعض کے نزدیک مثل ترکِ فرائض ہے، یتامیٰ کے مال میں بدوں وصیت تعرض ہوگا اور استعمال بے جا۔ اس لحاظ سے اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا کا مورد۔ سوم جب رکعتوں پر صدقہ مقرر ہوگیا تو آپ کو حق حاصل نہ ہوگا کہ تارک الصلوٰۃ پر احتساب جاری کریں، اس طرح یہ قاعدہ مسقطِ صلوٰۃ ہوا۔

رکاوٹ

مولانا سوات کے راستے باجوڑ جانا چاہتے تھے، خہر سے ملا کلیم اور سید عمران لوند خوڑ پہنچ گئے اور بتایا کہ سوات کے لوگ مزاحمت کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ عنایت اللہ خاں رئیس الاڈنڈ ان کا سرخیل ہے۔ چونکہ اہل سوات اور اہل باجوڑ میں سخت دشمنی تھی، اسلئے عنایت اللہ خاں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مولانا شاہ اسماعیل باجوڑ سے لشکر لے کر سوات پر چڑھائی کریں گے، یہ سنتے ہی لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ مولانا کو باجوڑ نہ جانے دیں گے۔

خہر پہنچ کر مولانا نے لوگوں کو بہت سمجھایا، لیکن عنایت اللہ خاں راضی نہ ہوا، بلکہ آخر میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب خان باجوڑ بھی نفاذِ احکامِ شریعت میں آپ کا ساتھی بن جائے گا تو پھر ہم کو بھی انھیں احکام کی اطاعت پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ہم سے عشر لیا جائے گا جو ہم پر گراں گذرتا ہے۔ لہٰذا ہم آپ کو ہرگز باجوڑ نہ جانے دیں گے۔ اگر آپ نے ہم پر عشر نافذ کردیا تو اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری سرزمین میں چلے جائیں گے۔

مولانا نے فرمایا: میں نے تمہارے سوا ایسے مسلمان آج تک کہیں نہیں دیکھے، جن

پر "شَاهِدِیْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ بِالْکُفْرِ" کا ٹھیک ٹھیک اطلاق ہوتا ہو، لیکن کیا کروں امیر المومنین کا حکم یہی ہے کہ تم سے قتال نہ کیا جائے۔

مراجعت

خمر سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں تھا، وہاں سے پیغام آیا کہ ہم احکامِ شریعت قبول کرنے کیلئے ہمہ تن تیار ہیں، مولانا ہمارے گاؤں تک پہنچ جائیں۔ پھر ان کی اور غازیوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہم بن جائیں گے، اور بے دغدغہ باجوڑ تک پہنچا دیں گے۔ مولانا اس تجویز کو قبول کر لیتے، لیکن اول سید صاحب نے تاکید فرما دی تھی کہ لڑائی نہ کی جائے، سب کو نرمی اور ملائمت سے سمجھایا جائے۔ دوم آگے بڑھنے کی صورت میں آٹھ کوس تک قدم قدم پر جنگ ناگزیر نظر آتی تھی، اور یہ حقیقت واضح تھی کہ مولانا کے پاس غازی بہت کم تھے۔ سوم اگر مولانا نکل بھی جاتے تو سید صاحب کے ساتھ سلسلۂ مواصلت اور رابطۂ نامہ و پیام بالکل منقطع ہو جاتا۔

آخر مولانا نے تمام حالات تفصیلاً سید صاحب کو لکھ بھیجے، وہاں سے حکم آیا کہ جلدی نہ کیجئے، خدا کارساز ہے، یہاں بہتر صورت پیدا ہو جائیگی تو اہل سوات کی اصلاح بھی کر لیں گے۔ فی الحال مناسب یہی ہے کہ آپ واپس آ جائیں۔ چنانچہ مولانا خمر ہی سے سید صاحب کے پاس چلے گئے اور باجوڑ تک نہ پہنچ سکے۔ (۱)

---

(۱) الیگزنڈر گارڈنر نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ میں نے امیر عالم خاں والیٔ باجوڑ کے ہاں مولانا شاہ اسمٰعیل کی تقریر سنی تھی، اس سے لوگوں میں اتنا جوش پیدا ہوا کہ میں نے طے کر لیا کہ مولانا کے پیر و مرشد سے مل جاؤں، ان جیسے لوگ میرے پاس ہوں گے تو میری خدمات کی بہت قدر ہوگی۔ (الیگزنڈر گارڈنر ص: ۱۶۹)
مولانا کا زورِ تقریر اور تاثیرِ دلپذیری بالکل مسلم ہے، لیکن وہ باجوڑ جا ہی نہ سکے، پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ گارڈنر امیر عالم خاں باجوڑی کے ہاں مولانا کی تقریر سنتا؟ یہ بیان بالکل بے سروپا ہے، اسی طرح گارڈنر کا یہ بیان بھی بے اصل ہے کہ امیر عالم خاں باجوڑی نے مجھے تین سو آدمی دے کر سید صاحب کی امداد کے لئے بھیجا اور میں بالاکوٹ گیا، دیکھا تو جنگ شروع تھی۔ میرے سامنے سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید ہوئے۔

تیسواں باب:

خوفناک سازش کا جال

روشن امیدیں

سلطان محمد خاں کے بعد درۂ خیبر سے اٹک تک پورے علاقۂ سرحد کے وسائل سید صاحب کی دسترس میں آ گئے تھے، مخالف عناصر ختم ہو چکے تھے، اب اطمینان سے ایک زبردست لشکر منظم کر کے سکھوں پر کامیاب یورش کے بہترین امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر سید صاحب کشمیر کی طرف پیش قدمی کرتے تو سلیمان والیٔ چترال زیادہ سے زیادہ امداد کے لئے تیار تھا اور کشمیر پر سکھوں کا قبضہ وتصرف خاصا کمزور نظر آ رہا تھا، جسے ختم کر دینا مشکل نہ تھا۔ پنجاب کی طرف بڑھتے تو غلزئی قبیلہ کے سردار ساتھ دینے پر آمادہ تھے، جو بنوں ہوتے ہوئے سید صاحب سے مل جاتے، ابتدائی کامیابی کے بعد سندھ کو بھی رفاقت پر آمادہ کر لینے کے قوی امکانات موجود تھے۔ سلطان محمد خاں کو جو علاقہ واپس کیا گیا تھا، اس کی زرخیزی اور سیرابی کا اندازہ اسی سے کر لیجئے، کہ ارباب بہرام خاں اسے سنبھال کر حفظ ودفاع کی پوری ذمہ داریاں قبول کرنے کے علاوہ چار ہزار غازیوں کا جیش اپنے خرچ پر مستقلاً سید صاحب کی رکاب میں دے دینے کا اقرار کر رہا تھا، اس علاقے کی آمدنی بدنظمی کی حالت میں بھی دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ سید صاحب جب سے سرحد پہنچے تھے، سازگار حالات کا ایسا روشن دور کبھی نہ آیا تھا۔

حسرت وافسوس

لیکن افسوس کہ خود مسلمانوں کی کج اندیشی، غرض پرستی اور ناحق کوشی کے باعث ان

امیدوں کی روشنی دیکھتے دیکھتے گل ہو گئی، بلکہ ان کی جگہ اشکہائے حسرت اور نالہائے غم باقی رہ گئے۔ تین چار برس کی جانفشانیوں سے جو کام سر انجام کو پہنچے تھے، وہ برباد ہو گئے، بہت سے غازی کا ملاً بے خبری کے عالم میں خاک و خون میں تڑپے، حکمرانی سے محرومی کے بعد اسلامیانِ ہند میں سے غیرت و حمیتِ حق کی جو بہترین اور عزیز ترین متاع جمع کی گئی تھی، وہ یوسف زئی کے میدانی علاقے میں جا بجا لٹ گئی۔ سید صاحب اپنے چار سالہ مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری کارگاہ کی تلاش میں نکلنے پر مجبور ہوئے، ابھی کسی جگہ جم کر بیٹھنے نہ پائے تھے کہ خلعتِ شہادت سے سرفرازی پا کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

سرداروں اور ملاؤں کی سازش

سردارانِ پشاور جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت سے انہوں نے خفیہ خفیہ سازش کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ جگہ جگہ ان کے قاصد دوڑنے لگے تاکہ ڈھب کے آدمی ساتھ ہو جائیں اور سید صاحب کے بکھرے ہوئے غازیوں کو ایک ہی وقت میں جا بجا شہید کر دیا جائے۔

سرحدی پٹھان صدیوں سے قبائلی طریقوں کے خوگر چلے آتے تھے، جو چیزیں مرورِ زمان سے ان کی زندگی کا لاینفک جزو بن چکی تھیں، انہیں وہ شرعی احکام کی طرح مان رہے تھے، اور ان کا ترک گوارا نہ تھا۔ کلمۂ توحید پر وہ بے شک ثابت قدم تھے، اسلام کے ساتھ محبت بھی تھی، لیکن اسلامی نظم و جمعیت سے یا تو وہ کبھی شناسا ہی نہ ہوئے تھے، یا سمجھ لیجئے کہ ایسے تمام نقوش بالکل مٹ چکے تھے۔ سید صاحب نے انہیں ضروریاتِ دین سے آگاہ کیا تو ان میں اصلاح کی ایک رو چلی، بیعت بھی کر لی لیکن اس بیعت کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ تھا کہ نماز ادا کرتے رہیں گے، روزے بھی رکھیں گے اور پیداوار میں سے کچھ حصہ ملاؤں کے بجائے سید صاحب کو دیتے رہیں گے۔

جب ہر مقام پر باقاعدہ تحصیل دار مقرر ہو گئے اور ان کے ساتھ حساب کتاب کے لئے محرر بیٹھ گئے تو یہ امر بعض لوگوں خصوصاً ملاؤں پر بہت شاق گذرا۔ بے خبر اور سادہ لوح پٹھانوں کے اسلام کی باگ ملاؤں ہی کے ہاتھ میں تھی، انہوں نے خفیہ خفیہ سید صاحب کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور پٹھانوں کو اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔ سید صاحب نے پٹھانوں کی مجلسی اور اخلاقی اصطلاحات کا کام سرگرمی سے جاری کیا تو ملاؤں کو اشتعال انگیزی کا ایک مؤثر حربہ مل گیا، وہ پٹھانوں سے کہنے لگے کہ دیکھو اب تو تمہارے ناموس بھی محفوظ نہیں رہے، یہ حالات سردارانِ پشاور کے لئے عین حسب مراد تھے، انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور خود غرض ملاؤں کے ذریعے سے پورے علاقے میں سازش کا وسیع جال بچھا دیا۔

دینی حربہ

ہم پہلے ایک محضر کا ذکر کر چکے ہیں، جو سلطان محمد خاں نے ملاقات کے وقت سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں اس محضر نے گمراہ کیا۔ اس میں سید صاحب اور ان کے رفقاء کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ کسی بھی مذہب کے پابند نہیں، اور انہوں نے ایک نیا دین نکالا ہے۔

پٹھانوں کے دل تو شرعی پابندیوں پر راضی نہ تھے، لیکن سید صاحب کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے انہیں یہ اندیشہ ضرور پریشان کر رہا تھا کہ یہ مخالفت کہیں خدا کی طرف سے وبال کا سرچشمہ نہ بن جائے۔ اس موقع پر سلطان محمد خاں نے محضر ملاؤں کے حوالے کر دیا، ملاؤں نے یہی محضر دکھا دکھا کر پٹھانوں کو اطمینان دلایا کہ سید صاحب کی مخالفت حقیقت میں دین کی بہت بڑی خدمت ہے، اور اس کیلئے خدا کی بارگاہ سے اجر و ثواب ملے گا۔ اس طرح سازش کی کامیابی کے لئے سازگار فضا مہیا کر لی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب

ایک چیز ناگوارِ خاطر ہو اور اس کی مخالفت کے لئے دینی سہارا بھی مہیا کر دیا جائے تو مخالفت میں کیسے تامل ہوگا؟

مقامی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں نے ایک لڑکی کے کان چیر کر اور سرننگا کر کے اسے فریادی کی حیثیت میں جگہ جگہ پھرایا تھا، پٹھانوں کے نزدیک فریادی کی یہ انتہائی دردانگیز صورت سمجھی جاتی تھی۔

حقیر اغراض کیلئے اسلام دشمنی

غرض مختلف اغراض و مصالح نے مختلف افراد و جماعت کو ایک مرکز پر جمع کر دیا، ان سب کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ سید صاحب جانبازانِ حق کے جس قدوسی قافلے کو لے کر ہزاروں میل کی منزلیں طے کر کے اس نیت سے سرحد پہنچے تھے کہ اسلام کی عزت، دین کی حمیت اور مسلمانوں کی آزادی کا پرچم بلند کریں، اس قافلے کو بے خبری کی حالت میں ذبح کر ڈالا جائے۔ سب کے سامنے حقیر ذاتی اغراض تھیں، سردار چاہتے تھے کہ وہ جس علاقہ پر حکمراں ہیں، اس میں شرعی محاسبے کا کوئی سوال پیدا نہ ہو اور وہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ عام لوگوں کی غرض یہ تھی کہ ان کے قبائلی معمولات میں کوئی خلل نہ پڑے، اگرچہ وہ معمولات اسلام کے کتنے ہی خلاف ہوں، اور اگرچہ ان کی وجہ سے آزادی اور اسلامیت پامال ہوتی رہے۔ ملاؤں کی غرض یہ تھی کہ وہ حسب سابق عوام سے پیسے بٹورتے رہیں، اگرچہ اس ضمن میں شریعتِ حقہ اسلامیہ کی جگہ رسومِ جاہلیت فروغ پائیں، ان اغراض کو کوئی مسلمان کس بناء پر جائز و بجا سمجھ سکتا ہے؟

ملک گیری کیلئے مسلمان آپس میں خونریز جنگیں بھی کرتے رہے تھے، اور اسلامی تاریخ کے صفحات سے برادر کشی کا لہو بھی برابر ٹپک رہا ہے، لیکن سردارانِ پشاور، اہلِ سرحد اور ان کے حق ناشناس ملاؤں نے جن حد درجہ حقیر اور دینی لحاظ سے سراسر شرمناک اغراض کیلئے غازیانِ اسلام کے خلاف سازش کی، اس کا تصور آج بھی قلب و روح پر لرزہ

طاری کر دیتا ہے۔ آہ! کہ یہ سب لوگ مسلمان تھے اور مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے، اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ جہل و بے خبری میں انہوں نے اسلام کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی کو دوستی سمجھ لیا۔

یہ زہرہ گداز اقدام مقدر ہو چکا تھا، قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا کہ ہندوستان کی اسلامی حمیت کا ایک مایہ ناز قافلہ اسی سرزمین میں لٹے، جس کی مظلوم اسلامیت کو اعدا کی ہولناک چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کیلئے وہ سیکڑوں روح فرسا مرحلوں سے گذر کر آیا تھا اور جس کی آزادی کی خاطر اس قافلے کے افراد نے بے دریغ اپنا خون بہایا تھا، اور اسے پورا کئے بغیر وہ اپنے اصل نصب العین یعنی آزادئ ہند کے لئے بھی کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

فتنے کی ابتدا

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سید صاحب اور سردارانِ پشاور کے درمیان مصالحت ارباب فیض اللہ خاں نے کرائی تھی، ارباب نے سید صاحب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر اب کے سرداروں کی طرف سے کوئی بے جا حرکت یا بے عنوانی سرزد ہوئی تو ان کا ساتھ چھوڑ کر غازیوں کی معیت اختیار کر لوں گا۔ مصالحت سے تھوڑے ہی دن بعد اس نے بھانپ لیا کہ سرداروں کی نیت صاف نہیں، جب اسے مخالفانہ توڑ جوڑ کی اطلاعات ملیں تو صاف دلی سے مولوی مظہر علی صاحب قاضی پشاور کو آگاہ کر دیا کہ ان لوگوں کی نیت میں فتور ہے، یہ غدار بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ امیر المومنین کو اطلاع دے کر اپنے لئے مناسب احکام لے لیں۔ (۱)

---

(۱) مولوی صاحب نے سید صاحب کو اطلاع دی تھی کہ ارباب نے ایک معتبر آدمی کی زبان سے حالات سن کر مجھے بتایا کہ سردار غدر پر آمادہ ہیں، نیز کہا تھا کہ اگر سردار مجھے اپنے پاس بلائیں تو آپ کو (مولوی صاحب کو) اس مجلس میں نہیں جانا چاہیے، اگر وہ آپ کو بلائیں تو میں نہیں جاؤں گا۔ (منظورہ ص: ۹۶۴)

مولوی صاحب نے مناسب سمجھا کہ عجلت کے بجائے خود حالات کا پورا اندازہ کرنے کے بعد سید صاحب کو لکھیں۔ اس اثناء میں ایک روز سلطان محمد خاں نے انہیں بلایا، وہاں کچھ علماء جمع تھے، یار محمد خاں کے قتل کی باتیں ہو رہی تھیں، مولوی مظہر علی صاحب کے پہنچتے ہی سلطان محمد خاں نے پوچھا کہ میرے بھائی (یار محمد خاں) کو کیوں مارا گیا؟ مجلس کے ہر فرد نے جوش وخروش سے یہی سوال دہرایا۔ مولوی صاحب نے اطمینان سے جواب دیا کہ شور مچانے سے کچھ فائدہ نہیں، اطمینان سے سوال کرو اور ایک ایک بات کا جواب سنتے جاؤ۔ پھر مختلف سوالوں کے جواب میں بتایا کہ خادے خاں اور یار محمد خاں نے اس کا بدلہ لینے کے لئے کمر باندھی، امیر المومنین نے ہر چند سمجھایا، خان پر کچھ اثر نہ ہوا، لہٰذا جو کچھ پیش آیا، اس کے ذمہ دار امیر المومنین نہیں ہو سکتے؟

غلط بیانیاں

پھر مولوی صاحب سلطان محمد خاں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اگر آپ کے دل میں اس معاملہ کے متعلق کوئی خلش تھی تو امیر المومنین کی بیعت سے پیشتر اس کا ازالہ کیوں نہ کرا لیا؟ سردار نے جواب دیا کہ اس وقت ہمارے علماء سید صاحب کے عساکر کے خوف سے پہاڑوں میں جا چھپے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ تحقیقات کے بغیر بیعت کر لی نیز یار محمد خاں کو اس وجہ سے خادے خاں کے انتقام کے لئے کھڑا ہونا پڑا کہ خادے خاں نے یار محمد خاں کے ہاتھ پر سرداری کی بیعت کی تھی۔ (۱)

یہ دونوں باتیں غلط تھیں، اس لئے کہ یار محمد خاں کا استاذ اخوند محمد عظیم، سید صاحب کے قیام پشاور کے وقت شہر میں موجود تھا اور اس نے سید صاحب سے ملاقات بھی کی تھی، نیز یار محمد خاں کے قتل کے سلسلے میں علماء سے کیا پوچھنا تھا؟ کیا یہ کہ وہ قتل جائز تھا یا ناجائز؟

---

(۱) یہ تمام حالات مولوی مظہر علی صاحب نے ایک مکتوب کے ذریعے سے پنجتار پہنچا دیے تھے۔

اس بارے میں سلطان محمد خاں مہینوں پہلے نہ محض علماء سے بلکہ اپنی مجلس کے ہر آدمی سے باتیں کر چکا تھا، پھر اس نے سید صاحب سے کیوں سب کچھ پوچھ نہ لیا؟

امر دوم کی حقیقت یہ ہے کہ اگر خادے خاں نے سید صاحب کے ورود سرحد سے پہلے یار محمد خاں کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو یار محمد خاں نے اس وقت یہ مسئلہ کیوں نہ اٹھایا جب خادے خاں سید صاحب کو اپنے ساتھ ہنڈ لے گیا تھا، اور وہاں اپنے زیر اہتمام خوانین وعوام کو بلا کر بیعت کی تھی؟ اس بیعت کے بعد خود یار محمد خاں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ اور خادے خاں دونوں سید صاحب کے زیر قیادت جنگ شیدو میں شریک ہوئے۔ زیدہ کی جنگ سے پیشتر سید صاحب نے صلح کے لئے کوشش فرمائی تھی تو اس موقع پر بھی یار محمد خاں نے کبھی یہ نہ کہا کہ خادے خاں اس کا ماتحت ہے اور ماتحت کے خون کا بدلہ اس کے ذمے ہے۔ وہ بارہ ہزار روپے لے کر خادے خاں کے بھائی، امیر خاں کی امداد کے لئے گیا تھا۔

مولانا شاہ اسماعیل کا مکتوب

مولوی مظہر علی کی طرف سے یہ روئیداد پنجتار پہنچی تو مولانا شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے حکم سے ایک مفصل مکتوب مولوی صاحب کے نام بھیج دیا جو مندرجہ ذیل مطالب پر مشتمل تھا:

۱۔ جن لوگوں نے یہ سوال اٹھائے وہ یا تو عالم نہیں، اس لئے انہیں لائق خطاب نہیں سمجھا جا سکتا یا ان کا مقصود تحقیق نہیں، صرف مکابرہ اور فتنہ انگیزی ہے۔

۲۔ خان ہنڈ نے بیعت کے بعد بغاوت کی اور کفار سے مدد لی، لہٰذا اس کے خلاف باغی کا سلوک کیا گیا۔

۳۔ حضرت امیر المومنین نے اس کے وارثوں کو بہت سمجھایا، لیکن وہ نہ مانے اور

بغاوت کے مسلک پر قائم رہے۔

۴۔ یار محمد خاں نے باغی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے امام کے خلاف اقدام کیا، یہ فعل شریعت حقہ کے سراسر خلاف تھا۔

۵۔ اس نے ظلم میں ابتدا کی اور بادی بالظلم کا معاملہ شرعاً محتاجِ تصریح نہیں۔

۶۔ سلطان محمد خاں، یار محمد خاں کے نقشِ قدم پر چلا، لڑائی میں شکست کھا کر تائب ہوا اور اطاعت گزار بنا۔ اب اس کی طرف سے جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، وہ سراسر بے محل اور تعجب انگیز ہیں۔

مسئلہ نفاق

ایک اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ مشکوٰۃ کی ایک روایت کے رو سے نفاق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے بعد ختم ہو گیا، لہٰذا سرداروں کو منافق کہنا جائز نہیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ حدیث نہیں بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اسے اگر ظاہر پر حمل کریں تو یہ متعدد آیتوں اور حدیثوں سے متعارض ہوگا۔ مثلاً ایک آیت میں کفار کی دوستی کو مدارِ نفاق قرار دیا گیا ہے اور یہ فعل کسی زمانے سے مختص نہیں۔ ایک آیت میں خدا سے فریب، نماز میں تکاسل، عبادت میں ریا اور قلتِ ذکرِ الٰہی کو نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: جھوٹ، خیانت اور عہد شکنی، یہ باتیں بھی کسی خاص وقت یا زمانے کیلئے نہیں۔

غرض زیرِ غور قول کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ زمانہ رسالت میں منافقوں کا علم وحی کے ذریعے سے ہو جاتا تھا اب وہ ذریعہ باقی نہیں رہا، اب ہم صرف علامتوں کی بنا پر حکم لگا سکتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر زمانۂ رسالت میں وحی کے ذریعے منافقین کی قطعی تعیین ہو جاتی تھی، اب تعیین قطعی کا کوئی ذریعہ باقی نہیں، نہ یہ کہ نفاق ناپید ہو گیا یا کسی میں نفاق کی

علامتیں پائی جائیں تو اسے منافق قرار نہیں دینا چاہئے۔

مولانا نے آخر میں لکھ دیا کہ ان معاملات کے متعلق خود گفتگو چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص یہ سوال اٹھائے تو اسے نرمی سے جواب دیں، مباحثے کی نوبت آئے تو ہماری تحریر حوالے کر دیں اور خود ساتھیوں کو لے پنجتار چلے آئیں۔(۱)

مخلصین کی اطلاعات

جس روز قاصد مولانا اسماعیل کا مندرجہ بالا مکتوب لے کر پشاور روانہ ہوا، اسی روز شیخ حسن علی کا بھائی عبدالعزیز دکھاڑا سے پنجتار پہنچا اور عرض کیا کہ مسجد دکھاڑا کے امام سید محمد اصغر کو خوانین سمہ کی ایک سازش کا علم ہوا ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب کے جو غازی دیہات میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں، ان پر رات کے وقت اچانک حملہ کر کے شہید کر ڈالا جائے۔(۲)

سید صاحب کو اپنی پاک نفسی کی بنا پر یقین نہ آیا اور فرمایا:

> شیخ بھائی! یہ بات خیال میں نہیں آتی، غلط سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس ملک میں رئیس اور خوانین، ہمارے موافق ہیں، ہم کو ان سے ہرگز ایسی امید نہیں۔ غالباً ہمارے اور ان کے درمیان نااتفاقی ڈالنے کیلئے یہ خبر اڑائی گئی ہوگی۔

شیخ عبدالعزیز نے خود یہ بات اپنے بھائی سے سنی تھی تو کہا تھا کہ غلط معلوم ہوتی ہے، کہیں مسلمان بھی مسلمانوں سے ایسی دغابازی کر سکتے ہیں؟ لیکن شیخ حسن علی نے کہا کہ سید محمد اصغر بھروسے کا آدمی ہے، وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتا، تم جا کر یہ اطلاع پنجتار پہنچا آؤ۔

---

(۱) یہ مکتوب پنجتار سے ۱۵ رجمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ (یکم نومبر ۱۸۳۰ء) کو پشاور بھیجا گیا۔

(۲) شیخ حسن علی ان کے بھائی عبدالعزیز اور عبدالباقی نیز ان کا بھتیجا عبدالقادر اس زمانے میں سید صاحب کے حکم کے مطابق دکھاڑا میں مقیم تھے، جو پنجتار سے اڑھائی کوس شمال مشرق میں ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اطلاع دینے والوں میں تورسک (علاقہ بونیر) کا ایک شخص محسن خاں بھی تھا، جسے کوہ کڑہ پر آگ جلانے کے نشان کی اطلاع ایک دوست سے ملی اور اس نے خود پنجتار جا کر غازیوں کو متنبہ کیا۔

شیخ نے واپس جا کر اپنے بھائی اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی رائے سنا دی تو انہیں بڑا افسوس ہوا، سید محمد اصغر نے دوبارہ شیخ صاحب کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میری اطلاع غلط نہیں، ضروری ہے کہ تمام غازیوں کو فی الفور پنجتار بلا لیا جائے اور اس معاملے میں دیر بالکل نہ کی جائے۔ شیخ عبدالعزیز نے دوبارہ حاضر ہو کر معروضہ پیش کیا، سید صاحب نے ازراہِ شفقت ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے فرمایا:

> بھائی! یہ بات غلط ہے، سمہ کے خوانین اور ملک ہمارے دوست ہیں، شاید کسی مفسد نے یہ خبر اس غرض سے مشہور کی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے۔ آپ جائیں اور اپنے گھر میں دل جمعی سے بیٹھیں۔(۱)

شیخ عبدالعزیز دوبارہ دکھاڑا پہنچے اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی گفتگو سنائی تو فرطِ قلق سے اس پیکر اخلاص کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ بولا: میری اس بات کو یاد رکھنا، دو تین روز میں حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔(۲)

آتشِ بغاوت کے ابتدائی شعلے

صحیح تاریخ معلوم نہیں مہینہ نومبر کا تھا کہ منشی امام الدین بمبئی والا پشاور سے آدھی رات کو پنجتار پہنچا۔ محمد امیر خاں قصوری کی روایت ہے کہ میں پہرے پر کھڑا تھا، امیر المومنین برج کے کوٹھے پر محوِ آرام تھے، ایک سوار نے آواز دی۔ میں نے پوچھا کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ جواب ملا: امام الدین بمبئی والا ہوں اور پشاور سے آیا ہوں۔ حضرت کو ابھی اطلاع دو۔

---

(۱) یہ "وقائع" کی روایت ہے۔ "منظورہ" میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ایں مردم ہمگی با ما خصوصیتے دارند۔ ایں سخن غلط خواہد بود۔ (منظورہ ص: ۹۷۴، ۹۷۵)

(۲) "وقائع" میں ہے کہ سید محمد اصغر نے تیسری مرتبہ شیخ حسن علی کو بھیجا، لیکن سید صاحب نے نیک طینی کی بنا پر اسے دشمنوں کی افسانہ طرازی قرار دیا۔

سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو برج کی کھڑکی کھول کر پوچھا: کیا بات ہے؟ عرض کیا گیا کہ امام الدین بمبئی والا پشاور سے آیا ہے، فرمایا: خیر ہے! پھر اسے اوپر بلا لیا۔ پاس پہنچتے ہی اس نے بتایا کہ سرداروں نے مولوی مظہر علی صاحب اور ان کے ساتھی غازیوں، نیز ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر ڈالا۔ میں اپنی تلوار صیقل گر سے لینے گیا تو راستے میں ایک شخص نے مجھے الگ لیجا کر واقعہ شہادت بتایا اور کہا کہ فوراً بھاگ جاؤ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔ میں وہاں سے نکلا، ہزار خانی سے گھوڑا لیا، اس پر زین بھی نہ ڈالی، دریا کو عبور کر کے حمزہ علی خاں رسالدار کے پاس پہنچا، ان سے دوسرا گھوڑا لیکر یہاں آیا ہوں۔ (۱)

شہادت کی تفصیل صرف اس قدر معلوم ہو سکی کہ سلطان محمد خاں نے مولوی صاحب کو مشورے کے بہانے ایک کوٹھری میں بلایا، وہاں پہلے سے چند آدمی تلواریں سنبھالے کھڑے تھے۔ جونہی مولوی صاحب کوٹھری میں پہنچے، ان پر ایک دم تلواریں پڑیں اور وہ واصل بہ حق ہوئے۔ ان کے ساتھیوں کو بعد میں شہید کر ڈالا گیا۔ منشی امام الدین اس وجہ سے بچ گیا کہ قیامگاہ پر موجود نہ تھا، ارباب فیض اللہ خاں کو اس وجہ سے جامِ شہادت پلایا گیا کہ وہ مرحوم قول کا سچا اور عہد کا پکا تھا، سرداروں کی کمینہ حرکتوں کو مذموم جانتا تھا۔ ان کی سنگ دلی اور محسن کشی ملاحظہ ہو کہ جس شخص نے انہیں ریاست واپس دلائی تھی، اسے بھی بے تکلف موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یقیناً اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر ارباب نے اپنے دعوے کے مطابق غازیوں کا ساتھ دیا تو سازش ناکام ہو جائے گی۔

غازیوں کی کیفیت

غازی اس وقت مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے، میں جہاں تک معلوم کر سکا ہوں، نومبر ۱۸۳۰ء میں یہ کیفیت تھی:

---

(۱) "وقائع" جلد سوم ص: ۱۵۱ تا ۱۵۲

۱۔ ایک جماعت شیخ بلند بخت دیوبندی کی ماتحتی میں امب میں مقیم تھی۔

۲۔ ایک جیش حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کی سرکردگی میں گڑھی چھتربائی کی حفاظت کر رہا تھا۔

۳۔ ایک جماعت مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے ساتھ لونڈ خوڑ میں تھی۔

۴۔ ایک جماعت پیر خاں مورائیں کے ساتھ کھبل میں بیٹھی تھی۔

۵۔ ایک جماعت مولوی نصیرالدین منگلوری کے زیر سرکردگی ٹوپی میں تھی۔

۶۔ حاجی حمزہ علی رسالدار سواروں اور شاہین خانے کے ساتھ شیوہ میں تھے، وہی مقام ان کا مستقل مرکز تھا۔

۷۔ مولوی حامد علی جھنجھانوی کم و بیش تیس غازیوں کے ہمراہ میگئی میں تھے، جہاں پن چکیوں پر غازیوں کے لیے آٹا پستا تھا۔ اس وجہ سے میگئی غازیوں کی رسد کا ایک مرکز بن گیا تھا۔

۸۔ خود سید صاحب پنجتار میں تھے، آپ کے ساتھ بھی غازیوں کی خاصی بڑی جماعت تھی۔

۹۔ کچھ مجروح اور بیمار دکھاڑا میں تھے جن کی خدمت پر کئی غازی مامور تھے، غالباً سید صاحب کی بی بی اور دوسری مستورات بھی وہیں تھیں۔

باقی غازی دو دو چار چار کر کے مختلف دیہات میں منتشر تھے۔ انکا ذکر آگے آتا ہے۔

جلبی کا فرمان

سید صاحب نے منشی امام الدین کی بات سنتے ہی مولانا شاہ اسماعیل، شیخ ولی محمد پھلتی، منشی محمدی انصاری اور دوسرے مشیروں سے مشورہ کیا۔ (۱) قرار پایا کہ تمام غازیوں

---

(۱) مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ منشی خانہ مسجد کے جنوب میں تھا۔ منشی محمدی انصاری آدھی رات کے وقت باہر گئے تھوڑی دیر بعد واپس آ کر انہوں نے یہ الم انگیز واقعہ سنایا تو فرط قلق سے کسی کو نیند نہ آئی۔

کو طلبی کا پیغام بھیج دیا جائے، یہ پیغام اسی وقت بھیج دینا چاہیے تھا، لیکن شیخ ولی محمد نے عرض کیا کہ رات کے وقت قاصدوں کا بھیجنا مناسب نہ ہوگا، صبح انتظام کر لیا جائے گا۔

صبح ہوئی تو سید اسماعیل رائے بریلوی کو حکم ملا کہ سید صاحب کی سواری کے گھوڑے پر شیوہ پہنچیں، وہاں مولوی محمد رمضان اور دوسرے غازیوں کو بہ صیغۂ راز یہ خبر سنا دیں اور کہہ دیں کہ سب عجلت کے ساتھ پنجتار آ جائیں۔ حمزہ علی خاں کو تاکید کر دی جائے کہ دو دو چار چار سوار مختلف دیہات میں بھیج کر سب غازیوں کو مراجعت کا پیغام پہنچا دیں، مولانا شاہ اسماعیل نے توپیں مسجد کے جنوبی و مغربی گوشے میں نصب کرا دیں۔ (۱)

گڑھی امان زئی کا ایک شخص نصر اللہ خاں اس وقت پنجتار میں تھا، وہ سازش میں شریک تھا اور غالباً مخبری کی غرض سے پنجتار پہنچا ہوا تھا۔ غازیانِ پشاور کی شہادت کا واقعہ راتوں رات پنجتار میں سب کو معلوم ہو چکا تھا، اس فیصلے کا بھی علم ہو گیا تھا کہ غازیوں کو بہ تاکید بلا لیا گیا ہے، نصر اللہ فوراً روانہ ہو گیا اور ہر بستی کے لوگوں کو بتا گیا کہ جس کام کے لیے پرسوں رات کا وقت مقرر ہو چکا ہے، اسے کل رات ہی پورا کر لینا چاہیے۔ اگر یہ نہ ہوا تو غازی سلامت نکل جائیں گے اور سازش بالکل بے نتیجہ رہے گی۔ (۲)

فیصلۂ قضا و قدر

بہر حال سید اسماعیل رائے بریلوی شیوہ پہنچے تو حاجی حمزہ علی خاں نے سوار مختلف دیہات میں بھیج دیے، ان کے ذریعے سے یہی پیغام بھیجا جا سکتا تھا کہ جلد سے جلد پنجتار پہنچو۔ اصل واقعہ بتانا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ غازیوں کو فوری روانگی کا

---

(۱) مسجد کی تفصیل کسی روایت میں نہیں بتائی گئی، یعنی آیا اس سے پنجتار کے اندر کی مسجد مراد ہے، یا وہ جگہ جہاں غازی جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ اس سے آخر الذکر مقام مراد ہے۔

(۲) "منظورہ" میں ہے: در دیہات ہمہ جاے کہ رسید، در گوش ہمہ رازداران خود ایں افسوں دمید کہ کارے کہ موعد آں بہ شب پس فردا است فردا اگر نہ کنید کار از دست خواہد رفت۔ (ص: ۹۷۷)

احساس نہ ہوا، اکثر نے سمجھا کہ شاید پشاور پر دوبارہ حملہ ہونے والا ہے اور لشکر تیار ہو رہا ہے، اس وجہ سے وہ اپنے دیہاتی دوستوں اور شناساؤں سے بے اطمینان ودائی ملاقاتیں کرتے رہے، ان ملاقاتوں میں دیہاتیوں کو غازیوں کے اوقاتِ روانگی کا بھی علم ہو گیا، حالانکہ اسے مخفی رکھنا بے حد ضروری تھا۔

اب واقعات پر پھر ایک دفعہ نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ مولوی مظہر علی کو ارباب فیض اللہ خاں نے بہت پہلے بتا دیا تھا، وہ اس انتظار میں رہے کہ خود سارے حالات کا اندازہ کر کے اطلاع بھیجیں، ایسا نہ ہو کہ عجلت میں کوئی غیر محقق بات سید صاحب تک پہنچانے کے مرتکب ہوں۔

۲۔ سید محمد اصغر امام مسجد دکھاڑا نے دو یا تین مرتبہ تاکیدی پیغامات بھیجے، سید صاحب سمجھتے رہے کہ یہ مخالفوں کی سخن سازی ہے۔

۳۔ واقعہ پشاور کی اطلاع رات کو مل گئی تھی، اسی وقت قاصد جابجا روانہ ہو جاتے اور غازیوں کو بے توقف بلا لیا جاتا تو وہ محفوظ رہتے۔ اسے شیخ ولی محمد نے خلافِ مصلحت قرار دے کر توقف میں ڈالا۔

۴۔ سید اسماعیل رائے بریلوی وگر سواروں سے کہہ دیتے کہ بلاوے کے ساتھ اصل واقعہ کی طرف اشارہ بھی کر دیتا تو غازی روانگی میں تاخیر نہ کرتے اور حفاظت کے لئے چوکس ہو جاتے۔

۵۔ نصر اللہ خاں گڑھی امان زئی والے کو پنجتار میں روک لیا جاتا تو وہ اہلِ سمہ کو یہ اطلاع نہ دے سکتا کہ موعدِ قتل کو ایک رات مقدم کر لو۔

بہر حال عزیز و علیم کی تقدیر پوری ہو کر رہی، اگر یہ ناشدنی سانحہ پیش نہ آتا تو دعویٰ کرنا بے شک مشکل ہے۔ لیکن اس حقیقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ اسلامیانِ ہند کی گزشتہ سوا سو برس کی سرگزشت کا رنگ بالکل مختلف ہوتا:

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

اکتیسواں باب:

مشہد اکبر (۱)

بہ جرم عشق توام مے کشند غوغائے است
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائے است

سرداران پشاور اور اہل سمہ کی سازش سے جس دردانگیز مقتل کا انتظام ہوا، اس کے پورے حالات ہمارے سامنے نہیں آئے، لیکن جو کچھ معلوم ہو سکا اسے بیان کر دینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہماری بدبختیوں کی یہ خونچکاں داستان بھی سننے اور عبرت کی غرض سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔

مولوی محمد جعفر مرحوم تھانیسری نے بالکل صحیح فرمایا کہ قلم اس واقعہ محزنہ کی تفصیل لکھنے پر جرأت نہیں کرتا۔(۱) لیکن سوانح نگار کے لئے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جو کچھ پیش آیا اسے بہر حال بیان کر دے، اگرچہ وہ کتنا ہی المناک اور کتنا ہی حزن افزا کیوں نہ ہو۔ بدبختی اور سیہ نصیبی کا اس سے زیادہ قلق انگیز واقعہ کیا ہو سکتا ہے کہ جو جانبازان راہ حق، عزت و حرمت اسلام کی تڑپ سے بے تاب ہو کر اور اپنے گھروں کی راحت افروز زندگیوں کو ٹھکراتے ہوئے مہاجر الی اللہ بن کر سرحد پہنچے تھے، تاکہ پہلے اہل سرحد کو اغیار کی ترکتازیوں سے نجات دلائیں، ان کی آزادی کو بچائیں اور اسلام کی برکتوں سے مالا مال کر دیں، پھر پورے ملک کے مسلمانوں کو محکومی کی ذلت سے باہر نکالیں، وہ غیروں نہیں بلکہ خویشوں کے ہاتھوں ذبح و قتل کا نشانہ بنے۔ جو غازی اپنی جانیں مسلمانوں کے

---

(۱) تواریخ عجیبہ ص: ۱۳۰

امن و اطمینان اور راحت و آسائش کے لئے بے دریغ قربان کر رہے تھے، وہ مسلمانوں کی تلواروں سے خاک و خون میں تڑپے۔ جس سرزمین میں مشہدِ اکبر پیش آیا، اگر اس کے ذروں کو آج طاقتِ گویائی مل جائے تو کتنے دل اس داستانِ غم کی تاب لاسکیں گے؟

اسماعیلہ

مولوی مظہر علی کی شہادت کے بعد غازیوں پر حملوں کا آغاز موضع اسماعیلہ سے ہوا۔ حاجی بہادر شاہ خاں سید صاحب سے مل کر گڑھی امان زئی جا رہے تھے، اسماعیلہ پہنچے تو لوگوں نے بہ اصرار ایک رات کے لئے ٹھہرا لیا۔ اہل اسماعیلہ ہی نہیں، ساری رزڑ قوم کو حاجی صاحب سے خاص عقیدت تھی، وہ ٹھہر گئے، انہیں پر تکلف کھانا کھلایا اور عشاء کی نماز میں امام بنایا۔ جب وہ پہلی رکعت کے سجدے میں گئے تو موضع کے خان، اسماعیل خاں نے تلوار سے ان کا سرتن سے جدا کر دیا اور اس مرحوم کی روح پاک سبحان ربی الاعلیٰ کے ذکر میں ڈوبی ہوئی اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔(۱) سبحان اللہ! کیا موت تھی جس پر تقویٰ اور شب بیداری کی سیکڑوں زندگیاں بے تکلف قربان کی جاسکتی ہیں۔

”خندروس کوبئ“

حاجی بہادر شاہ خاں کی شہادت کے ساتھ ہی اسماعیلہ میں نقارہ بجا۔ اس کی آواز سن کر بستی بستی نقاروں کا تار بندھ گیا، قرارداد کے مطابق یہ اس امر کا اعلان تھا کہ جو کچھ باہم طے کر چکے تھے، اس پر عمل کا وقت آ گیا۔ بعض مقامات کے غازیوں نے نقارہ کوبی کو غیر معمولی فعل سمجھ کر وجہ پوچھی تو بے دردوں نے بتایا کہ ”خندروس کوبئ“ (جوار کوٹنے) کے لئے لوگوں کو جمع کرنا منظور ہے، تاکہ جلد سے جلد اس کام سے فارغ ہو جائیں۔ پھر عشر حضرت امیر المومنین کے پاس پہنچا دیں۔ اصل میں ”خندروس کوبئ“ پہلے سے ایک

---

(۱) منظورہ ص: ۹۸۰، ۹۸۱

اصطلاح مقرر کر لی تھی، جس سے مراد غازیوں کا قتل تھا، لیکن غازی بیچارے اس اصطلاح کے حقیقی مطلب سے کیوں کر آگاہ ہو سکتے تھے؟

موضع شیوہ

موضع شیوہ رسالدار کا مرکز تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے وہ سواروں کو مختلف دیہات میں بھیج کر روانہ ہو گئے اور غازیوں کو صحیح حالات کی اطلاع دیے بغیر پنجتار پہنچنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔ وہاں کے خوانین میں سے آنند خاں اور مشکار خاں سید صاحب کے سچے عقیدت مند تھے، اور آخر تک عقیدت مند رہے۔ جو غازی شیوہ میں تھے، ان میں سے حافظ عبداللہ، شیخ ناصر الدین، مولوی محمد رمضان اور شیخ گلاب کے سوا کسی کا نام معلوم نہیں ہو سکا، سید امیر علی اور حافظ عبد العلی پھلتی (بن حافظ قطب الدین) عشر کی تحریر پر مامور تھے، اور اس سلسلے میں دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ بھی اتفاقیہ شیوہ پہنچ گئے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خطرے کا کچھ نہ کچھ احساس تھا، نقارے کی آواز سنی تو بھانپ گئے کہ شرارت ہونے والی ہے۔

سید امیر علی کے پاس بیت المال کا پانچ ہزار روپیہ جمع تھا، انہیں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس روپے کو پنجتار پہنچا دینا لازم ہے، چنانچہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور حافظ عبد العلی کو ساتھ لے کر گاؤں کے باہر پہنچ گئے۔ پھر حافظ صاحب یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، آپ کے پاس بیت المال کی امانت ہے، گاؤں سے باہر آ چکے ہیں، آپ چلے جائیں۔ سید امیر علی نے گھوڑا سرپٹ ڈال دیا، راستے میں انہیں ایک جانب ذرا فاصلے پر مفسدوں کا گروہ نظر آیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔

گاؤں کا محاصرہ

بقیہ غازی ہتھیار سنبھال کر مقابلے کے لئے تیار ہو گئے، اسی وقت آتند خاں اور مشکار خاں دوڑے ہوئے مولوی محمد رمضان کے پاس پہنچے اور بہ منت التماس کی کہ ہمارے ہاں چلے چلئے وہاں کسی کو آپ پر حملے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ مولوی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس وقت محافظِ حقیقی کی حفاظت کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں، اگر یہ لوگ ہمیں ختم کر دینے ہی پر تلے بیٹھے ہیں تو ہم سے بھی اپنے بچاؤ کے لئے جو کچھ ہو سکے گا، اس میں توقف نہ کریں گے۔

گاؤں والوں نے پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا اور باہر نکلنے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے، غازی باہم یہ طے کر کے بیٹھ گئے کہ رات بھر نگہبانی کا بندوبست جاری رہے، دن نکلے گا تو کسی نہ کسی تدبیر سے محاصرے کو توڑ کر پنجتار چلے جائیں گے۔

شیخ گلاب کا بیان

فیصلے کے مطابق صبح باہر نکلے اور جنگ کرتے ہوئے پنجتار کی طرف چلے، لیکن چند آدمی سیکڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں کی ندی تک پہنچتے پہنچتے ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے، صرف شیخ گلاب زندہ بچے، جو پیش آمدہ حالات کے راوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بے طرح زخمی ہو کر گر پڑا، مفسدوں نے ہتھیار اتار لئے اور مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے، کچھ دیر کے بعد ایک ملا آیا، اس وقت میرے حواس بحال ہو چکے تھے، لیکن اٹھنے کی ہمت نہ تھی، ملا کو میرے حال پر رحم آیا، وہ بستی سے دو آدمیوں کو لایا اور چارپائی پر ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک دن اور ایک رات میری تیمارداری کی، پھر دو آدمیوں سے میری چارپائی اٹھوا کر پنجتار پہنچا گیا۔

حافظ عبد العلی

حافظ عبد العلی کو سید امیر علی کے ساتھ نکل جانے کا موقع مل گیا تھا، لیکن اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور واپس جا کر اپنے مصیبت زدہ بھائیوں میں شامل ہو گئے۔ شیوہ عی میں گاؤں اور ندی کے درمیان کسی جگہ شہادت پائی۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ حافظ صاحب جنگ پھولڑہ میں بھی شریک تھے، وہاں سے سلامت اسپ پہنچے تو اپنے خاص رفیقوں کی مجلس میں بار بار حسرت سے کہا کرتے تھے کہ شہادت نصیب نہ ہوئی، کیا معلوم تھا کہ ان کی شہادت غیروں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ اپنوں کے ہاتھ سے مقدر تھی۔

غازی محمد حسین ترکئی میں تھے، مولوی امیر الدین اور ریاست علی موہانی یاروسین میں، یہ بھی اسی ہنگامے میں شہید ہوئے لیکن شہادت کی تفصیل بیان کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لئے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا حالات پیش آئے اور کس طور انہیں سعادت شہادت نصیب ہوئی۔

ترلانڈی

موضع ترلانڈی کے متعلق لکھمیر خاں کا بیان ہے کہ گاؤں والوں نے راتوں رات باہر جانے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے، غازیوں کو اس ناکہ بندی کا علم نہ تھا، خود لکھمیر خاں کو غسل کی حاجت تھی، بڑے تڑکے اٹھے اور ندی کا رخ کیا۔ ایک آدمی نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ بتایا: غسل کیلئے ندی پر جا رہا ہوں، دوسرے نے کہا: ”جانے دو“ ان کا خیال غالبًا یہ ہوگا کہ یہ غسل کے بعد واپس آئے گا تو خود بخود مارا جائے گا۔ ابھی تڑکے ہی ہنگامہ بپا ہوا تو دوسرے غازی متنبہ ہو جائیں گے۔

غسل کرتے کرتے اجالا ہو گیا، لکھمیر صرف پاجامہ پہن کر نماز کیلئے کھڑے ہو گئے، اس اثناء میں دو آدمی آئے، ایک نے ان کی تلوار اٹھائی، دوسرے نے کپڑے

سنبھال لئے۔ سلام پھیر کر دیکھا تو سمجھے کہ خوش طبعی کر رہے ہیں، اچانک ایک نے زور سے مکا مارا اور دھکا دیا، پھر دونوں نے ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔

لکھمیر خاں کی صاف گوئی

ان آدمیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیوں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائیں یہیں اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ دوسرا بولا کہ نہیں، اسے بھی وہیں لے جا کر ماریں گے جہاں اسکے ساتھی مرے پڑے ہیں۔ یہ بات سن کر **لکھمیر** کو اندازہ ہو گیا کہ گاؤں میں کیا کچھ پیش آ چکا ہے، اور ان کے ساتھیوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ صاف گوئی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

> یہ بات سنتے ہی میرے دل پر خوف مستولی ہو گیا اور یقینی موت نظر آنے لگی۔ اس وقت اللہ نے مجھے ہمت دی، پورا زور لگا کر ایک جھٹکا مارا اور ہاتھ چھڑا کر سرتوڑ بھاگا۔ انہوں نے پیچھا کیا لیکن مجھے پکڑ نہ سکے، پھر سواروں سے جا کر کہا کہ وہ شخص بھاگ گیا ہے، اسے پکڑو۔ چنانچہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا میرے پیچھے آیا، وہ ندی کے پاس پہنچا تو اتفاق سے اس کا گھوڑا دوسری سمت بھاگ نکلا، سوار میرا پیچھا چھوڑ کر گھوڑے کے تعاقب میں چلا گیا اور میں پنجتار چلا آیا، جن دیہات میں شور تھا ان سے دور دور ہی رہا۔

کچھ معلوم نہیں کہ ترلانڈی میں کتنے غازی تھے۔ "وقائع" میں ہے کہ پانچ سوار رہتے تھے، تین ایک حجرے میں دو ایک حجرے میں۔(۱) پیادوں کے بارے میں علم نہ ہو سکا۔

مینئی

مینئی میں غازیوں کے لئے آٹا پستا تھا۔ وہاں غلے اور آٹے کے گودام قائم ہو گئے

---

(۱) "وقائع" جلد سوم ص: ۲۵۸

تھے۔ میر حامد علی جھنجھانوی اس کاروبار کے مہتمم تھے اور بیس پچیس غازی ان کے ساتھ ہتے تھے۔ مولوی خدا بخش رام پوری بھی انہیں میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بیمار تھا، یک سوار آیا، حاجی فاضل پشاوری بھی اس کے ساتھ تھا۔ سوار نے مولوی مظہر علی اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی خبر سنائی، ساتھ ہی میر حامد علی سے کہا کہ حضرت نے ہر جگہ سے ازیوں کو پنجتار بلا لیا ہے، آپ کو حکم ہے کہ جتنا آٹا موجود ہو وہ اور ہمراہیوں کو لے کر چلے آئیں، میں دوسرے دیہات کے غازیوں کو بھی خبر پہنچانے جا رہا ہوں۔

اتفاق یہ کہ میر حامد علی اپنے سارے اونٹ اور خچر غلہ لانے کے لئے گندف بھیج چکے تھے، انہوں نے فوراً حاجی فاضل کو گندف بھیج دیا کہ اگر غلہ لادا بھی جا چکا ہو تو اسے اتروا کر انور جلد واپس لے آئیں۔ ظہر اور عصر کے درمیان حاجی صاحب جانور لے کر میکی پہنچ گئے اور اپنے ساتھ کرایے کے گدھے اور خچر بھی لے آئے۔ شام تک آٹا بوریوں میں بھر لیا گیا۔ عشاء تک تمام غازی کھانے سے فارغ ہو گئے۔

پنجتار میں ورود

روانگی کی تیاری مکمل ہو چکی تو میر حامد علی نے میکی کے خان معز اللہ خاں کو بلایا، اس کا بھائی شاہ ولی خاں آیا اور بتایا کہ میرا بھائی پنجتار گیا ہوا ہے، میں ہر خدمت کے لئے اضر ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ مجھے حکم آیا ہے کہ آٹا پنجتار پہنچاؤں، جتنا لے جا سکتا وں لے جا رہا ہوں، باقی آٹے اور غلے کی حفاظت آپ کے ذمے ہے۔ ہمارے تین آدمی یہاں رہیں گے، ان کی حفاظت کیجئے۔

عشاء کے بعد میر حامد علی روانہ ہوئے، جھنڈا بوکا اور توتالی ہوتے ہوئے پنجتار پہنچ گئے۔ سید صاحب نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ پنجتار کے جنوبی دروازے پر استقبال کیا، اس قافلے میں کل ستائیس غازی تھے، اسی روز دوپہر کے وقت مولوی نصیر الدین منگلوری اپنے ساتھیوں کو لے کر ٹوپی سے آ گئے حکم کے مطابق چلے آئے تھے، اگرچہ

ٹوپی میں کوئی خطرہ نہ تھا، اس لئے کہ یہ علاقہ سازش میں شریک نہ تھا۔

گودام اور اس کے نگہبان

میر حامد علی نے جن تین آدمیوں کو نگہبانی کے لئے چھوڑا تھا، ان میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں: ایک خدا بخش رام پوری، جو بیمار تھے، دوسرے داؤد خاں خورجوی۔

گودام کے دو بڑے کمرے تھے، ایک میں غلہ اور آٹا رہتا تھا، دوسرے میں غازی مقیم تھے۔ اس کا احاطہ بہت وسیع تھا، اسی رات کھبل سے پیر خاں مورائیں پینتیس غازیوں کے ساتھ پہنچ گئے اور شاہ ولی خاں کی مسجد میں اترے، ان کی طرف سے رمضان یہ پیغام لے کر آیا کہ پینتیس آدمیوں کی رسد دے دی جائے، داؤد خاں نے رسد تول دی، غازیوں نے کھانے سے فارغ ہو کر وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

اشتباہ اور حملہ

اس وقت تک غازیوں کے خلاف سازش کی خبر عام ہوچکی تھی، ایک نیک دل ملا نے پیر خاں کو بہ صیغہ راز یہ خبر پہنچائی اور مشورہ دیا کہ یہاں سے فوراً نکل جایئے۔ یہ غازی لمبی منزل طے کر کے پہنچے تھے اور پیش آنے والے حالات کا انہیں قطعاً اندازہ نہ تھا، بولے: ذرا سستا لیں پھر روانہ ہوجائیں گے۔ ملا بیچارے نے دلسوزی سے کہا کہ میں نے سمجھا دیا، اب آپ مختار ہیں۔ غازیوں نے کچھ خیال نہ کیا اور اطمینان سے سو گئے۔

ان میں سے دو آدمی مسجد سے نکل کر گودام میں پہنچ گئے: ایک یوسف علی خاں فرزند حسن علی خاں ساکن دربند، دوسرے حبیب خاں بوتیروال۔ اس طرح گودام میں پانچ غازی جمع ہوگئے اور مسجد میں تینتیس غازی رہے۔ گودام والوں نے باہم فیصلہ کیا کہ چار سو جائیں ایک پہرہ دے۔ یکایک گولی چلی، خدا بخش رام پوری نے پوچھا: پہرے پر کون ہے؟ معلوم ہوا داؤد خاں ہے۔ پوچھا: گولی کدھر سے آئی، جواب ملا: قبلے کی سمت

سے۔ پھر دوسری گولی چلی، خدا بخش نے ساتھیوں کو ہوشیار کیا، باہر صحن میں نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف گودام کا محاصرہ ہو چکا ہے بلکہ پچھواڑے سے بعض لوگ چھت پر پہنچ چکے ہیں۔

گودام کے غازیوں کی کیفیت

گودام کے غازیوں میں سے یوسف علی خاں اور حبیب خاں کے پاس تلواریں بھی تھیں، بندوقیں بھی۔ مولوی خدا بخش کے پاس صرف تلوار تھی اور داؤد خاں کے پاس صرف نیزہ تھا۔(۱) پانچویں رفیق کے پاس صرف لاٹھی تھی۔

خدا بخش کا بیان ہے کہ چھت پر سے پتھر برسنے لگے، داؤد خاں نے ایک آدمی کی طرف نیزہ تانا، اس نے کوٹھے پر سے نیزہ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا، سب غازی کمرے میں گھس گئے اور اندر سے کنڈا لگا لیا۔ بلوائی صحن کی دیواریں پھاند کر اندر گئے۔ گودام کے کمرے کا قفل توڑا اور رسد لوٹنے لگے۔ جس کمرے میں ہم تھے، اس کے پچھواڑے سے دیوار میں نقب لگانے کی آوازیں آئیں۔ ہم نے طے کیا کہ باہر نکلیں۔ دروازہ کھولا۔ بلوائی لوٹ میں لگے ہوئے تھے، میرے چاروں ساتھی صحن کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا تھا اور زیادہ نہ چل سکتا تھا۔ کھسکتا کھسکتا صحن کے اس حصے میں پہنچا، جہاں دیوار کے ساتھ لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈھیر پر سے ہوتا ہوا دیوار پر جا بیٹھا، دوسری طرف ایک ملا کا گھر تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ملا میرے ساتھی داؤد خاں کو لایا اور اپنی اندھی والدہ سے کہا کہ اسے کہیں چھپا دو، میں پھر باہر جاتا ہوں، شاید کوئی اور مظلوم مل جائے اور اسے بچا کر لے آؤں۔

---

(۱) ''وقائع'' میں ہے کہ داؤد خاں کے پاس بندوق بھی تھی اور اس کا فتیلہ روشن دیکھ کر مفسد چھت پر چڑھ گئے تھے۔

ملا کی نیک دلی

یہ سن کر میری ڈھارس بندھی، تلوار میان میں کی، کالے کمبل میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ ملا کے گھر میں اتر گیا اور صحن میں توت کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں ملا کی بیوی باہر نکلی، وہ کہہ رہی تھی کہ اس گاؤں کے لوگ کافر ہو گئے ہیں اور بیچارے غازیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی، پوچھا: ہندوستانی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ مجھے بھی اندر اس جگہ لے گئی جہاں داؤد خاں پہلے سے موجود تھا، پھر یوسف علی خاں کو ملا لے آیا۔

اس طرح رات کو تو بچ گئے، لیکن یہ اندیشہ لگا رہا کہ صبح ہونے پر دیکھیے کیا پیش آئے۔ ملا نے داؤد خاں اور یوسف علی خاں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے باہر بھیج دیا، خدا بخش بیمار ہونے کے باعث جا نہیں سکتے تھے، صبح ہوئی تو بلوائیوں نے خانہ تلاشی شروع کی۔ ملا کے گھر پہنچے تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے پاس تین غازی تھے، دو چلے گئے، تیسرا بیمار ہے، اسے ہرگز نہ دوں گا۔ اگر زور سے کام لو گے تو میں بھی اپنے ساتھیوں کو بلا کر لڑائی کروں گا، اس طرح خدا بخش کی جان بچی۔

یوسف علی خاں

یوسف علی خاں آٹھ دس برس کا ہوگا، جب اس کا باپ حسن علی خاں، سکھوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ماں نے شہید کی اکلوتی نشانی کو ناز و نعمت سے پالا، سن بلوغ کو پہنچا تو سید صاحب کی بیعت کر کے غازیانِ اسلام میں داخل ہو گیا۔ بے درد قاتلوں کے نزدیک انسانیت اور اسلامیت کے ایسے گراں بہا گوہروں کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، ان پر ایک جنون سوار تھا اور جنون کی حالت میں ہر فدا کارِ حق کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تل گئے تھے۔ فکر و نظر کی عجائب کاریاں ملاحظہ فرمایئے کہ جو تلواریں غیروں کے ظلم

وتعدی کو روکنے کے لئے نہ اٹھیں، جو تلواریں مسلمانوں کی مظلومیت ختم کرنے کے لئے بلند نہ ہوئیں، جو تلواریں امن، ناموس اور آزادی کے بچاؤ کے لئے بے نیام نہ ہوئیں، وہ ان لوگوں کی گردنوں پر بے دریغ چلنے لگیں جو کلمۂ حق کی سربلندی کیلئے جانیں ہتھیلیوں پر لئے پھرتے تھے۔

یوسف علی خاں نے ملا سے کہا کہ مجھے زیدہ کے راستے پر ڈال دیجئے، وہاں فتح خاں خان خیل میرا ہم قوم اور دوست ہے، اس کے پاس پہنچ جاؤں گا تو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ داؤد خاں بوڑھے تھے، وہ اپنے ایک دوست مدد خاں کے پاس چلے گئے، جو حاجی خیل میں تھا۔

مسجد پر یورش

اب پیر خاں اور ان کے ساتھیوں کا حال سنئے جو تھکے ماندے آئے تھے، اور تھوڑی دیر آرام کی غرض سے مسجد میں ٹھہر گئے تھے۔ راتوں رات اس مسجد کے گرد گھیرا ڈال لیا گیا، علی الصباح لڑائی شروع ہوگئی۔ خدا بخش رام پوری نے اپنی پناہ گاہ سے ملا کو بھیجا کہ ان کی خبر لائیے۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ ابھی جنگ ہو رہی ہے، غازیوں کے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں، بلوائی چھتوں پر بھی بندوقیں اور پتھر لئے بیٹھے ہیں۔ غازیوں کی گولیاں ان تک نہیں پہنچتیں۔

غازیوں کے پاس مقابلے کے لئے سامان نہ رہا تو مسجد کے اندر چلے گئے، کسی کو ان کے قریب جانے کی جرأت نہ تھی، آخر بلوائیوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد کو آگ لگا دی جائے یا اسے ڈھا دیا جائے۔ پھر چند علماء اور سید آگئے، انہوں نے بلوائیوں سے کہا کہ غازیوں کو کیوں مارتے ہو؟ یہ حاجی مہاجر ہیں تمہارا انہوں کیا بگاڑا ہے؟ بعض عورتوں نے بھی اس ظلم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ بستی میں جو ہندو رہتے تھے، انہوں نے بھی کہا کہ تمہیں

روپے چاہئیں تو ہم سے لے لو اور ان غازیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم انہیں سید بادشاہ کے پاس پہنچا دیں گے۔ شاہ ولی خاں (برادر معز اللہ خاں رئیس میلئی) بھی دوڑا آیا اور بولا میں اپنی مسجد کو نقصان نہ پہنچنے دوں گا۔ بلوائیوں نے کسی کی نہ سنی اور مسجد کو آگ لگانے کا فیصلہ ہو گیا۔

کربلا زار

غازی یہ سب باتیں سن رہے تھے، جب انہیں یقین ہو گیا کہ خانۂ خدا میں بھی امن سے بیٹھے رہنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو تلواریں سونت کر باہر نکل آئے۔ پیر خاں غالباً سب سے آگے تھے، اتفاق سے انہوں نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ ایک جوان نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، پوری جماعت بہ جانب مشرق روانہ ہو گئی، ان کے پاس کوئی نہیں آتا تھا، بلوائی ان کا چھوڑا ہوا مال واسباب لوٹنے لگے۔ غازی ندی پر پہنچ گئے، رات بھر کے پیاسے تھے، بے اختیار پانی پر لپکے، اس اثناء میں ایک ہجوم عظیم ان کے سر پر پہنچ گیا، غازی ندی کے بہاؤ میں تھے، ان پر پتھروں اور نیزوں اور تلواروں کی بارش شروع ہو گئی، صرف آٹھ آدمی بچ کر ادھر اُدھر نکل سکے، پچیس یا چھبیس اسی ندی میں ابدی نیند سو گئے۔

حبیب خاں بونیر وال

حبیب خاں بونیر وال سولہ برس کا نوجوان تھا، وہ گودام سے نکلا تو سیدھا مسجد میں پہنچا اور اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔ بلوائی اسے بار بار آوازیں دیتے تھے کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ، کوئی گزند نہ پہنچائیں گے، لیکن اس جوانمرد کی زبان سے ہر مرتبہ یہی جواب نکلتا:

> مجھے تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں، غازیوں کے ساتھ درجۂ شہادت پانا میرے لئے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس طرح خدائے قدیر کی بارگاہ میں اعلیٰ مرتبہ

ملے گا۔

جب غازی مسجد سے باہر نکلے تو ایک بلوائی نے حبیب خاں کے سر پر تلوار مارنی چاہی، دوسرے نے اسے روک دیا، بالاکوٹ کے معرکے تک یہ عالی قدر مجاہد غازیوں کے ساتھ رہا۔

خدا بخش رام پوری جس ملا کے گھر میں تھے، اس نے بتایا کہ اصل شرارت معز اللہ خاں کی ہے، جو خود تو تالی میں بیٹھا ہے اور جگہ جگہ آدمی بھیج کر بلوے کرائے۔ پیر خاں کے متعلق یہ افواہ مشہور کی کہ اس کے پاس بہت بڑی رقم ہے، بلوا ہو چکا تو واپس آیا اور ریاکاری کے طور پر کہتا رہا کہ میں ہوتا تو کبھی کچھ نہ ہونے دیتا۔ بعد ازاں ندی کے پاس پہاڑ کے دامن میں بڑا گڑھا کھدوا کر غازیوں کی لاشیں دفن کرائیں، معلوم نہیں اس گنج شہیداں کا کوئی نشان اب تک باقی ہے، یا نہیں۔

ظلم کی تیرگی میں نیکی کی کرنیں

ایک ملا کی نیک دلی کے واقعات ہم پہلے بتا چکے ہیں، مینئی میں ایک اور صاحب بھی تھے، جنہوں نے دو غازیوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی: ایک سید حیدر علی کاکوری تھے، دوسرے کا نام معلوم نہیں اور اسے “شاہ جی” کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نیک دل بزرگ کا نام سید محمد تھا، خدا بخش رام پوری کا حال معلوم ہوا تو اسے بھی ملا کے گھر سے اپنے گھر لے گیا، سید حیدر علی کا پاؤں سخت زخمی تھا اور وہ چلنے سے معذور تھے، انہیں اپنے پاس رکھا۔ خدا بخش رام پوری اور “شاہ جی” کو ملا صاحب کوٹھا کے پاس پہنچا دیا جہاں چار اور غازی تھے، پھر ملا صاحب نے اپنے پانچ شاگردوں کی حفاظت میں انہیں پنجتار بھیج دیا۔

غازیوں کا داعیۂ قربانی

آپ نے اہل سمہ کی شقاوت و سنگ دلی کے لرزہ خیز مناظر دیکھ لئے، اب غازیوں

ل ہمت، للّٰہیت اور داعیۂ قربانی کا نقشہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

میٹئی کے سید محمد ایک روز مولوی خدا بخش سے باتیں کر رہے تھے، غازیوں کی ظلومیت کا ذکر چھڑ گیا تو بے اختیار اشکبار ہو گئے۔ خدا بخش نے کہا:

> ہم شوقِ شہادت ہی لے کر اس دور دست مقام پر آئے تھے، جو لوگ شہید ہوئے وہ مراد کو پہنچ گئے جو باقی ہیں ان کی آرزو بھی یہی ہے کہ راہِ حق میں جانیں دیدیں، اللہ تعالیٰ ہمارے امام کو سلامت رکھے، ان شاء اللہ ان کی برکت سے پھر جہاد کا سامان ہو جائے گا۔

یعنی:

من و دل گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

سید صاحب کی سعیٔ جہاد

مولوی خدا بخش ملا صاحب کوٹھا کے پاس تھے کہ وہاں بھی ایک روز ایسی ہی گفتگو چھڑ گئی، مولوی صاحب نے کہا:

> جو لوگ شہید ہوئے وہ گھر سے یہی ارادہ لے کر آئے تھے، لیکن ہر شخص کا خیال تھا کہ کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نصیب ہوگا، یہ خیال نہ تھا کہ اسلام کے مدعی اس سلسلے میں کفار کی نیابت کریں گے۔

پھر مولوی صاحب نے مثال بیان کی کہ ایک عالی جاہ بادشاہ نے ایک شخص کو باغ کا داروغہ بنایا، وہ دل و جان سے باغ کی خدمت کرتا تھا، ہر درخت کو پانی دیتا، سارا باغ سرسبز و شاداب ہو کر بارآور ہوا اور سال بہ سال پھل دینے لگا۔ اچانک نمک حراموں نے موقع پا کر درخت کاٹ ڈالے اور باغ کو ویران کر دیا۔

اس مثال میں سید صاحب کی سعیٔ جہاد اور اس میں اہلِ سمہ کی خلل اندازی کی کتنی صحیح، عمدہ اور عبرت انگیز تصویر کھینچی گئی تھی۔

بتیسواں باب:

مشہد اکبر (۲)

سرِ گلہ اختصار ے باید کرد یک کار ازیں دو کار ے باید کرد
یا سر بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر ز یار ے باید کرد

مولوی خیر الدین شیر کوٹی

ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان محمد خاں سے صلح کے بعد مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو لوند خوڑ میں متعین کر دیا گیا تھا، کاٹ لنگ اور آس پاس کے دوسرے مواضع بھی انہیں کی تحویل میں تھے۔ مولوی صاحب کے ساتھ کم وبیش ستر ہندوستانی اور قندھاری غازی تھے، انہیں تین جماعتوں میں بانٹا۔ قندھاریوں کو گاؤں کی شمالی مسجد میں ٹھہرایا، دوسری جماعت کو میر عبد الرحمٰن کی سرداری میں وسطِ دہ کی مسجد میں بٹھایا، تیسری جماعت اپنے ساتھ رکھی اور جنوبی مسجد میں مقیم ہوئے۔ لوند خوڑ اس زمانے میں بہت بڑا گاؤں بلکہ قصبہ تھا، اس کے اردگرد ندیاں بہہ رہی تھیں، جن کی وجہ سے حفاظت کا قدرتی سامان ہو گیا۔ قصبے میں کم وبیش ایک سو دکانیں جیوں کی تھیں اور چھ مَلِک تھے۔

مولوی صاحب نے حسن تدبیر سے تمام لوگوں میں ہر دلعزیزی پیدا کر لی اور وعظ وتذکیر سے انہیں شریعت کے پابند بنا دیا۔ تمام مَلِکوں کو جمع کر کے کہا کہ خود اپنے اپنے حلقے میں اجراءِ احکامِ الٰہی کے لئے سبقت کرو، مجھے مداخلت پر مجبور کیا تو آپ لوگوں کی برتری زائل ہو جائیگی۔ جو کام ضروری ہیں، ان میں آپ ہی لوگوں کا فائدہ ہے، مثلاً نماز

وزے کی پابندی، عشر کی ادائیگی، بالغ لڑکیوں کا نکاح اور ان کی رخصتی میں عجلت۔ ملک مولوی صاحب کے طرزِ عمل سے اتنے خوش ہوئے کہ سب مخلص معتقد بن گئے۔

حادثۂ پشاور کی اطلاع

اس اثناء میں نور محمد قندھاری گڑھی امان زئی سے ایک خط لایا جس میں حادثۂ پشاور کی کیفیت درج تھی، یعنی یہ کہ مولوی مظہر علی صاحب، ان کے ساتھی غازی اور ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر ڈالا گیا۔ مولوی صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ لوند خوڑ سے مان زئی پہنچ جائیں تا کہ دونوں مقامات کے غازی یکجا بیٹھ کر ناسازگار حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ مولوی صاحب کو یہ تجویز پسند نہ آئی، اس لئے کہ فتنہ و ہنگامہ کے دوران میں گڑھی امان زئی تک پہنچنا دشوار تھا، راستے میں قدم قدم پر لڑائی کا خطرہ تھا اور غازیوں کے پاس بقدرِ کفایت سامانِ جنگ نہ تھا۔ اسی روز دوپہر کے وقت سید صاحب کا فرمان پہنچ گیا کہ کارِ ضروری درپیش ہے، آپ قاضی موضع کو قائم مقام بنا کر اور ایک ملک کو ساتھ لے کر پنجتار پہنچ جائیں۔

رفیقوں سے مشورہ اور ہدایات

مولوی صاحب نے اپنے تمام رفیقوں کو جمع کر کے سارے حالات بے کم و کاست نا دیے، پھر کہا کہ آپ مجھے اپنا سردار سمجھتے ہیں، وقت بے حد نازک ہے، اس میں ستقامت کی اشد ضرورت ہے۔ میری صرف ایک درخواست ہے کہ جو کچھ کہوں، اس پر بے چون و چرا عمل کرتے جائیں اور عقل دینے کی کوشش نہ کریں۔ اس لئے کہ جن حالات سے ہمیں سابقہ پڑا ہے، اس میں مختلف مشوروں سے طبیعت پراگندہ ہوتی ہے ور استقامت میں ضعف آتا ہے۔ اگر مجھ سے خدانخواستہ کوئی فعل خلافِ مصلحت سرزد وگا تو اس کیلئے عند اللہ جواب دہ ٹھہروں گا۔ آپ لوگ ہوشیار ہو جائیں، ہتھیاروں کو ایک

لو کے لئے بھی بدنوں سے الگ نہ کریں۔ ہمارے جو بھائی شہید ہوئے، غفلت میں شہید ہوئے۔ ہم ستر آدمی ہیں، جب تک سیکڑوں کو نہ مار لیں گے اپنا خون زمین کے حوالے نہیں کریں گے۔

میں مصلّے پر بیٹھ کر ملکوں کو بلاتا ہوں، دو بندوقچی بندوقیں بھر کر میرے پیچھے کھڑ جائیں، چار قرابین دار صحن مسجد کے نیچے رہیں۔ اگر ملک اپنے آدمیوں کو لے کر یورش کریں اور لڑائی چھڑ جائے تو سب سے پہلے ملکوں کو مارا جائے، اگر وہ مسجد میں آ جائیں تو حتی الامکان انہیں باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

ملکوں کی آمد

مولوی صاحب خود مصلّے پر بیٹھ گئے کچھ آدمی تحصیل زر کیلئے بازار میں بھیج دیے، کچھ آدمی ملکوں کو بلانے کیلئے ارسال کر دیے۔ تحصیل زر کا حکم سن کر ایک غازی نے کہا: مولو صاحب! یہ کیا غضب کر رہے ہیں، تحصیل زر کا یہ کونسا موقع ہے؟ مولوی صاحب بولے میں نے کہا نہیں تھا کہ مجھے عقل دینے کی کوشش نہ کرنا، جو کچھ کہوں کرتے جانا؟(۱)

ملک آئے تو مولوی صاحب انہیں مسجد کے اندر لے گئے اور سید صاحب کے فرما سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ یقینی طور پر تو معلوم نہیں، کونسا ضروری کام درپیش ہے۔ میر خیال ہے کہ مداخلیوں پر لشکر کشی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھے پنجتار ہوتے ہوئے گڑھ چھتر بائی پہنچنا چاہیے، جو میرا اصل مقام ماموری ہے، تا کہ مجاہدین کیلئے رسد اور دوسر ضروری چیزوں کا انتظام کر سکوں۔ آپ لوگ جس ملک کو میرے ساتھ بھیجنا چاہیں، اس کا فیصلہ ابھی کر لیں۔

---

(۱) اس تدبیر کا مدعا یہ تھا کہ گاؤں والوں پر ثابت ہو جائے کہ غازی نہ ہراساں ہوئے نہ ان کے عام انتظاما میں کوئی فرق آیا۔

انتظامات

ملکوں نے فیصلہ کیا کہ ملک صدرالدین ساتھ جائے، مولوی صاحب نے اسے مسجد ہی میں روک لیا۔ عصر سے مغرب تک ایک سو پچیس روپے عشر کے جمع ہوئے، پھر مولوی صاحب نے سارے انتظامات قاضی کے حوالے کئے، روانگی سے پہلے:

۱۔ جمع شدہ غلے کا بڑا حصہ ملکوں میں بانٹ دیا، صدرالدین کو دوہرا حصہ دیا، جو غلہ باقی بچا وہ پورا قاضی کے حوالے کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اگر ہم زندہ رہے تو واپس لے لیں گے، مارے گئے تو سارا غلہ آپ کا ہوگا۔

۲۔ اطلاع ملی کہ وسط دیہ کی مسجد کے سامنے کچھ لوگ بہ ارادۂ فساد جمع ہو رہے ہیں، مولوی صاحب دو آدمی لے کر اس مسجد میں پہنچے، دیکھا تو واقعی مسجد کے ایک جانب چالیس پچاس بندوقچی بیٹھے تھے۔ ان سے بے باکانہ کہا کہ یہ تماشہ کی جگہ نہیں، یہاں کیوں آئے؟ لڑنے کی خواہش ہے تو یقین رکھو کہ بری طرح مارے جاؤ گے، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوں گے، خیر اسی میں ہے کہ چپ چاپ چلے جاؤ۔ اپنے غازیوں سے کہا کہ ہتھیار سنبھال لو، ان لوگوں کی نیت بری معلوم ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی یہ بے باکی دیکھ کر وہ لوگ منتشر ہو گئے اور مولوی صاحب اپنے آدمیوں کو بہ اطمینان نکال کر اپنے پاس لے گئے۔

۳۔ ملا لعل محمد قندھاری کی جماعت کو بھی لانا چاہتے تھے لیکن کسی نے آکر بتایا کہ وہ پشاور روانہ ہو گئے، یہ حقیقت میں ملا لعل محمد کی ایک تدبیر تھی جس کی کیفیت آگے چل کر معلوم ہوگی۔

۴۔ قاضی کو پشاور کے حادثے اور غازیوں پر جابجا مفسدوں کی یورش کا علم ہو چکا تھا، مولوی صاحب سے کہا کہ ٹھہر جائیے، حفاظت میرے ذمے ہے، جب تک میں خود

اور میرا بھائی نہ مارے جائیں گے، آپ کو خفیف سا آزار بھی نہ پہنچے گا۔ مولوی صاحب نے ان کے اخلاص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو مروا کر ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ آج نکل جانا جتنا آسان ہے، اتنا کل نہیں رہے گا۔

روانگی اور منزلِ مقصود

رات کے وقت مولوی صاحب ملک صدرالدین کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے، ابتدا میں رُخ پنجتار کی طرف رکھا، جب کچھ مسافت طے ہوگئی تو دفعتہً ''پڑان غار'' کا رخ کرلیا، جہاں پہنچنا نسبتاً سہل تھا، نیز وہاں کے ملک پر پورا بھروسا تھا۔ پنجتار پہنچنے میں کم از کم تین روز لگتے اور غازیوں کے پاس تین روز کی جنگ کا سامان نہ تھا۔ مولوی صاحب نے پہلے ہی سے پڑان غار جانے کا ارادہ کر رکھا تھا، لیکن جب تک لوند خوڑ میں رہے کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کیا۔ ملک صدرالدین بھی مولوی صاحب کی دانائی اور احتیاط کوشی پر حیران رہ گیا۔

رات موضع جلالہ کی ندی پر بسر کی، صبح کے وقت وہاں کے رئیس کو بلایا اور بات چیت کی۔ سید صاحب کو اطلاع بھیجنی ضروری تھی، ایک طالب علم سے کتاب لی اور اس کے اندر کسی جگہ یہ سطریں لکھ دیں:

> تا ایں جا (جلالہ) از فضل وکرمِ خدا آمدیم و در پڑان غار مے رویم، آنجناب دعا فرمایند کہ باز زیر قدم آنجناب حاضر شویم۔
>
> **ترجمہ**: ہم خدا کے فضل وکرم سے یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور پڑان غار جارہے ہیں، دعا فرمائیں کہ پھر آپ کے قدموں میں حاضری نصیب ہو۔

سفر کے شدائد

جلالہ سے بھوکے روانہ ہوئے، ایک گاؤں ویرانے میں ملا تو وہاں کھچڑی پکوائی

چاہی، دکانداروں سے معلوم ہوا کہ چاول نہیں ملتے۔ گاؤں کے ملک کو روپے دیے، وہ انتظامات میں لگ گیا تو معلوم ہوا کہ اس ملک نے ورگئی سے لشکر منگایا ہے، خدا جانے کب آجائے، پھر کیا پیش آئے، لہٰذا پھر بھوکے نکل پڑے۔ رات کے وقت اگلے گاؤں میں پہنچے، معلوم ہوا کہ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے غازیوں سے کہا کہ آپ آرام کریں، خود کھچڑی پکوائی، پک چکی تو سب کو جگا کر کھلائی۔

وہیں اطلاع ملی کہ ملا لعل محمد قندھاری مع جماعت دو کوس پر ایک موضع میں اترے ہیں، مولوی خیر الدین نے آدمی بھیج کر انہیں بھی بلا لیا اور کھچڑی کھلائی۔

ملا صاحب نے جب لوند خوڑ میں دیکھا کہ حالات ابتر ہو رہے ہیں اور لوگ فساد پر آمادہ ہیں تو اپنی جماعت کو لے کر یہ اعلان کرتے ہوئے نکل پڑے کہ اب سیدھا پشاور پہنچ کر سلطان محمد خاں کی ملازمت کر لوں گا۔ جب گاؤں سے باہر پہنچے تو سوات کا راستہ اختیار کر لیا، غرض یہ تھی کہ سوات سے بونیر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچ جائیں۔ موضع ٹوٹی میں ٹھہرنے لگے تو لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے، ناچار اپنے بیس ساتھیوں سمیت اس گاؤں میں پہنچے جہاں سے مولوی خیر الدین نے انہیں بلایا۔

پڑان غار میں قیام

تمام غازی کھانا کھا چکے تو پھر چل پڑے، پڑان غار کے پاس ندی پر پہنچ کر باقی رات گزاری، صبح ہوئی تو ملک کو بلایا۔(۱) وہ آیا تو بولا: مولوی صاحب! آپ نے کیوں مجھے غیر سمجھا؟ میں تو حضرت امیر المومنین کا سچا ارادت مند ہوں۔ راستے میں کیوں ٹھہرے اور سیدھے گھر کیوں نہ چلے آئے جو میری طرح آپ کا بھی گھر تھا؟ پھر ساتھ گاؤں میں لے گیا، تمام غازیوں کو تین وقت کا کھانا اپنے ہاں سے کھلایا، پھر مولوی

---

(۱) اس کا نام لعل محمد تھا۔

صاحب نے بہ اصرار اسے روک دیا اور سب میں معمول کے مطابق رسد بٹنے لگی۔ پورا ایک مہینہ چڑان غار میں بسر ہوا، پھر سید صاحب کا حکم پہنچا کہ محمود خاں (ساکن تنگی) کو بھیجا جا رہا ہے، جس راستے سے ممکن ہو، اس کے ساتھ آ جایئے۔(۱)

سفرِ پنجتار

محمود خاں دس بارہ آدمی لے کر پہنچ گیا، مولوی صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ دو روز کے لئے روغنی روٹیاں تیار کر لو، روانہ ہوئے تو ملک لعل محمد نے اپنے بھانجے کو بھی ساتھ کر دیا۔ چڑان غار سے گڑھی اور رنگ شاہ میاں پہنچے (۲) تو بارہ آدمی پاؤں میں چھالے پڑ جانے کے باعث چلنے سے معذور ہو چکے تھے، انہیں گڑھی کے سید کی تحویل میں چھوڑ کر گھڑیالہ پہنچے۔ منصور خاں گاؤں سے باہر منتظر تھا، اس نے کہا کہ پہاڑ پر دو رہبر بٹھا رکھے ہیں، مصلحت اسی میں ہے کہ سفر جاری رکھا جائے اور قیام نہ کیا جائے۔ مولوی صاحب کو یہ بات اچھی معلوم نہ ہوئی، منصور خاں نے از راہِ خلوص کہا کہ خفگی نہ فرمائیں، آپ بے شک ٹھہر جائیں، صبح میں بھی اہل و عیال کو لے کر ساتھ ہو جاؤں گا، اس لئے کہ جب اہل سمہ کو معلوم ہوگا کہ آپ نے رات میرے ہاں گزاری ہے تو میرے لئے یہاں رہنا غیر ممکن ہو جائے گا۔

مولوی صاحب نے سفر جاری رکھا، مزید پندرہ آدمی معذور ہو چکے تھے، انہیں منصور خاں کے پاس چھوڑ دیا، ساری رات سفر میں گذری اور صبح کی نماز تیمم سے ادا کی۔ شیدہ

---

(۱) محمود خاں سید صاحب کا مخلص مرید تھا، رنج و راحت میں برابر شریک رہا، بالاکوٹ کے معرکے میں شامل نہ ہو سکا۔ سید صاحب نے مولوی صاحب کو چڑان غار سے لانے کے لئے مولانا اسمٰعیل کے ساتھ مشورہ کیا تھا تو انہوں نے عرض کیا تھا کہ یہ سفر خالی از خطرہ نہیں، بہتر یہ ہے مولوی صاحب کو ادھر ہی سے ہندوستان بھیج دیا جائے۔ محمود خاں نے حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا تو سید صاحب نے انہیں پنجتار بلا لیا۔

(۲) یہ لوند خوڑ سے دو کوس پر تھا، معلوم ہوا کہ اب وہاں کوئی گاؤں نہیں۔

کے پاس سے گذر رہے تھے تو وہاں کا ایک آدمی ملا، مولوی صاحب نے تفنناً اس سے کہا: اپنے گاؤں والوں کو میرا یہ پیام پہنچا دینا کہ لونڈ خوڑ کے جس مولوی کے انتظار میں تم نے راتیں گزاریں، وہ صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے، حوصلہ ہے تو اُٹھو اور اسے پکڑ لو، ورنہ عمر بھر حسرت میں مبتلا رہو گے۔

ایک گھڑی دن چڑھے فتح خاں پنجتاری کے گاؤں میں پہنچ گئے، سید صاحب نے پنجتار سے نکل کر درے میں استقبال کیا۔ مولوی خیر الدین اور ان کی جماعت کے لوگوں کو ''زندہ شہید'' کا لقب ملا۔ مولوی صاحب کی دانشمندی، معاملہ فہمی، ہمت اور استقامت کا اندازہ کیجئے، اتنے نادر اوصاف کا جامع کس جماعت اور قوم کیلئے زیادہ سے زیادہ عزت وشرف کا باعث نہ ہوگا۔

سدم کے حالات

حاجی محمود خاں اور حاجی بہادر شاہ خاں کو سید صاحب نے جب تحصیل عشر کے لئے مقرر فرمایا تھا تو یاد ہوگا کہ مولانا شاہ اسمٰعیل نے اس سے اختلاف کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ کام تدبیر و دانشمندی کا ہے، شجاعت کا نہیں۔ ایسے آدمیوں کو مقرر کرنا چاہئے جو صاحب تدبیر و دانش ہوں، حاجی بہادر شاہ خاں اسماعیلہ میں شہید ہو چکے تھے، حاجی محمود خاں پندرہ غازیوں کے ساتھ سدم میں مقیم تھے، بلوہ ہوا تو محمود خاں اپنی جماعت کو لے کر گاؤں سے باہر ندی پر جا ٹھہرے، گاؤں والے انہیں دور سے آوازیں دیتے تھے، قریب کوئی نہیں آتا تھا۔ اس اثناء میں جبین خاں رئیس سدم بھی پہنچ گیا، اسی نے اسماعیلہ میں حاجی بہادر شاہ خاں کو شہید کرایا تھا، حاجی محمود خاں کے پاس بیٹھ کر ریاکاروں کی طرح اظہار اخلاص کرنے لگا اور بولا: دن کو تو ممکن نہیں، ذرا ٹھہر جایئے، رات کو پنجتار پہنچا دوں گا۔ محمود خاں اس کے فریب میں آ گئے اور جس دامِ بلا سے رہائی پا چکے تھے، اس میں خود

دوبارہ جا پھنسے۔

سنگ دلی کی حد ہوگئی

غازی گاؤں میں پہنچ گئے تو سبین خاں نے چکنی چپڑی باتیں کر کر کے ان کے ہتھیار بھی لے لیے، سب نہتے ہو گئے تو ایک دم ان پر حملہ بول دیا۔

مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> ہر کسے را بہ بے رحمی تمام بہ زخمہائے شمشیر وکارد تمام ساختند، بعضے را برزمیں غلطانیدہ چوں میش وبز ذبح کردند، چنانکہ عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں را پدر زوجہ شاں بہ سینہ سوار شدہ ذبح نمود، ہمہ ایں گروہ قربان راہ مولائے حقیقی شدند۔(۱)

> **ترجمہ**: ہر شخص کو تلوار اور چھری سے بے دردانہ شہید کر ڈالا۔ بعض کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح زمین پر لٹا کر ذبح کر دیا گیا، مثلاً عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں کو اس کے خسر نے چھاتی پر بیٹھ کر ذبح کیا۔ اس طرح یہ گروہ اپنے مولائے حقیقی کی راہ میں قربان ہوگیا۔

حیرت اس بات پر ہے کہ حاجی محمود خاں سدم والوں کے ہم قوم تھے، اسی وجہ سے ان کے بھائی نے سدم میں شادی کی تھی، لیکن سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ خسر نے چھری لے کر اپنے داماد کو ذبح کیا اور بیٹی کو بیوہ بنایا۔ ستر آدمیوں میں سے صرف دو اس طرح بچے کہ بھاگ کر ایک بڑھیا کے گھر میں گھس گئے، اس نے از راہِ خدا ترسی انہیں بھس میں چھپا دیا، بعد میں وہ راتوں رات پنجتار پہنچ گئے اور یہ خونچکاں داستان سنائی۔ سدم کے شہدا میں سے صرف مندرجہ ذیل کے نام معلوم ہو سکے:

حاجی محمود خاں، ان کا بیٹا یوسف خاں، بھائی عظیم اللہ خاں، دو بھتیجے برہان الدین

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۲۳

اور عبدالوہاب، کریم بخش جراح، استاد خدا بخش ٹھکیت (ساکن متھاؤں)۔

حافظ الٰہی بخش کی سرگزشت

مظلوم غازیوں میں سے ایک حافظ الٰہی بخش تھا، صرف تیرہ چودہ برس کی عمر، قرآن کا حافظ اپنے ماموں نور خاں کے ساتھ کسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا، جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ دونوں آرام سے سو رہے تھے کہ دفعۃً نقارہ بجا، نوعمر بھانجے نے ماموں کو جگایا۔ نور خاں دریافتِ حالات کے لئے باہر نکلا، بلوائیوں کا شور سن کر بھانجے کو آواز دی کہ میری تلوار دو، تلوار پہنچنے سے پیشتر شیر دل غازی کا جسم خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ ایک شقی نے نوعمر حافظ کے سر پر تلوار ماری، دوسرے نے اسے روک دیا اور کہا کہ یہ حافظ قرآن ہے، میں اسے غلام بناؤں گا۔ (۱)

اس طرح الٰہی بخش کی جان بچ گئی۔ بچانے والا اسے اپنے گھر لے گیا اور بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور کر دیا۔ الٰہی بخش پشتو خوب سمجھتا تھا، لیکن یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا، اس کے سر پر زخم تھا، جس جراح کو علاج کے لئے مقرر کیا گیا وہ بدبخت ایسا مرہم لگاتا رہا، جس سے زخم اچھا ہونے کے بجائے بگڑتا جائے۔

سید صاحب کے پاس پہنچنے کی تدبیر

حافظ جس دن سے ان ظالموں کے قبضے میں آیا تھا، برابر تدبیریں سوچتا رہا کہ کس طرح نجات حاصل کروں۔ قرآن پڑھنے کے لئے ایک بالغ شاگرد بھی اس کے پاس آتا تھا، اس کے اخلاص کا اندازہ کر کے اپنا ہمراز بنایا، پانچ روپے اجرت طے کی، موقع پا کر اس کی رہنمائی میں سدم سے نکلا۔ سید صاحب اس زمانے میں پنجتار سے ہجرت کر کے

---

(۱) سید صاحب کے سامنے یہ واقعہ بیان ہو رہا تھا، راوی جب ان الفاظ پر پہنچا تو حضرت نے فرمایا: او (الٰہی بخش) غلامِ خداست، کسے را چہ یارا کہ او را بہ غلامی بہ گیرد۔ (منظورہ ص: ۱۰۰۴)

راج دواری پہنچ چکے تھے، حافظ الٰہی بخش وہیں خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اسیری کی کہانی سنائی۔

سر کا زخم بہ دستور تھا، سید صاحب نے اسی وقت نور بخش جراح کو علاج کا حکم دیا۔ جراح نے زخم دیکھا تو کہا کہ پہلے معالج نے بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، سر کی ایک ہڈی خراب ہو چکی ہے، اسے کاٹے بغیر زخم اچھا نہیں ہو سکتا۔ الٰہی بخش نے صبر وسکون کے ساتھ ہڈی کٹوائی اور پٹی بندھوائی۔ جب غازیوں نے اسے اٹھا کر بستر پر پہنچانا چاہا تو انکار کر دیا کہ میرے پاؤں زخمی نہیں، جو اٹھانے کی ضرورت ہو۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا، پھر خود چل کر ایک ایک غازی کے ڈیرے پر گیا اور سب سے ملا۔ تمام غازی اس نوعمر کی جرأت اور تحمل شدائد پر حیران تھے۔

سید صاحب کی تربیت

یہ لوگ تھے جو سید صاحب کی صحبت میں تیار ہوئے تھے۔ تیرہ چودہ برس کا لڑکا، اس کی دانائی اور دور اندیشی پر غور کیجیے کہ دشمنوں کے درمیان مہینے گزار دیے، ان سب کے راز معلوم کرتا رہا اور اپنا کوئی راز اُن پر ظاہر نہ ہونے دیا، بلکہ انہیں یہ بھی پتا نہ لگ سکا کہ حافظ ان کی ساری باتیں سمجھتا ہے۔ ہمت و استقامت کو سامنے لائیے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اصل مرکز سے غافل نہ ہوا، مشکلات کے باوجود اس ارادے پر قائم رہا کہ جلد سے جلد سید صاحب کے پاس پہنچ جائے۔ پھر خود ہی رہبر کا انتظام کیا، ایک نوعمر بچے کے لئے یہ اندازہ کر لینا سہل نہ تھا کہ جس شخص کو رہبری کے لئے چنا گیا ہے، ضبط راز کی صلاحیت میں اس کا پایہ کیا ہے؟

تحمل شدائد کی ہمت دیکھیے کہ سر پر گہرا زخم لگا اور اسے برداشت کر لیا، سدم سے راج دواری تک کٹھن سفر سے نہ گھبرایا، سر کی ہڈی کاٹی گئی اور اُف تک نہ کی۔ غازیوں نے

اٹھا کر بستر پر لٹانا چاہا تو بولا اسکی ضرورت نہیں اور خود بستر پر گیا، پھر ذرا آرام کر کے سب سے ملا۔ مسلمانوں کی کتنی بد نصیبی تھی کہ ان اخلاق اور ان اوصاف کے مجاہد اہل سرحد کی جہالت، نادانی، تنگ نظری اور شقاوت کے باعث بیدردی سے موت کے گھاٹ اُترے:

آتش بہ دو دست خویش در خرمن خویش　　چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست، منم دشمنِ خویش　　اے وائے من و دست من و دامن خویش

موقع عبرت

المیہ مشہد اکبر کے یہ چند خونچکاں اوراق تھے جو محفوظ رہ گئے اور اس وجہ سے ہم تک پہنچ سکے کہ بعض غازی محض بہ حسن اتفاق مقتل سے بچ گئے۔ دسیوں یا بیسیوں ایسے مقامات تھے، جہاں کا ایک غازی بھی زندہ نہ بچا اور ان پر جو قیامت گذری، وہ معرضِ بیان و تسوید ہی میں نہ آسکی۔ مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> وقت عشاء بعضے را در نماز و بعضے را در تہیہ آں مشل طہارت وغیرہ، گرداگرد شاں محیط شدہ قتل آغاز نہادند۔ و در بعضے دیہہ وقت نیم شب و در بعض قبل از فجر یا در عین صلوٰۃ فجر قتل ساختند، کم کسے بود کہ فرصت یافتہ فرار نمود یا در جائے محفوظ خزید۔(۱)
>
> **ترجمہ** : عشاء کے وقت بعض نماز میں مشغول تھے، بعض نماز کی تیاری کے سلسلے میں طہارت وغیرہ کر رہے تھے کہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کشت وخون کا آغاز کر دیا۔ بعض دیہات میں آدھی رات کو، بعض میں نماز فجر سے پیشتر یا عین حالت ادائے نماز میں غازیوں کو قتل کر ڈالا گیا، کم لوگ تھے جو فرصت پا کر بھاگ سکے یا کسی محفوظ جگہ گھس سکے۔

شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ شہیدوں کی لاشوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتے اور

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۳

کہتے کہ اٹھو نماز کی تاکید کر دیا عشر لو، سید صاحب نے یہ حالات سنے تو فرمایا:

> نعوذ باللہ، اہل سمہ کلمہ گو ہستند جز ایں دو کلمہ یعنی نماز و اخذ عشور وقت دوانیدن دواب بر جثہ ہائے ایشاں دیگر نمے گویند، معلوم شد کہ ہمیں امور شرعیہ بر دل ایشاں شاق بود کہ از راہ دغا بر سر خفتگاں تاخت نمودہ کشتند۔
>
> **ترجمہ** : نعوذ باللہ اہل سمہ نمازیوں کے جثوں پر گھوڑے دوڑاتے وقت یہی دو باتیں کہتے تھے، یعنی نماز اور عشر، حالانکہ کلمہ گو تھے۔ معلوم ہوا یہی دو شرعی باتیں ان پر شاق تھیں کہ سوئے ہوئے غازیوں پر حملہ کر کے انہیں مار ڈالا۔

شہدا کی تعداد

کچھ معلوم نہیں کہ جو غازی اس ہنگامۂ جنوں میں واصل بحق ہوئے ان کی تعداد کیا تھی۔ میں نے ہر چند زیادہ سے زیادہ قرین صحت اندازے کی سعی کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اس لئے کہ پورے نام نہ مل سکے۔ تعداد سے کہیں بڑھ کر یہ امر دردناک ہے کہ جتنے مارے گئے، سید صاحب کے قول کے مطابق ان میں سے ہر ایک اپنے وطن کی انسانیت و اسلامیت کا ''خلاصہ'' اور ''لب لباب'' تھا۔

تینتیسواں باب:

عزمِ ہجرتِ ثانیہ

اہلِ سمہ سے بیزاری

سید صاحب صبر و حلم کے پیکر تھے، حالات کی ناسازگاری یا شدائد کے ہجوم سے کبھی متاثر نہ ہوئے، لیکن اہلِ سمہ کی شقاوت و بد عہدی نے ان کے قلب صافی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اس ملک میں قیام سے بیزار ہو گئے۔ اگر وہ ملک وجاہ کے خواہاں ہوتے تو بقیۃ السلف غازی باغیوں سے سخت انتقام لینے کیلئے بالکل کافی تھے، خود اہلِ سمہ کی یہ حالت تھی کہ بلوے کے بعد جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب پنجتار میں سلامت ہیں، تو ان پر سخت خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے اب کیسی سخت سزا ملے۔ ارباب بہرام خاں نے ایک روز عرض کیا کہ اجازت ہو تو لشکر اور توپ لے کر نکل جاتا ہوں، سارے دیہات حسب سابق مطیع و فرمانبردار بن جائیں گے اور انشاء اللہ لڑائی کی بھی نوبت نہیں آئے گی۔ (۱) سید صاحب نے فرمایا کہ ہم ابتدا میں یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے حالات سے پورے واقف نہ تھے، مدت تک وعظ و نصیحت کرتے رہے، جب اس طرح کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حاکمانہ فہمائش کا طریقہ اختیار کیا، ہمارا مدعا اجرائے احکامِ دین کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن یہ طریقہ بھی بے اثر رہا:

> نیت ما ازیں سیاست طلب ملک وجاہ نہ بود، غیر از تادیب عباد و تہذیب شاں مقصودے دیگر نداشتیم، لہٰذا ایشاں را بانصاف حَکَم حقیقی مے گزاریم وخود

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۰۲

با بقیہ رفقا راہ ملک دیگرے گیریم۔ زیرا کہ چوں از وطن خود ہجرت نمودیم ہر کجا کہ مردم صادق القول خواہم یافت، قیام خواہم نمود، انحصار بر ایں دیار نیست۔ (۱)

ترجمہ : اس سیاست سے ہماری غرض یہ نہ تھی کہ صاحب ملک وجاہ بن جائیں، محض اللہ کے بندوں کی تادیب وتہذیب چاہتے تھے۔ اب ہم انہیں منتقم حقیقی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں اور بقیہ رفیقوں کے ساتھ دوسرے ملک کا راستہ لیتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کو چھوڑ چکے ہیں جہاں کہیں صادق القول لوگ مل جائیں گے مقیم ہو جائیں گے، اس ملک پر انحصار نہیں۔

فتح خاں پنجتاری

فتح خاں پنجتاری بلوے کے دنوں میں باہر تھا، اس اثناء میں اس کے ہم قوموں کے غول پنجتار کے آس پاس آبیٹھے۔ پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ جواب ملا: غازیوں کی حفاظت کیلئے۔ غازیوں کے دل میں طبعاً وسوسہ پیدا ہوا کہ ان کی نیت نیک نہیں، فصیل کی دیوار کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی، غازیوں نے سید صاحب سے اجازت لے کر اس کی مرمت کرلی، نیز پھلاہ کے درخت پنجتار کے آس پاس بہت زیادہ تھے، انہیں کاٹ کاٹ کر فصیل کے ساتھ ساتھ خار بندی کا انتظام کرلیا۔

فتح خاں واپس آیا اور سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو غازیوں نے اس سے ہتھیار رکھوا لینے چاہے لیکن آپ نے ارشاد فرمایا ہتھیاروں سمیت آنے دو، وہ سامنے آیا تو پوچھا کہ آپکی قوم کے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ آپکی حفاظت مقصود ہے، فرمایا: انہیں رخصت کر دیجئے، چنانچہ فتح خاں نے سب کو واپس بھیج دیا۔

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۰۲

مخلصین کا اجتماع

سید صاحب اگرچہ سمہ سے چلے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ ان لوگوں سے یہ تو پوچھ لیں کہ غازیوں کو کس گناہ میں بے دردانہ ذبح کیا گیا؟ چنانچہ آپ نے فتح خاں سے کہا کہ جو مخلص خوانین و رؤسا ہنگامۂ قتل سے الگ رہے، ان سب کو دعوت دیکر بلایئے تاکہ ہم دریافت کر لیں یہ کشت و خون کیوں روا رکھا گیا؟ اگر کوئی قصور لائق سزا سرزد ہوا تو اس سے آگاہ ہو کر توبہ کر لیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب کو دعوت نامے بھیجے گئے:

۱۔ سید، سید میاں (تختہ بند)
۲۔ سید رسول (تاواگئی)
۳۔ سید اعظم (تاواگئی)
۴۔ سید شاہ رندان (منگل تھانہ)
۵۔ اخوندزادہ قابل (منگل تھانہ)
۶۔ قاضی سید امیر (کوٹھا)
۷۔ فاتح خاں (زیدہ)
۸۔ ابراہیم خاں (کھلابٹ)
۹۔ منصور خاں (گھڑیالی)
۱۰۔ محمود خاں (تنگی)

سید اکبر شاہ ستھانوی کو بھی بلانے کی تجویز تھی لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ وہ ہمارے ہی کام میں مصروف ہیں، انہیں تکلیف نہ دی جائے۔

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلُوْا

تین چار روز میں یہ اصحاب آگئے، سید صاحب نے تاکید فرما دی کہ مہمانداری میں کوتاہی نہ ہو، بلکہ حکم دے دیا کہ اگر بلوائیوں میں سے بھی کچھ لوگ آجائیں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے، پھر ایک مفصل تقریر فرمائی جس کا مفاد یہ تھا:

> جب ہم جہاد فی سبیل اللہ کی تدبیر کے لئے وطن سے آئے تھے تو یہاں کے خوانین و رؤساء میں نااتفاقی اور پچند داری تھی، سب ایک دوسرے کے جانی

دشمن بنے ہوئے تھے، اور اتفاق کے بغیر جہاد ممکن نہ تھا۔ ہم نے ایک مدت تک للہ فی اللہ ان کے درمیان میل ملاپ کی کوشش کی، ان سب نے برضا و رغبت ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور ہمیں امام بنایا، ہم سے عہد و پیمان کیے، شریعت کا حکم قبول کیا، ان کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کیے گئے۔ خود عشر دینا قبول کیا، خود تحصیل دار مقرر کرائے، پھر اچانک دشمن بن گئے، نہ کوئی استغاثہ ہمارے پاس پہنچا، نہ کوئی شکایت گوش زد ہوئی، دفعۃً اٹھ کر غازیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کا سبب اصلاً معلوم نہ ہوا، ہماری اس بات کا جواب آپ بھائی سوچ سمجھ کر دیں۔

سید میاں کا دورہ برائے تحقیق

یہ تمام اصحاب ایک روز باہم صلاح مشورے کرتے رہے، پھر عرض کیا کہ ہم سب متحیر ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ کیوں یہ معاملہ پیش آیا؟ نہ ہم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور نہ ان کے مشوروں میں شریک تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے معلوم کر کے ہمیں آگاہ کریں، اس غرض کے لیے سید، سید میاں ساکن تختہ بند تجویز ہوئے، جو اس مجلس میں سب سے ممتاز اور پورے علاقے میں محترم سمجھے جاتے تھے، ان سے کہا گیا کہ رڑڑوں کی بستیوں میں جا کر حقیقی حالات کی تحقیق فرمائیں۔

ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال شیوہ میں تھے، آنند خاں اور مشکار خاں نے دوران بلوہ میں انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا تھا، سید صاحب نے اخوند قابل کو سید میاں کے ساتھ بھیج دیا کہ لوٹتے وقت ارباب کے اہل و عیال کو ساتھ لیتے آئیں۔

سید میاں نے رڑڑوں کی بستیوں کے سرکردہ آدمیوں کو جمع کر کے پوچھا کہ سچ سچ بتادو کہ کیا معاملہ ہوا؟ کیوں تم نے یہ ناشائستہ حرکت کی؟ یہ بھی بتادیا کہ سید صاحب کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے، انہوں نے بدھ سنگھ، یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کو شکستیں دیں، وہ

توپخانہ اور لشکر لے کر نکلیں گے تو تم ان کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔

مجرموں کے بیانات

وہ بڑے نادم و پریشان تھے، بعض نے کہا کہ ہم پر سختیاں ہوتی تھیں، معمولی قصوروں پر بے عزت کیا جاتا تھا، ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے نکاح جبراً کرائے جاتے تھے، تنگ آکر ہمیں یہ کام کرنا پڑا۔ سید میاں اور اخوندزادہ قائل نے ان تمام عذروں کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ نکاحوں کے معاملے میں اصرار کا مدعا یہ تھا کہ تم لوگ بہنوں اور بیٹیوں کو روپے کی خاطر بڑی عمروں تک بٹھا کر رکھتے تھے۔ یہ اصرار عین شریعت کے مطابق تھا اور تمام نکاح قوم میں ہوتے رہے، باقی رہا سزاؤں کا معاملہ تو ہر حاکم رعایا کے قصوروں کے مطابق جرمانے بھی لیتا ہے، زدوکوب بھی کرتا ہے اور قید کی سزا بھی دیتا ہے۔

چند لوگوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اقرار کر لیا کہ ہمارے پاس سلطان محمد خاں کی طرف سے خط آئے تھے کہ ہندوستان کے علماء نے ہندوستانی غازیوں کو بدعقیدہ اور انگریزوں کے جاسوس قرار دیا ہے، یہ تمہارا ملک بھی چھنوا دیں گے اور دین و مذہب کو بھی خراب کریں گے۔

یہ خطوط اسی محضر کی نقل تھے جو سلطان محمد خاں نے پشاور میں سید صاحب کے ساتھ ملاقات کے موقع پر پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے اس محضر نے غلط فہمی میں ڈالا، گویا جس چیز کو وہ خود غلط اور بے سروپا مان چکا تھا، اسی کو ایک مستند شئے قرار دے کر اس نے سارے سمہ میں گمراہی کی آگ لگائی۔

قصد ہجرت

پانچ چھ روز کے بعد اخوندزادہ قائل ارباب بہرام خاں کے اہل وعیال کو ساتھ لے کر واپس آیا اور سارے حالات سید صاحب کی خدمت میں عرض کیے تو آپ کے دل کو

بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا: کچھ اوپر چار برس ہم ان لوگوں کی اصلاح میں لگے رہے، وعظ و نصیحت کی، ان کے دین اور دنیا کی بھلائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن یہ لوگ اتنے سخت دل اور ہدایت سے بے بہرہ ہیں کہ کچھ اثر نہ ہوا، اب ہم کس کس سے بدلہ لیں؟ بہتر یہی ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کریں وہ منتقم حقیقی جس طرح چاہے انتقام لے۔ سلطان محمد خاں پر حیف ہے کہ اس نے خود سب کچھ ہمیں بتایا اور عذر کیا کہ غلطی ہوئی، معاف کر دیجئے، بعد ازاں اسی بہتان نامے کو دستاویز بنا کر صدہا مسلمانوں کا ناحق خون کرایا، اس سے تو اس کا بھائی دوست محمد خاں ہی اب تک اچھا رہا کہ نہ ہم سے بھلائی کی اور نہ برائی، اب ان لوگوں میں رہنا اچھا نہیں، یہاں سے ہجرت کر کے جدھر اللہ چاہے گا، چلے جائیں گے۔

ملا شیر اور مولوی خیر الدین

قصد ہجرت نے شہرت پائی تو قاضی سید محمد حبان شہید مردان کے استاد ملا شیر سید صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرے نزدیک یہاں سے ہجرت شرعاً جائز نہیں، اہل سمہ کا گناہ زیادہ سے زیادہ کبیرہ ہے، کفر کی حد تک نہیں پہنچا، پھر ہجرت کے لئے کون سی وجہ جواز ہے؟ پہلے مولانا شاہ اسمٰعیل نے پھر سید صاحب نے ان سے گفتگو کر کے مطمئن کر دیا۔ (۱)

مولوی خیر الدین شیر کوٹی پڑان غار سے پنجتار پہنچے تو ہجرت کا عام چرچا تھا۔ ایک روز انہوں نے سید صاحب سے گفتگو کی، شیخ ولی محمد بھی پاس تھے، عرض کیا کہ میرے نزدیک موجودہ مقام کو چھوڑنا قرین مصلحت نہیں، اگر کسی دوسرے علاقے میں جائیں گے تو پہلے تو یہی امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہمارے قیام پر راضی ہوں گے یا نہیں، پھر

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۴۸-۱۰۵۱- اس سے ظاہر ہے کہ مولانا شاہ اسمٰعیل بھی ہجرت کے ارادے میں سید صاحب کے ہم نوا تھے، لیکن گفتگو کی تفصیل کہیں نظر سے نہیں گذری۔

انہیں وعظ ونصیحت سے قیامِ جہاد پر آمادہ کرنے میں عمر بسر ہو جائے گی۔ اہلِ سمہ کو دوبارہ راہِ راست پر لانا سہل ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہاں ٹھہرنے کی کوئی صورت نہیں، اہل سمہ کی مخالفت ظاہر ہو چکی، پشت پر سوات ہے، وہ لوگ بھی مخالف ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ فتح خاں پنجتاری کے متعلق بھی تو اطمینان نہیں۔

سید صاحب کا ارشاد

مولوی صاحب نے کہا کہ فتح خاں یا اس کے پنجتار کے ہم محتاج نہیں، اگر مجھے سدم کا غلہ عنایت فرمائیں تو اس سے لشکر کا سرو سامان کر کے اہل سمہ سے سمجھ لوں گا۔ سید صاحب نے فرمایا:

> آنچہ شما می گوئید شدنی ست اما مرا ازیں مردماں چناں نفرت است کہ کسے را از قے خود نفرت مے باشد۔ ہم چنیں از نشستن در ملک اینہا نفورم پس ایں را چہ علاج است؟ (۱)
>
> **ترجمہ** : آپ جو کچھ کہتے ہیں، یہ ہو سکتا ہے لیکن مجھے ان لوگوں سے ایسی نفرت ہے جیسے کسی کو اپنی قے سے نفرت ہوتی ہے، میں ان کے ملک میں قیام سے بھی اسی طرح نفور ہوں اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

نیز فرمایا کہ یہاں مخلص کم ہیں اور مفسد زیادہ۔ ایک دفعہ دغا کھانے کے بعد متنبہ نہ ہونا ہوشیاری سے بعید ہے۔ **لا یلدغ المؤمن من حجرٍ واحدٍ مرتین۔**

یہ اس بزرگ ہستی کے الفاظ تھے جس کا وجود سراپا محبت تھا۔

بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولوی خیر الدین کی رائے بھی یہ تھی کہ رضا کارانہ جہاد پر انحصار کے بجائے سپاہی ملازم رکھے جائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا عہد ہے،

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۱۰۲۹

آپ للّٰہی جہاد چاہتے ہیں اور اسی کی تلقین فرماتے ہیں۔ اس طرح اگر ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو جائیں تو البتہ بخوبی جہاد ہو سکے گا، نوکر رکھنے سے ہمیشہ آپ کو نفرت رہی، اگر رکھے بھی تو پھر موقوف کر دیے، کیا اب بھی آپ کو یہی امید ہے کہ نوکر رکھے بغیر جہاد ہو سکے گا؟ فرمایا میں تو یہی کروں گا خواہ تنہا رہ جاؤں۔ (۱)

فتح خاں پنجتاری کو جواب

فتح خاں اس پورے زمانے میں بالکل متذبذب رہا، اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ سید صاحب پنجتار سے چلے جائیں، لیکن یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر سید صاحب بیٹھے رہے تو سارے اہل سمہ سے عدوات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک روز اس نے بھی ہجرت کی مخالفت کی تو سید صاحب نے فرمایا:

> اپنی قوم سے پوچھیے کہ ہم کس بنا پر انہیں صادق القول تسلیم کر لیں؟ ہزاروں لوگ اپنے عہد و قرار سے پھر گئے اور غازیوں کی لاشوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا، جس کی امید کفار سے بھی نہ تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ لوگ کلمۂ توحید بھی محض عادۃً پڑھتے ہیں:
>
> پس مارا ضروراست کہ دوائے دل خود کنیم کہ شک از جانب کلمہ گویاں از دل ما زائل شود۔ (۲)
>
> **ترجمہ** : پس ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کی دوا کریں تاکہ کلمہ گویوں کی طرف سے شک زائل ہو جائے۔

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۱۰۳۶

(۲) واضح رہے کہ سید صاحب کو تنخواہ دار سپاہی رکھنے سے اختلاف نہ تھا، لیکن اس غرض کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ ملک وجاہ کے بغیر میسر نہ آ سکتے تھے، نیز سید صاحب مسلمانوں میں دینی جذبہ بیدار کرنا چاہتے تھے۔ جن حالات سے وہ گذر رہے تھے، ان میں صحیح راہ عمل وہی تھی جو اختیار کی، اہل سمہ کو بزور لشکر مطیع کیا جا سکتا تھا، لیکن نتیجہ یہ ہوتا کہ لامتناہی کشت وخون شروع ہو جاتا اور پوری قوت مسلمانوں کو زیر کرنے میں خرچ ہو جاتی۔

راستے کا مسئلہ

اس اثناء میں زبردست خاں مظفر آبادی، ناصر خاں بھٹ گرامی، حبیب اللہ خاں سواتی، عبدالغفور خاں اگروری اور راجا نجف خاں خانپوری کی طرف سے پے در پے عرضیاں پہنچیں اور سید صاحب نے پکھلی جانے کا ارادہ فرمالیا۔ چونکہ توپیں اور بھاری سازوسامان پہاڑی راستے سے نہ جاسکتا تھا، اس لئے مینگیٔ اور کھبل کے راستے سے جانا چاہتے تھے۔ فتح علی خاں پنجتاری سے کہہ کر راستے کے تمام مواضع کو خط لکھوادیے کہ محض گذرنے کی اجازت دے دی جائے۔ فتح خاں نے بطور خود بھی بڑی کوشش کی لیکن وہ سب شامتِ اعمال سے خوفزدہ تھے۔ سمجھتے تھے کہ سید صاحب سازوسامان اور لشکر لے کر آگئے تو ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لہٰذا اجازت نہ دی۔ ناچار سید صاحب کو دشوار گزار کوہستانی راستہ اختیار کرنا پڑا۔

سید صاحب کا خطبہ

جب تمام مراتب طے ہوچکے تو ایک روز غازیوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ کی حیاتِ طیبہ کے مقاصد کا ایک جامع مرقع ہے۔ اس لئے اسے من وعن یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

> مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عبادت میں شریک کیا اور اپنی رضا کے راستے میں گرم و سرد اور فتح و شکست کو برداشت کر لینے کی توفیق بخشی۔ آپ نے سعی و نصرت اور شراکت کا حق ادا کیا، اب ہم اس ملک سے ایک دوردست علاقے کا قصد کرچکے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں جائیں، سفر کو "قطعة من العذاب" کہا گیا ہے، خصوصاً پہاڑی علاقے کا سفر، جس میں آب ودانہ کی تکلیف اور مالوفات کا ترک لازماً پیش آئے گا۔ بس وہی شخص ہماری معیت

اختیار کرے جس میں صبر و استقامت کی ہمت ہو اور مالک حقیقی کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ میں سب کو آگاہ کرتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ تکلیف پیش آنے پر کوئی شخص کہے کہ سید نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا، یا کہے کہ مجھے معلوم نہ تھا ایسی تکلیف پیش آئے گی۔ جس شخص میں صبر و استقامت کی قوت ہے وہی ہمارا ساتھی بنے۔

ہم اپنی ساری عمر پروردگار کی رضا میں صرف کر دینے کا پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں، جو بھائی جسمانی اور نفسانی تکالیف پر صبر نہ کر سکے وہ ہم سے جدا ہو جائے لیکن جدا ہونے والے بھائی کو خراسان یا ہندوستان یا کسی دوسرے ملک میں جا کر نہیں بسنا چاہیے بلکہ وہ عرب کے سوا کہیں توطن اختیار نہ کرے، اس لئے کہ عرب کے سوا ہر جگہ ایمان کی حفاظت مشکل ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ حرمین شریفین (زادہما شرفاً وتعظیماً) کی راہ لے اور وہاں کے حکام یا دوسرے اشخاص کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ وہی سرزمین ہے، جہاں دین خلل سے محفوظ رہے گا، اگرچہ بدعات سے وہ ملک بھی خالی نہیں۔

پھر مولانا شاہ اسماعیل کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

میاں صاحب! آپ قرآن شریف کی تلاوت پر زیادہ توجہ فرمائیں، میں کثرت مراقبہ میں مشغول رہوں گا، یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے جہاد کا انتظام ہو سکے۔

ارباب بہرام خاں

اس خطبے کو سن کر تمام غازی زار و قطار رونے لگے اور ان کے دل مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپ اٹھے۔ اس بات کا تو خدا کے فضل سے وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی غازی شدائد سفر کا ذکر سن کر اپنے محبوب امام یا اہم ترین دینی مقاصد کا دامن چھوڑے گا، لیکن ارباب بہرام خاں کا معاملہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے جب سے سید صاحب

کی رفاقت اختیار کی تو پروانہ وار ساتھ رہے، جب ہجرت ثانیہ کا فیصلہ ہو چکا تو ارباب نے اہل وعیال کو جمع کر کے فرمایا: میں تو حضرت کے ہمرکاب رہوں گا، اب تم سب لوگ میرے بھائی جمعہ خاں کے پاس چلے جاؤ۔ ارباب کے پانچ بیٹے تھے، جن میں سے دو نابالغ تھے، ایک بیٹی تھی اور ایک بیوی، بھتیجا محمد خاں بھی تھا، جس کی شادی غالباً ارباب کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان سے سب نے بھی بے توقف کہا کہ ہم ہر حال میں ساتھ رہیں گے خواہ کچھ پیش آئے۔ (۱)

اس زمانے میں بھی اکا دکا غازی پنجتار پہنچتے رہے، مثلاً شیخ امجد علی غازی پوری بحالت مجروحیت آئے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں مجروح ہوئے، پنجتار میں یا سفر ہجرت کی پہلی یا دوسری منزل میں سید صاحب سے آ کر ملے، بالاکوٹ میں ان کی شہادت یقینی اور متفق علیہ ہے۔ (۲)

احبابِ سندھ کو ہدایت

سید صاحب نے ہجرت سے پیشتر متعدد خطوط سندھ روانہ کئے، مثلاً ایک خط ابوالقاسم نام ایک شخص کو لکھا جو سندھ میں یا راستے کے کسی مقام میں رہتا تھا، ایک خط امیرانِ سندھ کے نام تھا، اور ایک پیر صبغۃ اللہ شاہ راشدی کے نام۔ دونوں بیبیوں کے نام الگ الگ خط تحریر فرمائے۔ پیر صاحب اور امیروں کو لکھا تھا، آپ رضائے باری تعالیٰ کی نیت سے مہاجرات (ازواج اور متعلقات) کے حال پر توجہ فرماتے رہیں، تاکہ ہم لوگ اطمینانِ خاطر سے جہاد کا کام انجام دے سکیں۔

> از حسن اخلاق شما توقع ے داریم کہ اگر سرنوشت تقدیر ما و رضائے مالک حقیقی در ہمیں منحصر است کہ زندگانی ما در ہمیں عبادت صرف شود، پس دراں صورت از راہ خیر خواہی و دینداری برخود لازم گردانید کہ ایں مہاجرات را تا

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۶۱ (۲) منظورہ ص: ۱۰۵۴

حرمین شریفین زادہما اللہ تشریفاً و تعظیماً رسانند۔ (۱)

ترجمہ: آپ کے حسن اخلاق سے امید ہے کہ اگر ہماری تقدیر کا نوشتہ اور ہمارے مالک حقیقی کی رضا یہی ہے کہ عمر اسی عبادت میں صرف ہو جائے تو دینداری اور خیر خواہی کے نقطۂ نگاہ سے اپنا فرض جانیں کہ یہ مہاجرات حرمین شریفین پہنچ جائیں۔

ازواج کو وصیت

ازواج کو دوسرے امور کے علاوہ تحریر فرمایا:

اگر پیمانۂ زندگانی ما درہمیں عبادت پُر شود پس شما را ضرور است کہ بسوئے حرمین شریفین بروند و بر مقام دیگر ہرگز توطن نہ سازند، زیرا کہ ایں زمانِ فتن است صیانت ایمان بجز آں دو مقام صورت نخواہد بست۔ بر ظلم و تکلیف آں بلا صبر کردن و توطن ہمانجا نمودن بہتر خواہد بود۔ (۲)

ترجمہ: اگر ہماری زندگی کا پیمانہ اسی عبادت میں لبریز ہو جائے تو تمہارے لئے ضروری ہوگا کہ حرمین شریفین پہنچ جاؤ اور دوسرے کسی ملک میں توطن اختیار نہ کرو، اس لئے کہ یہ فتنوں کا زمانہ ہے اور حرمین شریفین کے سوا ایمان کے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، ان مقامات میں ظلم و تکلیف پر صبر کرتے ہوئے مقیم رہنا بہتر ہوگا۔

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۵۱

(۲) منظورہ ص: ۱۰۵۲- مولوی سید جعفر علی نقوی نے منشی ہونے کی حیثیت میں یہ خط لکھے تو میر منشی محمدی انصاری اور حکیم خیرالدین پھلتی سے کہا کہ یہ مضمون بالکل نیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ امور معروف میں وصیت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، تمہیں اس پر تعجب کیوں ہوا؟ نقوی نے کہا کہ میں اسے برا نہیں کہتا، صرف یہ کہتا ہوں کہ مضمون نیا ہے، پہلے کبھی کوئی ایسی بات نہیں لکھوائی گئی، حقیقتاً یہ مضمون نیا تھا، خاص نظر و احساس رکھنے والے اصحاب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنے کا موجب بنا کہ غالباً شہادت کی منزل بہت قریب آ گئی ہے۔

مسلمان کا موقف

اسی زمانے میں ایک روز شیخ محمد اسحاق گورکھپوری نے اس نماز کا ذکر چھیڑا جو سید صاحب نے مولانا عبدالحی مرحوم کو دہلی میں پڑھائی تھی۔ بہت سے ارادت مند یہ نماز سیکھنے کے خواہاں تھے۔ فرمایا یہ ایسی چیز نہیں کہ پوری جماعت کو سکھائی جائے، ایک دو آدمیوں کو البتہ سکھائی جا سکتی ہے، لیکن آپ سب بھائی یکساں ہیں کسے سکھائی جائے اور کسے نہ سکھائی جائے۔ ایک دوسرا معاملہ سوچا ہے، کل انشاء اللہ بعد نماز عصر باہر چلیں گے تو اس کا انتظام کریں گے۔

دوسرے روز نماز عصر ادا کر کے غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ باہر تشریف لے گئے، دامن کوہ میں ایک میدان تھا وہاں آپ نے وعظ فرمایا اور کہا:

> مسلمان را بایدکہ در مقام خواہش نفسانی و مشتہیات آں مثل طعام لذیذ و شیریں و انواع فواکہ دیگر برادران مسلمین را بر نفس تقدیم دہد و خود از انہا موخر شود و روا ندارد کہ زیادہ تر از ایشاں بہ محظوظ گردد بلکہ دریں امر کمی بہ جانب خویش پسند نماید در مقام رنج و تکلیف نفس خود را بہ دیگراں مقدم سازد و آمدن بلا و تکلیف برآنہا نہ پسندد۔
>
> **ترجمہ:** مسلمان کو چاہئے کہ خواہش نفسانی اور اس کے مشتہیات مثلاً لذیذ و شیریں کھانا میوہ وغیرہ میں مسلمان بھائیوں کو اپنے اوپر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ اس امر کا روادار نہ ہو کہ اپنے بھائیوں سے زیادہ حظوظ نفسانی سے محظوظ ہو، بلکہ دوسروں سے فروتر رہے، لیکن مقام رنج و تکلیف میں اپنے نفس کو دوسروں پر مقدم سمجھے اور پسند نہ کرے کہ انہیں کوئی بلا یا تکلیف پہنچے۔

نئی بیعت

پھر مولانا اسماعیل سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ اولیائے کرام کا مرتبہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کو اس کی تکلیف نہ دی جائے، بلکہ یہ سب مسلمانوں کیلئے ضروری ہے، اور اس پر بیعت کرنی چاہئے۔ چنانچہ منشی محمدی انصاری، شیخ محمد اسحاق گورکھپوری، مولوی عبدالوہاب لکھنوی، مولوی احمد اللہ ناگپوری، حبیب اللہ خاں گورکھپوری اور بہت سے دوسرے غازیوں نے بیعت کی، واپسی کے بعد پنجتار میں دو روز تک بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا شاہ اسماعیل نے بیعت نہ کی اور اپنے عجز و ضعف کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ ایک عہد کر لوں، پھر اس کے ایفاء میں تقصیر واقع ہو تو مواخذہ کا مستوجب ٹھہروں۔

چونتیسواں باب:

پنجتار سے راج دواری

روانگی

رجب ۱۲۴۶ھ (۱) کا مہینہ تھا، صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وسط ماہ میں سید صاحب نے پنجتار کو چھوڑا اور قاسم خیل کے راستے وادیٔ چملہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جو بزرگ ہستی اپنے عزیز وطن کو اللہ کے لیے چھوڑ چکی تھی، جہاں زندگی کے چالیس برس گذرے تھے، جہاں آباء و اجداد کی عمریں بسر ہوئی تھیں، جہاں قرابت و عزیزداری کے بیسیوں سلسلے موجود تھے، جس کے چپے چپے پر خویشی کی مہریں ثبت تھیں، اسے پنجتار چھوڑنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا، جو بہر حال ایک اجنبی مقام تھا۔ تاہم پنجتار کے ساتھ چار برس کے قیام میں کئی وابستگیاں پیدا ہو چکی تھیں، یہ مقام جہاد و اجرائے شریعت کا مرکز رہ چکا تھا، اس کی آغوشِ خاک میں سیکڑوں مجاہد محوِ خوابِ ابدی تھے، جنھوں نے اپنی اپنی جانیں راہِ خدا میں قربان کیں اور سید صاحب انھیں پدری شفقت کے ساتھ ہندوستان کے مختلف خطوں سے اٹھا کر لائے تھے۔

پنجتار سید صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے اوج و عروج کی بہاریں دیکھ چکا تھا، وہاں اعلائے کلمۃ الحق اور احیائے اسلامیت کے نقشے تیار ہوئے تھے، اگر ان نقشوں پر عمل پیرائی میں بالکل غیر متوقع موانع پیش نہ آ جاتے تو ہندوستان کی تقدیر کا دھارا بالکل دوسرے رخ پر بہنے لگتا۔ سید صاحب کو اپنے دوسرے وطن سے بھی روگردانی کا مرحلہ پیش

---

(۱) دسمبر ۱۸۳۰ء

آ گیا تو بے تکلف اٹھے اور اس طرح باہر نکل پڑے گویا ان کی سرگزشتِ حیات میں پنجتار کی حیثیت ایک کاروانِ سرائے سے زیادہ نہ تھی کہ رات بسر کی، پھر رختِ سفر باندھ کر روانہ ہو گئے۔

زائرین کا ہجوم

ہجرتِ ثانیہ کی تیاری شروع ہو گئی تو علماء و سادات اور مخلص خوانین جوق در جوق زیارت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے ہمیں سید میاں ساکن تختہ بند، سید رسول ساکن ناواگئی، قاضی سید امیر ساکن کوٹھا، اخوند زادہ قابل ساکن منگل تھانہ کے نام بالتعیین معلوم ہیں۔ اب فتح خاں کے ہم قوم آ آ کر قیام پر اصرار کرنے لگے، سید صاحب سب کے سامنے محبت آمیز انداز میں معذرت کرتے رہے، فتح خاں سامنے آیا تو سید صاحب نے فرمایا: ساری دنیا مل کر کہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، مگر آپ کہیں کہ نہ جاؤ تو میں آپ کا کہنا مان لوں گا۔ لیکن فتح خاں مخمصے میں مبتلا تھا، اس نے چار برس برکات وحسنات کی جن بہاروں میں گزارے تھے، ان کا تقاضا تھا کہ سید صاحب کو روک لے۔

جب نظر گرد و پیش کے حالات پر پڑتی اور سوچتا کہ سید صاحب کو ٹھہرا کر یونیر، سوات اور سمہ کے لوگوں کی عداوت کا ہدف بن جائے گا تو اس کی زبان بند ہو جاتی، وہ کھل کر روک نہ سکا اور سید صاحب جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ روانگی سے پیشتر فتح خاں کے تمام ہم قوموں کو نصیحت فرمائی کہ خان تمہارا رئیس ہے اسے عشر دیتے رہنا، احکامِ شریعت کی پابندی کرنا، ہندوستان سے غازی آئیں تو انہیں مدارات سے ٹھہرانا اور حفاظت کے ساتھ ہمارے پاس پہنچا دینا۔

حرمِ محترم اور سید موسیٰ

سید صاحب نے حرمِ محترم کو دکھنڑا بھیج دیا تھا، جہاں سید موسیٰ (ابن سید احمد علی

شہید) سخت بیمار تھے۔ وہ جنگ مایار میں زخمی ہوئے تھے اور مہینوں گذر جانے کے بعد بھی زخم بھرے نہ تھے بلکہ ان کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ شیخ حسن علی اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ سید موسیٰ کی تیمارداری کر رہے تھے، روانگی سے پیشتر سید صاحب نے دکھاڑا پیغام بھیج دیا کہ شیخ حسن علی بی بی صاحب، سید موسیٰ نیز مال و اسباب کو لے کر کن گلی پہنچ جائیں جو حملہ میں سید صاحب کی پہلی منزل تھی۔

مولوی سید جعفر علی نقوی ایک روز پیشتر روانہ ہو چکے تھے، کن گلی پہنچے تو دکھاڑے سے سب لوگ آ چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سید موسیٰ نے میرے پہنچنے کی خبر سنتے ہی آواز دے کر بلایا، میں پاس جا بیٹھا تو بار بار حضرت امیر المومنین کا پوچھتے رہے، میں نے عرض کیا کہ جلد آ جائیں گے۔ شیخ حسن علی میرا ہاتھ پکڑ کر کھانے کیلئے لے گئے، کھانے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ سید موسیٰ نے پھر آواز دے کر بلا لیا، وہ بہت بے چین تھے، طبیعت زیادہ علیل معلوم ہوتی تھی، بار بار پوچھتے تھے کہ حضرت کب پہنچیں گے۔

سید صاحب کا سفر

سید صاحب کن گلی پہنچے تو سب سے پہلے اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کو دیکھا اور دیر تک پاس بیٹھے تسلی دیتے رہے۔ سید موسیٰ ہی کے پاس خاطر سے مزید ایک روز کن گلی میں ٹھہرے۔ پنجتار سے توپیں بھی ساتھ آئی تھیں، لیکن اگلے پہاڑی راستے میں انہیں ساتھ لے جانا مشکل تھا، لہٰذا کن گلی میں کسی محفوظ مقام پر دفن کرا دیا۔ شیخ حسن علی دکھاڑا سے جو سامان لائے تھے، اس میں بوجھل چیزیں بھی تھیں، جن کا لے جانا مشکل تھا اور ان کی فوری ضرورت بھی نہ تھی، وہ سب سید حسن رسول ساکن ناواگئی کے حوالے کر دیں۔ اس خاندان سادات پر بعد میں کئی مرتبہ مصیبتیں آئیں اور گھر بار تباہ ہو گئے

معلوم نہیں وہ چیزیں کہاں گئیں۔ (۱)

تیسرے روز کن گلئی سے روانہ ہو کر نگرئی پہنچے، تیسری منزل برڈھیری میں ہوئی۔ (۲) سید موسیٰ چونکہ بہت علیل تھے، اس لئے انہیں کن گلئی میں چھوڑ دیا۔ شیخ حسن علی ان کی خدمت پر مامور ہوئے۔ سید صاحب برڈھیری میں تھے کہ سید موسیٰ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ باپ پھولڑا میں شہید ہوا تھا، بیٹے نے مایار کی جنگ میں دادِ شجاعت دے کر مہلک زخم کھائے اور کئی ماہ کی علالت کے بعد کن گلئی کی خاک میں آسودگی پائی۔ سادات بریلی نے احیائے اسلامیت کے لئے جو بے مثال قربانیاں دیں ان کی نظیریں یہاں کا کونسا خانوادہ پیش کر سکتا ہے؟

امب اور چھترباِئی کے مجاہدین

جو مجاہدین امب اور چھترباِئی میں تھے انہیں پنجتار سے حکم بھیج دیا تھا کہ چملہ پہنچ جاؤ، برڈھیری میں وہ بھی سید صاحب سے آملے۔ ہم سمہ کی جنگوں اور بلوائے عام کی داستان سناتے رہے اور ان غازیوں کا ذکر بالکل نظر انداز کئے رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے حالات بھی اختصار سے پیش کر دیے جائیں۔

امب کا انتظام شیخ بلند بخت کے ذمے تھا، سید اکبر شاہ تھانوی کے بھائی سید عمر شاہ تھانوی ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ان کی اعانت فرما رہے تھے۔ ادھر سمہ میں بلوائے عام ہوا تو پائندہ خاں نے شیخ بلند بخت کو پیغام بھیجا کہ ہمارے تمام مقامات خالی کر دو ورنہ

---

(۱) مولوی سید جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ جو چیزیں سید حسن رسول کے حوالے کی گئیں ان میں ایک خود بھی تھا جو شیخ غلام علی الٰہ آبادی نے سید صاحب کے لئے تیار کرایا تھا، نیز خیمے، دیگیں، قالین، بندوقیں اور تلواریں تھیں۔ سید عبدالجبار شاہ تھانوی نے، جو سید حسن رسول کے ہم خاندان ہیں، مجھ سے بیان کیا کہ خود ایک مرتبہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر معلوم نہیں کہاں گیا۔

(۲) کن گلئی، نگرئی اور برڈھیری سب وادیٔ چملہ میں ہیں۔ ڈھیری دو مقام ہیں: برڈھیری یعنی بالا ڈھیری اور زیریں ڈھیری۔ میں جب چملہ گیا تھا تو گاؤں کے مغرب میں وہ مقام مجھے دکھایا گیا، جہاں سید صاحب کا خیمہ بندھا تھا۔

جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شیخ نے کہلا بھیجا کہ امیر المومنین کے حکم کے بغیر ہم ایک انچ زمین بھی نہیں چھوڑ سکتے، اگر تم جنگ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کر دیکھو، ہمیں قطعاً پروا نہیں۔ سید صاحب کو بھی اطلاع بھیج دی، آپ نے فرمایا کہ بالفعل وہیں رہو، چند روز کے بعد ہم اس ملک سے نکلیں گے۔ اگر ادھر کا قصد ہوا تو خیر ورنہ آپ بھائیوں کو بھی بلا لیں گے۔

لسب کے انتظامات کی کیفیت یہ تھی کہ گڑھی کے کل چھ برج تھے: تین مشرق میں اور تین مغرب میں۔ مشرقی سمت میں جس برج کا نام پائندہ خاں والا برج تھا، اس میں میر امام علی پوری کا انتظام تھا اور ان کے ہمراہ ہزارے کے اسّی آدمی تھے۔ اس کے ساتھ کے برج میں مشوانیوں کی جماعت تھی جن کا جمعدار صالح محمد ساکن کنگر تھا۔ تیسرے برج میں موضع خاں امان زئی ساکن دیگوہ کا انتظام تھا، اس کے مقابل کے غربی برج میں موضع خاں کی رعایا کے آدمی تھے۔ غربی سمت کے باقی دو برجوں میں سید عمر شاہ ستھانوی کے آدمی مقیم تھے۔ شیخ بلند بخت خود گڑھی میں رہتے تھے، غازی بھی ان کے ساتھ تھے۔ گڑھی کے دروازے سے خار بندی تک گیارہ ہندوستانی غازیوں کا پہرہ تھا، الٰہی بخش رام پوری ان میں رسد اور گولی بارود تقسیم کیا کرتے تھے۔ احتیاط کے خیال سے خار بندی کے تین حلقے قائم کر لیے گئے تھے۔

پائندہ خاں کے حملے کا اندیشہ

ایک روز شیخ بلند بخت کو اطلاع ملی کہ پائندہ خاں کھل بائی کے گھاٹ سے اپنا لشکر دریا کے غربی کنارے پر پہنچا رہا ہے، کھل بائی اور لسب کے درمیان گڑھی بلوچاں (۱) میں سید صاحب کی طرف سے دین محمد (باشندہ جانب عظیم آباد) تحصیل عشر پر مامور تھا، وہ

---

(۱) اسی مقام کو آج کل لسب کہتے ہیں۔ اصلاً یہ لسب جدید ہے، جو ۱۸۴۱ء کی طغیانی کے بعد آباد ہوا، سید صاحب کے زمانے کا لسب اب ایک معمولی گاؤں ہے۔

گاؤں کے لوگوں کے ساتھ ایک جگہ کھڑا تھا کہ ایک آدمی نے پیچھے سے نیزہ مار کر اسے شہید کر ڈالا۔ شیخ بلند بخت کو یقین ہو گیا کہ پائندہ خاں گڑھی بلوچاں میں پہنچ گیا ہے اور وہ ضرور امب پر حملہ کریگا۔ بستی ویران پڑی تھی، شیخ نے غازیوں کو حکم دیدیا کہ منہدم مکانوں سے لکڑیاں نکال کر گڑھی میں جمع کر لو، اس لئے کہ محاصرہ ہوا تو لکڑی باہر سے لانے کا کوئی موقع نہ رہے گا۔ وہاں چار توپیں تھیں، شیخ نے دو شمال سمت میں نصب کرا دیں، جدھر سے حملے کا اندیشہ تھے، ایک مشرقی سمت میں رکھی اور دوسری مغربی سمت میں۔

آخر پائندہ خاں کے سواروں اور پیادوں نے یورش کی لیکن وہ قریب نہ پہنچ سکے۔ ایک روز مشرقی سمت کی خاربندی کے بیرونی حلقے میں آگ لگا دی، غازیوں نے فوراً اسے بجھا دیا، بیس پچیس روز کشمکش جاری رہی، لیکن پائندہ خاں کے سوار اور پیادے کچھ نہ کر سکے۔

سکھوں کا پیغام

ایک روز کرپلیاں کی جانب سے جو امب کے مقابل دریا کے مشرقی کنارے کی بستی تھی، آواز آئی کہ کسی معتبر آدمی کو دریا پر بھیجو، ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ شیخ بلند بخت نے الٰہی بخش رام پوری، حسن خاں ساکن زمانیہ اور ایک اور آدمی کو بھیجا۔ دریا پار سے سکھوں کا پیغام ملا کہ آپ لوگوں نے تنولیوں کے مقابلے میں خوب بہادری دکھائی، سپاہی کی قدر صرف سپاہی ہی پہچان سکتا ہے، ہم آپ کے خیر خواہ ہیں، ایک آدمی ہمارا خط لائے گا، سوچ سمجھ کر اس کا جواب دینا۔ خط آیا تو اس میں یہ لکھا تھا:

> خلیفہ صاحب کے غازی بہت بہادر، امانت دار اور نمک حلال ہیں، انہوں نے شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کے پاس جو ساز و سامان پائندہ خاں کا ہے، اسے دے دیں اور خود ہمارے پاس چلے آئیں، ہم نوکر رکھ لیں گے، اور خلیفہ صاحب کے پاس تمہاری جو عزت ہے اس سے زیادہ عزت کے ساتھ

رکھیں گے۔

شیخ نے جواب دیا:

> اپنے سردار سے کہو کہ ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں، حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لئے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں، نہ ملک چاہتے ہیں، نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے اور قادر ذوالجلال کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، پائندہ خاں اور اس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے؟ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے آئے تو نہ ڈریں گے، ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے، ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں، پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیام نہ بھیجا جائے۔(۱)

گڑھی کا تخلیہ

سینتیس روز کے بعد سید اکبر شاہ ستھانوی گڑھی کے دروازے پر آئے اور شیخ بلند بخت سے کہا کہ حضرت امیر المومنین کے پیغام کے مطابق گڑھی خالی کر دینی چاہئے، پائندہ خاں کا لشکر ہٹ گیا ہے۔ شیخ توپوں، غلے، اسلحہ اور مال و اسباب کے ساتھ امب سے نکل کر عشرہ چلے گئے۔ وہاں سے توپیں کشتیوں پر سوار کرا کے ستھانہ پہنچا دیں اور خود عشرہ میں رہے، جہاں چھتر بائی کے غازیوں کو بھی سید اکبر شاہ لے آئے، اس ساری مدت میں غازیوں میں سے صرف ایک آدمی شہید ہوا، تین کے خفیف زخم لگے۔ پائندہ کے ساٹھ آدمی مارے گئے اور پینتالیس زخمی ہوئے۔

چھتر بائی کے حالات

چھتر بائی کے اصل قلعہ دار مولوی خیر الدین شیر کوٹی تھے، انہیں سید صاحب نے

---

(۱) منظورہ ص: ۱۰۶۸، ۱۰۶۹۔

پنجتار بلا لیا تو حافظ مصطفیٰ کاندھلوی قلعدار بن گئے۔ پائندہ خاں نے اس گڑھی کا بھی محاصرہ کرلیا جو چالیس روز جاری رہا، لیکن وہ گڑھی نہ لے سکا۔ اس دوران میں یہ پیغام بھی بھیجا کہ میرے ہاں نوکری کرلو، حافظ مصطفیٰ نے جواب دیا کہ ہم امیر المومنین کے فرمانبردار ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آئے ہیں، نوکری وہ کرے جو مال و دولت کا طلب گار ہو، ہم صرف خدا کے طلب گار ہیں۔

پائندہ خاں نے ایک تنولی عورت کو رشوت دے کر ساتھ ملایا، جس کا شوہر حافظ صاحب کے ماتحت جمعدار تھا۔ اس طرح لشکر اسلام میں خلل پیدا کرنا چاہا، لیکن بات چل نہ سکی ایک مخلص نے اس کا نام عبدالکریم تھا، سب کچھ بے کم و کاست حافظ صاحب کو سنا دیا۔ حافظ صاحب نے حسن تدبیر سے اس جمعدار کو اپنے پاس بلا لیا، جو سازش کا مرکز تھا، اس کے ساتھیوں کو دوسرے مقامات پر تبدیل کر دیا اس طرح یہ سازش ناکام ہوگئی۔

ایک روز گڑھی کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ قضائے حوائج کے لئے باہر چلے گئے، ان میں سے ایک غازی، جس کا نام خدا بخش تھا شہید ہوا۔ یہ پنجاب یا ہزارہ کا باشندہ تھا، آخر سید اکبر شاہ ہی نے سید صاحب کے فرمان کے مطابق چھتر بائی کو بھی خالی کرا دیا اور غازیوں کو عشرہ لے گئے جہاں شیخ بلند بخت پہلے سے موجود تھے۔

عشرہ سے برڈھیری

یہ غازی عشرہ سے چملہ کی طرف روانہ ہوئے، سید اکبر شاہ نے دیگروہ کے موضع خاں اور مدد خاں کو رہبری کیلئے ساتھ کر دیا تھا۔ قافلے میں تین عورتیں تھیں: ایک زوجہ الٰہی بخش مہاجر، دوسری زوجہ الٰہی بخش رام پوری، تیسری زوجہ حسن خاں ساکن زمانیہ۔ چار بچے تھے۔ شیخ بلند بخت نے انہیں اپنے ساتھ قافلے کے پیچھے رکھا، رات کا وقت، راستہ پہاڑی اور اس سے قدم ناآشنا۔ ایک عورت غار میں گری لیکن درخت میں اٹک

گئی، دو کمبل باندھ کر اسے باہر نکالا۔ ایک رات پہاڑ پر سوئے، دوسری رات ایک بستی کے کنارے ٹھہرے، تیسرے روز سید صاحب کے پاس پہنچے۔

شہزاد خاں رئیس ڈگر

شہزاد خاں رئیس ڈگر، بونیر کا سب سے بڑا خان تھا۔ مشہور تھا کہ وہ مفسدین سمہ کے تمام مشوروں میں شریک رہا۔ سید صاحب کی ہجرت کی خبر مشہور ہوئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، بونیر و چملہ کے مختلف خوانین کو ساتھ لے کر تقصیر معاف کرانے کے لئے برڈھیری میں سید صاحب کے پاس پہنچا۔ آپ عادت شریفہ کے مطابق خندہ پیشانی سے ملے، شہزاد خاں نے عرض کیا کہ اہل سمہ نے غلط بیانیاں کر کے مجھے گمراہ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سید بادشاہ ہمارے ملک میں نئے نئے حکم جاری کر رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے قصوروں پر بے عزت کرتے ہیں، میں ان کے فریب میں آگیا۔

سید صاحب نے فرمایا کہ آپ نے آدمی بھیج کر ہم سے ہر الزام کی حقیقت کیوں معلوم نہ کر لی؟ بولا کہ مجھے باغی نہ سمجھئے اور خطا معاف کر دیجئے۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ نے میری کوئی خطا نہیں کی، خداوند کریم کا گناہ کیا۔ سچے دل سے توبہ کرو گے تو عفو کی امید ہے۔ وہ رونے لگا کہ اہل سمہ نے میرا دین بھی تباہ کیا اور دنیا بھی۔

فتح خاں کی گزارش

خان ڈگر کی عاجزی دیکھ کر فتح خاں پنجتاری کی بھی ہمت بندھی، اس نے شہزاد خاں ہی کو واسطہ بنا کر درخواست کی کہ سید صاحب نہ جائیں اور پنجتار ہی میں ٹھہریں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ وقت ہاتھ سے جاتا رہا، اب اس بات میں کوئی لطف نہیں:

وقت ہر کار نگہ دار کہ نافع نہ بود
نوشدارو کہ پس از مرگ بہ سہراب دہند

برڈھیری سے چلتے وقت شہزادہ خاں کو رخصت کیا تو معمول کے مطابق ایک نہایت عمدہ گھوڑا بطور تحفہ دیا۔

اگلی منزلیں

برڈھیری تک تین منزلیں ہوئی تھیں، بعد کی منزلوں کا نقشہ یہ ہے:

۱۔ برڈھیری سے چلے تو برندو ندی کے کنارے اس جگہ ٹھہرے جہاں سے مجاہدین کا موجودہ مرکز اسمست بہت قریب ہے۔

۲۔ برندو کو عبور کرنے کے بعد پیواڑ پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی، یہ بڑی کٹھن تھی، سید صاحب ہاتھی پر سوار تھے، گھوڑے اور اونٹ گر گر جاتے تھے، پیادے بہ مشکل راستے طے کرتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں چند مکان تھے، کچھ غازی ماندگی سے لاچار ہوکر وہیں ٹھہر گئے۔ سید صاحب لشکر کے ساتھ کرنا میں مقیم ہوئے، وہاں سے فتح خاں پنجتاری رخصت ہوا۔

۳۔ کرنا سے نکلے تو کابل گرام میں منزل ہوئی جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اخوند خیلوں کا موضع ہے۔ وہاں سے دریا کو عبور کرنا تھا، جس میں تین روز لگ گئے، ایک اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی، سید صاحب نے اسے ذبح کرا کے گوشت لشکر میں تقسیم کرا دیا۔

۴۔ عبورِ دریا کے بعد ایک منزل دریا کے مشرقی کنارے پر ہوئی پھر تاکوٹ میں قیام کیا، جہاں ناصر خاں بھٹ گرام اور پکھلی کے دوسرے خوانین استقبال کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔ اس وقت تک سید صاحب کی قیامگاہ کا معاملہ طے نہیں ہوا تھا، تاکوٹ ہی میں خوانین نے باہمی مشورے سے راج دواری میں ٹھہرانے کا فیصلہ کیا۔

۵۔ بی بی صاحبہ کی زچگی کے دن قریب تھے، سید صاحب نے انہیں تاکوٹ میں چھوڑا، خود ایک رات دیشیوں کی بستی میں گزاری۔ اس کے بعد بھٹ گرام گئے جہاں چار

مقام کیے، ایک رات کا کڑ سنگ میں بسر کی، پھر راج دواری پہنچ گئے، شعبان کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔

مدتِ مسافت

میرے اندازے کے مطابق پنجتار سے نکل کر راج دواری پہنچنے میں انیس یا بیس دن صرف ہوئے۔ زیادہ تر مقامات میں ایک ایک رات ٹھہرے، کن گلی اور برڈھیری اور تاکوٹ میں دو دو راتیں، کابل گرام میں تین راتیں اور بھٹ گرام میں چار راتیں، راج دواری چونکہ تیسری چوتھی شعبان کو پہنچے (۱۷ر یا ۱۸ر جنوری ۱۸۳۱ء کو) اس بناء پر قیاس یہ ہے کہ پنجتار سے ۱۵ر یا ۱۶ر رجب کو چلے ہوں گے (یعنی ۲۹ر یا ۳۰ر دسمبر کو)۔

۷ر شعبان (۲۱ر جنوری ۱۸۳۱ء) کو آپ کے گھر بچی پیدا ہوئی جس کا نام ہاجرہ رکھا گیا۔ غالباً اس مناسبت سے کہ اس کی پیدائش دورانِ ہجرت میں ہوئی تھی، نیز اس کی بڑی بہن کا نام سارہ تھا۔

شاہ اسماعیل کا واقعہ

تاکوٹ میں مولانا شاہ اسماعیل موت کے منہ سے بچے، انہیں غسل کی حاجت تھی، منہ اندھیرے دریا پر چلے گئے، سخت سردی کا موسم اور دریا کا پانی برفانی، سردی نے عاجز کر دیا، فوراً باہر نکل کر کپڑے پہنے، لیکن چلا نہ گیا بے بس ہو کر گرے اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ صبح صادق کے وقت محمد امیر خاں قصوری اور بعض دوسرے غازی وضو کے لئے دریا پر گئے تو سمجھے کہ کوئی آدمی مرا پڑا ہے، دیکھا تو مولانا تھے۔ دو آدمیوں نے انہیں اٹھایا، باقی بھاگ کر چارپائی لائے قیام گاہ پر پہنچ کر کمبل اڑھائے، پاس آگ جلائی سورج نکلنے پر مولانا کو ہوش آیا۔ سید صاحب کو معلوم ہوا تو دیکھنے کے لئے پہنچے اور فرمایا کہ خدا نے آپ کو اتنا بڑا عالم بنایا ہے، تعجب ہے کہ آپ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی۔ نہانا تھا تو

آدمیوں سے کہہ کر پانی گرم کرا لیتے۔

بھٹ گرام سے سید صاحب ایک بزرگ سے ملنے کیلئے چھپر گرام بھی گئے تھے۔

راج دواری کی تجویز کے وجوہ

راج دواری کو خوانین نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر سید صاحب کے قیام کے لئے منتخب کیا تھا:

۱۔ یہ مقام پکھلی کے تمام دروں کے سر پر تھا، اسلئے اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

۲۔ وہاں کئی پن چکیاں تھیں اور غازیوں کو آٹا پسوانے میں دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔

۳۔ پاس جنگل تھا، جہاں سے حسبِ ضرورت ایندھن لایا جا سکتا تھا۔

۴۔ راج دواری کی ملکیت میں متعدد خوانین شریک تھے اور وہاں کے قیام میں سب کو مہمانداری کا شرف حاصل ہوتا تھا، نیز کسی ایک کے علاقے میں قیام کی بنا پر دوسروں کے دلوں میں رقابت پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

راج دواری سے آدھ کوس پر ایک نالہ تھا، سید صاحب وہاں ٹھہر گئے، پوشاک بدلی وضو کر کے دوگانۂ شکر ادا کیا، پھر بستی میں پہنچے، غازیوں کو مختلف مکانوں میں ٹھہرایا، جو پہلے سے ان کیلئے خالی کرائے جا چکے تھے، خود مسجد کے قریب ایک مکان میں اترے۔

بھوگڑ منگ روکنے کا فیصلہ

راج دواری پہنچے تو برف باری کا موسم شروع ہو چکا تھا اور اس موسم میں جہاد ناممکن تھا، لیکن سید صاحب نے خوانین کو جمع کر کے فرمایا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبراتی ہے، کچھ مشغولیت کا انتظام ہونا چاہئے۔ نیز جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ برف باری کے دنوں میں دور افتادہ علاقوں سے غلہ راج دواری لانا مشکل ہوگا تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ پورے

لشکر کو راج دواری میں رکھنے کے بجائے جا بجا مناسب مقامات پر پھیلا دیا جائے۔

دروں میں بھوگڑ منگ کو خاص اہمیت حاصل تھی، وہ شنکیاری کے سر پر تھا، جہاں سکھوں نے ایک چھاؤنی سی بنا رکھی تھی اور وہاں سے اٹھ کر بھوگڑ منگ میں اقدامات کرتے رہتے تھے۔ سید صاحب نے مناسب سمجھا کہ اس درے پر لشکر بٹھا دیا جائے تا کہ سکھ حملہ نہ کر سکیں، نیز درے کے اندر کے سارے لوگ مطمئن ہو کر سکھوں کو خراج دینا بند کر دیں۔ اس حصہ کے رئیس حسن علی خاں بچوں والے پر شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ سکھوں سے ساز باز کیے بیٹھا ہے۔ یہ شبہ اگر درست بھی ہوتا تو غازیوں کا لشکر درے پر بیٹھ جانے سے حسن علی خاں کے لیے دو دلا رہنا غیر ممکن ہو جاتا، ناصر خاں (بھٹ گرام) سعادت خاں اور شاہی خاں (ٹیکری)، محمد خاں اور بارک خاں (کورنش)، شہزاد خاں (چھپر گرام) نیز رئیس تنج بوڑی، اس مشورے میں شریک تھے اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

مولانا اسماعیل اور مولوی خیر الدین

سید صاحب نے چار سو غازی مولانا شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں بھوگڑ منگ بھیج دیے۔ مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو نائب و مشیر بنایا اور معمول کے مطابق بعد دعا کے بعد انہیں رخصت فرمایا۔ مولانا نے ایک منزل راستے میں کی، وہاں سے مولوی خیر الدین کو ساڑھے تین سو غازیوں کا امیر بنا کر موضع بھوگڑ منگ بھیج دیا جو درے کے اندر دہانے سے تھوڑے فاصلے پر ہے، خود پچاس غازیوں کے ساتھ بچوں چلے گئے، جو بھوگڑ منگ سے چند میل شمال میں واقع ہے۔

مولوی خیر الدین نے بھوگڑ منگ پہنچ کر درے کے دہانے تک اتنا عمدہ انتظام کر لیا کہ سکھوں کو شنکیاری کی گڑھی سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ رہا، درے کے اندر کے تمام لوگ مطمئن ہو گئے اور خوشی خوشی مولوی صاحب کو عشر دینے لگے۔

ایک روز قندھاریوں کی ایک جماعت درے سے باہر میدان میں نکل گئی۔ اس میں زیادہ آدمی نہ تھے، اتفاق سے سکھ سامنے آگئے، اگرچہ وہ غازیوں سے دو چند تھے لیکن جم کر لڑنے کی ہمت نہ پڑی اور عالم ہراس میں آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ گئے۔ قندھاریوں نے احتیاطاً مولوی خیر الدین کو خبر بھیج دی۔ عصر کا وقت تھا، مولوی صاحب فی الفور تیس چالیس غازیوں کو لے کر درے پر پہنچ گئے، سکھ چھپ چھپ کر گڑھی میں چلے گئے، اندھیرا ہو گیا تو مولوی صاحب واپس ہوئے۔

پچوں تین گاؤں تھے: ایک پچوں کلاں دوسرا پچوں خورد تیسرا کہار سچا۔ حسن علی خاں نے اپنے بھائی کی حویلی مولانا کے لئے خالی کرادی اور تمام لوگوں کے نام پیغام بھیج دیا کہ جو مالیہ سکھوں کو دیتے ہو بند کر دو اور غازیوں کو عشر پہنچاتے رہو، سکھ اقدام کریں گے تو غازی انہیں روکنے کے ذمہ دار ہوں گے۔

اس زمانے میں مولانا ایک مرتبہ مشورۂ خاص کیلئے راج دواری بھی گئے تھے۔

بیعت اہل صفہ

سید صاحب راج دواری ہی میں رہے، وہیں ۱۴ر شعبان کو سیدہ ہاجرہ کا عقیقہ کیا، اس زمانے میں اکثر غازیوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت اہل صفہ کی، جس کی خاص شرطیں یہ تھیں:

۱۔ کوئی حاجت چھوٹی ہو یا بڑی خدا کے سوا کسی سے طلب نہ کی جائے گی۔

۲۔ جس بات کو بیعت کنندہ اپنے حق میں معیوب و مکروہ سمجھے گا، اس کا حکم کسی مسلمان بھائی کو نہ دے گا۔ جو کچھ اپنے لئے پسند کرے گا وہی ہر مسلمان بھائی کے لئے پسند کرے گا۔

۳۔ بیعت کنندہ اپنی حاجت و ضرورت پر مسلمان بھائیوں کی حاجات و ضروریات

کو مقدم رکھے گا۔

۴۔ ہر کام صرف رضائے خدا کے لئے کیا جائے گا۔

مولوی الٰہی بخش رام پوری یہ بیعت کر چکے تو سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ دعا کیجئے خدا مجھے تادمِ مرگ اس عہد پر قائم رکھے۔ سید صاحب نے فرمایا:

> بھائی، سچ کہتے ہو، میرا بھی یہی حال ہے، اپنے نفس پر اعتماد مشکل ہے۔ پروردگار کی تائید شامل حال رہنی چاہئے، میرے لئے بھی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس طریق پر ثابت قدم رکھے۔

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری نے ایک مرتبہ پنجتار میں مولانا شاہ اسماعیل کا وعظ سن کر کھانا پینا چھوڑ دیا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ایک روز راج دواری میں اس قسم کا واقعہ پیش آیا، کھانا پینا چھوڑ دیا اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگے۔ رفیقوں نے سبب پوچھا تو بولے: حضرت امام المسلمین نے تین موقعوں پر جن غازی بھائیوں کو مغفرت کی بشارت دی، میں ان میں سے کسی موقع پر موجود نہ تھا، یہ میری انتہائی بے نصیبی تھی۔ اب اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گا، جب تک حضرت میرا ہاتھ پکڑ کر نہ فرمائیں گے کہ یہ شخص جنتی ہے۔

سید صاحب تک بات پہنچی تو شیخ اسحاق کو اپنے پاس بلایا، آپ محبت سے شیخ کو ''دیوانے شاہ'' فرمایا کرتے تھے۔ پوچھا: ''دیوانے شاہ'' کیا ہوا؟ مولوی جعفر علی نقوی پاس تھے، انہوں نے پوری کیفیت عرض کی۔ سید صاحب بولے:

> بھائی! آپ مجھ سے ایسی بات کہلوانا چاہتے ہیں کہ علماء اس پر میرے قتل کا حکم دیدیں گے۔ ایسی بات کہی نہیں جاسکتی، لیکن اپنی حالت پر غور کیجئے آپ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، کاروبار جہاد میں مصروف ہیں، شر و فساد کا ازالہ کرتے ہیں، کیا یہ نیک کام نہیں ہیں؟ اہل جنت کے اعمال نہیں ہیں؟ اب

اٹھئے، کھانا کھائیے اور سو جائیے۔ جس کام میں مشغول ہیں مشغول رہیے۔ ارحم الراحمین کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھئے، انشاء اللہ آپ کا انجام بخیر ہوگا۔(۱)

خدائی انتقام

راج دواری ہی میں سید صاحب کو اطلاع ملی کہ پنجتار کو چھوڑ کر پکھلی کی جانب آنے کے بعد سکھوں کے دل سے ہر خوف دور ہو گیا اور انہوں نے اہل سمہ پر ظلم و تعدی کا سیل بہا دیا۔ جہاں جاتے، دیہات کے مکانوں کو آگ لگا دیتے، جو چیز ہاتھ آتی اٹھا کر لے جاتے، سکھوں کی سپاہ میں مسلمان بھی شامل تھے، وہ اہل سمہ کو بار بار طعن کے انداز میں کہتے تھے کہ تم لوگوں نے اپنے مرشد و امام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اسکے بعد کسی دوسرے کو تم سے بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ سردارانِ پشاور اور اہل سمہ نے اپنے خیال کے مطابق غازیوں کو خونِ شہادت میں تڑپا کر نفاذِ شریعت سے نجات حاصل کی تھی اور رسومِ جاہلیت کو محفوظ کیا تھا، درحقیقت انہوں نے وہ بند توڑ دیا تھا جسکی وجہ سے چار برس تک فتن و محن کا سیل رکا رہا۔ بند ٹوٹا تو اہل سمہ سیلِ تعدی میں تنکوں کی طرح بہنے لگے۔ سچ ہے:

تا دلِ صاحب دلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

---

(۱) منظورہ ص:۱۱۹۸

پینتیسواں باب:

بالاکوٹ اور سچوں

امداد کی درخواستیں

سید صاحب کاروبارِ جہاد کے مستقل آغاز کے لئے موسمِ برف کے اختتام کا انتظار کر رہے تھے، اس اثناء میں مختلف خوانین کے حالات معلوم ہوئے تو عجیب نقشہ نظر آیا۔ سکھوں کی یورشوں نے محض عام مسلمانوں ہی پر عرصۂ اطمینان تنگ نہیں کیا تھا، خوانین ورؤسا کو بھی خاصے خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان میں پہلے سے عداوتیں جاری تھیں، بعض فریق سکھوں کے ساتھ مل گئے اور ان کی امداد سے اپنی برادری کے آدمیوں کو ملک وریاست سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئے، مثلاً:

۱۔ زبردست خاں کو اس کے عم زاد بھائی نجف خاں نے سکھوں کی مدد لے کر مظفرآباد سے نکال دیا تھا۔

۲۔ نجف خاں گھوڑی والا، اپنی ریاست سے نکل کر کوہ درابہ میں بیٹھا تھا۔

۳۔ راجا منصور خاں والیِٔ ملک درابہ اپنے بھائی معزالدین کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا۔

۴۔ حبیب اللہ خاں مالک گڑھی (حبیب اللہ خاں) اس طرف کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ وہ گڑھی کو چھوڑ کر بالاکوٹ سے بھی آگے درۂ کاغان میں مقیم تھا۔

ان سب نے سید صاحب سے دستگیری کی درخواستیں کیں اور یہ سب راہ کشمیر کے خوانین ورؤسا تھے، اگر ان کے لئے اطمینان سے بیٹھنے کی صورت پیدا ہو جاتی تو امید تھی

کہ نہ محض کشمیر پہنچنا سہل ہوگا، بلکہ تسخیر کشمیر میں ان سے گراں قدر امداد ملے گی۔ سید صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل کو یہ سارے حالات لکھ بھیجے اور حکم دیا کہ بہتر ہو آپ بالاکوٹ چلے جائیں، مولانا نے یہ حکم پہنچتے ہی مولوی خیر الدین کو لکھا کہ آپ فی الفور بالاکوٹ چلے جائیں، میں بھی دو تین روز میں پہنچ جاؤں گا۔

مولوی خیر الدین بالاکوٹ میں

چنانچہ مولوی صاحب ۲۷/شعبان ۱۲۴۶ھ (۱۰/فروری ۱۸۳۱ء) کو ظہر کے وقت بھوگڑ منگ سے روانہ ہوئے، پہاڑی راستے سے بالاکوٹ اگرچہ صرف تین کوس تھا لیکن نشیب و فراز کے باعث منزل سخت کٹھن تھی اور برف باری نے سفر کی مشکلات میں بہت اضافہ کر دیا تھا، بایں ہمہ مولوی صاحب چار گھڑی رات گئے تک بالاکوٹ پہنچ گئے۔

خوانین کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو پیغام بھیجا کہ نجف خاں سکھ افواج کے سپہ سالار شیر سنگھ کے ساتھ باہر چلا گیا ہے(۱) اور مظفر آباد خالی پڑا ہے۔ گڑھی میں سات آٹھ سو آدمی ہوں گے، اگر اس موضع پر حملہ کیا جائے تو مظفر آباد قبضے میں آ جائے گا، حضرت کو وہاں بٹھا دیں گے اور متفقہ قوت سے کشمیر پر چڑھائی کر دیں گے۔ مولوی صاحب نے کہلا بھیجا کہ مجھے صرف بالاکوٹ پہنچنے کا حکم ہوا ہے، آگے جا نہیں سکتا، مولانا شاہ اسماعیل دو تین روز میں آ جائیں گے تو ان سے بات کر لینا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت امیر المومنین اس ملک میں تازہ وارد ہیں، وہ نہ آپ لوگوں کے حالات سے واقف ہیں، نہ آپ نے انہیں دیکھا ہے، نہ ان کے ارادوں سے آگاہی حاصل کی ہے، بہتر یہ ہوگا کہ پہلے حضرت سے مل کر ان کے ارادوں سے پوری آگاہی حاصل کر لیجئے، پھر رفاقت کی درخواست کیجئے۔

---

(۱) روایتوں میں ہے کہ پشاور کی سمت چلا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ مانسہرہ کی طرف آیا ہوگا۔ اس زمانے میں شیر سنگھ یہ سوچ رہا تھا کہ سید صاحب کی قوت کو توڑنے کے لئے کہاں حملہ کرے، بالاکوٹ پر یا بھوگڑ منگ پر؟

خوانین نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر حضرت سے مل کر سب مراحل طے کرنے کا انتظار کیا گیا تو ممکن ہے نجف خاں اور شیر سنگھ واپس آ جائیں، پھر مظفر آباد پر حملے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ خوانین نے مولوی صاحب سے ملاقاتیں بھی کیں جن میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا:

خوانین کی تجویز

۱۔ نجف خاں اور شیر سنگھ کی مراجعت سے پہلے پہلے مظفر آباد کی تسخیر کا جو موقع ہے، اسے ضائع نہ کرنا چاہئے۔

۲۔ ہمارے اہل وعیال بالاکوٹ سے آ گئے ہیں، انہیں تنہا چھوڑ کر حضرت کے پاس کیسے جائیں؟

۳۔ ہمیں صرف بطور تبرک غازیوں کی امداد مطلوب ہے، لڑائی کی پوری ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے پہلی بات کے جواب میں وہی کہا جو پہلے کہا تھا، یعنی یہ کہ میں مختار نہیں ہوں مامور ہوں اور بطور خود کوئی اقدام نہیں کر سکتا، ان کے اہل وعیال کی پوری حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ تیسری بات کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ میں لڑنے کی ہمت ہوتی تو گھر بار چھوڑ کر جلاوطن کیوں ہوتے؟

مولانا کا سفر بالاکوٹ

مولانا ۲۹ رشعبان ۱۲۴۶ھ کو پچوں سے نکلے، چونکہ قصد بالاکوٹ کو ملکی آدمیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لئے ساتھیوں سے فرمایا کہ بھوگڑمنگ جانا منظور ہے۔ برف اس وقت پڑ رہی تھی، لیکن نہ رکے۔ بھوگڑمنگ کی آبادی کے قریب پہنچے تو درختوں کے نیچے ٹھہر گئے، اس وقت کہا کہ بالاکوٹ پہنچنا ہے، چنانچہ وہاں سے بالاکوٹ کا رخ

کرلیا۔ راستے میں ایک گاؤں ملا جس کے باہر ایک مکان مسافروں کیلئے تھا۔ اس میں ٹھہر گئے اور کپڑوں سے برف جھاڑی۔ جب معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں اور کوئی مکان خالی نہیں مل سکے گا تو پھر چل پڑے۔ عصر کی نماز دامن کوہ میں ادا کی، پھر چڑھائی شروع ہوگئی۔ مغرب کی نماز بعض غازیوں نے پہاڑ کی چوٹی پر ادا کی، بعض نے چڑھائی کے دوران میں، اس سفر میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ایک غازی کی بندوق کی نالی برف سے اٹ گئی اس نے بندوق چلائی تو نالی پھٹ گئی اور ایک ٹکڑے سے اس کا رخسار زخمی ہوگیا۔ اخوندزعفران قندھاری ایک درخت پر چڑھنے لگے، ساتھیوں نے یہ کہہ کر روکا کہ برف کی سردی ہلاک کرڈالے گی۔ کہنے لگے کہ چلنے میں بھی زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں، سامانِ جنگ یابوؤں اور خچروں پر سوار تھا، چڑھائی میں تو خیر وہ زیادہ نہ رکے لیکن اترائی میں بالکل بے بس ہوگئے۔

مولانا کی بے بسی

خود مولانا بھی جسم کے کمزور تھے اور زیادہ تر علیل رہتے تھے۔ چلتے چلتے وہ بھی عاجز ہوکر ایک جگہ بیٹھ گئے اور فرمایا: بھائیو کچھ ہو، ہم تو یہاں سے اٹھتے نہیں۔ چند توانا غازی تیزی سے مٹی کوٹ پہنچے اور وہاں سے گوجروں کو چارپائی سمیت لائے، چنانچہ مولانا کو چارپائی پر ڈال کر مٹی کوٹ پہنچایا گیا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری ہوگئی تھی، انہوں نے اپنا سارا سامان یعنی قرابین، شمشیر اور لحاف ایک پنجابی غازی کے حوالے کیا، جس کا نام برکات تھا اور کہا کہ اگر میں زندہ بچا تو لے لوں گا ورنہ اسے بیت المال میں دے دینا۔ پھر ایک گوجر سے کہا کہ میری دستار لے لو اور کسی طرح مجھے گاؤں میں پہنچادو، صرف دستار کی پیشکش اس لئے کی کہ جو سامان وہ گھر سے لائے تھے، اس میں سے محض دستار باقی رہ گئی تھی، باقی سب کپڑے بیت المال کے تھے اور انہیں کسی کے

حوالے کرنا مولوی صاحب کے نزدیک تقویٰ کے خلاف تھا۔ مولانا کو گوجروں نے گاؤں میں پہنچا دیا تو مولوی جعفر علی کو بھی چار پائی ہی پر ڈال کر لے گئے۔

جس مکان میں مولانا اور مولوی جعفر علی کو رکھا گیا وہاں آگ جلا دی گئی لیکن تاکید کردی کہ دیکھنا آگ کے قریب نہ آنا ورنہ ہاتھ پاؤں بیکار ہو جائیں گے۔ اسی شام کو مٹی کوٹ میں رمضان کا چاند دیکھا، مولانا دوسرے دن بالاکوٹ پہنچ گئے، مولوی جعفر علی نقوی ہاتھوں اور پاؤں پر گھی اور نمک مل کر دھوپ میں لیٹے رہے، جب چلنے کے قابل ہوئے تو مٹی کوٹ سے چلے۔

لشکر مظفر آباد بھیجنے کا فیصلہ

خوانین مولانا سے ملے تو ان سے بھی مظفر آباد پر حملے کی درخواست کی، مولانا نے غازیوں کو بھیجنے کا وعدہ کرلیا، مولوی خیر الدین کو امیر لشکر بنانا چاہا تو انہوں نے معذرت کردی اور کہا کہ ان خوانین کا کچھ اعتبار نہیں، خدا جانے ہمیں کہاں مصیبت میں الجھا کر الگ ہو جائیں۔ نیز میرا لشکر بے سامان ہے، یا تو زبردست خاں سے کہیے کہ پانچ ہزار روپے نقد دے تاکہ میں سامان درست کرلوں، یا آپ دو ہزار روپے دے دیں، آخر مولانا نے تین سو غازیوں کو زبردست خاں کے ساتھ کردیا۔ مولوی قطب الدین ننگر ہاری، منصور خاں قندھاری اور منشی محی الدین امان زئی کو مشترکا اس لشکر کی سالاری کا کام سپرد کیا۔

ادھر یہ لشکر مظفر آباد روانہ ہوا ادھر حبیب اللہ خاں (گڑھی والا)، نجف خاں (گھوڑی والا)، اور منصور خاں (درابہ والا) سید صاحب کی زیارت کیلئے روانہ ہو گئے۔ جب یہ سنایا کہ مولوی خیر الدین مظفر آباد نہیں گئے تو سید صاحب نے مولوی صاحب موصوف کے نام فرمان بھیجا کہ بے شک آپ کا عذر معقول تھا، لیکن اب ضرور جانا

چاہیے، اسلئے کہ جو لوگ گئے ہیں مبادا انہیں ناواقفی کے باعث نقصان پہنچے اور کاروبار جہاد میں خلل پڑے۔ چنانچہ مولوی خیر الدین بھی دس آدمی لے کر مظفر آباد چلے گئے۔

بالاکوٹ میں دینی مشغولیتیں

بالاکوٹ میں مولوی نصیر الدین منگلوری نے نماز تراویح کا انتظام کیا، شاہ اسماعیل بوجہ ضعف ونقاہت شریک نہیں ہوتے تھے، لیکن سب سے علی الاعلان فرماتے رہتے تھے کہ اس بارے میں میری پیروی کوئی نہ کرے، میں مجبور ہوں، ہاں جس شخص کی مجبوری میرے جیسی ہو، اس کا معاملہ دوسرا ہے۔

اس زمانے میں ملا محمود، مولانا سے سورۂ انفال کا ترجمہ پڑھتے تھے۔ مولوی جعفر علی نقوی نے بھی پڑھنے کی درخواست کی، مولانا نے فرمایا کہ فرصت بالکل نہیں۔

۲۷؍ رمضان کو مولانا نے فرمایا: آج جی چاہتا ہے کہ دو رکعت تراویح میں بھی پڑھ لوں، لیکن شرط یہ ہے کہ امام مجھے بنایا جائے۔ سب نے عرض کیا کہ آپ کے ہوتے ہوئے امامت کا حقدار کون ہے؟ مولوی سید جعفر علی نقوی کہتے ہیں کہ ان دو رکعتوں میں پوری سورۂ بنی اسرائیل پڑھی اور:

> با آں لطف خواندند کہ ہیچ نمازے با حظ ولذت آں نماز از ابتداء عمر تا الیوم پس ہیچ کدام امام نگزاردہ ام کہ تمام عمر از یاد نخواہد رفت۔(۱)
>
> **ترجمہ**: اور اس کیف میں پڑھی کہ ابتداء عمر سے آج تک (یعنی تادم تحریر) کسی امام کے پیچھے کسی نماز میں وہ لذت نصیب نہ ہوئی۔ یہ نماز عمر بھر نہ بھولے گی۔

سید صاحب بچوں پہنچ گئے

غالباً ۱۷؍ یا ۱۸؍ رمضان کو سید صاحب کی بی بی تا کوٹ سے راج دواری پہنچیں، اس

---

(۱) منظورہ ص: ۴۴۳

اثناء میں خوانین نے عرض کیا کہ اب برف کم ہو رہی ہے اور سکھوں کی یورشیں شروع ہونے والی ہیں، بہتر یہ ہے کہ راج دواری سے پچوں تشریف لے چلیں۔ علاوہ بریں ایسی خبریں آئی تھیں کہ سکھوں کا لشکر بھوگڑ منگ پر حملے کے لئے درے کے باہر جمع ہو رہا ہے۔

چنانچہ سید صاحب ۲۲ر رمضان (۲ر مارچ ۱۸۳۱ء) کو بہ قصد پچوں راج دواری سے روانہ ہو گئے۔ شیخ حسن علی اور ان کے اقربا(۱) نیز حاجی ننھے خاں بنارسی، الٰہی بخش مہاجر، ان کے بھائی، حاجی قاسم پانی پتی، احمد خاں ساکن عیسیٰ خیل، رحیم بخش اور بعض دوسرے غازیوں کو راج دواری میں چھوڑا۔ کچھ خواتین بھی تھیں، ساڑھے تین سو غازی آپ کے ساتھ گئے۔ ۲۲ر رمضان کی رات شارکول میں بسر کی، جہاں ارباب بہرام خاں مقیم تھے۔ ۲۳ر کی رات ایک اور گاؤں میں گزاری جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ۲۴ر رمضان المبارک کو پچوں پہنچ گئے۔ بی بی صاحبہ اور بچی سے یہ آخری مفارقت تھی، پھر اس دنیا میں ملاقات مقدر نہ تھی۔

خطبہ

سید صاحب نے پچوں پہنچ کر ۲۷ر رمضان کو جمعہ کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں یہ بھی کہا:

> جب کسی گھر کی کوئی دیوار گر جاتی ہے تو سارے اہل خانہ کو تکلیف پہنچتی ہے، زن و مرد و اطفال سب اس کی درستی میں لگ جاتے ہیں۔ کوئی گارا لاتا ہے کوئی اینٹیں جمع کرتا ہے، کوئی چھت ڈالتا ہے۔ جب رات دن کی محنت سے گھر درست ہو جاتا ہے تو پھر مدت دراز تک لوگ اس میں آرام سے رہتے ہیں۔
>
> اسی طرح اب مسلمانوں کا خانۂ دین معرض انہدام میں ہے، کفار نے رہزنوں کی طرح گھر کے مال و متاع پر دست تاراج دراز کر رکھا ہے، انہیں کوئی دغدغہ

---

(۱) یعنی شیخ کے دو بھائی، عبدالرحمٰن اور عبدالعزیز اور ایک بھتیجا عبدالقادر۔

> نہیں، اس لیے کہ گھر کے پاسبان اور محافظ کہیں نظر نہیں آتے۔ لازم ہے کہ غفلت کے ماتے آنکھیں کھولیں اور اپنے ویران گھر کی نگہبانی کریں، اسے نئے سرے سے محفوظ بنائیں۔ رہزنوں اور چوروں کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچائیں، گھر درست ہو جائے، چوری اور رہزنی کا کھٹکا نہ رہے تو پھر بے شک آرام کریں۔

یہ خطبہ ایسے پرتاثر انداز میں بیان ہوا تھا کہ اکثر سامعین پر گریہ طاری ہو گیا، حسن علی خاں رئیس پکھوں کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس نے اعتراف کیا:

> میں اب تک غازیوں کے کاروبار جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھتا تھا، لیکن حضرت کا جمالِ جہاں آرا دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اس عظیم الشان عزم کا انسان اگر ہفت اقلیم کی تسخیر کا ارادہ بھی کر لے تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے تمام ممالک کی فتح آسان کر دے۔ (۱)

ضامن شاہ کاغانی

سید صاحب پکھوں ہی میں تھے کہ سید ضامن شاہ ساکن کوائی (کاغان) بیس بائیس آدمیوں کے ساتھ زیارت کے لیے پہنچا۔ ان میں آٹھ افراد اس کے اقربا میں سے تھے، ضامن شاہ کے ساتھ نامہ و پیام تو پہلے سے جاری تھا لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پکھوں پہنچ کر اس نے اقربا سمیت بیعت کی اور کاروبار جہاد میں جان و مال سے شرکت کا پیمان باندھا۔ جنگ بالاکوٹ میں بھی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ شریک تھا، سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مجاہدین کی اعانت میں برابر سرگرم رہا۔ ایک زمانے تک اس کا وطن ''کوائی'' مجاہدین کا مرکز بنا رہا۔ ضامن شاہ اور جو تحفے لایا ان کی تفصیل معلوم نہیں، لیکن روایتوں میں ایک تحفے کا ذکر تفصیل سے آیا ہے، یہ مرغ زریں کا جوڑا تھا، جو سوات

---

(۱) منظورہ، ص: ۱۱۶۴

اور کاغان کے برفانی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور بے حد خوبصورت ہوتا ہے۔ جثہ بھاری کلنگ کا سا، پروں پر کئی رنگ، کوئی خط سبز، کوئی لاجوردی، کوئی سنہرا، کلغی سنہری مائل بہ سبز، چونچ نہایت درجہ سرخ، آنکھیں بھی سرخ، سید صاحب اور ہندوستانی غازیوں نے یہ مرغ کبھی دیکھا نہ تھا، سب کو قدرت کی یہ نادر عجائب کاری سراپا حیرت بنا گئی۔(۱)

تجویز شبخون

ادھر مولانا کو خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خاں گڑھی حبیب اللہ واپس آ گئے ہیں اور جگہ جگہ سے فوج جمع کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کی تیاری تھی، بالاکوٹ کا راستہ بہت دشوار گزار تھا، اور بظاہر اس قصبے پر براہِ راست حملہ مشکل تھا۔ فوج دریائے کنہار کے مغربی کنارے پر جمع ہونے لگی (۲) خیال ہوا کہ شاید بالاکوٹ کے بجائے بھوگڑمنگ پر حملہ ہو۔ مولانا نے یہ حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے تاکہ وہ دفاع کی مناسب تیاری کر رکھیں۔

ایک روز مولانا نے فرمایا کہ کیوں نہ سکھوں کی لشکر گاہ پر شبخون مارا جائے؟ اسے سب نے پسند کیا، چنانچہ غازیوں کا ایک جیش تیار کر دیا گیا اور انہیں حکم مل گیا کہ دوسرے دن عصر کے وقت بالاکوٹ سے روانہ ہو جائیں۔ ایک ایک کر کے اس پہاڑ پر چڑھ جائیں جس کے نیچے سکھوں کا لشکر تھا، دو تین آدمی کمبل سر پر اوڑھ کر چرواہوں کی سی شکل

---

(۱) اس مرغ کی کلغی اور گردن کے سنہرے پروں کو عموماً بچوں کی ٹوپیوں میں بطور کلغی لگاتے ہیں، یہ عموماً پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ والیٔ سوات کی محافظ فوج کی ٹوپیوں میں مرغ زریں کے پروں کی کلغی ایک امتیازی نشان کے طور پر لگائی جاتی ہے۔

(۲) میں نے ہر چند کوشش کی لیکن مقامِ اجتماع کا تعین نہ کر سکا۔ روایتوں میں کوئی اشارہ تک نہ مل سکا، جسے دلیل راہ بنا سکتا۔ سرسری اندازہ یہ ہے کہ فوج نظر بہ ظاہر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر کسی کھلی جگہ جمع ہوئی ہوگی۔ اسی جگہ صرف وہ زمین ہے جسے میدان کہتے ہیں اور یہ تھوڑا سے ذرا آگے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گڑھی حبیب اللہ خاں سے قریب کوئی اور مقام تجویز کر لیا گیا ہو، یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

بنالیں اور لشکر کے احوال پر نگاہ رکھیں، باقی چھپے رہیں۔

ایک غازی نے کہا کہ جہاں سکھ ٹھہرے ہوئے ہیں، وہاں تین طرف پہاڑ ہیں، صرف لاہور کی جانب کا راستہ کھلا ہوا ہے، اسے پہلے سے روک لینا چاہئے۔ مولانا نے اس رائے کی تغلیط کرتے ہوئے فرمایا: شبخون کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو بے خبری میں نقصان پہنچایا جائے۔ یہ نہیں کہ مستقل صف بندی سے جنگ کی جائے، راستہ روکنا بالکل غیر مناسب ہے، اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ سکھ بالکل عاجز آکر باقاعدہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

سید صاحب کا فرمان

جس روز شبخون مارنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، غازی ظہر کے وقت سے مولانا کے پاس پہنچنے لگے، آپ مناسب ہدایات دیتے رہے۔ دعا کر کے جیش کو رخصت کرنیکا انتظام کر رہے تھے کہ سید صاحب کا ایک خاص قاصد پچوں سے ایک فرمان لایا، اس میں درج تھا:

> مدت است کہ آں برگزیدہ بارگاہ از ما جدا ہستند واشتیاق از بس داریم نامہ بہ طلب ے رسد واز عقب سردار حبیب اللہ خاں ہم مے رود۔ حکم قطعی برائے خود ہمیں دانند کہ زود از زود روانہ نزد ایں جانب شوند، سردار حبیب اللہ خاں در بالاکوٹ حفاظت جائے خود خواہد نمود۔(۱)

> **ترجمہ**: مدت سے آپ ہم سے جدا ہیں ملاقات کا بے حد اشتیاق ہے، لہٰذا آپ کو بلایا جاتا ہے۔ سردار حبیب اللہ خاں بھی آ رہا ہے، اپنے لئے قطعی حکم یہ سمجھیں کہ جلد سے جلد ہمارے پاس آ جائیں۔ سردار حبیب اللہ خاں خود بالاکوٹ میں بیٹھ کر اپنی اس بستی کی حفاظت کرے گا۔

اس خط کے خاتمے پر مہر تھی اور پیشانی پر ”کلمۃ اللہ کافی“ سید صاحب نے اپنے

---

(۱) منظورہ ص: ۱۱۵۹

دست مبارک سے لکھا تھا اور سید صاحب کی اصطلاح میں اس کلمے سے مراد انتہائی تاکید تھی۔ مولانا نے یہ فرمان پاتے ہی فرمایا کہ بھائیو! ہم تو اب جاتے ہیں اس لئے شبخون کو ملتوی کر دو۔ بعض اصحاب نے عرض کیا کہ حضرت کو مفصل حالات لکھ بھیجئے اور شبخون کو نہ روکیے، بلکہ ٹھہر جائیے۔ مولانا نے جواب دیا کہ فرمان تاکیدی ہے، اور میرے لئے عذر کی گنجائش نہیں رہی۔

مولانا کی رائے

مولانا نے سید صاحب کے فرمان سے جو کچھ سمجھا اس کا خلاصہ یہ تھا: سردار حبیب اللہ خاں کو پہلے بھی یہ خیال تھا کہ سکھوں کا کوئی لشکر دشواری طریق کے باعث بالاکوٹ پر حملہ نہیں کر سکا، اور اب بھی حملہ نہیں ہوگا۔ جب اس نے دیکھا کہ درۂ بھوگڑ منگ پر حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہے تو سید صاحب سے عرض کیا کہ لڑائی کا زیادہ اندیشہ بھوگڑ منگ میں ہے لہٰذا اس کی حفاظت اور مدافعت کا بندوبست فرمائیے، بالاکوٹ کی حفاظت میں کروں گا، اگر سکھوں نے ادھر توجہ کی تو مقابلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔ سید صاحب نے یہ حالات سنے تو حبیب اللہ خاں کو بالاکوٹ بھیج دیا اور مولانا کو اپنے پاس بلا لیا۔ ساتھ ہی مولانا نے ایک بالغ نظر مبصر کی حیثیت میں پیش گوئی کر دی کہ انشاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں حبیب اللہ خاں ہمیں پھر بالاکوٹ بلائے گا۔

اہلِ کشمیر کا وفد

مولانا نے اپنی جگہ شیخ بلند بخت دیوبندی کو امیر بنایا، سارا انتظام انہیں سونپا، خود ست بنے کے راستے جبوڑی پہنچے جو درۂ بھوگڑ منگ کا ایک گاؤں ہے۔ رات وہاں بسر کی، اگلے روز ڈیڑھ پہر دن چڑھے بچوں پہنچ گئے۔ سید صاحب نے بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا۔

مولانا بالاکوٹ میں تھے تو اہل کشمیر کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ ہمارا وطن اب صرف تین منزل پر (یعنی ۳۲، ۳۳ میل) رہ گیا ہے اور ہم دعائیں مانگ رہے ہیں کہ آپ پہنچیں تو ہمیں سکھوں کے تسلط سے نجات ملے۔ مولانا نے یہ درخواست بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش کی، ساتھ ہی عرض کیا کہ جب آپ امب میں تھے تو کئی مرتبہ کشمیر کا ارادہ فرمایا تھا، اب ہمارے لشکر کا مقدمۃ الجیش مظفر آباد پہنچا ہوا ہے، وہاں سے وادیٔ کشمیر صرف دو دن کی مسافت پر ہے، اگر ملکی لوگ موافقت کریں تو ہم دوسرے روز کشمیر پہنچ سکتے ہیں، وہاں کے لوگ سکھوں کی تعدیوں سے بہت متالم ہیں۔ آبادی میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے، وہ بہ دل و جاں ہمارا ساتھ دیں گے۔

سید صاحب نے خوانین سے مشورہ کیا، انہوں نے تجویز سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ سکھوں سے فیصلہ کن جنگ کیے بغیر آپ آگے بڑھے تو سکھ ہم سے ضرور بدلہ لیں گے اور کہیں گے کہ تمہیں لوگوں نے خلیفہ صاحب کو آگے پہنچایا ہے۔ اگر سکھوں کو شکست ہوئی تو ہم لوگ بھی بہ اطمینانِ قلب آپ کے ساتھ کشمیر جائیں گے۔ یہ سن کر سید صاحب توقف میں پڑ گئے۔

غربا پر شفقت

مولانا چاہتے تھے کہ راستے میں لڑے بھڑے بغیر کشمیر پہنچیں، تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف اٹھنے کا موقع مل سکے۔ اس طرح کشمیر سکھوں کے تسلط سے پاک ہو جائے۔ لیکن سید صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح بالاکوٹ اور آس پاس کے مسلمان روسا و عوام سخت تکلیفوں میں مبتلا ہو جائیں گے، آخر مولانا یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ:

جناب حضرت امیر المومنین را بہ تاسّی خیر الانبیاءؐ رحمت بر غربا بسیار است

> حالانکہ مسئلہ فقہ است کہ اگر کفار مسلماناں را گرفتار نمودہ آنہا را سپر سازند یا در دیوار ہائے قلعہ خود آویزند، آں وقت ہم ترک جہاد و قتال و تسخیر آں قلعہ غازیاں را مناسب نیست بلکہ قصد کشتن کفار نمایند و حتی الوسع والامکان اہل اسلام را از اسلحہ خود محفوظ دارند۔ اگر بالفرض و التقدیر از دست ایشاں آسیبے بہ مسلماناں برسد یا آنہا کشتہ شوند درآں نہ دیت است نہ قصاص و نہ گناہے۔(۱)
>
> **ترجمہ:** حضرت امیر المومنین، حضور رحمۃ للعالمینؐ کے اسوۂ مبارکہ کی پیروی میں غریبوں پر بہت شفیق ہیں۔ حالانکہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ کافر اگر مسلمانوں کو گرفتار کر کے اپنے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کریں یا انہیں قلعے کی دیواروں کے ساتھ لٹکا دیں، (تاکہ مسلمان قلعے پر گولے گولیاں نہ برسائیں) تو اس حالت میں بھی جہاد و قتال یا تسخیر قلعہ کی تدبیر سے دست کش ہونا مناسب نہیں بلکہ غازیوں کو چاہیے کہ کافروں کو مارنے کیلئے قدم بڑھائیں اور حتی الوسع مسلمانوں کو اپنے واروں سے بچائیں۔ اگر ان مسلمانوں کو غازیوں کے ہاتھ سے گزند پہنچے یا وہ مارے بھی جائیں تو نہ ان کے لئے خون بہا مانگا جائے گا، نہ قصاص لیا جائے گا اور نہ کوئی گناہ ہوگا۔

غرض کشمیر پر پیش قدمی کی تجویز اس وجہ سے ملتوی کرنی پڑی کہ سکھوں کے حملے کا انتظار کر لیا جائے اور ضرورت ہو تو ان سے جنگ کی جائے، پھر قدم آگے بڑھایا جائے۔

درسِ مشکوٰۃ

مولانا ہکوں پہنچے تو سید صاحب کے حکم کے مطابق مشکوٰۃ کا درس شروع کر دیا، صبح ایک مجلس خاص میں جس میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا چند حدیثوں کا ترجمہ سناتے اور ان کی شرح کرتے۔ عصر کے بعد مجمع عام میں مشکوٰۃ کی تقریباً ایک فصل پیش

---

(۱) منظورہ، ص: ۱۱۳۰

نظر رکھ کر وعظ فرماتے۔

سید صاحب خود بھی ان دنوں مشکوۃ کا مطالعہ فرماتے رہتے۔ اکثر اوقات فراغت میں کتاب لے کر چار پائی پر لیٹ جاتے اور مطالعہ شروع کر دیتے۔ اگر کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا اور رفیقوں میں سے کوئی عالم پاس سے گذرتا تو اس سے معنی پوچھ لیتے۔(۱) بعض اوقات خود بعض احادیث کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔

پکھوں کے مکان بھی عام پہاڑی بستیوں کی طرح اوپر تلے تھے، ایک روز مکانوں پر چڑھے تو فرمایا کہ آؤ ذرا تیر اندازی کی مشق کرلیں۔ پچیس تیس قدم پر بھینس کا گوبر پڑا تھا، اسی کو نشانہ ٹھہرا کر تیر اندازی ہونے لگی۔ کسی کا تیر نشانہ پر نہ بیٹھا، سید صاحب نے جتنے تیر پھینکے سب اس میں پیوست ہوئے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلے اور ایک درخت کو نشانہ ٹھہرا کر تیر چلاتے رہے۔

فارغ ہوئے تو سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے۔ لوگ چار پائی لے آئے، آپ نے اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ نیاز مندوں نے عرض کیا کہ آپ ہمارے مرشد و امام ہیں۔ فرمایا:

> جیسے آپ سب ہیں، ویسا ہی ایک میں بھی ہوں۔ مجھ کو کب مناسب ہے کہ چار پائی پر بیٹھوں اور آپ سب زمین پر بیٹھیں۔

مقصد و نصب العین

پھر فرمایا:

> بھائیو! میں جو اپنے وطن سے اتنے بندگانِ خدا کو جا بجا لے کر اور طرح طرح کی سختی اور مصیبت اٹھا کر آپ کے اس ملک کوہستان میں آیا، فقط اس

---

(۱) اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب عربی بخوبی جانتے تھے ورنہ مشکوۃ کا مطالعہ کیوں کر فرما سکتے تھے۔

> واسطے کہ آپ کے ملک پر کفار غالب ہو گئے اور طرح طرح کی آپ کو تکلیف اور ذلت دیتے ہیں، ان کو مدد الٰہی سے مغلوب کروں تا کہ آپ اپنی ریاستوں پر قابض و متصرف ہوں اور دین اسلام قوت پکڑے۔ اگر میں طالب عیش وآرام ہوتا تو میرے واسطے ملک ہندوستان میں طرح طرح کے عیش وآرام تھے، اس کوہستان میں کبھی نہ آتا۔ سو مراد اس گفتگو سے یہ ہے کہ آپ سب بھائی حکومت کفار سے غیرت کریں اور جان و مال سے میرے ساتھ شریک ہوں، اور شرکت نہ کرو گے تو چند روز میں ایسا افسوس اور غم کرو گے کہ بیان اس کا تقریر سے باہر ہے۔ پھر وہ افسوس اور غم کچھ کام نہ آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں سے اپنا کام لینا چاہے گا تو اپنے اور بندوں کو میرے ساتھ کر دے گا، اور ان کے ہاتھوں سے اپنے دین اسلام کو غالب کرے گا۔ (۱)

آس پاس کے گوجر اکثر ملنے آتے تھے۔ سید صاحب ان کی بہت مدارات فرماتے تھے۔ ایک ولایتی ملا کئی روز آپ کے پاس رہا۔ ایک روز اس نے محمد امیر خاں قصوری کو جو نوجوان تھے، دیکھ کر کہا کہ حضرت! آپ کے لشکر میں زیادہ تر نوعمر لڑکے ہیں۔ ہتھیار بھی درست نہیں اور ارادہ والیٔ لاہور سے لڑنے کا ہے۔ یہ بات میرے خیال میں محال نظر آتی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا:

> اخوند صاحب! لڑائی کی فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کثرتِ فوج اور درستیٔ اسلحہ پر موقوف نہیں۔ اللہ تعالیٰ تھوڑوں کو بہتوں پر کامیاب کرتا ہے اور بہتوں کو تھوڑوں پر۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کار خیر ہے، جو کوئی خلوصِ دل اور اعتقاد درست سے شریک ہوگا، لڑکا ہو یا جوان یا بڈھا، اس کی بہ ہر طور فتح ہے۔ اور جس کی نیت میں خلل ہے اگر اسلام کی جہاں بھر پر فتح ہوئی، مگر اس کی شکست ہوئی، اور میں تو جب تک زندہ رہوں

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۳۲،۳۱

> گا انشاء اللہ اس کام کو نہ چھوڑوں گا، بعد میرے جب تک پروردگار چاہے گا اس سلسلے کو جاری رکھے گا۔ (۱)

پھر امیر خاں سے فرمایا کہ ذرا اپنے یہاں آنے کا حال تو سناؤ۔ اس جانباز نے جو داستان سنائی، وہ تفصیلاً اس کے حالات میں بیان ہوگی، یہاں اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔ بہرحال پورے حالات سن کر ملا کو یقین ہو گیا کہ سید صاحب نے مختلف اصحاب میں کس درجہ عزیمت پیدا کر دی تھی۔

دعائیں

ایک روز مولانا سے فرمایا: میاں صاحب دل میں آتا ہے کہ جناب الٰہی میں خوب دعا کریں، میں گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جایا کروں گا، آپ سب بھائیوں کو لے کر جنگل میں نکل جایا کریں۔ چنانچہ پانچ سات روز تک اسی طرح دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ سید صاحب بعد نماز عصر ایک حجرے میں الگ تھلگ بیٹھ جاتے اور مغرب تک دعا میں لگے رہتے، مولانا غازیوں کو لے کر بستی سے باہر نالے پر چلے جاتے، وہاں ایک بھاری پتھر تھا، اس پر تشریف فرما ہوتے، غازی اردگرد بیٹھ جاتے، کچھ دیر تک مولانا وعظ فرماتے، پھر ننگے سر ہو کر کمال عجز و انکسار سے دیر تک دعا کرتے رہتے۔

ماہ شوال (مارچ ۱۸۳۱ء) میں مولوی خیر الدین شیر کوٹی کا عریضہ آیا، جس میں جنگ مظفر آباد کے حالات تفصیلاً درج تھے۔ اس جنگ کی کیفیت اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ کشمیر سے عرضی رنجیت سنگھ کے پاس پہنچی کہ سید صاحب اور زبردست خاں نے علاقہ مظفر آباد و کشمیر کے چند گاؤں تاراج کر ڈالے ہیں، رنجیت سنگھ نے کھڑک سنگھ کو حکم بھیجا کہ خود حسن ابدال یا سرائے کالہ میں ٹھہرے رہو، اور فوج مظفر آباد بھیج دو۔

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۴۶، ۲۴۷

چھتیسواں باب:

جنگ مظفر آباد

زبردست خاں کی عہد شکنی

ہم بتا چکے ہیں کہ مولانا نے بالاکوٹ سے جن غازیوں کو زبردست خاں کے ساتھ مظفر آباد بھیجا تھا اس کے تین جیش تھے، اور تینوں کے سالار الگ الگ تھے۔ انھیں باہم مشورے سے حسب ضرورت جنگی اقدامات کی ہدایت کی گئی تھی۔ غازیوں نے مظفر آباد پہنچتے ہی بازار اور زبردست خاں کے محل پر قبضہ کر لیا، سکھوں کے ہاتھ میں صرف چھاؤنی اور گڑھی رہ گئی۔ اس اثناء میں سید صاحب کے فرمان کے مطابق مولوی خیر الدین شیرکوٹی محاذ مظفر آباد کے سالار اعظم بن گئے۔

زبردست خاں کو اطمینان سے بیٹھنے کا موقع مل گیا تو اس نے خفیہ خفیہ سکھوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ عام روایت کے مطابق خان کا مطالبہ یہ تھا کہ سکھ لوٹا ہوا سامان واپس کر دیں اور فرمانبرداری کا پختہ عہد لے لیں۔ اس نامہ و پیام کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ غازیوں کے ساتھ امداد کا جو وعدہ اس نے کیا تھا اس میں لیت و لعل شروع ہو جاتی۔ مولوی خیر الدین بار بار فرماتے کہ ساز و سامانِ جنگ مہیا کرو تا کہ ہم آگے بڑھیں، خان ٹال مٹول کرنے لگا یہاں تک کہ غازیوں کو خفیہ نامہ و پیام کا حال معلوم ہو گیا۔

اچانک یورش

عبدالصمد خاں خیبری اور قطب الدین ننگرہاری کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ سالار

اعظم کو اطلاع دیے بغیر مظفر آباد چھاؤنی پر ہلّہ بول دیا۔ زبردست خاں کے بھائی بھی اس میں شریک تھے، غازیوں کا فوری مدعا غالبًا یہ تھا کہ زبردست خاں کے خفیہ نامہ و پیام کو ناکام بنا دیں۔ سخت جنگ ہوئی، جس میں سکھوں کا بڑا جمعدار اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ چھاؤنی غازیوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس جنگ میں ملا قطب الدین کا بازو زخمی ہوا، عبدالصمد خاں خیبری کے سات گولیاں لگیں، لیکن ان میں صرف ران کا زخم گہرا تھا، باقی بالکل معمولی تھے۔ اور غازی بھی مجروح ہوئے۔ مولوی خیر الدین اس بات پر بہت خفا ہوئے کہ اجازت کے بغیر حملہ کر دیا گیا، لیکن چونکہ چھاؤنی پر قبضہ ہو گیا تھا اس لئے خطا معاف کر دی، زخمیوں کو بالاکوٹ کے راستے پچوں بھجوا دیا تاکہ وہاں اطمینان سے ان کا علاج ہو سکے۔

گوگلو کی حالت

اب مولوی خیر الدین نے زیادہ زوردار طریق پر ساز و سامان کا مطالبہ کیا تاکہ گڑھی کو بھی سکھوں سے خالی کرا لیں۔ اس لئے کہ گڑھی کو خالی نہ کرایا جاتا تو مظفر آباد کے جتنے حصے پر قبضہ ہو چکا تھا، وہ بھی خطرے میں پڑا رہتا۔ زبردست خاں کو اول تو یہ امید تھی کہ سکھوں کے ساتھ معاملہ روبراہ ہو جائے گا، دوسرے وہ طبعًا بخیل تھا اور اس کی آرزو تھی کہ کچھ خرچ کئے بغیر ہی سب مقاصد پورے ہو جائیں۔ وہ وعدہ کرتا رہا، لیکن کچھ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ (۱) مولوی صاحب نے یہ حالات مولانا کو لکھ بھیجے۔

مظفر آباد کشمیر کے راستے کا نہایت اہم مقام تھا۔ یہ گوارا نہ تھا کہ وہ سکھوں کے قبضے میں چلا جائے، لیکن زبردست خاں نے جو ڈھنگ اختیار کر لیا تھا، اسے پیش نظر رکھتے

---

(۱) منظورہ میں ہے کہ زبردست خاں بالاکوٹ میں پہلی مرتبہ مولانا سے ملا تو آپ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بعض ساتھیوں سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی روشِ کلام سے نفاق مترشح ہوتا ہے۔ (ص: ۱۱۳۰)

ہوئے غازیوں کی بڑی جماعت کو مظفر آباد میں بٹھائے رکھنا بالکل بے سود معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا مولوی خیر الدین کو لکھا کہ قندھاری اور ننگر ہاری غازیوں کو واپس بھیج دیا جائے، اگر زبردست خاں آپ کی مراجعت پر ناخوش ہو تو آپ ٹھہر جائیں۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو حکم سنایا تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو ساتھ لے کر جائیں گے اور زبردست خاں کے پاس نہ چھوڑیں گے، خدا جانے وہ کیسا سلوک کرے۔

دشمن کی آمد

زبردست خاں نے تذبذب کے باعث فیصلہ کن اقدام کے بہترین مواقع ضائع کر دیے۔ دفعۃً خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خاں مختلف علاقوں میں پھر پھرا کر گڑھی حبیب اللہ خاں پہنچ گئے ہیں۔ (۱) یہ سنتے ہی زبردست خاں اضطراب کا ہدف بن گیا، اب اس نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے پہلے ہی سے ان خطرات کا اندیشہ تھے، اگر سامان دے دیتے تو دفاع کے پورے انتظامات کر لیتا، اب بھی ہر خطرے کی روک تھام ممکن ہے بشرطیکہ میرے لشکر کیلئے ضروری سامان فراہم کر دیں اور جو مقامات آپ کے نزدیک سخت خطرے کے ہوں ان کی حفاظت میرے حوالے کر دیں۔ اپنے آدمی ان مقامات پر بٹھا دیں جہاں چنداں خطرہ نہ ہو۔ زبردست خاں نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اب رات ہو گئی ہے، صبح ہوتے ہی پورا سامان غازیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

فرار

مظفر آباد کے ایک کنارے چھوٹی سی مسجد تھی، اس کے پاس سے پہاڑوں پر جانے

---

(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ غازیوں نے گڑھی کا محاصرہ کر رکھا تھا، سکھوں نے ایک دن کے لئے لڑائی بند کر دینے کی درخواست کی۔ مولوی خیر الدین اس پر راضی نہ تھے، زبردست خاں نے سکھوں کی درخواست مان لی، اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے کمک کے لئے درخواست شیر سنگھ کے پاس بھیج دی۔

کا راستہ تھا۔ مولوی صاحب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زبردست خاں کا سارا سامان گٹھوں میں بندھا ہوا مسجد کے قریب دھرا ہے، یہ فرار کی تیاری تھی، مولوی صاحب حیران رہ گئے، اس اثناء میں زبردست خاں آ گیا اور بولا:

”چلئے“

مولوی صاحب: کہاں؟

زبردست خاں: پہاڑوں میں۔

مولوی صاحب: کیا ہوا؟ کون سی نئی بات پیش آ گئی کہ رات کی تجویز نظر انداز کرنی پڑی؟

زبردست خاں بتاتا کچھ نہیں تھا، بار بار یہی کہتا تھا کہ ”چلئے“۔ اس کے آدمی ہراس زدگی کے عالم میں پہاڑوں پر چڑھے جا رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر سکھ لشکری گڑھی سے باہر نکل آئے اور زبردست خاں کے آدمیوں پر گولیاں برسنے لگیں۔ وہ اِدھر اُدھر پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو مقابلے کا حکم دے دیا، سکھ پیچھے ہٹے تو گڑھی میں جانے کے بجائے انہوں نے بستی کے چند مکانوں میں آگ لگا دی۔ عین اس وقت زبردست خاں کا داماد قطب الدین خاں آیا اور اپنے خسر کا ہاتھ پکڑ کر مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: ”اس شخص کی شرم آپ کے ہاتھ میں ہے، آج اس کا کوئی ہمدرد اور ساتھی نہیں، صرف آپ اسے بچا سکتے ہیں۔“

مولوی صاحب بولے: ”بے فکر رہئے جب تک میں زندہ ہوں، زبردست خاں کو انشاء اللہ کوئی آزار نہ پہنچے گا۔“

سفرِ مراجعت

مظفر آباد سے بالاکوٹ آنے کے دو راستے تھے: ایک گڑھی حبیب اللہ خاں کے

پاس سے جسے ایک روز میں طے کیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ پورا فاصلہ بیس میل سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن اس راستے میں سکھوں کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا تھا، اگر سکھوں کو خبر ہو جاتی تو سخت مقابلہ پیش آتا۔ دوسرا راستہ بہت دشوار گزار پہاڑوں میں سے تھا، یہ پر پیچ ہونے کے باعث چالیس میل سے کم نہ تھا اور اس راستے سے بالاکوٹ پہنچنے میں چار دن لگتے تھے۔ چونکہ اس میں دشمن سے مقابلے کا کوئی خطرہ نہ تھا لہٰذا مولوی خیر الدین نے یہی راستہ اختیار کیا اور سید صاحب کو اس بارے میں اطلاع بھی بھیج دی، البتہ اس راستے میں برف کا خطرہ تھا، اس لئے سید صاحب نے راستے کے گوجروں کو کہلا بھیجا کہ دس دس بیس بیس آدمی جگہ جگہ سے برف ہٹانے کے لئے مقرر کر دیے جائیں۔

اب اس راستے کی کیفیت ملاحظہ فرمالیجیے۔

ا۔ مولوی خیر الدین مظفر آباد کے پاس سے پہاڑ پر چڑھے تھے، گجر سیداں اور کنڈا ہوتے ہوئے نورسیری پہنچے، جس کا فاصلہ مظفر آباد سے بارہ میل ہے۔ یہیں قطب الدین اور منصور خاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

۲۔ نورسیری اس لئے گئے کہ یہیں سے دریائے کشن گنگا عبور کیا جا سکتا تھا، وہاں کشتی بھی تھی جسے مقامی اصطلاح میں "ڈونڈا" کہتے ہیں اور چمڑے کے رسوں کا پل بھی بنا ہوا تھا۔ دریا کے بائیں کنارے پر گھنڈی پیراں، پڑسچا اور گھوڑی قریب واقع ہیں۔ گھوڑی وہی مقام ہے جس کی بناء پر نجف خاں کو "گھوڑی والا" کہتے ہیں اور پڑسچا میں اس کے اخلاف اب بھی موجود ہیں۔

۳۔ عبور دریا کے بعد مولوی صاحب سید پور گئے، جو پڑسچا سے سات میل ہے۔

۴۔ سید پور سے نورگلی پہنچے، جہاں برف کے ہونے کا امکان تھا، اس لئے سید صاحب نے برف ہٹانے کے لئے گوجروں کو پیغام بھیجا تھا۔

۵۔ نورگلی سے بالاکوٹ کا راستہ گیارہ بارہ میل سے کم نہ ہوگا۔

وقت گذر گیا

ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ مولوی خیر الدین کو سخت بخار آ گیا، ساتھ ہی خبر ملی کہ بالاکوٹ میں جنگ ہونے والی ہے۔ اب ہر غازی کی یہ خواہش تھی کہ جس طور بھی ممکن ہو جلد سے جلد بالاکوٹ پہنچ جائے۔ مولوی صاحب چل نہیں سکتے تھے، اور انہیں چارپائی پر لٹا کر چار آدمیوں نے اٹھا لیا۔ ۲۳ ذی قعدہ کو وہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالاکوٹ کے سامنے پہنچ گئے، اس وقت تک دریا کا پل توڑا جا چکا تھا۔ وہ درۂ کاغان کی طرف پلٹے تا کہ کسی دوسرے گھاٹ سے دریا کو عبور کریں، جب وہ چکر کاٹ کر ان پہاڑوں پر پہنچے جو بالاکوٹ کے شمال میں ہیں تو معلوم ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی اور اکثر غازی شہادت پا گئے، جو باقی بچے وہ میدانِ جنگ سے باہر جا رہے تھے۔

سید صاحب کے حالات

ہم نے سید صاحب کو پچوں میں چھوڑا تھا اور آپ نے مولانا کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس وقت خیال تھا کہ غالباً سکھ درہ بھوگڑ منگ پر حملہ کریں۔ مظفر آباد سے مولوی خیر الدین نے جب یہ اطلاع بھیجی تھی کہ سکھوں نے شیر سنگھ سے کمک مانگی ہے تو سید صاحب نے خوانین کو جمع کر کے مشورہ لیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے غازی جابجا بکھرے پڑے ہیں، کچھ راج دواری میں ہیں، کچھ بالاکوٹ اور مظفر آباد میں، کچھ ہمارے پاس ہیں، کچھ بھوگڑ منگ میں۔ طریق کار کے باب میں کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ بالاکوٹ سے حبیب اللہ خاں کی عرضی پہنچی، اس میں مرقوم تھا کہ شیر سنگھ بالاکوٹ پر پیش قدمی کرنے والا ہے، اس لئے آپ بالاکوٹ آ جائیں۔ اس طرح مظفر آباد کے غازیوں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ سید صاحب نے یہ تجویز منظور فرمائی۔

بی بی صاحبہ کو آخری پیغام

بالاکوٹ کیلئے تیار ہوئے تو ارادہ فرمایا کہ بی بی صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی ساتھ لے لیں۔ چنانچہ مولوی عبد القیوم کو پچوں سے راج دواری بھیج دیا کہ خواتین کو لے آئیں۔ پھر خیال آیا کہ اغلب ہے جنگ پیش آ جائے اس صورت میں خواتین کو ساتھ لینا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ مولوی عبد القیوم کو راستے سے واپس بلالیا، مولوی الٰہی بخش اور میاں جی نظام الدین کو مندرجہ ذیل پیغام بی بی صاحبہ کے نام دیکر راج دواری بھیج دیا۔

> اول اپنے پاس بلا لینے کا ارادہ تھا، پھر سکھوں کے آنے کی خبر گرم ہوئی، ہم ادھر جارہے ہیں، عجب نہیں ان سے مقابلہ ہو جائے، دیکھا چاہیے انجام کیا ہو۔ اس سبب سے بلانا مناسب نہ جانا، کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور ہم سب کے لئے دعا کرنا۔

معیت کا اضطراب

یہ دونوں قاصد راج دواری جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت شارکول بھی ٹھہرے جہاں ارباب بہرام خاں مقیم تھے۔ ارباب کو جب بالاکوٹ کے قصد کا علم ہوا تو پیغام دیا کہ میری طبیعت یہاں بہت گھبراتی ہے۔ حضرت سے عرض کرنا کہ اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو جاؤں۔ تیسرے روز انہیں بھی پچوں بلالیا، تقریباً بیس آدمی ان کے ہمراہ تھے۔

ارباب کی طرح ہر شخص معیت کیلئے مضطرب تھا، مولوی نصیر الدین منگلوری پہلے سے درۂ بھوگڑ منگ کی حفاظت پر مامور تھے، بالاکوٹ روانہ ہونے سے پہلے میاں ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں قندھاری کو بھی تھوڑے آدمیوں کے ساتھ مولوی نصیر الدین کے پاس جانے کا حکم دے دیا۔ خضر خاں بار بار عذر پیش کرتا رہا کہ جنگ درپیش ہے، مجھے ہمرکابی کے شرف سے محروم نہ رکھئے۔ سید صاحب نے عادت شریفہ کے مطابق نرمی اور ملائمت سے سمجھا کر اسے راضی کیا۔

پچھوں سے روانگی

ذی قعدہ کی پانچویں تاریخ تھی (۷ / اپریل ۱۸۳۱ء) اتوار کا دن تھا کہ سید صاحب پچھوں سے بالا کوٹ روانہ ہوئے، یا کہنا چاہئے کہ حیاتِ مستعار کی آخری منزل میں انہوں نے قدم رکھا۔(۱) پچھوں سے اڑھائی کوس پر جبوڑی ہے (۲) وہاں کے لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ رات جبوڑی میں گزاری، صبح کھانا کھا کر روانہ ہوئے، وہیں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ آپ ہاتھی پر سوار تھے، جلد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے، جب راستہ اتنا خراب آ گیا کہ سواری میں اسے طے کرنا قرینِ احتیاط نہ رہا تو اتر کر پیدل چلنے لگے۔ اس اثناء میں معلوم ہوا کہ گوجروں کی عورتیں دہی کے مٹکے اور ہانڈیاں لئے راستے سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہیں تاکہ خود یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کریں، آپ نے ہر مٹکے میں سے تھوڑا تھوڑا دہی چکھا اور ان کیلئے دعا کی، شاید کچھ رقم بھی دی۔

مولانا کا وعظ

مولانا کمزور تھے، پہاڑ کی چڑھائی میں چند قدم پر سانس پھول جاتا اور تھک جاتے تو پتھر پر بیٹھ کر وعظ فرمانے لگتے۔ سانس اعتدال پر آ جاتا تو چل پڑتے۔ ایک موقع پر فرمایا:

> بھائیو! خیال کرو، اگر ہم کسی امیر یا رئیس کے نوکر چاکر ہوتے اور وہ اپنے کسی کام کیلئے ایسے دشوار گزار راستے پر بھیجتا تو بلا عذر جانا اور رنج راہ اٹھانا پڑتا۔ لیکن وہ نوکری صرف گذرانِ دنیا کے لئے ہوتی۔ الحمد للہ آج ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں، بلکہ محض اپنے پروردگار کی خوشنودی و رضامندی کیلئے یہاں آئے

---

(۱) منظورہ میں ہے: ماہ ذی القعدہ بہ نصف رسیدہ بود (ص: ۱۱۶۵) میرے نزدیک "وقائع" ہی کا بیان صحیح ہے کہ پچھوں سے ذی قعدہ کی پانچویں کو نکلے۔

(۲) روایتوں میں اس مقام کا نام گنج بوڑی لکھا ہے، میں نے موقع پر پہنچ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ گنج بوڑی پچھوں میں بالا کوٹ کے راستے پر نہیں بلکہ بالا کوٹ کے شمال میں ہے، اس مقام کا صحیح نام جبوڑی ہے۔

ہیں، اور خوشی خوشی یہ سب محنتیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اگر ہماری نیتیں خالص ہیں تو اللہ تعالیٰ آخرت میں جزا ور جید دے گا۔(۱)

پہاڑ پر مقام

پہاڑ کی چوٹی پر کئی چشمے جاری تھے، سید صاحب وہاں ٹھہر گئے اور ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر اترائی شروع ہو گئی، تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک وسیع میدان ملا، اس میں بھی چشمہ بہتا تھا۔ سید صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ آپ بالاکوٹ چل کر ہمارے لئے کھانے پینے کا انتظام کریں، عصر کے وقت ہم یہاں سے چلیں گے۔ تقریباً ایک سو غازی آپ کے ساتھ ٹھہر گئے۔ مولانا جا چکے تو سید صاحب نے پیچھے پیغام بھیج دیا کہ ہمارا انتظار نہ کیا جائے، ہم رات پہاڑی ہی پر بسر کریں گے اور صبح کو آئیں گے۔

تمام غازیوں کا سامان بالاکوٹ جا چکا تھا اور کسی کے پاس رات کو اوڑھنے کے لئے بھاری کپڑا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ پہاڑ پر رات کیوں کر بسر ہوگی۔ سید صاحب کے کان میں یہ بات پہنچی تو فرمایا: پروردگار نے میرے ساتھ بڑی مہمانیوں کا وعدہ فرمایا ہے، ان میں سے ایک مہمانی آج کی رات سہی۔

نماز مغرب کے بعد آپ چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور رب العالمین کی رزاقی وربوبیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسی ذکر میں عشاء کا وقت ہو گیا۔ ساتھیوں پر رقت طاری تھی، پھر آپ نے برہنہ سر ہو کر دعاء کی۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد آپ قضائے حاجت کے لئے نکلے۔

یادِ خدا

جس جگہ ٹھہرے تھے، اس کے ایک جانب موضع ست بنے اور دوسری جانب کچھ

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۸۳،۸۴

فاصلے پر جنگلی درختوں کا جھنڈ تھا۔ آپ ان درختوں کی طرف چلے گئے، پندرہ سولہ غازی ساتھ تھے۔ آپ کے خادمِ خاص میاں فرجام کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا۔ تھوڑی دور جا کر حافظ صابر تھانوی اور پھلت کے ایک صاحب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے اور ساتھیوں سے فرمایا:

بھائیو! اگر چند روز کی مہلت دو تو جی چاہتا ہے کہ کسی پہاڑ پر تنہا بیٹھ کر اپنے پروردگار کو خوب راضی کر لوں، آپ لوگ بھی عبادت میں لگ جائیں۔

ساتھیوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ جب تک آپ کو دیکھتے رہتے ہیں، تسکین رہتی ہے، عبادت بھی اپنے حوصلے کے مطابق کر لیتے ہیں۔ جب آپ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو دلوں پر پریشانی طاری ہو جاتی ہے۔ ہمارے لئے تو دو چار گھڑی کی مفارقت بھی ناقابل برداشت ہے۔

درخت قریب تھے، آدمیوں کی آہٹ پا کر پرندے بولنے لگے۔ سید صاحب نے ان کی آواز سن کر فرمایا:

> یہ پرندے جابجا سے دانہ چن کر پیٹ بھرتے ہیں، مگر اپنے پروردگار کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ انسانوں کو دیکھو کہ طرح طرح کی نعمتیں بے رنج ومشقت اللہ تعالیٰ کھلاتا پلاتا ہے، پھر بھی ہم سے اس کی یاد نہیں ہو سکتی۔

طبیعت میں تغیر

پھر آپ تنہا درختوں کی طرف چلے گئے اور اتنی دیر وہاں لگائی کہ ساتھی گھبرا گئے۔ (۲) ان پہاڑوں میں درندے بھی رہتے تھے، دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو جانا غیر اغلب نہ تھا۔ واپس آئے تو صرف اتنا فرمایا کہ بڑی دیر ہو گئی۔

راویوں کا بیان ہے کہ اس وقت سے آپ کی طبیعت میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا، اس سے پیشتر جہاد کی مختلف تدبیروں سے اتنی دل بستگی تھی کہ ایک ایک امر کے متعلق مشورے

---

(۱) ان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

(۲) ایک روایت ہے کہ چار گھڑی وہاں رہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹے۔

فرماتے تھے اور جب تک پورا اطمینان نہ ہو جاتا کوئی حکم صادر نہ کرتے۔ درختوں کے جھنڈ سے واپس آئے تو بات بات میں تفویض و توکل کا رنگ غالب تھا اور تدبیروں کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

ایک کپڑا بچھا دیا گیا آپ لیٹ گئے اور ساتھی پاؤں دبانے لگے، لیٹے لیٹے فرمایا:

> بھائیو! خیال کرو کہ پروردگار نے ہم لوگوں کے واسطے کہاں کہاں روزی مقرر کی ہے۔ جس طرح چڑیاں اپنی روزی کے دانے، جہاں جہاں پروردگار نے مقرر کیے ہیں، وہاں چگتی پھرتی ہیں، اسی طرح ہم لوگ بھی مقدر کی روزی کھاتے پھرتے ہیں، اور اپنے پروردگار کا کام بھی اپنی طاقت کے موافق کرتے ہیں۔ (۱)

مہمانی کا خدا ساز بندوبست

اس اثناء میں دور سے دو تین مشعلیں نظر آئیں، تھوڑی دیر میں مشعلیں قریب آگئیں تو معلوم ہوا کہ چند آدمی ملاقات کیلئے آئے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کچھ رات گئے ہمیں آپ کی تشریف فرمائی کی خبر ملی، اس وجہ سے حاضری میں دیری ہوگئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک چارپائی، ایک بستر، کمبلوں کا ایک بڑا گٹھا، روٹیوں کی ایک ٹوکری اور دودھ کے دو گھڑے لائے۔ سید صاحب نے کچھ دیر ان سے باتیں کیں، پھر وہ چلے گئے۔ سب نے کھانا کھایا، سید صاحب کے لئے چارپائی بچھا دی گئی، باقی غازی ایک کمبل لے کر لیٹ گئے، صبح کی نماز کے بعد روانہ ہونے والے تھے تو پوچھا: سامان کس کے حوالے کریں؟ سید صاحب نے فرمایا: یہیں چھوڑ دو، مالک خود لے جائیں گے۔

بالاکوٹ پہنچے تو مولانا شاہ اسماعیل نے ست بنے کے نالے پر استقبال کیا۔ سید صاحب واصل خاں کی حویلی میں فروکش ہوئے جو مسجد بالا سے قریب تھی اور پہلے سے آپ کے لئے خالی کرائی گئی تھی۔

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۹۳

سینتیسواں باب:

رزمگاہِ بالاکوٹ کا نقشہ

بالاکوٹ

اب ہم سید صاحب کے آخری معرکے پر پہنچ گئے ہیں جس میں اس پاک باطن مجاہد حق نے اپنے عزیز ترین مقاصدِ حیات پر خونِ شہادت سے مہر لگائی۔ اس خونچکاں داستان کو شروع کرنے سے پہلے رزمگاہ کا پورا نقشہ پیش کر دینا ضروری ہے، جسے سامنے رکھے بغیر جنگ کے احوال ووقائع کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

بالاکوٹ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے اور تحصیل کے شمالی و مشرقی گوشے میں وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے پر پاسبان کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ اردگرد کے پہاڑی سلسلوں کو پیش نظر رکھا جائے تو بالاکوٹ وادیٔ کاغان کا ایک حصہ معلوم ہوگا، چونکہ اس کے سر پر پہنچ کر وادی کو پہاڑی دیوار نے بند کر دیا ہے اور دریائے کنہار (جس کا اصل نام دریائے کاغان ہے) کے منفذ کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، اس لئے بالاکوٹ وادیٔ کاغان سے منفک ہو گیا۔

مانسہرہ سے جو سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گذرتی اور پیچ و خم کھاتی ہوئی مظفر آباد اور سری نگر جاتی ہے، وہ پندرھویں یا سولھویں میل پر وادی کنہار میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ایک مشل دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کو گئی ہے، تقریباً ڈیڑھ میل پر ایک پل ملتا ہے، اس سے گذر کر مشرقی کنارے پر جائیں تو تھوڑی دور گڑھی حبیب اللہ خاں کی آبادی ہے، یہی سڑک مظفر آباد اور سری نگر

جاتی ہے۔ دوسری شاخ کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ شمال کو گئی ہے اسکے دسویں میل پر بالاکوٹ واقع ہے، اس سے آگے بڑھتے ہی وادی کاغان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

راستے کی کیفیت

دس میل کی اس مسافت میں سڑک کی حالت یکساں نہیں، ابتدا میں یہ صاف اور ہموار ہے، اس کے بعد خطرناک چڑھائی آ جاتی ہے، جس میں بہت سے پیچ وخم ہیں۔ پھر سڑک مستقیم اور ہموار ہو جاتی ہے، بیچ میں ایک اور چڑھائی آتی ہے، آخری حصہ پھر ہموار ہے۔ (۱)

سڑک کے آغاز سے بالاکوٹ کے قریب تک پہاڑ کی دو دیواریں تقریباً متوازی چلی گئی ہیں، بیچ میں خلا ہے، جس کا عرض زیادہ سے زیادہ آدھ میل ہوگا۔ اسی خلا میں سے دریائے کنہار پیچ وخم کھاتا ہوا گذرا ہے، کہیں مشرقی سمت کی دیوار سے جا ٹکرایا ہے، کہیں مغربی سمت کی دیوار سے آملا ہے۔ دونوں جانب کے پہاڑوں سے نالے اُتر اُتر کر دریا میں ملتے گئے ہیں۔ چونکہ پانی کی افراط ہے اس لئے دونوں جانب کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے، بالاکوٹ تک سڑک کے آس پاس کئی آبادیاں ہیں، جن میں قابل ذکر یہ ہیں: بانڈہ، برولہ، بسیاں (دوگاؤں)، شوہال نجف خاں، ترنہ، ہال پھوڑا، (یم پھول)، بادلی، سنگل بھوئی، ٹھنڈا کٹھہ اور پوڑیاں (دوگاؤں)۔

سید صاحب کے زمانے میں یہ سڑک موجود نہ تھی نیز ترنہ اور بالاکوٹ کے درمیان ”کمریاں“ تھیں، یعنی پہاڑ کے بعض حصے آگے نکل کر عین دریا کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ اس وجہ سے آمدورفت آسان نہ تھی، انہیں کاٹ کر موجودہ راستہ نکالا گیا اور اب سید صاحب کے زمانے کی حالت کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ میں جہاں تک تحقیق کرسکا ہوں

---

(۱) یہ اس وقت کی کیفیت ہے جب کتاب مرتب ہوئی تھی، اب یہ سڑک اول سے آخر تک درست ہوگئی ہے، سابقہ سڑک کے پیچ وخم اور نشیب وفراز بھی کم ہوگئے ہیں۔

سید صاحب کے وقت میں موجودہ راستے کا وجود ہی نہ تھا، بلکہ مختلف پہاڑی راستے جا بجا بنے ہوئے تھے وہی آمد و رفت کا ذریعہ تھے۔

گڑھی سے بالاکوٹ تک

گڑھی حبیب اللہ خاں سے بالاکوٹ تک دریائے کنہار کے دونوں کناروں کے مقامات کا ذرا مفصل ذکر اس وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کے نام جنگ کے سلسلے میں آئے ہیں اور جو اصحاب بطور خود اس حصے کی سیر کے خواہاں ہوں ان کے لئے یہ بیان ایک مفید رہنما کا کام دے گا۔

پہلے مغربی کنارے کی کیفیت ملاحظہ ہو: گڑھی حبیب اللہ خاں کے سامنے سے بالاکوٹ کا رخ کریں تو ابتداء میں ”بیلہ“ نام ایک مقام آتا ہے، اس سے آگے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ”گل ڈھیری“ ہے، اس مقام اور دریا کے درمیان ایک ٹیلہ حائل ہے جسے ”ڈوگہ“ کہتے ہیں۔ وہاں سے پونے میل پر ”بانڈہ“ ہے، بانڈہ میں ڈاک بنگلہ موجود ہے۔ آگے بڑھیں تو پہلے ”برولہ“ آئے گا پھر ”جاگیر“ پھر ”بسیاں زیریں“ ساتھ ہی ”شوہال نجف خاں“ جہاں حال ہی میں عبور دریا کے لئے پل بنایا گیا ہے۔ ”شوہال“ گڑھی اور بالاکوٹ کے وسط میں واقع ہے۔

اس سے آگے ترنہ ہے، جس کا فاصلہ شوہال سے کوئی دو میل ہوگا، اس نام کا نالہ بھی پہاڑ سے اتر کر دریا میں شامل ہوتا ہے۔ نالے پر سے گذرنے کے لئے پل بنا ہوا ہے، ترنہ سے تھوڑی دور آگے ”بادلی کٹھہ“ نام ایک نالہ آتا ہے۔ بالاکوٹ کی طرف جانے والے آدمی کے دائیں ہاتھ سڑک سے ذرا ہٹ کر وہ مشہور پہاڑ ہے جس کا نام ماسٹر ڈھاکہ ہے۔ اس کے ایک کم بلند حصے کو بسوت نکہ کہتے ہیں، بادلی کٹھہ سے آگے بال پھوڑا (بم پھولہ) کٹھہ آتا ہے، اور دونوں کے درمیان بال پھوڑا نکہ نام پہاڑ ہے، جس

کے ڈھلوان کو پرانے زمانے میں "کھڑیاں" کہتے تھے اور اب تک یہ نام بدستور چلا آتا ہے۔ اس جگہ "بندوقاں والی" نام ایک مقام ہے، بالاکوٹ کیا جنوبی سمت میں سید صاحب کا سب سے اگلا مورچہ یہیں تھا۔

"ہاں پھوڑا کٹھہ" سے آگے "سنگل بھوئی کٹھہ" ہے اور آگے "ٹھنڈا کٹھہ" جس کے پاس ہی سے بالاکوٹ کا حلقہ شروع ہو جاتا ہے۔ سنگل بھوئی اور ٹھنڈا کٹھہ کے درمیان مقام کو "پوڑیاں" کہتے ہیں، ٹھنڈا کٹھہ اوپر جا کر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے، ان شاخوں کے درمیان پہاڑ کا نام لیدی نکہ ہے جو شہید گلی تک جاتا ہے۔ اس کٹھہ کی بالاکوٹ والی سمت میں "مٹی کوٹ" نام ٹیلہ واقع ہے، جس کے ڈھلوان پر "کالی مٹی" نام ایک موضع ہے اور چوٹی پر مٹی کوٹ۔

اب مشرقی کنارے کی کیفیت ملاحظہ فرمالیجئے: گڑھی حبیب اللہ خاں سے آگے "سیری" ہے۔ اس سے آگے "حصاری" پھر جب (۱) "اور کشتڑہ" اس سے آگے "ستابڑہ" ہے، جہاں عام شہرت کے مطابق سید صاحب کا دھڑ دفن ہے اور قبر کا نشان اب تک قائم ہے۔ "ستابڑہ" سے آگے "بھلے کوٹ"، اس کے شمال میں میدان شروع ہو جاتا ہے، جو دریا کے ساتھ ساتھ شوہال معزاللہ خاں تک جاتا ہے۔ اس سے آگے کے مقامات یہ ہیں: ہستہ، بٹ کرڑ، ڈھیریاں، بیلہ، منڈی اور بالا پیر کی خانقاہ جو بالاکوٹ کے عین سامنے واقع ہے۔ (۲)

---

(۱) جب جابہ، جبڑ اور جبوڑی چاروں لفظ دلدلی زمین کے لئے استعمال ہوتے ہیں، مطلب یہ نہیں کہ زمین اب بھی دلدلی ہے، یہ سمجھنا چاہئے کہ ابتدا میں دلدلی تھی، اس لئے یہ نام رکھے گئے۔

(۲) مقامی لوگوں نے پہاڑ کے لئے بلندی کے اعتبار سے مختلف نام تجویز کر لئے ہیں، مثلاً سب سے اونچا "ڈھاکہ" اس سے نیچا ڈنہ، اس سے نیچا "نکہ"۔ اس طرح سب سے کم بلند ٹیلے کو ڈھیری کہتے ہیں، آپ بعض اسماء کے آگے ڈھاکہ یا ڈنہ یا نکہ یا ڈھیری دیکھیں تو سمجھ لیں یہ مختلف بلندیوں کے پہاڑ ہیں، اسی طرح کٹھہ نالے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

بالاکوٹ کا حلقہ

مٹی کوٹ کے ٹیلے کے دامن سے وادیٔ کنہار کی مغربی سمت کی پہاڑی دیوار دریا سے پیچھے ہٹ گئی ہے اور اس کا رخ شمال مغرب کے بجائے بالکل شمال میں ہو گیا ہے۔ اسی طرح وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے کے باہر پہاڑوں کے درمیان سطح مرتفع کا ایک خاصا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں:

۱۔ مشرق میں کڑا پہاڑ کا وہ حصہ جس کا نام کالوخاں کا ٹیلہ ہے، یہ بہت بلند ہے، اور اس کی چوٹی پر کالوخاں نام کا گاؤں ہے، جسے کالوخاں گوجر نے آباد کیا تھا۔

۲۔ مغرب میں مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے، یہ بھی بلندی میں کالوخاں کا ہمسر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا شمالی حصہ ذرا ڈھالو ہے اور جنوبی حصے کی اونچائی کم ہوتے ہوتے پوڑیاں کے قریب پہنچ کر معمولی سی رہ گئی ہے۔ ٹیلے کے شمالی حصے میں چوٹی پر مٹی کوٹ گاؤں ہے، جس کے بارے میں مثل مشہور ہے: "جس کا مٹی کوٹ، اسی کا بالاکوٹ" ٹیلے کا نام مٹی کوٹ شاید اس لئے پڑا کہ اس عظیم الشان تودے میں بہ ظاہر مٹی زیادہ ہے اور پتھر کم، اس کے شمالی ڈھلوان کو ڈھیری کٹلیاں کہتے ہیں۔ جنگ بالاکوٹ میں گھمسان کا رن اس نالے پر پڑا تھا جو مٹی کوٹ کے ٹیلے اور ڈھیری کٹلیوں کے بیچ میں اترتا ہے اور مقام نزول پر اس نے ٹیلے اور کٹلیاں کے درمیان تھوڑا سا خلا پیدا کر دیا ہے۔

۳۔ حلقے کے شمالی حصے میں تین ٹیلے ہیں جنہوں نے مل کر ایک دیوار بنا دی ہے، یہ دیوار بالاکوٹ کے شمالی و مغربی گوشے سے شروع ہو کر شمالی و مشرقی گوشے تک چلی گئی ہے۔ مغرب کی سمت میں ست بنے کا ٹیلہ ہے، جس پر اسی نام کا گاؤں آباد ہے، بیچ میں برنا کا ٹیلہ مشرق میں سارنگ کا ٹیلہ۔

۴۔ حلقے کی جنوبی سمت میں کوئی ٹیلہ نہیں بلکہ کنہار کی وادی ہے، جس نے کاغان

سے باہر نکلتے ہی بالا کوٹ کے پاس جنوبی و مغربی رخ اختیار کر لیا ہے۔ ترنہ کی طرف سے بالا کوٹ جائیں تو جب تک پوڑیاں سے آگے نہ بڑھیں بالا کوٹ نظر نہیں آتا، اس لئے کہ مٹی کوٹ کے ٹیلے کا جنوبی حصہ بیچ میں حائل رہتا ہے۔ اس حلقے کی زمین پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ ذرا اونچی ہے، جیسے جیسے جنوبی اور جنوبی و مغربی سمت میں آئیں، اس میں نشیب پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح انتہائی حصوں کی سطح میں کم و بیش پانچ چھ سو فٹ کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔

قصبہ

حلقے کے عین بیچ میں ایک ٹیلہ یا قدرتی پشتہ ہے، جس پر بالا کوٹ آباد ہے۔ پشتے کی جنوبی سمت پاس کی زمین سے چھ سات سو فٹ بلند ہوگی، مشرقی سمت اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ شمالی سمت میں ٹیلہ ڈھالوان ہے، یہاں تک کہ اس کا آخری گوشہ زمین کے برابر ہو گیا ہے، مغربی سمت بھی ڈھالو ہے۔

قصبے کی آبادی گنجان ہے، مکان چھوٹے چھوٹے، گلیاں تنگ اور پیچ دار، اَن گھڑ پتھر آس پاس کے نالوں اور دریائے کنہار میں بے شمار ہیں، انہیں کو گارے سے جوڑ جوڑ کر دیواریں کھڑی کر لی گئی ہیں۔ اکثر مکان معمولی حیثیت کے ہیں۔ پشتے کی مشرقی سمت چونکہ بالکل سیدھی کھڑی ہے اس لئے ادھر چوٹی سے نیچے تک کوئی مکان نہیں۔ یہی صورت جنوبی سمت کی ہے، لیکن شمالی و مغربی سمت میں زمین کی سطح تک مکان چلے گئے ہیں، اور عام پہاڑی آبادی پھیلتے پھیلتے شمالی و مغربی سمت کے کھیتوں میں بھی چلی گئی ہے۔

پہلی آبادی غالباً یہی تھی، ممکن ہے میدان میں بھی جا بجا چھوٹے چھوٹے گاؤں یا دو دو چار چار گھر زمینداروں نے بنا لئے ہوں، اب بھی ان کے نشان ملتے ہیں، لیکن بالا کوٹ چونکہ کاغان، چیلاس، گلگت اور دوسرے شمالی کوہستانی علاقوں کی تجارت کا مرکز

تھا، اس لئے انگریزوں کے زمانے میں آبادی بہت پھیل گئی۔

میرا خیال ہے کہ پہلے قصبے کے جنوب مشرق میں دریائے کنہار کے پل کے پاس دکانیں بنیں، پھر پل کی دوسری طرف ایک منڈی بن گئی، جسکی وجہ سے لوگوں نے مکان بنا لئے۔ تھوک مال کے زیادہ تر تاجر انہیں آبادیوں میں رہتے ہیں، اور عام کاروبار بھی یہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح بالاکوٹ سے نیچے سڑک کے قریب اسکول، شفاخانہ، ڈاک بنگلہ اور تھانہ وغیرہ بن گئے۔ (۱)

مساجد

قصبے میں اب کئی مسجدیں ہیں۔ دو حال ہی میں بنی ہیں، جو خاصی شاندار ہیں: ایک قصبے کے جنوبی حصے میں، دوسری قصبے سے نیچے شمال مغرب میں۔ آخری مسجد کو آج کل بالاکوٹ کی مسجد جامع کہا جاتا ہے۔ یہ وسیع اور کشادہ ہے۔ اس کے پاس چشمے ہیں۔ ان میں سے ایک کا پانی ٹھنڈک میں ضرب المثل بنا ہوا ہے۔

سید صاحب کے زمانے میں غالباً تین مسجدیں تھیں: مسجد بالا یا مسجد کلاں، مسجد متوسط اور مسجد زیریں۔ مسجد بالا یا کلاں قصبے کے جنوبی و مغربی حصے میں تھی۔ اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کے حدود پہلے سے کسی قدر کم ہو گئے ہیں۔ مسجد متوسط شمالی حصے میں ہے اور مسجد زیریں قصبے سے نیچے اتر کر مغربی سمت میں۔ ان مسجدوں کو نہ صرف یہ کہ وسیع ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ خاصی تنگ اور بے رونق ہیں۔ مثلاً میرے اندازے کے مطابق مسجد کلاں (بالا) میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ آدمی ایک وقت میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری مسجدیں اس سے بھی چھوٹی ہیں۔

---

(۱) پاکستان بن جانے کے بعد قصبے کے نیچے کی آبادی بہت پھیل گئی۔ بڑے بارونق بازار بن گئے، ڈاک بنگلے، پولیس کے تھانے وغیرہ کے علاوہ بھی عالی شان عمارتیں وجود میں آ گئیں۔ اب وہاں پہنچ کر سابقہ حالت کا اندازہ بہت مشکل ہے۔

ان کی خصوصیت کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ عام مساجد کے برعکس ان کا مسقف حصہ مغربی سمت میں نہیں بلکہ مشرق میں ہے، یعنی قبلہ رخ کے برعکس۔ مثال کے طور پر مسجد کلاں کا خاکہ ملاحظہ فرمائیے:

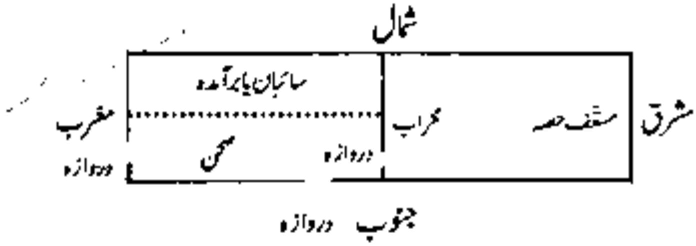

میں نے متفرق لوگوں کو سائبان میں نماز پڑھتے دیکھا۔ معلوم نہیں مسقف حصے کو وہ کس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ پرانی روایات کا علم رکھنے والے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ اس مسجد کے مسقف حصے کی محراب میں سید صاحب نے مراقبہ کیا تھا، مسجد بالا کلاں اور مسجد زیریں کے درمیان سو گز کا فاصلہ ہوگا۔

مسجد بالا سید صاحب کے زمانے میں

یقینی طور پر بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب کے زمانے میں مسجد بالا کا نقشہ کیا تھا، میں مختلف روایتوں سے جو معلومات حاصل کر سکا، ان کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ اس میں نمازیوں کی دو صفیں کھلی کھڑی ہو جاتی تھیں۔
۲۔ اس کے سائبان کا عرض تقریباً چھ ہاتھ یعنی نو فٹ تھا۔
۳۔ مسجد خام تھی اور اس پر لکڑی کی چھت تھی، جسے مٹی سے پاٹ دیا گیا تھا۔
۴۔ قبلہ رخ ایک کھڑکی تھی اور جنوبی سمت میں بڑا دروازہ تھا۔
۵۔ بڑے دروازے کے سامنے تیس ہاتھ (۴۵ر فٹ) لمبا اور نو ہاتھ (ساڑھے

تیرہ فٹ) چوڑا میدان تھا۔ اگر سائبان اسی جگہ تھا جہاں اب ہے تو سمجھنا چاہئے کہ مسقف حصے کی کھڑکی سائبان میں کھلتی تھی۔ بڑا دروازہ اب بھی جنوبی سمت ہی میں ہے، اس کے باہر جو میدان تھا وہ اب باقی نہیں رہا اور اس میں مکان بن گئے ہیں۔ ایک دروازہ مغربی سمت میں بھی ہے جو غالباً پہلے بھی موجود تھا، اس لئے کہ روایتوں میں "بڑے" دروازے کا رخ جنوبی سمت میں بتایا گیا ہے۔ "چھوٹا" دروازہ بظاہر مغربی سمت ہی میں ہوسکتا تھا۔

مکانات

کچھ معلوم نہیں کہ سید صاحب اور ان کے غازیوں کے لئے قصبے کے کتنے مکانات خالی کرائے گئے تھے۔ سید صاحب کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ واصل خاں کی حویلی میں ٹھہرے تھے، مسجد بالا کے مشرق میں تین فٹ چوڑی ایک گلی ہے، اس کے دوسری جانب مسجد کے سامنے واصل خاں کی حویلی تھی۔(۱) مسجد کلاں کے نیچے شمالی سمت میں ایک دالان تھا، جو اب باقی نہیں رہا۔ اس میں مولانا شاہ اسماعیل اپنی جماعت کے ساتھ مقیم ہوئے تھے۔ غالباً توشہ خانہ اور منشی خانہ قریب قریب تھے، توشہ خانے کے مہتمم شیخ ولی محمد تھے اور منشی خانے کے افسر اعلیٰ منشی محمدی انصاری۔ سب غازی بالاکوٹ کے قصبے میں نہ تھے، مختلف جماعتوں کو سید صاحب نے ضروری مورچوں پر بھیج دیا تھا، جیسا کہ آگے

---

(۱) میں نے اس حویلی کی سرگزشت اور کیفیت کے باب میں کئی مرتبہ پرسشیں کیں، یہی معلوم ہوسکا کہ اس کی پہلی حالت باقی نہیں رہی اور حدود بھی کم ہوگئے۔ واصل خاں کا بیٹا لال خاں تھا، لال خاں کا بیٹا دوست محمد خاں، آخر الذکر کے تین بیٹے تھے: گل زماں خاں، فقیر خاں اور تاج محمد خاں۔ ۱۹۳۶ء میں فقیر خاں کا بیٹا محمد اشرف خاں موجود تھا، بعد کا حال معلوم نہیں۔ سنا تھا کہ حویلی تقسیم ہوگئی تھی اور اس کے بعض حصے بک بھی گئے تھے۔ یہ مقام بھی یادگار کے طور پر محفوظ رہنا چاہئے۔ "منظورہ" میں مسجد بالا کو سید صاحب کی اقامت گاہ اور مسکن قرار دیا گیا ہے (ص: ۷۷، ۱۷۱، ۸۰، ۱۱۷)۔ اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ رہتے واصل خاں کی حویلی میں تھے لیکن زیادہ وقت اس مسجد میں گزارتے تھے۔ دونوں کے درمیان تقریباً تین فٹ کی ایک گلی کا فصل تھا۔

چل کر معلوم ہوگا۔

نالے

دریائے کنہار بالاکوٹ کے پاس سے گذرتا ہے، اس کے علاوہ شمالی و مغربی سمت کی پہاڑیوں سے کئی نالے اتر کر حلقہ بالاکوٹ میں سے بہتے ہوئے دریائے کنہار میں ملے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر نالے یہ ہیں:

۱۔ ست بنے کا نالہ، جو شمالی و مغربی گوشے سے آیا ہے، اس کا پاٹ خاصا چوڑا ہے، اور قصبے کے شمالی گوشے میں پہنچتے پہنچتے یہ بہت گہرا ہوگیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق گہرائی ایک سو فٹ سے کم نہ ہوگی۔

۲۔ برنا نالہ: یہ عین شمالی سمت سے آیا ہے اور بالاکوٹ کے شمال میں ست بنے سے ملا ہے۔ مقامِ اتصال پر قلندر کی خانقاہ ہے، پھر یہ دونوں نالے بہم ہو کر بالاکوٹ کے پشتے کی مشرقی سمت سے ملے ہوئے نیچے چلے گئے ہیں اور پل کے قریب کنہار میں شامل ہوئے ہیں۔

۳۔ مٹی کوٹ کا نالہ: یہ نالہ مٹی کوٹ ٹیلے کی شمالی سمت سے نیچے اترا ہے، دامن میں پہنچتے ہی اس نے جنوبی رخ اختیار کرلیا ہے۔ ڈاک بنگلے اور اسکول کی عمارتوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا یہ دریا میں شامل ہوگیا ہے۔ اور نالے بھی ہیں لیکن ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

گرد و پیش

بالاکوٹ کی مغربی جانب میں پشتے سے متصل جو کھیت ہیں وہ خاصے نشیب میں ہیں، پھر مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف زمین کی سطح بہ تدریج بلند ہوتی جارہی ہے، اس وجہ سے کھیت درجہ بہ درجہ بنے ہوئے ہیں۔ قصبے کے پاس کی زمین میں دھان بہ کثرت

ہوتے ہیں۔ جو زمینیں ذرا فاصلے پر ہیں، ان میں گندم اور مکی بوئی جاتی ہے۔ شمالی، وشرقی اور جنوبی سمت کی زمینیں بھی خوب سیراب ہیں اور فصل اچھی ہوتی ہے۔ دھان کی زمینوں کو مقامی اصطلاح میں "ہوتر" کہتے ہیں۔

دریا کے پار کالوخاں کے دامن میں کئی گاؤں ہیں: مثلاً گھرلاٹ، بالا پیر، نترا، ڈھیریاں۔

ست بنے کے نالے پر کھڑے ہو کر مغربی سمت دیکھیں تو پیچھے ایک اونچا پہاڑ نظر آئے گا، جس کا بالائی حصہ چیڑ کے درختوں سے لدا ہوا ہے۔ یہ بالاکوٹ کے حلقے کے مغربی ٹیلوں سے پیچھے ہلال کی صورت میں شمال سے لے کر جنوب تک پھیلا ہوا ہے، اسے "رکھ ماسٹر" یا "ماسٹر کا ڈھاکہ" کہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق سکھ ترنہ کے نالے سے اوپر چڑھ کر پہلے اسی پر پہنچے تھے۔ وہاں اب تک ایک مقام "شہید گلی" کے نام سے موسوم ہے، جہاں غازیوں نے سب سے پہلے سکھوں سے جنگ کی تھی۔ مٹی کوٹ ٹیلے کے دوسری طرف جنوبی سمت میں ٹھنڈا کٹھہ اور سنگل بھوئی کے نالے ہیں، یہ نالے اوپر جا کر مل جاتے ہیں۔ یعنی اوپر سے ایک نالہ آیا تھا، ایک ٹیلے نے اسے دو حصوں میں بانٹ دیا، ترنہ کا نالہ ترنہ کے پاس ہے۔

مشاہد

بالاکوٹ کے ارد گرد کئی مقامات ہیں، جہاں شہیدوں کی قبریں بتائی جاتی ہیں، ان کی بھی سرسری کیفیت ملاحظہ فرمالیجے۔

۱۔ جس قبر میں عام روایت کے مطابق سید صاحب کو دفن کیا گیا تھا، وہ پل کے قریب دریا کے کنارے ایک احاطے میں ہے اور کاغان جانے والی سڑک اس احاطے کی دیوار کے پاس سے گذری ہے۔ اگر یہ قبر صحیح بھی ہو تو میری تحقیق کے مطابق سید صاحب

کی میت تین دن سے زیادہ اس میں نہ رہی اور اب وہ خالی ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

۲۔ شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کی قبریں بالاکوٹ کے شمال مشرق میں ست بنے نالے کے پار ہیں۔

۳۔ بعض شہیدوں کی قبریں شاہ اسماعیل کے مرقد سے بھی شمال مشرق میں ہیں۔

۴۔ کچھ قبریں دریائے کنہار کے پار کالوخاں پہاڑ کے دامن میں ہیں۔

۵۔ زیادہ تر شہیدوں کی قبریں مٹی کوٹ کے ٹیلے کے دامن میں مٹی کوٹ نالے کے کنارے دو جگہ ہیں۔

۶۔ ایک شہید کی قبر گاؤں کے قریب مغربی سمت میں ہے۔

پل

جس مقام پر آج کل پختہ پل بنا ہوا ہے۔(۱) یہاں سید صاحب کے زمانے میں بھی لکڑی کا معمولی پل تھا اور غازیوں کی ایک جماعت اس کی حفاظت پر مامور تھی، لیکن وہ لوگ پل کے پاس نہیں رہتے تھے بلکہ اس سے کسی قدر جنوب میں مقیم تھے۔ سکھوں نے بالاکوٹ سے تقریباً چار میل جنوب میں لکڑی کا ایک اور پل بنا لیا تھا، اسی پل پر سے وہ اپنے جانور چرانے کیلئے دوسرے کنارے پر لاتے تھے۔(۲) غازی وقتاً فوقتاً ان پر حملے بھی کرتے رہتے تھے۔

آپ بالاکوٹ کا خاکہ سامنے رکھ کر بقیہ تفصیلات پر غائر نظر ڈالیں گے تو امید ہے وہ سمجھ میں آجائیں گی۔ اس کے بعد آئندہ ابواب کے سمجھنے میں ان شاء اللہ کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

---

(۱) اب ایک کے بجائے دو پل بن گئے ہیں، یہاں مراد پرانا پل ہے۔

(۲) یعنی مشرقی جانب سے مغربی جانب، کیونکہ لشکرگاہ دریا کے مشرقی جانب تھی۔

اڑتیسواں باب:

دفاعی انتظامات

شیر سنگھ کی نقل و حرکت

شیر سنگھ اوائل شوال میں گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس تھا، سید صاحب بالا کوٹ پہنچے تو سکھوں کا لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالا کوٹ سے دو اڑھائی کوس جنوب میں نیچے ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، شیر سنگھ کے لئے بالا کوٹ پر حملے کی دو ہی صورتیں تھیں: یا وہ پکھلی کی جانب سے پہاڑ پر چڑھتا اور مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ کر نیچے اترتا، اس راستے سے بھاری سامان اور توپیں لے جانا ممکن نہ تھا، یا کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالا کوٹ کے سامنے پہنچتا۔ اس نے دوسری صورت اختیار کی۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے ڈیرے اور خیمے بالا کوٹ سے نظر آ رہے تھے۔

سید صاحب کے لئے بالا کوٹ پہنچتے ہی پہلا کام یہ تھا کہ مختلف ناکوں اور گذرگاہوں کی حفاظت کا پورا بندوبست ہو جائے، میں بتا ہی چکا ہوں کہ جس سڑک سے آج کل بالا کوٹ آتے جاتے ہیں، یہ پہلے موجود نہ تھی، ترنہ اور بالا کوٹ کے درمیان ''کھڑیاں'' تھیں، جن پر سے اکا دکا آدمی آ سکتے تھے، بڑا لشکر نہیں آ سکتا تھا، تاہم اس حصے کی حفاظت بھی ضروری تھی۔

دفاعی مورچے

اب سید صاحب کے دفاعی انتظامات کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ جنوبی سمت کی کمزوریوں پر امان اللہ خاں لکھنوی کو بیس پچیس غازیوں کے ساتھ متعین کیا اور دو شاہنیں انہیں دے دیں، اس حصے میں اتنے ہی غازی خاصے بڑے لشکر کو روکنے کے لئے کافی تھے۔

۲۔ سردار حبیب اللہ خاں نے بتایا تھا کہ ایک پرانی پگڈنڈی جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچتی ہے، اس حصے کی حفاظت کیلئے ملا لعل محمد قندھاری کو ایک سو غازیوں کے ساتھ مقرر کر دیا گیا۔

۳۔ ملا لعل محمد قندھاری کی پشتیبانی کے لئے قندھاری غازیوں کی ایک جماعت مٹی کوٹ میں بٹھا دی۔

۴۔ بالاکوٹ کے جنوب مشرق میں جو پل تھا، اس کی حفاظت اس وجہ سے بے حد ضروری ہو گئی تھی کہ خیال تھا شاید شیر سنگھ دریا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر کے بالاکوٹ کے سامنے پہنچ جائے اور پل پر سے فوج گزار کر قصبے میں آ جائے، اس کی حفاظت کیلئے ایک جماعت مقرر کر دی، میری معلومات کے مطابق اس جماعت نے پل کے پاس نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جنوبی سمت میں دریا کے مغربی کنارے پر دفاعی مورچے بنا لئے تھے، جہاں سے پل کی حفاظت بھی ہو سکتی تھی اور سکھ فوج کو مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی سے بھی روکا جا سکتا تھا۔

سکھ لشکر گاہ

سکھ لشکر گاہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر اس جگہ تھی جسے مقامی اصطلاح میں میدان کہا جاتا ہے۔ یہ مقام گڑھی حبیب اللہ خاں سے تقریباً پانچ چھ میل شمال میں واقع ہے اور وہاں سے بالاکوٹ بھی کم و بیش اتنے ہی فاصلے پر ہوگا۔ اس "میدان" کے جنوب میں "بھٹلے کوٹ" اور شمال میں شوہال معز اللہ خاں ہے۔ ہموار زمین کا یہ ٹکڑا رقبے میں میل

سو امیل مربع ہوگا، اس حصے میں بڑے لشکر کے قیام کیلئے اس سے موزوں تر مقام کوئی نہیں۔

غازیوں کی روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ آس پاس جانور چرانے کے لئے کافی جگہ نہ تھی، اس لئے سکھوں نے دریا پر لکڑی کا پل بنالیا تھا، تاکہ جانوروں کو مغربی کنارے پر لا کر چرا سکیں، مجاہدین جب موقع پاتے چھاپے مار کر جانور پکڑ لے جاتے۔

غالباً ابتدا میں شیر سنگھ کا ارادہ یہ تھا کہ دریا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا بالاکوٹ کے عین سامنے پہنچ جائے اور وہاں سے دریا عبور کر کے جنگ کرے، لیکن بعض بدیہی مشکلات کے پیش نظر اس تدبیر پر عمل نہ ہوا۔

پہاڑی پگڈنڈی

شیر سنگھ نے غور و مشورہ کے بعد طے کیا کہ پہاڑوں میں سے گذر کر لشکر مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچایا جائے، وہاں سے بالاکوٹ پر حملہ بہت آسان تھا اور اسی آسانی کے پیش نظر یہ مثل بنی تھی کہ ”جس کا مٹی کوٹ، اسی کا بالاکوٹ“۔ اس راستے کا علم تمام مقامی اصحاب کو تھا سید صاحب کے جن سوانح نگاروں نے اسے غیر معروف یا غیر مستقل پگڈنڈی قرار دینے میں مبالغے سے کام لیا ہے، ان کے تمام تصورات سنی سنائی غیر مستند باتوں پر مبنی ہیں، حقیقت حال سے وہ آگاہ نہ تھے۔ آج کل بھی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ راستہ بے تکلف طے کیا جا سکتا ہے، حالانکہ پختہ سڑک بن جانے کے باعث اب اس سے کام لینے کی چنداں ضرورت نہیں رہی، اب راستے کی عام کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ یہ پوری کیفیت برادر عزیز عبدالرشید صاحب علوی بی اے کی تحقیق پر مبنی ہے، جنہوں نے خود اس راستے کا چپہ چپہ پیدل پھر کر دیکھا اور یہ زحمت اس لئے اٹھائی کہ میں صحیح کیفیت قلمبند کر سکوں:

۱۔ سکھ لشکر ”میدان“ سے اٹھ کر بذریعہ پل ”جاگیر“ میں پہنچا جو ”میدان“ کے بالمقابل مغربی کنارے پر واقع ہے، وہاں سے بسیاں زیریں گیا، جو ”جاگیر“ کے شمال

میں زیادہ سے زیادہ ایک میل ہوگا۔

۲۔ بسیاں زیریں سے یہ لشکر شوہال کنھ کے ساتھ ساتھ درۂ شوہال میں سے ہوکر ڈمگلہ پہنچا۔ یہ فاصلہ چار میل ہوگا، ڈمگلہ ہی وہ مقام ہے جہاں اوائل جہاد میں مجاہدین کی ایک جماعت نے سید محمد مقیم رام پوری کے زیر قیادت سکھوں پر شبخون مارا تھا۔

۳۔ ڈمگلہ سے سکھ لشکر نے شمال کا رخ اختیار کرلیا اور وہ ''جابہ'' اور اکھڑیلہ ہوتا ہوا ''چنڈوال'' پہنچا یہ فاصلہ ساڑھے چھ میل کے قریب ہے۔

۴۔ ''چنڈوال'' سے ساڑھے تین میل شمال میں ایک مقام ہے، جس کا پہلا نام معلوم نہیں آج کل اسے شہید گلی (۱) کہتے ہیں۔ مقامی روایت بھی یہی ہے کہ یہاں سید صاحب کا ایک دفاعی مورچہ تھا، اس مورچے کے مجاہدین نے حملہ آور سکھوں کو روکنا چاہا، لیکن قلت تعداد کے باعث روک نہ سکے۔ کچھ مجاہدین یہاں شہید ہوئے، ان کی قبریں تین دائروں کی شکل میں موجود ہیں، اسی وجہ سے اس مقام کا نام ''شہید گلی'' مشہور ہوا۔ اس مقام پر سروے کے محکمے کی ایک برجی بھی ہے، یہاں دفاعی مورچہ قائم کرنے سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس راستے سے بھی یورش کا خطرہ موجود تھا، یعنی راستہ نہ غیر معروف تھا نہ غیر مستعمل۔ چونکہ سوانح نگاروں کے سامنے جنگ کی پوری کیفیت نہ تھی، اس لئے وہ غلط قیاسات کی بناء پر غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔

۵۔ سکھ لشکر شہید گلی سے آگے بڑھا تو لیبی نکہ کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا کٹھہ کو عبور کرکے مٹی کوٹ پہنچ گیا۔ یہ فاصلہ چھ میل کے قریب ہے، گویا میدان سے اٹھ کر مٹی کوٹ پہنچنے تک سکھ لشکر نے تقریباً اکیس میل کی مسافت طے کی۔

---

(۱) ''گلہ'' اور ''گلی'' (ڈمگلہ اور شہید گلی) بڑے اور چھوٹے درے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ضروری تصریحات

غازیوں کی روایات میں بعض ایسے اشارے ملتے ہیں جن کی بناء پر قیاساً صورت حال کا زیادہ سے زیادہ صحیح نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ غور فرمایئے:

۱۔ سکھ لشکرگاہ بدستور قائم رہی، یعنی سکھوں نے "میدان" سے خیمے یا دوسرا بھاری سامان نہ اٹھایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فوج کا ایک حصہ وہاں موجود تھا، اور اس کی تعداد خاصی ہوگی۔ یہی حصہ تھا جو مٹی کوٹ کے ٹیلے سے سکھوں کی یورش کے موقع پر توپیں لے کر دریا کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا بالاکوٹ کے سامنے پہنچا اور جنوبی و مشرقی سمت سے قصبے پر گولہ باری شروع کی۔

۲۔ غازیوں نے سکھوں کے لشکر کو دریا عبور کر کے مغربی کنارے پر آتے دیکھا تو سمجھے کہ لشکر لاہور واپس جا رہا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پہاڑی علاقے میں مجاہدین کو اس نقل و حرکت کا علم کیوں کر ہوا؟ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ سید صاحب کا سب سے اگلا یعنی جنوبی مورچہ بندوقوں والی میں تھا اور وہاں سے سکھوں کی ہر حرکت دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک مقام اور بھی ہے جہاں سے گڑھی حبیب اللہ خاں تک پوری وادی کا گوشہ گوشہ نظر آ سکتا ہے، یعنی موضع جنگیاں کی مسجد جو بالاکوٹ کے سامنے دریائے کنہار کے بائیں کنارے کڑا پہاڑ پر واقع ہے۔ غالباً سید صاحب نے اس مقام پر بھی چوکی مقرر فرما دی تھی، چونکہ مسجد بستی سے خاصے فاصلے پر واقع ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ مسجد مجاہدین کی چوکی کے مقام پر بعد میں بطور یادگار بنادی گئی ہو۔ وہاں قرآن مجید کے پانچ قلمی نسخے بھی موجود ہیں، بالاکوٹ سے اس مسجد کا فاصلہ کوئی چار میل ہوگا۔ ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ مقامی باشندوں نے نقل و حرکت کی خبر پہنچا دی ہو، ان میں اکثر کے جسم بلاشبہ سکھوں کے فرمانبردار تھے، لیکن دل یقینی طور پر سید صاحب کے ساتھ تھے۔

سید صاحبؒ کا آخری خط

سید صاحب نے ۱۳؍ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۲۵؍ اپریل ۱۸۳۱ء) کو یعنی شہادت سے صرف گیارہ روز پیشتر نواب وزیر الدولہ کو جو اس زمانے میں ولی عہد تھے، ایک خط ٹونک بھیجا تھا، جسے ہندوستان کی طرف ان کا آخری سمجھنا چاہیے اس میں اہل سمہ کے ظلم وستم اور ہجرت ثانیہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> میں پکھلی کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں، یہاں کے باشندے حسن اخلاق سے پیش آئے اور انہوں نے کاروبار جہاد میں اعانت کے پختہ وعدے کئے، ہمیں قیام کے لئے جگہ دی، چنانچہ فی الحال قصبہ بالاکوٹ میں جو درہ کنہار میں ہے، دل جمعی سے ٹھہرا ہوا ہوں، کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس پر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ چونکہ یہ مقام (بالاکوٹ) نہایت محفوظ ہے، لشکر خدا کے فضل سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا، ہاں اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور نکل کر لڑیں تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جاوے۔ بارگاہ واہب العطایا سے امید ہے کہ فتح ونصرت کے دروازے کھل جائیں۔ اگر تائید ربانی شامل حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہوئے تو انشاء اللہ دریائے جہلم پر ملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامرانی کیلئے دعائیں مانگتے رہیں۔

پہاڑی مورچے

ہم بتا چکے ہیں کہ پہاڑی پگڈنڈی کے مورچے کی حفاظت کیلئے ملا لعل محمد قندھاری کو مقرر کیا گیا تھا، ایک روز بعض اصحاب نے عرض کیا کہ ملا لعل محمد صاحب کے مورچے پر سردی بہت ہے، مناسب ہوگا کہ تھوڑے دنوں کے لئے ان کی جگہ کوئی دوسرا جیش بھیج دیا

جائے۔ ملا صاحب دوسرے تیسرے روز سید صاحب کی زیارت کے لئے بالاکوٹ آتے رہتے تھے، انہیں جب پہرہ بدلنے کی تجویز کا علم ہوا تو عرض کیا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی تکلیف کا خیال نہ کیا جائے اور مجھے وہیں رہنے دیا جائے۔ سید صاحب نے ملا صاحب کی تکلیف ہی کے خیال سے میرزا احمد بیگ کو ان کی جگہ متعین کر دیا، ساٹھ یا ستر غازی میرزا کے ساتھ تھے، کچھ ملکی لوگ بھی بھیج دیے گئے۔ (۱)

اس تبدیلی سے دوسرے دن ظہر کے وقت میرزا احمد بیگ والے مورچے کی طرف سے گولیوں کی آواز آئی، تمام پہرہ داروں نے اپنے لشکروں کے سالاروں کو متنبہ کر دیا۔ عصر کے قریب میرزا کی طرف سے قاصد آیا اور بتایا کہ سکھوں نے پگڈنڈی سے پہاڑ پر چڑھ کر میرے (میرزا کے) مورچے پر حملہ کر دیا۔ (۲)

---

(۱) منظورہ میں ہے کہ یہ تبدیلی خود ملا لعل محمد کی درخواست پر عمل میں آئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ پلی کی حفاظت پر مامور ہوں تا کہ سکھوں کو لوٹتے رہیں۔ (ص: ۱۱۷۲) میرے نزدیک "وقائع" کا بیان درست ہے۔

(۲) منظورہ میں ہے کہ میرزا احمد بیگ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے یا کسی کاذب کلمہ گو نکی نے سکھوں کو اس راستے سے آگاہ کیا۔ (ص: ۱۱۷۲)

"تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ کسی پنجابی یا ولایتی اہل کار نے بہ طمع دنیا مخفی طور پر راجا شیر سنگھ کے پاس جا کر اس کوہی راستے کے مفصل حال سے اس کو مطلع کر دیا۔ (ص: ۱۴۴) بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ راستہ سابق بادشاہوں نے بنایا تھا، پھر مدت تک استعمال نہ ہونے کے باعث اس پر درخت اور گھاس اُگ آئی تھی۔ یہ بیانات غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔ یہ راستہ نہ بادشاہوں نے بنایا تھا اور نہ غیر مستعمل ہونے کے باعث اس پر گھاس یا درخت اُگ آئے تھے، بلکہ عام راستہ تھا، جس سے لوگ آتے جاتے تھے۔ پکھلی کے عام لوگوں میں سے شاید ایک بھی نہ ہو گا جسے اس کا علم نہ تھا۔ خود سید صاحب نے اسی لئے بغرض حفاظت اس پر پہرے بٹھائے تھے کہ اندیشہ تھا، شاید دشمن اس سے کام لے۔ سکھوں کے ساتھ اور ان کے زیر اثر ہزاروں مقامی مسلمان تھے، ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں آدمیوں سے اس کا حال معلوم ہو گیا ہو گا، میں سمجھتا ہوں سینکڑوں سکھوں کو بھی اس راستے کا حال معلوم ہو گا، جو ضلع ہزارہ میں آباد تھے۔ البتہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ بڑی فوج کے لئے بھاری سامان کے ساتھ یہ راستہ اختیار کرنا بظاہر مشکل تھا، اس باب میں پنجابی ولایتی کی تخصیص غیر ضروری ہے، اگر اس قسم کا واقعہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں پیش آتا تو وہاں کے مقامی آدمیوں کو بھی ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑتا۔

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

جب سکھوں نے میرزا کے مورچے پر حملہ کر دیا تو ان کی کثرتِ تعداد سے بالکل بے پروا ہو کر بہادر میرزا نے مقابلہ شروع کر دیا اور ایک قاصد کے ہاتھ حملے کی خبر سید صاحب کے پاس بھیج دی۔ اس مقابلے میں میرزا کی جماعت کے آٹھ آدمی شہید ہوئے۔(۱) لیکن وہ دو چار سو کو روک سکتے تھے، ہزاروں کو کیوں کر روکتے، جو پہاڑ پر چڑھ آنے کے بعد جس طرف سے چاہتے آگے بڑھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا اور ان کے بقیۃ السیف ساتھی اس سیل میں تنکوں کی طرح بہتے بہتے پیچھے ہٹتے گئے۔

میرزا کے لئے کمک

سید صاحب نے اطلاع پاتے ہی پہلے ایک جیش ابراہیم خاں اور فرج اللہ عرب کی ماتحتی میں بھیجا، اس جیش میں منگا خاں بارود ساز، قاضی عبدالعزیز دکھنی، میاں جی حسین علی بڑھانوی اور محمد امیر خاں قصوری بھی شامل تھے۔ ان کے بعد سید نور اللہ شاہ کو ایک گروہ کے ساتھ دوڑایا، پھر ارباب بہرام خاں کو حکم دیا کہ آپ بھی کچھ آدمی لے کر جائیں، آخر میں سید جعفر علی نقوی کو تھوڑے سے آدمی دے کر بھیج دیا۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں دو سو غازی ٹیلے پر پہنچ گئے۔ میرزا احمد بیگ ملے تو انہوں نے بتایا کہ اب مورچے پر پیش قدمی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ سکھ بڑی تعداد میں پہاڑ پر آ گئے ہیں، دو تین سو آدمی انہیں روک بھی نہیں سکتے، چہ جائیکہ پیچھے ہٹا دیں۔ ارباب بہرام خاں

گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ...... میرزا احمد بیگ اور ان کے ساتھی بے حد مخلص تھے، انہوں نے بے دریغ جانیں راہِ حق میں قربان کیں اور ان پر خفیف سا شک بھی سراسر بے جا ہے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے جس روز سکھوں نے لشکر گاہ سے اٹھ کر دریا عبور کیا، اس روز کچھ معلوم نہ ہوا۔ اگلے روز اخیر ظہر کے وقت میرزا احمد بیگ والے مورچے سے بندوقوں کی آواز آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لشکر گاہ سے اٹھ کر سکھوں نے پورا دن پوری رات اور اگلے دن اخیر ظہر تک کا وقت راستے میں گزارا۔

(۱) یہی مقام ہے جسے آج کل "شہید گلی" کہتے ہیں۔

نے میرزا کے بیان کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ دو چار راستے ہوں تو انہیں روکا جا سکتا ہے، پہاڑ پر چڑھنے کے بعد سکھوں کے لئے بیسیوں راستے پیدا ہو گئے ہیں، ہم ایک دو یا تین چار کو روکیں گے، سکھ انہیں چھوڑ کر اور راستہ اختیار کر لیں گے۔

سید جعفر علی سے ارباب نے کہا: حضرت امیر المومنین کو لکھ بھیجئے کہ اب بہتر یہ ہے سکھوں کی لشکر گاہ پر جو دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر ہے، ہلّہ کیا جائے۔ وہاں کم آدمی معلوم ہوتے ہیں، اگر ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ لوگ دو چار مرتبہ توپیں سر بھی کریں گے تو مضائقہ نہیں۔ ہم لشکر گاہ پر قابض ہو کر سکھوں کو بالا کوٹ میں بند کر دیں گے، ہمارا لشکر اگرچہ زیادہ نہیں پھر بھی اشیائے خوردنی فراہم کرنے میں دقتیں پیش آ رہی ہیں، سکھ اتنے بڑے لشکر کو کہاں سے کھلائیں گے؟ یا بھوکے مریں گے یا واپس چلے جائیں گے۔

سید جعفر علی کے پاس قلمدان نہ تھا، اس لئے ایک آدمی کے ہاتھ زبانی پیغام بھیجا گیا، سید صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ ارباب خود بالا کوٹ پہنچ کر گفتگو کریں۔

نجف خاں کا خط

غرض سکھ منڈہ پر قابض ہو کر بھاری تعداد میں مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ گئے، لیکن آگے نہ بڑھے، اس لئے کہ رات ہو گئی تھی، اور رات کے وقت بالا کوٹ کی طرف اترنا شدید خطرات سے لبریز تھا۔ جو غازی مٹی کوٹ گاؤں میں متعین تھے وہ وہیں رہے۔

عین اس وقت نجف خاں کی طرف سے خفیہ خط آیا کہ میں سکھوں کو مظفر آباد کے لئے لایا تھا، یہ خیال نہ تھا کہ بالا کوٹ میں آپ سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ شیر سنگھ کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں، اگر آپ مقابلہ کر سکیں تو ٹھہریں ورنہ بہتر یہ ہوگا کہ پیچھے کے پہاڑ پر چلے جائیں، لشکر خود بخود واپس چلا جائے گا، یا راتوں رات دریا کے مشرقی کنارے پر آ جائیں اور سکھ لشکر گاہ پر چھاپا ماریں۔

سید صاحب نے ناصر خاں (بھٹ گرامی) اور حبیب اللہ خاں (ساکن گڑھی) سے مشورہ کیا۔ ناصر خاں کی رائے تھی کہ خط فریب پر مبنی ہے، حبیب اللہ خاں نے کہا کہ نجف خاں کے خلوص یا فریب کے باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس کا مشورہ درست ہے، پچھلے پہاڑ پر چلے جانا بہتر ہے۔ سکھ لشکر گاہ پر چھاپا مارا جائے تو عجب نہیں، مال و اسباب اور توپ خانہ ہاتھ لگے۔

حسن خاں عظیم آبادی کہتے ہیں کہ حبیب اللہ خاں کی بات سن کر حضرت نے فرمایا:

> خان بھائی! آپ کہتے تو سچ ہیں، لیکن اب کفار کے ساتھ یہیں لڑیں گے۔ اسی میدان میں لاہور ہے اور اسی میں جنت۔ جنت کے سامنے ساری دنیا کی ریاست بے حقیقت ہے۔ اگر کل دنیا کی عزیز ترین چیزیں دیکر پروردگار کی رضامندی حاصل ہو جائے، یہاں تک کہ میری جان بھی اسی راہ میں قربان ہو جائے تو ایسا ہی ہے جیسے تنکا توڑ کر پھینک دیا۔

پل توڑ دیا

پھر خیال آیا کہ پل توڑ دیا جائے اور جو غازی اس کی حفاظت پر مامور ہیں انہیں واپس بلا لیا جائے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی، میرا خیال ہے کہ پل کی شکست اس وجہ سے ضروری سمجھی گئی کہ سکھوں کو بالاکوٹ کی مغربی سمت میں قدم جمانے کا موقع مل گیا ہے، اغلب ہے اب وہ پل کے راستے بالاکوٹ پر مشرقی سمت سے بھی یورش کر دیں۔

چنانچہ شیخ نصر اللہ خورجوی اور سلو خاں دیوبندی کو بھیج کر پل تڑوا دیا گیا، اس وقت الٰہی بخش رام پوری اور میاں جی نظام الدین چشتی بھی پل پر موجود تھے۔ میاں جی چشتی نے کہا کہ جب کبھی لڑائی کی نوبت آئی اور میں نے جناب الٰہی میں دعاء کی تو اک گونہ تسکین ہو جاتی تھی، میں سمجھ لیتا کہ انجام بخیر ہوگا، موجودہ حادثے کے سلسلے میں کئی مرتبہ مراقبہ بھی کیا، دعاء بھی کی لیکن تسکین قلب کی کوئی صورت نہ بنی، خدا جانے کیا پیش آنے

والا ہے؟

ارباب بہرام خاں

ارباب بہرام خاں کو غروب آفتاب کے بعد مٹی کوٹ میں حکم ملا تھا کہ بالاکوٹ پہنچ کر اپنی تجویز خود سنایئے۔ انہیں پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی، انہوں نے جو تجویز قاصد کے ذریعے سے پیش کی تھی خود حاضر ہو کر تفصیلاً عرض کی۔ سید جعفر علی نقوی بھی اس مجلس میں موجود تھے، لشکر گاہ پر چھاپے کی تجویز کا جواب سید صاحب نے یہ دیا کہ ہم نے پل تڑوا دیا ہے اور اب مشرقی کنارے پر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ارباب نے عرض کیا کہ مضائقہ نہیں، پل راتوں رات درست ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس بات کو چھوڑیے، جو کچھ ہونے والا ہے یہیں ہو رہے گا۔(۱) جاں نثار ارباب نے انگشتِ شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا:

این سر در راہِ خدائے تعالیٰ حاضر است۔

ترجمہ: یہ سر خدائے تعالیٰ کی راہ میں حاضر ہے

لاہور یا جنت الفردوس

ایک روایت ہے کہ سید صاحب نے ملا لعل محمد قندھاری سے پوچھا: آیا یہ ممکن ہے کہ آپ ست بنے کے نالے سے ہو کر پہاڑ پر جائیں اور سکھوں پر شبخون ماریں؟ ملا نے عرض کیا: کیوں نہیں! لیکن آپ کو یہاں چھوڑ کر نہ جاؤں گا، اپنی جان کے ساتھ رکھوں گا۔ مدت سے اس ملک میں رہ کر لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا، ان سے نفاق دور ہونا مشکل ہے، یہی لوگ سکھوں کو لائے ہیں۔ سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا:

اتنے برسوں ہم نے واسطے اس کارِ خیر کے طرح طرح کی کوشش اور

---

(۱) منظورہ میں یہ الفاظ ہیں: آنچہ شدنی است ہمیں جا خواہد شد۔

جانفشانی کی، اپنی دانست میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، ہندوستان، خراسان اور ترکستان میں اپنے خلفاء روانہ کیے، انہوں نے بھی حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوتاہی نہ کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو بطور وعظ ونصیحت کے سمجھاتے رہے، مگر کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا، جو دیا تو غربا لوگوں نے۔ بلکہ طرح طرح کا ہم پر افترا کیا، شاید مشیت الٰہی میں یونہی تھا۔ سو اب ہمارے کاتب خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے اور ہم بھیجتے بھیجتے تنگ آ گئے۔ کچھ ظہور میں نہ آیا، اب یہی خوب ہے کہ اپنے غازی بھائیوں کو پہروں پر سے اپنے پاس بلوا لیں۔

بچاؤ کے وسائل

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب بہ آسانی بچ کر نکل سکتے تھے، مثلاً راتوں رات برنا یاست ہنے کے راستے عقب کے پہاڑوں پر جا سکتے تھے اور سکھ ان کا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خوانین بھی اس تجویز کے حامی تھے جو سکھوں کو اپنی امداد کے لئے بالاکوٹ لائے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پل پر سے گذر کر مشرقی کنارے پر پہنچ جاتے یا وادی کاغان میں چلے جاتے، جہاں کے سادات حمایت کیلئے تیار بیٹھے تھے، اور ضامن شاہ کوائی والا اس وقت خود بالاکوٹ میں موجود تھا، راتوں رات دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے کوائی پہنچ جانا مشکل نہ تھا۔ پھر سید صاحب نے کیوں ان وسائل سے فائدہ نہ اٹھایا؟ ارادت مندوں کا خیال ہے کہ قرب شہادت کا اشارہ ہو گیا تھا اور اس پر بہ دل وجان مطمئن تھے۔ ایک جماعت کی رائے تھی کہ جب بالاکوٹ آتے ہوئے پہاڑ پر ٹھہر گئے تھے اور رات کے وقت دیر تک درختوں کے جھنڈ میں رہے تھے تو اسی ساعت سے طبیعت میں ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا تھا، تدابیر پر بہت کم متوجہ ہوتے تھے، زیادہ تر تقدیر پر توکل واعتماد کے کلمات زبان پر جاری رہتے تھے۔

شجاعت و تدبیر میں تصادم

مجھے اس تعبیر سے اختلاف کی ضرورت نہیں، جس مردِ خدا نے زندگی کی ہر عزیز متاع راہِ خدا میں بے دریغ قربان کر دی تھی اور مسلکِ رضا کی پابندی میں جان دے دینے کو اس درجہ بے حقیقت جانتا تھا گویا ایک تنکا توڑ کر پھینک دیا، اسے یقیناً بارگاہِ باری تعالیٰ سے ہر ایماء و اشارہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس معاملے کا ایک عقلی پہلو بھی ہے، جسے سامنے رکھ لینا غیر مناسب نہیں، اور نہ اسے سید صاحب کی ذاتِ بابرکات کے لئے غیر شایاں سمجھا جا سکتا ہے۔ یاد ہوگا کہ مولانا شاہ اسماعیل نے امام خاں خیر آبادی کی شہادت کے موقع پر فرمایا تھا کہ میدانِ جنگ میں انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں، بعض اربابِ تدبیر ہوتے ہیں بعض اربابِ شجاعت اور بعض جامع ہر دو، نرے اربابِ تدبیر ہمارے کام کے نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ مقام تدبیر کا نہیں شجاعت کا ہے۔

بلاشبہ وہ مقامِ شجاعت تھا، تدبیر بھی یقیناً ضروری تھی اور سید صاحب نے کبھی اس میں تامل نہ کیا، لیکن بالاکوٹ میں ایسے حالات پیش آ گئے تھے کہ شجاعت و تدبیر میں تصادم ہو گیا تھا۔ اس موقع پر مناسب تھا کہ تدبیر کا پہلو اختیار کرنے کے بجائے شجاعت کے تقاضوں کو مقدم رکھا جاتا۔ سید صاحب نے یہی کیا۔

موازنہ مضار و منافع

فرض کر لیجئے کہ سید صاحب غازیوں کو لے کر عقبی پہاڑوں میں جا بیٹھتے یا کوئی چلے جاتے اور سکھ بالاکوٹ پہنچ کر حسبِ عادت عوام پر سختیاں کرتے، یعنی قصبے کو لوٹتے اور مکانوں کو جلاتے۔ پھر سید صاحب کے لئے اجراءِ کاروبارِ جہاد کی کون سی خوشگوار شکل باقی رہ جاتی؟ بالاکوٹ کا حشر سامنے رکھتے ہوئے کون بہ طیبِ خاطر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو سکتا؟ موقع ایسا آ گیا تھا کہ ذاتی شجاعت و مردانگی کی نمائش کے لئے نہیں بلکہ

کاروبارِ جہاد کے ناموس کو بچانے کیلئے، مرنے کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کو رضائے باری تعالیٰ کی خاطر بے دریغ جانیں دیدینے کا سبق پڑھانے کیلئے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹتے اور جس مقام پر بیٹھے تھے وہیں ہر افتاد، ہر آفت اور ہر بلا کا مقابلہ صابرانہ کرتے۔ یہ منزل بڑی کٹھن اور دشوار تھی لیکن سید صاحب کے لئے اس میں گامزن ہونا اتنا ہی سہل تھا جتنا دوسروں کے لئے کامرانی و فیروز مندی کا تاج پہن لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ بچ نکلنے میں سیکڑوں آفتیں تھیں یا کم از کم آئندہ کے لئے اعانت و رفاقت کے مواقع یقینی طور پر ضغطے میں تھے۔ مردانِ حق کی طرح لڑنے میں فتح مندی کا بھی امکان تھا، پہلے راستے کی مضرتیں روزِ روشن کی طرح مبرہن تھیں، دوسرے راستے میں مضرتوں کے احتمال کے ساتھ منافع بھی دسترسِ امکان میں نظر آتے تھے۔ سید صاحب نے وہی راستہ اختیار کیا جو عقلِ سلیم، ایمانی حمیت اور دینی غیرت کے عین مطابق تھا، باقی رہا، انجام کا معاملہ تو:

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز؟　　اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

انتالیسواں باب:

زندگی کی آخری رات اور آخری صبح

لڑائی کی اسکیم

سکھ منی کوٹ کے ٹیلے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو صاف واضح ہو گیا تھا کہ اب قصبے اور ٹیلے کے درمیان میدان میں لڑائی ہوگی۔ اس لیے سید صاحب نے جو مورچے جابجا بغرضِ دفاع قائم کیے تھے، ان پر غازیوں کو بٹھائے رکھنا بے سود تھا۔ چنانچہ آپ نے مورچوں اور چوکیوں سے غازیوں کو بلا لیا اور فرمایا کہ رات کو خوب دعائیں مانگو، پروردگار کی بارگاہ میں آمرزش و استغفار کرو، صبح مقابلہ ہے، خدا جانے کس کی شہادت ہو اور کون زندہ رہے۔

اس وقت تک لڑائی کی اسکیم تیار کر لی گئی تھی، اور وہ یہ تھی کہ سکھ منی کوٹ سے اتر کر ٹیلے اور قصبے کے درمیان نشیب میں پہنچیں تو ان پر حملہ کیا جائے۔ اسی نشیب میں زیادہ تر شالی کے کھیت تھے، ان میں رات کو پانی چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ زمین دلدلی بن کر زیادہ سے زیادہ ناقابل گذر ہو جائے۔ ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بہترین اسکیم تھی، اس لئے کہ سکھ جب اوپر سے اتر کر نشیب میں پہنچ جاتے تو پہلے انہیں دلدل سے سابقہ پڑتا اسے عبور کر لیتے تو قصبے کی سمت میں ان کے سامنے چڑھائی تھی، دونوں صورتیں ان کے لئے خطرناک تھیں۔ دلدل میں آگے پیچھے یا دائیں بائیں نقل و حرکت مشکل تھی، اس سے گذر کر چڑھائی میں ان کے سانس پھول جاتے اور تیزی سے پیش قدمی نہ کر سکتے۔ غازی دلدل سے باہر کھڑے ان پر گولیاں برسا سکتے تھے، جو سکھ دلدل سے گذر آتے ان

پر چڑھائی کے وقت حملہ کر سکتے تھے۔

مورچہ بندی

اس اسکیم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف جماعتوں کو مناسب مقامات پر مورچہ بندی کا حکم دیا گیا۔ زیادہ تر مورچے ست بنے کے نالے پر تھے، جو شمالی و مغربی گوشے سے بالا کوٹ کے حلقے میں داخل ہوتا ہے اور جنوبی و مغربی رخ پر بہتا ہوا قصبے کے پشتے کی مشرقی جانب کے ساتھ سے گذرا ہے۔

پوری تفصیلات نہیں مل سکیں، لیکن میں مختلف روایتوں سے جو کچھ اخذ کر سکا، اس کا مرقع یہ ہے:

۱۔ جہاں سے ست بنے نالہ بالاکوٹ کے حلقے میں داخل ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے ملا لعل محمد قندھاری کا مورچہ تجویز ہوا۔ یہ مورچہ اس ٹیلے کے دامن سے شروع ہوتا تھا جو ست بنے نالے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان ہے۔

۲۔ ملا لعل محمد کے مورچے کے بائیں جانب یعنی قصبے کی سمت میں مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت کو بٹھانے کا فیصلہ ہوا، لیکن خود مولانا جماعت کے ساتھ نہ تھے۔

۳۔ مولانا کی جماعت کے بائیں ہاتھ شیخ ولی محمد کی جماعت کا مورچہ تھا، شیخ بھی جماعت کے ساتھ نہ تھے۔

۴۔ شیخ کی جماعت کے بائیں ہاتھ ناصر خاں بھٹ گرامی اور حبیب اللہ خاں (گڑھی والا) کے جیش متعین ہوئے، اس طرح مختلف جماعات جیوش کے مورچے ہلالی شکل میں قصبے تک آتے تھے۔ بعض جماعتوں کے مورچے مسجد زیریں میں یا اس کے آس پاس رکھے گئے۔ مولانا شاہ اسماعیل غازیوں کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد بالا کوٹ کے پاس شمالی جانب میں قیام فرما ہوئے، ان کے سامنے مسجد کی غربی سمت میں مولوی احمد اللہ

ناگپوری کی جماعت کو بٹھایا گیا، اس مسجد سے دس پندرہ قدم نیچے اتر کر ایک نشیب میں شاہین چیوں کا مورچہ تجویز ہوا۔ خود سید صاحب نے طے کیا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد بالا میں بیٹھیں گے، اور وہیں سے جب مناسب سمجھیں گے سکھوں پر حملہ کریں گے۔

رزمگاہ کے نقشے پر ایک نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جائیگا کہ سکھ مٹی کوٹ سے اتر کر قصبے میں پہنچنے تک برابر تمام مورچوں کے ہدف بنے رہتے، اول تو سو میں سے دس بھی قصبے کے قریب تک سلامت نہ پہنچ سکتے، جو پہنچ جاتے ان پر قصبے کی سمت سے یورش ہوتی۔

لباس اور استراحت

مختلف جماعتوں نے رات رات میں مورچہ بندی مکمل کر لی، اس غرض کے لئے زیادہ تر پتھر استعمال کیے گئے اور بالا کوٹ میں اس جنس کی کمی نہ تھی، تختوں اور کواڑوں سے بھی کام لیا گیا۔ سید صاحب نے عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھایا، پھر اپنے پارچوں میں سے کچھ جوڑے منگائے، ان میں سے ایک ارخالق، سفید پاجامہ، دستار اور پشاوری لنگی منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو دی کہ صبح یہی پہننا۔ ایک ارخالق، سفید پاجامہ اور دستار حکیم قمر الدین پھلتی کو دی، ایک سرمئی ارخالق، سفید پاجامہ، کانگریزی دستار کشمیری پٹکا وغیرہ چیزیں اپنے پہننے کے لئے الگ کر لیں۔ پھر ساتھیوں سے فرمایا کہ اب آرام کرو، خود بھی بہ اطمینان خاطر سو گئے۔ حسب معمول پچھلی رات اٹھ کر تہجد پڑھی، پھر ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

صبح شہادت

صبح کی نماز کے لئے مسجد بالا میں پہنچے، جہاں بہت سے غازی پہلے سے موجود تھے۔ سب نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی، ان فداکارانِ حق میں سے اکثر کی یہ آخری نماز تھی اور خود امام کے لئے بھی اس کے بعد مصلّے پر بطور امام یا بہ طور مقتدی

کھڑے ہونا مقدر نہ تھا۔ نماز سے فارغ ہوکر آپ قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور دیر تک وظائف میں لگے رہے۔

سورج نکل آیا تو اشراق کی نماز پڑھی، پھر نور محمد جراح کسبت لے کر آیا، آپ نے لبیں ترشوائیں، ریش مبارک میں کنگھی کی، سرمہ لگایا اور رات کے وقت جو لباس الگ کر رکھا تھا اسے پہن کر تیار ہو گئے۔ ایک پستول، ایک ولایتی چھری اور ایک کٹار لی، چھری شیخ غلام علی الہ آبادی نے دی تھی اور کٹار جنگِ مردان کے مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی تھی، ان دونوں کے دوال سابری ایک ایک انگلی چوڑے تھے۔ ایک تلوار باندھی جو ارباب بہرام خاں نے نذر کی تھی اس کا پرتلہ سابری ایک ایک انگلی چوڑا تھا۔ جنگ میں دو رائفلیں استعمال کرتے تھے یہ دو رفیقوں کے پاس رہتی تھیں جو باری باری بھر بھر کر دیتے جاتے تھے۔ لباس پہن کر اور ہتھیار سجا کر آپ مسجد بالا میں پہنچ گئے، اس وقت دن چڑھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گذرا تھا۔

دندانہ دار گنڈاسے

غازیوں کو گولی بارود وغیرہ چیزیں دے دی گئیں۔ اسلامی لشکر کا ایک خاص ہتھیار دندانہ دار گنڈاسہ تھا، جس میں لمبا دستہ لگا دیا جاتا تھا، اور عام لوہار اسے کثیر مقدار میں تیار کر لیتے تھے۔ بالاکوٹ میں کئی لوہار گولیوں، گولوں اور گنڈاسوں کی تیاری کیلئے بلا لئے گئے تھے، اور انہوں نے کئی روز کی محنت سے یہ چیزیں خاصی بڑی مقدار میں بنائی تھیں۔ گنڈاسے ان لوگوں کو بھی دیے جاتے تھے، جن کے لئے کوئی دوسرا ہتھیار نہ ہوتا تھا، یا جو بندوق اور تلوار سے کام لینے میں مشاق نہ ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو بھی گنڈاسے دیدیے جاتے تھے جن کا ایک ہاتھ کسی جنگ میں بیکار ہو گیا تھا اور جہاد کو کارِ ثواب وعبادت سمجھ کر انجام دینے کے مشاق ہوتے تھے۔ اس آخر الذکر گروہ میں سے ایک صاحب شیخ محمد

اسحاقؒ گورکھپوری بھی تھے، جن کے شانے میں جنگ مایار میں نیزے کی انی چبھ گئی تھی اور اس کی وجہ سے بایاں ہاتھ اس درجہ بیکار ہو چکا تھا کہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی نے انہیں بھی ایک گنڈاسہ دلا دیا۔

مولوی احمد اللہ ناگپوری کی دعوت

مولوی احمد اللہ ناگپوری نے رات کے وقت اپنی پوری جماعت کو کھانے کی دعوت دی۔ حافظ مصطفیٰ کاندھلوی، شیخ محمد اسحاق گورکھپوری اور مولوی سید جعفر علی نقوی اسی جماعت میں تھے، کھانے کے بعد مولوی احمد اللہ نے مولوی جعفر علی سے کہا کہ میں تو حضرت امیر المومنین کے ساتھ رہوں گا۔ جماعت کی امارت وقیادت کے فرائض آپ کو انجام دینے ہوں گے۔ مولوی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے افسری کا تجربہ نہیں، بہتر یہ ہوگا کہ حافظ مصطفیٰ کو یہ منصب سونپا جائے۔

مولوی احمد اللہ: مصطفیٰ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی جعفر علی: پھر شیخ محمد اسحاق کو امیر بنا دیجئے۔

مولوی احمد اللہ: وہ ذرا غصہ ور آدمی ہیں، اور امارت کے لئے متین آدمی کی ضرورت ہے۔

مولوی جعفر علی: پھر میں حسن خاں بنارسی کا نام پیش کرتا ہوں۔

مولوی احمد اللہ: بھائی! کیا آپ طے کر چکے ہیں کہ میرا حکم نہ مانیں گے۔

مولوی جعفر علی: میں معافی مانگتا ہوں محض اپنی ناتجربہ کاری اور ناتوانی کو آپ پر واضح کر رہا تھا۔

مولوی احمد اللہ یہ سن کر مسکرا دیئے اور جماعت کو حکم دیا کہ سب لوگ مولوی جعفر علی کے احکام کی تعمیل کریں۔

توشہ خانہ اور مہریں

معمول یہ تھا کہ جنگ کے موقع پر توشہ خانے کا سارا اسباب کسی محفوظ مقام پر رکھوا دیا جاتا، جنگ سے ذرا پہلے شیخ ولی محمد مہتمم توشہ خانہ نے ایک آدمی بھیج کر پچھوایا کہ اسباب کہاں رکھوا دیا جائے۔ فرمایا: جہاں پر ہے، وہیں رہنے دیجئے۔

راویوں نے اس واقعہ کو ایسے رنگ میں پیش کیا کہ گویا سید صاحب کو قرب شہادت کا یقین ہو چکا تھا اور مال و اسباب کی جانب سے طبیعت مستغنی ہو چکی تھی، گویا اس سے پہلے انہیں مال و اسباب سے دل بستگی تھی حاشا و کلا۔ سید صاحب عمر بھر مستغنی رہے، نہ کبھی کسی دنیوی چیز کی آرزو کی اور نہ کسی سے دل لگایا۔ مال و دولت اور اعزازات ہمیشہ ان کے قدموں پر گرتے رہے، لیکن وہ برابر ان چیزوں کو اپنے رفیقوں اور دوسرے لوگوں میں بانٹتے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت توشہ خانے کے اسباب کو کسی دوسری جگہ بھیجنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ (۱) نیز بھیجا جاتا تو ساتھیوں اور عوام پر عین آغاز جنگ کے وقت نہایت برا اثر پڑتا۔

سید صاحب کی مہر منشی محمدی انصاری میر منشی کے پاس رہتی تھی، مولانا شاہ اسماعیل نے کہا کہ جنگ درپیش ہے، خدا جانے کیا صورت پیش آئے، مہر حضرت کے حوالے کر دیجئے تاکہ امانت مالک کے پاس پہنچ جائے۔ منشی صاحب نے مہر حضرت کے خریطے میں ڈال دی، خود مولانا کی مہر سید جعفر علی نقوی کے پاس تھی، انہوں نے یہ مہر مولانا کو

---

(۱) روایتوں میں ہے کہ چار پانچ غازی بیمار تھے، ان کے بارے میں پوچھا کہ کہاں بھیجا جائے۔ فرمایا: جہاں ہیں وہیں رہیں۔ ہاتھی کے متعلق بھی یہی فرمایا۔ تاکوٹ سے ساٹھ آدمی آئے تھے اور گولی بارود مانگ رہے تھے، مقامی آدمیوں کا مطالبہ بھی یہی تھا، جن لوہاروں سے گنڈاسے وغیرہ بنوائے گئے تھے وہ بھی لڑنے کے لئے تیار تھے، صرف اسلحہ چاہتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا: کچھ ضرورت نہیں۔

میرے نزدیک یہ سب باتیں قیاس میں نہیں آتیں، یا تو راویوں کو غلط فہمی ہوئی یا سید صاحب کے پاس اس وقت فالتو اسلحہ تھے ہی نہیں۔

دے دی۔

سکھوں کا ظہور

سکھ ایک دن پہلے ہی پہاڑ پر پہنچ گئے تھے، لیکن انہوں نے رات ہو جانے کے باعث پیش قدمی نہیں کی تھی۔ سورج نکل آیا تو مٹی کوٹ کے شمالی گوشے میں نمودار ہوئے آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی، ان کی گولیاں قصبے اور مسجد بالا میں آ رہی تھیں، شاہینوں کے گولے قصبے کے اوپر سے نکل رہے تھے۔ غازیوں کے لشکر میں دو لڑکے ذرا سیانے تھے: ایک حافظ الٰہی بخش دوسرا علیم الدین۔ یہ دونوں چلے ہوئے گولے اور گولیاں اٹھا اٹھا کر غازیوں کو دینے لگے۔

سید صاحب مسجد میں پہنچ کر سائبان کے نیچے بیٹھ گئے، جو سکھوں کے گولوں اور گولیوں کی زد میں تھا۔ ساتھیوں نے عرض کیا کہ آڑ میں ہو جائیں۔ فرمایا: ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہیے۔ ارباب بہرام خاں ساتھ تھے، اسی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک گولی ان کے ٹخنے سے چھوتی ہوئی نکل گئی اور خفیف سا زخم آیا۔ اس اثناء میں غازی اِدھر اُدھر سے کواڑ اٹھا کر لے آئے اور مسجد کی مغربی سمت میں، جو مٹی کوٹ کے سامنے تھی، کواڑ کھڑے کر کے حفاظت کا بندوبست کر لیا۔ قصبے کے بیشتر باشندے ایک دن پہلے ہی گھر بار چھوڑ کر باہر جا چکے تھے، صرف غازی باقی رہ گئے تھے، یا ممکن ہے چند مقامی آدمی ہوں۔

یومِ بالاکوٹ کا پہلا شہید

سید صاحب نے ایک روز پہلے تاکید فرما دی تھی کہ تمام غازی بھائی صبح کی نماز کے ساتھ ہی کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ اکثر کھانا کھا چکے تھے، بعض کھا رہے تھے، پٹیالہ کے سید چراغ علی صاحب نے کھیر پکانے کا ارادہ کیا، نماز سے فارغ ہو کر وہ اس کام میں لگ گئے۔ سکھ مٹی کوٹ کے ٹیلے سے نیچے اترنے لگے تو سید چراغ علی دیگچی میں کفگیر

ہلاتے جاتے تھے اور وقتاً فوقتاً سکھوں کو دیکھ لیتے تھے۔ اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور بولے: بھائیو! دیکھو وہ حور سرخ کپڑے پہنے چلی آرہی ہے۔ یہ کہتے ہی کفگیر اٹھا کر دیگچی پر مارتے ہوئے کہا: بس اب حور ہی کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ پھر اٹھے اور تیزی سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف دوڑے، جدھر سے سکھ نیچے آرہے تھے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور ساتھیوں کو انہیں روکنے کا موقع نہ مل سکا۔ جب ان کی توجہ سید چراغ علی کی طرف ہوئی تو وہ اتنی دور آگے جا چکے تھے کہ ان کے پیچھے جانا بے سود تھا۔ اسی حالت میں ان کے گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ یومِ بالاکوٹ کے یہ پہلے شہید تھے۔

صرف رضائے خدا

سردار حبیب اللہ خاں بھی مسجد بالا ہی میں تھا، اس نے اپنے پاس کے کسی شخص سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا ہے اور ہم تھوڑے ہیں۔ مقابلے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بات سید صاحب نے بھی سن لی اور فرمایا:

> خان بھائی! فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جس کو چاہے دیوے بہت لوگوں یا تھوڑوں پر موقوف نہیں، کبھی اللہ تعالیٰ تھوڑوں کو بہتوں پر غالب کر دیتا ہے، کبھی بہتوں کو تھوڑوں پر، اور ہم کو تو اپنے پروردگار کی رضامندی درکار ہے، فتح اور شکست سے کچھ غرض نہیں۔ پروردگار کی خوشنودی میں بہر صورت ہماری فتح مندی ہے۔

یعنی اگر خدا بزرگ و برتر کی رضامندی و خوشنودی حاصل ہو جائے اور ہمارا ہر عمل رضا کے عین مطابق ہو تو بہ اعتبار ظواہر ہماری شکست بھی دراصل فتح مندی ہوگی۔

نجف خاں کو جواب

نجف خاں مظفر آبادی کا ایک خط خفیہ خفیہ پہلے آیا تھا، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ سید صاحب مسجد بالا میں تھے کہ اس کا دوسرا خط آیا اس میں بھی پہلے خط کے مضمون کو دہرایا گیا تھا، یعنی یہ کہ اگر سکھ لشکر کا مقابلہ کر سکیں تو بیٹھیں ورنہ پچھلے پہاڑ پر چلے جائیں یا دریا کے مشرقی کنارے پر جا بیٹھیں۔

اس وقت تک بھی سید صاحب تمام غازیوں سمیت برنا یا مست بنے کے نالے سے ہوتے ہوئے پہاڑوں پر جا سکتے تھے، لیکن ان کا فیصلہ استقامت غیر متزلزل تھا اور اس کی مصلحتیں ہم پہلے باب میں تفصیلاً عرض کر چکے ہیں۔ نجف خاں کو آپ نے لکھا:

> دو خط آپ کے دربار کے ہمارے پاس آئے، مضمون ان کا معلوم ہوا۔ فی الحقیقت آپ نے ہماری خیر خواہی کا جو حق تھا، ادا کیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔ مگر ادھر خلاصہ ہمارے مطالب کا یوں ہے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی رضامندی منظور ہے، تھوڑے بہت لوگوں کا اصلاً خیال نہیں اور نہ غیرت اسلام اس بات کو چاہتی ہے کہ مقابلہ کفار سے ہٹ جائیں، اب اسی بالاکوٹ کے میدان میں ہم لوگوں کے واسطے جو کچھ منظور الٰہی ہے، وہ ہوگا۔

اجتماعی حملے کا فیصلہ

سید صاحب نے تمام جماعتوں کے سرداروں کو تاکید فرما دی تھی کہ سب بھائی مورچوں میں بیٹھے ہوئے گولیاں چلاتے رہیں، لیکن باہر نکل کر اس وقت تک کوئی حملہ نہ کرے جب تک ہمارا نشان آگے بڑھتا ہوا نظر نہ آئے۔ یعنی جب تک خود سید صاحب حملہ نہ کریں۔ یہ تاکید اس مصلحت پر مبنی تھی کہ سکھوں کی جماعت بہت بڑی ہے، غازیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے متفرق حملے کیے تو سب غیر موثر رہیں گے۔ سکھ پہاڑ

پر سے اتر کر میدان خصوصاً اس کے نشیبی حصے میں پہنچ جائیں گے تو اس وقت ان پر شمال، شمال مشرق اور مشرق کی جانب سے ایک دم اجتماعی یورش ہوگی اور انہیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے گا۔

کسی غازی نے عرض کیا کہ پہاڑ پر سکھوں کی جمعیت بہت بڑی تعداد میں فراہم ہوگئی ہے۔ فرمایا منی کوٹ سے اتر کر انہیں نیچے کے کھیتوں میں آ لینے دو۔ ملا لعل محمد قندھاری اپنے مورچے سے دوڑے آئے اور عرض کیا کہ سکھ ہم سے بہت تھوڑے فاصلے پر رہ گئے ہیں کیا حکم ہے؟ پوچھا: کتنی دور ہوں گے؟ ملا صاحب نے کہا: ''گولی کی زد پر'' فرمایا مورچوں سے بندوقیں چلاتے جاؤ، جب تک ہم نہ نکلیں ان پر حملہ نہ کرو۔ (۱)

سکھ لشکر کے جو دستے نیچے اتر چکے تھے انہوں نے تیزی سے قصبے کی جانب پیش قدمی شروع کردی باقی لوگ سیل کی طرح اتر رہے تھے۔ سید صاحب سائبان کے نیچے لیٹ گئے۔ شیخ لکھمیر پاؤں دابنے لگے، اس اثناء میں محمود خاں لکھنوی نے عرض کیا: حضرت! آرزو ہے کہ آپ دست مبارک میرے چہرے پر پھیر دیں۔ سید صاحب اٹھ بیٹھے اور داہنا ہاتھ محمود خاں کے چہرے پر پھیر کر ان کے لئے دعاء کی۔ وہ خوش خوش اپنے مورچے میں چلے گئے۔

پھر آپ نے غازیوں سے فرمایا: ''بھائیو! ہم اندر جا کر اکیلے دعاء کریں گے، کوئی بھائی ہمارے ساتھ نہ آئے''۔ چنانچہ آپ اندر چلے گئے (۲) اور دروازہ بند کرلیا۔ تھوڑی

---

(۱) ملا صاحب کا مورچہ شمالی و مغربی سمت میں سب سے پہلے تھا، منی کوٹ سے اتر کر سکھ سب سے پہلے ملا صاحب ہی کے مورچے کی زد میں آئے تھے۔ روایتوں میں ہے کہ ملا صاحب ایک مرتبہ نہیں، تین مرتبہ پوچھنے کے لئے آئے۔ میرے نزدیک یہ راویوں کی غلط فہمی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ملا صاحب کا مورچہ مسجد بالا سے کم از کم پونے میل پر ہوگا۔ طلوع آفتاب سے سید صاحب کے حملہ آور ہونے اور گھمسان کا رن پڑنے تک ملا صاحب کا اپنے مورچے سے تین مرتبہ آنا جانا قیاس میں نہیں آتا۔

(۲) اس سے مراد مسجد کا مسقف حصہ ہے، جو آج کل کی طرح پہلے بھی مشرقی سمت میں تھا۔

دیر دعاء میں مشغول رہے پھر دروازہ کھول کر پوچھا کہ مجھے کس نے آواز دی؟ عرض کیا گیا کسی نے نہیں، یہ سن کر دروازہ بند کر لیا، اسی طرح دو مرتبہ دروازہ کھول کر استفسار فرمایا۔ محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ میں مسجد سے باہر کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ (۱) اسی طرح تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی کھول کر مجھ سے بھی پوچھا کہ کس نے آواز دی؟

اس آواز وندا کی حقیقت کے باب میں کچھ عرض کرنا مشکل ہے، نہ کسی نے آپ سے سوال کیا نہ سوال کا موقع تھا، اور نہ آپ نے خود کچھ بیان فرمایا۔

مسجد بالا کے پاس کا مورچہ

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مولوی احمد اللہ کی جماعت کا مورچہ مسجد بالا کی غربی سمت میں قریب ہی تھا اور مولوی صاحب اپنی جماعت کی امارت مولوی سید جعفر علی کو سونپ کر خود سید صاحب کے ساتھ ہو گئے تھے۔ سید جعفر علی فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس چار پائیاں کافی تھیں، ان پر بیٹھ کر اسلحہ صاف کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے خطائیں معاف کرا رہے تھے۔ کواڑوں کی آڑ میں ہونے کے باعث گولیوں سے محفوظ تھے، ہمیں حکم یہ تھا کہ وہاں سے نہ ہلیں۔ جب سکھ شالی کے کھیتوں میں پہنچ جائیں تو ان پر گولیاں چلائی جائیں۔ جو لوگ کھیتوں سے گذر کر قصبے کی سمت میں چڑھائی پر پہنچیں ان پر تلواروں سے وار کیے جائیں۔

اس جماعت کے بعض آدمیوں نے کہا کہ بندوقیں دیر سے بھری ہوئی ہیں اگر اجازت ہو تو انہیں سر کر کے نئے سرے سے بھر لیں۔ مولوی جعفر علی نے کہا کہ آپ لوگ چپ چاپ بیٹھے رہیں، وقت آنے پر اگر ایک مرتبہ فائر خالی بھی جائیں گے تو مضائقہ نہیں، اس وقت شیخ محمد اسحاق گورکھپوری بولے: اب تک دل میں وطن اور اہل و عیال کی

---

(۱) یہ کھڑکی غالباً شمالی سمت میں تھی۔

محبت جاگزیں تھی، اب شہادت اور لقائے باری تعالیٰ کے سوا کوئی آرزو نہیں رہی۔

مسجد بالا سے مسجد زیریں میں

سید صاحب اندر دعاء میں مشغول تھے۔ غازی سائبان میں بیٹھے تھے، مسجد میں اس وقت تین نشان تھے، ایک داوا ابوالحسن کا، دوسرا ابراہیم خاں خیر آبادی کا، یہ دونوں سیاہ تھے، تیسرا نشان سرخ وسپید ملکیوں کا تھا۔ یکایک اندر کا دروازہ کھلا اور سید صاحب مسجد سے باہر نکل گئے۔ تمام غازی بھی اٹھ کر ساتھ ہو گئے۔ جب معلوم ہوا کہ آپ میدان کی طرف جا رہے ہیں تو بعض غازیوں نے عرض کیا کہ حکم ہو تو نشان ساتھ لے لیں۔ فرمایا: داوا ابوالحسن کا نشان ہمارے آگے آگے چلے۔

مولانا شاہ اسماعیل مسجد بالا کے شمالی دالان میں تھے، وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ مسجد سے سید صاحب تشریف لے گئے تو مولوی احمد اللہ کی جماعت کے لئے بھی وہاں بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی بھی مع جماعت کے ہمراہ ہو گئے۔ اس طرح سید صاحب غازیوں کے جھرمٹ میں مسجد زیریں تک پہنچ گئے، جہاں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف ایک پگڈنڈی جاتی تھی۔

چالیسواں باب:

آغازِ جنگ

صدائے تیغِ تو آمد بہ بزمِ زندہ دلاں
کدام سر کہ درو ذوقِ ایں سرود نہ ماند

مسجد زیریں سے حملہ

سید صاحب مسجد زیریں میں پہنچے تو صحن غازیوں سے بھرا ہوا تھا، بعض باہر کھڑے تھے، بعض دائیں جانب کی گلی میں تھے۔ سید صاحب وہاں کھڑے رہے، اس وقت سکھوں کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ بعض غازی زخمی ہو گئے، سید صاحب نے فرمایا کہ کواڑوں کی اوٹ بنالی جائے، چنانچہ کچھ غازی کواڑ اٹھا لائے اور اوٹ بنانے میں لگ گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ مسجد میں ٹھہر کر ان سکھوں کے نیچے پہنچ جانے کا انتظار کریں گے، جو پہاڑ پر سے اتر رہے تھے۔ اس اثناء میں آپ نے مسجد کے کونے کی آڑ سے سکھوں کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ قرابین دار اور لمبی مار کی بندوقوں والے ہمارے آگے چلیں۔ یہ فرماتے ہی تکبیر کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکلے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف چل پڑے۔

اس پر سب کو تعجب ہوا۔(۱) اس لئے کہ لڑائی کی جو اسکیم پہلے طے ہو چکی تھی، وہ یہ تھی کہ جب تک سکھ نشیب میں نہ پہنچ جائیں، ان پر حملہ نہ کیا جائے۔ وہ ابھی نشیب سے

---

(۱) اصل کیفیت ابواب ضمیمہ سے واضح ہوگی۔

دور تھے کہ خود سید صاحب نے حملہ کر دیا۔ مولوی جعفر علی نقوی بھی قرابین دار تھے، اس لئے سید صاحب کے حکم کے مطابق ساتھ ہو گئے۔ مولوی احمد اللہ سے انہوں نے کہہ دیا کہ اب آپ اپنی جماعت کو سنبھال لیں۔

''منظورہ'' کا بیان

یہاں تک تمام راوی فی الجملہ متفق ہیں، اس کے بعد بیانات میں کم و بیش اختلافات ہیں، مسلسل بیان صرف مولوی سید جعفر علی نقوی کا ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ سید صاحب نے مسجد سے نکل کر دلدل کا قصد کیا، عرض کیا گیا کہ لوگ مجروح ہو رہے ہیں، ہمیں بھی جواب میں بندوقیں چلانے کی اجازت مرحمت ہو۔ فرمایا: جن کے پاس لمبی مار کی بندوقیں ہیں، وہ سر کریں اور جہاں جہاں ممکن ہو مورچے بنا لئے جائیں۔ دلدلی زمین ہموار تھی اور اسے عبور کئے بغیر مورچے بنانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

مولانا اسماعیل نے فرمایا کہ قرابین دار سید صاحب کے گرد و پیش رہیں، آپ آہستہ آہستہ تکبیر کہتے ہوئے جا رہے تھے۔ دلدل پر پہنچے تو اس کے کنارے ایک بھاری پتھر تھا اس پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ ارباب بہرام خاں آپ کے بائیں جانب تھے، شیخ ولی محمد کو قصبے سے شاہین لانے کا حکم دیا۔ عرض کیا گیا کہ قندھاریوں کی طرف سکھوں کا زور معلوم ہوتا ہے، مناسب ہوگا کہ ادھر کمک بھیجی جائے۔ فرمایا: جتنے لوگ وہاں ہیں وہی کافی ہیں۔ ایک شخص نے تلوار لے کر دلدل میں اترنا چاہا، لوگوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ حضرت کے حکم کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ سید صاحب نے بیٹھے بیٹھے ارباب بہرام خاں سے فرمایا: دل چاہتا ہے کہ سکھوں کا جو گروہ نیچے اتر آیا ہے، اس پر حملہ کر دیا جائے۔ ارباب نے عرض کیا: جو لوگ نیچے آ چکے ہیں، انہیں مار لینا مشکل نہیں لیکن جو ابھی تک پہاڑ پر ہیں یا پہاڑ سے اتر رہے ہیں، ان پر یورش کی کیا صورت ہے؟

فرمایا: بہتر ہے، بڑے گروہ کو پیچھے آ لینے دیں:

پس آنجناب یک لحہ توقف نمودند بعد ازاں ہیچ کس را اطلاع بہ یورش ناداده، خود "بسم اللہ اللہ اکبر" بہ زبان آوردہ داخل خلاب شدند۔ چوں طاقت روحی وجسمانی خدا دادے داشتند درآں خلاف کہ تا زانوے رفت وپائے را بہ وقت بالا کشیدن بہ مشکل می گزاشت بہ سرعت وچستی وچالاکی مثل شیر ژیاں حملہ کناں می رفتند وبہ طرز اہل ورزش جست ے نمودند کہ آنجناب در آں مہارت تامہ داشتند۔ پس ارباب بہرام خاں ودیگر کسانیکہ نگاہ شاں بہ جانب آنجناب بود ہمراہ شدند حتیٰ کہ دادا ابوالحسن نصیر آبادی کہ نشان بردار بودند غافل محض بودند کسے دادا موصوف را آگاہ ساخت وراقم الحروف ہم بعد بالا کشیدن زیر جامہ داخل آں خلاب گردید، چوں عافیت بدنی نہ داشت بلکہ رنجور بود ہمراہ آنجناب نہ رسید۔ (۱)

ترجمہ : سید صاحب نے ایک لحہ توقف فرمایا پھر کسی کو یورش کی اطلاع دیے بغیر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر دلدل میں داخل ہو گئے۔ چونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خاص روحانی وجسمانی قوت عطا کر رکھی تھی، اسلئے تیزی، چستی اور چالاکی سے شیر ژیاں کی طرح حملہ کرتے ہوئے بڑھے حالانکہ دلدل میں پاؤں زانو تک دھنس رہا تھا اور اسے باہر کھینچنا مشکل تھا۔ آپ اہلِ ورزش کی طرح چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہے تھے، اس میں آپ کو پوری مہارت حاصل تھی۔ آپ کے ساتھ ہی ارباب بہرام خاں اور وہ لوگ چلے جن کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی تھیں۔ دادا ابوالحسن نصیر آبادی جو آپ کے نشان بردار تھے، بالکل غافل تھے، (یعنی ان کا دھیان سید صاحب کی طرف نہیں، بلکہ سکھ لشکر کی طرف تھا) کسی نے انہیں آگاہ کیا راقم الحروف نے بھی پاجامے کے پائینچے اوپر چڑھائے اور دلدل میں داخل ہو گیا۔ چونکہ بیمار تھا اس لئے حضرت کے ساتھ نہ جا سکا۔

---

(۱) منظورہ ص: ۱۱۸۲

ضروری تصریحات

یہ ایک مستند چشم دید بیان ہے اور فی الجملہ اس کی درستی میں کلام کی گنجائش نہیں، لیکن اس کے بعض حصے یا تو غلط فہمی پر مبنی ہیں یا سمجھنا چاہئے کہ انہیں واضح کرنے کے لئے جو تفصیل درکار تھی وہ سید جعفر علی نے پیش نہ کی۔ مثلاً:

۱۔ سکھ لشکر پر حملے کیلیے ہموار میدان سے گذر کر آگے بڑھنا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن ایک پتھر پر اوٹ کے بغیر بیٹھ جانا سمجھ میں نہیں آتا، جب کہ سکھوں کی طرف سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

۲۔ میں نے قصبے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان چپہ چپہ زمین دیکھی، وہاں کوئی ایسی جگہ نہ ملی جو مخصوصاً دلدل بن گئی ہو۔ اس حصے میں یقیناً نشیبی زمین موجود ہے، جس میں آج کل بھی کھیتی باڑی ہوتی ہے، جنگ بالاکوٹ کے وقت اس میں دھان بوئے ہوئے تھے۔ یہ زمین چھوٹے بڑے کھیتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہر کھیت کی مینڈ تھی، پگڈنڈی مینڈوں پر سے تھی۔ یقیناً کھیتوں میں پانی بھر دیا گیا تھا، لیکن مینڈوں پر سے گذرا جا سکتا تھا۔

۳۔ ''وقائع'' میں میاں عبدالقیوم کا بیان ہے کہ سید صاحب آدمی گھڑی (دس بارہ منٹ) مسجد زیریں میں ٹھہر کر بلند آواز سے تکبیر کہتے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ داوا ابوالحسن سے فرمایا کہ نشان لے کر ہمارے آگے آگے چلو، اس وقت ارباب بہرام خاں آپ کے سامنے سپر بنے ہوئے چل رہے تھے۔ پچیس تیس قدم پر کھیت میں ایک بڑا پتھر زمین سے نکلا ہوا تھا، اس کی آڑ میں جا کر آپ ٹھہرے (۱)، یہ پتھر اب کہیں نظر نہیں آتا۔

۴۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ سید صاحب مینڈ پر سے گذرے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۰۱

مولوی سید جعفر علی آخر تک سید صاحب کے ساتھ نہیں رہے تھے، اس لئے ان کی روایت، ان اصحاب کی روایتوں کے مقابلے میں ترجیح نہیں پا سکتی، جو سید صاحب کے ساتھ تھے۔

اب آپ تمام بیانات ملاحظہ فرمالیں، جنہیں سامنے رکھنے کے بعد جنگ کے مختلف مدارج کا اندازہ ہو سکے گا۔

لعل محمد جگدیش پوری

لعل محمد جگدیش پوری کہتے ہیں کہ سید صاحب:

> اوپر کی مسجد سے نیچے کی چھوٹی مسجد میں تشریف لائے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر حملہ کیا اور تکبیر کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ جن کھیتوں میں رات کو چشمے کا پانی چھڑوایا تھا، ان میں جا کر پہنچے۔ ایک جگہ مینڈ سے آپ کا پاؤں پھسل کر کیچڑ میں جاتا رہا اور اس پاؤں کا جوتا اسی کیچڑ میں رہ گیا۔ میں نے جلد اس کو کیچڑ سے نکال کر حضرت کے پاؤں میں پہنا دیا۔ آپ تو آگے چلے گئے، کچھ دور چل کر میرا بھی پاؤں پھسل گیا، جب تک کیچڑ سے نکلوں، تب تک سات آٹھ آدمی پیچھے کے آگے ہو گئے۔ میں ان کے پیچھے ہولیا اور حضرت علیہ الرحمۃ جا کر نالے پر پہنچے، جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار اور بندوق جانبین سے چلنے لگی۔ پھر سکھ منہزم ہو کر طرف پہاڑ کے بھاگنے لگے اور پہاڑ پر چڑھنے لگے۔(۱)

کریم اللہ خاں میواتی

کریم اللہ خاں میواتی مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت میں تھے، اس جماعت کو ملا لعل محمد قندھاری کے مورچے کے قریب متعین کیا گیا تھا۔ سب لوگ صبح ہوتے ہی

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۲۷۔ اس روایت میں نالے سے مراد مٹی کوٹ کا نالہ ہے۔

مورچوں میں جا بیٹھے۔ کریم اللہ خاں کو سید صاحب کی زیارت کے شوق نے روکے رکھا، وہ کہتے ہیں کہ مسجد بالا میں پہنچا تو آپ دعا و مناجات میں مشغول تھے۔ سکھوں کے گولے ان کی طرف آتے تھے، لیکن کوئی گولہ کسی کو لگتا نہ تھا۔ میں چلے ہوئے گولے اٹھا اٹھا کر شاہین چیوں کو دینے لگا، اس وقت مسجد (یعنی مسجد بالا) میں بڑا ہجوم تھا:

> پھر حضرت کواڑ مسجد کے کھول کر باہر نکلے اور بالا کوٹ کے نیچے کو روانہ ہوئے اور سب لوگ آپ کے پیچھے آپ کے ہمراہ چلے۔ جب نیچے کی مسجد کے قریب پہنچے، گلی تنگ تھی، تمام آدمی اس میں گھس گئے اور ایک گلی مسجد کے داہنے طرف اور تھی۔ پھر حضرت تو مسجد مذکور میں تشریف لے گئے اور کچھ لوگ اس گلی میں گئے انہیں کے ساتھ میں بھی چلا گیا اور دھانوں کے کھیت میں پہنچ کر بندوق سکھوں پر لگانے لگا۔ اس (اثناء) میں حضرت امیر المومنین اس مسجد سے حملہ کر کے آئے اور ہم لوگوں کے بائیں طرف جو سکھوں کا بڑا ہجوم تھا ادھر چلے گئے اور جانبین سے بندوق کی باڑھ بھی چلتی تھی اور تلوار بھی چلتی تھی اور دھوئیں کی ایسی تاریکی تھی کہ دس قدم کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہوا مخالف تھی تمام دھواں ان کا ہماری طرف آتا تھا۔ (۱)

حافظ وجیہ الدین بانپتی

حافظ وجیہ الدین بانپتی کہتے ہیں:

> مسجد زیریں میں سکھوں کی گولیاں مانند اولوں کے برستی تھیں اور کئی آدمی وہاں زخمی بھی ہوئے اور شہید بھی ہوئے .... پھر حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ یکبارگی مسجد سے بہ آواز بلند تکبیر کہتے ہوئے حملہ آور ہوئے: اس سرعت سے اس وقت جاتے تھے جیسے شکار پر شیر جاتا ہے اور تمام مجاہدین پاک

---

(۱) وقائع ص ۲۲۱۔ نیچے کی "مسجد زیریں" ہے۔

> دین آگے پیچھے آپ کے ہمراہ چلے جاتے تھے۔ پھر لڑائی کے کھیت میں جا کر دو دو چار چار جا بجا متفرق ہو کر لڑنے لگے…… جو سکھ پہاڑ سے اتر کر دھان کے کھیتوں کی کیاریوں میں آئے تھے، وہ پھر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے، اور غازیوں نے مارتے مارتے پہاڑ کی جڑ پکڑی۔(۱)

شیخ حفیظ اللہ دیوبندی

شیخ حفیظ اللہ دیوبندی، شیخ ولی محمد کی جماعت میں تھے، جس کا مورچہ مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت کے بائیں جانب ست بنے کے کنارے پر تھا۔ شیخ موصوف کہتے ہیں کہ سوا پہر دن چڑھا ہوگا، ہمیں خیال بھی نہ تھا کہ حضرت خود حملہ کریں گے، ہماری جماعت کے بعض آدمیوں نے کہا کہ سکھوں پر حملہ کرنا چاہیے، وہ اگرچہ تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن ابھی سب پہاڑ سے اترے نہیں۔ دوسرے بھائیوں نے کہا کہ حضرت کے حکم کے بغیر حملہ مناسب نہیں۔ اس اثناء میں:

> ہم لوگوں کے پیچھے سے یکبارگی ایک آواز بلند ”اللہ اکبر“ ”اللہ اکبر“ کی سنائی دی۔ ہم سب نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ ایک غول غازیوں کا چلا آتا ہے، معلوم ہوا کہ خود حضرت امیر المومنین نے ہلّہ کر دیا۔ پھر ہمارے سب لوگ ہلّہ کر کے حضرت کی طرف چلے۔ مجھ کو چند روز پہلے سے بخار آتا تھا، اس سبب سے پیچھے رہ گیا اور میری جماعت کے سب لوگ آگے بڑھ گئے۔(۲)

---

(۱) منظورہ ص:۱۹۲ جلد سوم

(۲) ”وقائع“ ص:۲۰۸ جلد ۳۔ اس روایت میں ”پیچھے“ کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، ست بنے کا نالہ بالا کوٹ کے حلقے میں جنوب مشرق کے رخ بہتا ہے، اس کے کنارے مورچوں کا رخ جنوب مغرب میں تھا، اس وجہ سے قصبہ مورچوں کے عقب میں یا تقریباً عقب میں آ گیا۔

شیر محمد خاں رام پوری

شیر محمد خاں رام پوری کہتے ہیں:

> حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ مسجد (زیریں) سے بہ آوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے نکلے اور مانند شیر کے، طرف سکھوں کی روانہ ہوئے اور کھیتوں کے پشتوں پر جا کر چڑھنے لگے۔ میں بھی آپ کے پیچھے تھا۔ چار یا پانچ پشتوں پر بہت مشقت سے چڑھا، پھر آگے نہ چڑھا گیا اور حضرت علیہ الرحمۃ اپنے لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ پھر جب کثرت لوگوں کی کم ہوئی، تب میں دم لے کر اور کئی پشتوں پر چڑھا، کوئی پشت کمر تک بلند تھا، کوئی سینے تک اور جانبین سے بندوقیں بہ کثرت چلتی تھیں، اور جہاں میں تھا وہاں سے قرابین چلانے کا موقع نہ تھا، میں متردد تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ پھر کھیت کی مینڈ پر ہو کر میں داہنے طرف چلا۔(۱)

رحیم بخش بناری

رحیم بخش بناری بھی کہتے ہیں کہ زیریں مسجد پوری کی پوری غازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سکھوں کی گولیاں بہ کثرت آ رہی تھیں، کئی آدمی زخمی اور شہید ہوئے۔ جب حضرت سے یہ عرض کیا گیا تو:

> بہ آوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے، مسجد کی طرف سے سکھوں پر حملہ آور ہوئے اور تمام مجاہدین آپ کے ہمراہ تھے۔ جب مسجد سے نکل کر دھانوں کی کیاریوں میں پہنچے تو وہاں جا بجا لوگ متفرق ہو گئے، اور کیاریوں کی آڑ میں مورچے پکڑ کر سکھوں پر گولیاں مارنے لگے۔ ... ہمارے آگے بائیں طرف، کوئی سو سوا سو قدم کے فاصلے سے ایک جگہ غازیوں اور سکھوں کا بڑا اژدحام تھا اور اپنے لوگ اکثر کہتے تھے کہ حضرت علیہ الرحمۃ اسی اژدحام کے اندر ہیں۔(۲)

---

(۱) "وقائع" ص: ۲۳۰-۲۳۵ جلد سوم (۲) "وقائع" ص: ۲۲۳-۲۲۴ جلد سوم

میاں لکھمیر

میاں لکھمیر فرماتے ہیں کہ جب سکھ بڑھتے بڑھتے قندھاری جماعت کے مورچوں سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو ملا لعل محمد نے ہلّہ کر دیا۔ حضرت کو خبر ملی تو اگرچہ اتنے فاصلے سے حملے کا ارادہ نہ تھا لیکن قندھاریوں کو دیکھ کر دیر کرنا مناسب نہ جانا، چنانچہ آپ بھی بہ آوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے مسجد زیریں سے نکل کر حملہ آور ہوئے:

> دھان کی کیاریوں میں پہنچے اور تلوار چلنی شروع ہوگئی، اس وقت یہ حال تھا کہ جو سکھ غازیوں کے مقابلے پر تھے، انکے ہاتھوں اور بدنوں پر رعشہ پڑ گیا۔ بندوقیں نہ چلا سکے، غازی لوگ ایک ہاتھ سے ان کی بندوق پکڑتے دوسرے ہاتھ سے تلوار مارتے اور قرابین والے قرابین مارتے تھے اور سکھ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑ کی طرف چلے جاتے تھے۔ بے شمار سکھ اس وقت مارے گئے۔ (۱)

سکھوں کے افسر نے اپنے آدمیوں کو للکارا تو وہ لوٹے اور میاں لکھمیر وغیرہ کے بائیں جانب سے آنے لگے۔ اس وقت لکھمیر کے ساتھ کل آٹھ آدمی تھے۔

حضرت علیہ الرحمۃ نے ہم آٹھوں سے فرمایا کہ ان سکھوں کو مارو، ہمارے پیچھے کی طرف نہ آنے پائیں۔ پھر ہم آٹھ آدمی کھیت کی مینڈ کی آڑ میں ہو کر بندوقیں مارنے لگے۔ (۲)

---

(۱) "وقائع" ص: ۲۲۶ - ۲۲۸ جلد ۳۔ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ شیخ ولی محمد پھلتی، خدا بخش، شیر محمد خاں، محمد امیر خاں قصوری، میاں عبد القیوم، لعل محمد جگدیش پوری، عبد اللہ، امام الدین بڑھانوی، حسن خاں عظیم آبادی، رحیم بخش ہتاری، پیر محمد قاصد، کریم اللہ خاں میواتی، حاجی امان اللہ اور سید جعفر علی کہتے ہیں کہ میاں لکھمیر گرچہ بڑے معتبر راوی ہیں، لیکن ملا لعل محمد قندھاری کی جانب سے بلا اذن حملے کا بیان صحیح نہیں۔ اس بارے میں میاں صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ غلط فہمی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ملا صاحب کا مورچہ چونکہ سکھوں کے بہت قریب تھا، حملہ سید صاحب کے حکم سے ہوا، ملا صاحب قرب کی وجہ سے سکھوں پر پہلے پہنچ گئے، میاں لکھمیر نے سمجھ لیا کہ وہ بلا اذن حملہ آور ہوگئے۔

(۲) "وقائع" ص: ۲۰۳ جلد ۳

یہ تمام بیانات موقع اور محل کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہیں اور انہیں پڑھ کر بالا کوٹ کی رزمگاہ کو دیکھا جائے تو طبیعت میں کوئی خلجان پیدا نہیں ہوتا، جس طرح مولوی سید جعفر نقوی کے بیان سے پیدا ہوا۔

بہرحال لڑائی کی سرسری کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سید صاحب جس طرح مسجد بالا سے نکل کر اچانک مسجد زیریں میں گئے تھے، اسی طرح مسجد زیریں سے نکلے اور اچانک حملہ کر دیا۔ ممکن ہے کسی جگہ اوٹ میں ذرا سی دیر کے لئے توقف بھی فرمایا ہو، لیکن یہ صحیح نہیں کہ ایک پتھر پر بازوؤں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے، نہ یہ کہ آپ دلدل میں کود پڑے۔ قرین قیاس صورت یہی ہے کہ نشیب کے کھیتوں کی مینڈوں پر سے گذرے، پھر درجہ بہ درجہ کھیتوں پر پہنچے اور کود کود کر درجہ بہ درجہ چڑھتے ہوئے تیزی کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئے جو مٹی کوٹ کے دامن میں سکھوں کی نزول گاہ سے قریب تھا اور جہاں بڑے بڑے پتھروں کی آڑ مل سکتی تھی۔ وہیں سکھوں کا زیادہ اجتماع تھا اور انہیں پر حملہ مقصود تھا۔

جو غازی آپ کے ساتھ مسجد سے نکلے تھے وہ سارے ساتھ نہ رہے بلکہ دو دو چار چار، دس دس ہو کر بکھر گئے۔ ہر گروہ نے اپنے لئے اوٹ کی مناسب جگہ تلاش کر کے لڑائی شروع کر دی ہوگی۔ سید صاحب غالباً اس مقام سے قریب تھے، جہاں سے مٹی کوٹ کا نالہ پہاڑ پر سے اترتا ہے۔ یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ جتنے سکھ نیچے آچکے تھے، ان میں سے اکثر مارے گئے، باقی پیچھے پلٹ کر پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے۔ کچھ اوپر چڑھنے لگے۔

جنگ سے ایک روز پیشتر بارش ہوئی تھی، لیکن لڑائی کے وقت مطلع صاف تھا اور دھوپ نکل آئی تھی، تاہم بارود کا دھواں اتنا زیادہ تھا کہ تھوڑے فاصلے پر بھی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ کارتوسوں کے کاغذ ہوا میں اس طرح اڑتے تھے جیسے تتریاں اڑا کرتی ہیں۔

میاں عبدالقیوم اور محمد امیر خاں قصوری

میاں عبدالقیوم داروغۂ باورچی خانہ کہتے ہیں:

> متی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ سے سکھوں نے ہم سے پہلے ہلہ کیا اور ان کر کوہ کے کھیتوں کی یہ کیفیت تھی جیسے پختہ تالاب کی سیڑھیاں، کوئی اونا چھاتی تک بلند تھا اور کوئی کمر تک اور کوئی اس سے بھی کم، اور اوپر سے نیچے تک وہ البتہ چالیس پچاس چبوترے ہوں گے، ہم لوگ وقت ہلے کے ان پر چڑھ کر جاتے تھے اور سکھ اتر کر ہماری طرف آتے تھے، اور حضرت امیر المومنین اس پتھر مذکور کی آڑ میں اس نیت سے ٹھہرے تھے کہ جب سکھوں کا ہلہ بہت نزدیک آوے تب ایک باڑھ قرابینوں کی مار کر تلوار سے لڑیں۔ پھر حکمت الٰہی سے یونہی معاملہ ہوا کہ جب ان کا ہلہ اوپر سے اترتے اترتے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر آیا تب ایک بارگی تکبیر کہہ کر ایک باڑھ بندوقوں والوں نے ماری اور بعد ان کے دوسری باڑھ قرابین والوں نے ماری، ان دونوں باڑھوں میں بے شمار کفار واصل دار البوار ہوئے اور باقی منہزم ہو کر اوپر کی طرف بھاگے۔ ادھر سے غازیوں نے اپنے اپنے ہتھیار لے کر ان کا تعاقب کیا، کوئی تو تلوار سے کوئی گنڈاسے سے اور پتھروں سے، کوئی بندوق وغیرہ سے ان کو مارنے لگا..........
>
> باقی بھاگتے بھاگتے پہاڑ کی جڑ میں جا پہنچے۔(۱)

آگے چل کر بتاتے ہیں کہ سکھ افسر نے یہ حالت دیکھ کر ترم بجایا اور اس آواز میں کچھ کہا، سکھ پھر پلٹے اور غازیوں پر باڑھیں مارنے لگے۔ محمد امیر خاں قصوری کے بیان کے مطابق سید صاحب کے حملے نے بقیۃ السیف سکھوں کو پہاڑ کی جڑ میں پہنچا دیا تھا، وہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ غازی ان کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچتے اور تلواریں مار مار کر ختم کرتے جاتے۔(۲)

---

(۱) "وقائع" ص:۱۹۱ جلد ۳

(۲) "وقائع" ص:۱۹۲ جلد ۳

یہ تمام روایتیں فی الحال ایک دوسری کی مصدق ہیں۔ بعض اور روایتیں بھی ہیں، کسی میں تفصیلات زیادہ ہیں کسی میں کم، صرف میاں نجم الدین شکار پوری کی روایت میں ایک بات ایسی ہے جس میں وہ منفرد ہیں، اور وہ یہ کہ سید صاحب نے جب مسجد زیریں میں دیکھا کہ بعض غازی سکھوں کی گولیوں سے زخمی یا شہید ہوئے تو فرمایا:

> جن غازیوں کے پاس پلہ دار بندوقیں ہوں، وہ آگے چل کر سکھوں کے مقابلے میں مورچے لگا دیں۔ پھر اس وقت حضرت تو مسجد ہی میں رہے اور پلہ دار بندوقوں والے سکھوں کے مقابلے کو گئے۔ ان کے ساتھ میں بھی گیا، اور مورچوں سے تو پہلے ہی بندوقیں چل رہی تھیں، پھر ہم لوگ دھانوں کی کیاریوں میں جا کر پانچ پانچ سات سات آدمی متفرق ہو گئے اور کیاریوں کی آڑ لے کر سکھوں پر گولیاں مارنے لگے اور میں سب کے کنارے پر تھا۔ (۱)

مولوی سید جعفر علی

آخر میں پھر مولوی سید جعفر علی نقوی کا بیان سن لینا چاہئے۔ فرماتے ہیں:

> آنجناب و ہمراہیانِ آنجناب تیز تر از برق و باد بر سرِ آں کافراں رسیدند۔ بعضے از نیزہ و شمشیر جرأتے کردند والا تمامی بگریختند و راہ گریز ہم تنہ بود چہ از کوہ فرود آمدہ بودند و دیدہ بالائے کوہ چگونہ روند۔ پس ہمہ آنہا کہ زیر آمدہ بودند مردار شدند و کافران کہ بالا بودند از گلولہ ہائے بندوق دخویش را گزاشتند و تہ بیگانہ را آنجا گلولہ تفنگ چوں ژالے می بارید و کاغذ ہائے کارتوس در ہوا می پرید وز دوں سنگہا از جا نتیں بود۔ پس راقم الحروف و منشی انصاری وقتے رسیدیم کہ قلیل ازاں کافرانِ زیرِ کوہ زندہ بودند بہ طرفۃ العین چوں شکار کشتہ شدند۔ (۲)

---

(۱) ''وقائع'' ص: ۲۲۸-۲۲۹ جلد ۳۔ میاں نجم الدین کے پاس ایک چھوٹی روی بندوق تھی جو سید صاحب نے سفر حج میں عرب سے خریدی تھی، یہ پہلے شیخ صلاح الدین پھلتی کو دی گئی، ان سے میاں نجم الدین کو ملی، اس کی گولی بڑی بڑی پلہ دار بندوقوں کے برابر جاتی تھی۔

(۱) منظورہ ص: ۱۱۸۶-۱۱۸۷

ترجمہ: سید صاحب اور آپ کے ساتھی بجلی اور آندھی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سکھوں کے سر پر پہنچے، ان میں سے بعض نے تیزہ شمشیر اٹھانے کا حوصلہ کیا، باقی بھاگ نکلے، لیکن راہ گریز کہاں تھی؟ وہ پہاڑ سے نیچے اتر چکے تھے اور دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ نہیں سکتے تھے۔ پس جتنے نیچے اترے تھے، مارے گئے، جو سکھ اوپر تھے وہ گولیاں چلا رہے تھے، ان کی گولیاں نہ اپنوں کو چھوڑتی تھیں نہ بیگانوں کو۔ گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں، کارتوس کے کاغذ ہوا میں اڑ رہے تھے، دونوں طرف سے ایک دوسرے پر پتھر بھی پھینکے جا رہے تھے۔ میں (سید جعفر علی) اور منشی محمدی انصاری اس وقت موقع پر پہنچے جب تھوڑے سے سکھ زندہ تھے، وہ بھی طرفۃ العین میں مارے گئے۔

بیانات کا خلاصہ

تمام بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ سید صاحب اچانک مسجد بالا سے نکل کر مسجد زیریں میں پہنچے اور وہاں سے اچانک حملہ کر دیا۔

۲۔ دھانوں کے کھیتوں کی مینڈوں سے گذرے، ایک جگہ پاؤں پھسل کر کھیت کے کیچڑ میں پھنسا اور جوتا اس میں رہ گیا، جو لعل محمد جگدیش پوری نے نکال کر پہنایا۔

۳۔ پھر پایہ بہ پایہ کھیتوں سے جست کرتے کرتے گذرے اور پہاڑ کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچے، جہاں سکھوں کا ہجوم تھا۔

۴۔ نیچے اترے ہوئے سکھوں میں سے بہت سے مارے گئے۔ باقی پیچھے ہٹ گئے، یا پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مولوی جعفر علی کے بیان کے مطابق نیچے اترے ہوئے سب مارے گئے۔

۵۔ غازی ایک جگہ نہیں رہے تھے، بلکہ مختلف اوٹوں میں جا بجا بکھر گئے تھے۔

۶۔ دھواں اتنا پھیلا ہوا تھا کہ دس قدم سے آگے کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

۷۔ ہوا مٹی کوٹ کی طرف سے بالا کوٹ کی طرف چل رہی تھی اور سکھوں کی بندوقوں کا دھواں غازیوں کی طرف آ رہا تھا۔

۸۔ سید صاحب اکثر غازیوں سے آگے تھے پھر کسی نے انہیں پیچھے آتے نہ دیکھا۔

۹ پہاڑ پر سکھ بندوقیں چلا رہے تھے، ان کی گولیاں بے امتیاز برس رہی تھیں، غازیوں کے علاوہ سکھ بھی ان سے مارے گئے۔

۱۰۔ بندوقوں، تلواروں اور نیزوں کے علاوہ پتھر بھی اس لڑائی میں استعمال کیے گئے۔

۱۱۔ میاں نجم الدین شکار پوری کا بیان درست سمجھا جائے تو سید صاحب نے مسجد زیریں سے حملے کے لئے نکلنے سے پیشتر غازیوں کی ایک جماعت کو بھیج کر دھانوں کے کھیتوں میں مورچے بنوا دیے تھے۔

۱۲۔ میاں لکھمیر کے بیان کے مطابق سید صاحب کو حملے میں عجلت اس وجہ سے کرنی پڑی کہ ملا لعل محمد قندھاری نے اچانک بے اذن ہلّہ بول دیا تھا، لیکن تمام دوسرے راوی اس بیان کو میاں لکھمیر کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہیں۔

اکتالیسواں باب:

شہادت

چوں شہید عشق در دنیا و عقبیٰ سرخرو ست
اے خوش آں ساعت کہ مارا کشتہ زیں میداں برند

روایات میں اضطراب کی وجہ

اس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے کہ سید صاحب مسجد زیریں سے بہ نیت یورش نکلے تو سکھوں کو مارتے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے مٹی کوٹ کے دامن میں پہنچ گئے۔ اگرچہ تفصیلات میں کم وبیش اختلاف ہے، لیکن بعد کی رواجوں میں سخت اضطراب کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ مثلاً:

۱۔ غازیوں کا بڑا گروہ صرف مٹی کوٹ کی جانب اقدام شروع ہونے تک آپ کے ساتھ رہا، پھر جنگی مصلحتوں کی بنا پر اکثر کو اِدھر اُدھر منتشر ہو جانا پڑا۔ وہ لوگ کچھ بتا ہی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ بے خبر تھے۔

۲۔ جن اصحاب نے کسی قدر حالات بتائے وہ صرف تھوڑی دیر تک سید صاحب کے ساتھ رہے، پھر انہیں بھی زد و کشت کے ہنگامے میں الگ ہونا پڑا۔

۳۔ جو خوش نصیب آخری دم تک سید صاحب کے دامن سے وابستہ رہے، ان میں سے غالباً ایک بھی زندہ نہ بچا۔ اس وجہ سے ان کا کوئی بیان محفوظ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان حالات میں ہمارے لئے اسکے سوا چارہ نہیں کہ رواتوں کے پورے ذخیرے میں سے وہ مطالب فراہم کر کے بصورت مرتب پیش کر دیں، جن میں سید صاحب کے متعلق

کچھ نہ کچھ ذکر آیا ہے، پھر غور و فکر سے پیش آمدہ حالات کا ایک قیاسی نقشہ مرتب کریں۔

''منظورہ'' کا بیان

سب سے پہلے سید جعفر علی نقوی مؤلف ''منظورہ'' کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

> لشکر غازیاں ہمراہ حضرت امیر المومنین تا بیخ آں کوہ (مٹی کوٹ) رسید۔ کشتہائے شالی ختم شدہ بود و کوہ دشوار گزار بود۔ بعد فراغ از کشتن آں کافران پائیں، گلولہ ہائے تفنگ و سنگ، باراں صفت از بالائے کوہ می افتاد و جناب حضرت امیر المومنین در ہماں جماعت از نظر من غائب شدند۔ از منشی موصوف (منشی محمدی انصاری) پرسیدم کہ حضرت امیر المومنین کجا ہستند؟ ایشاں فرمودند کہ عقب ما بہ سمت چپ ہستند۔ گفتم کہ الحمد للہ، پیش آنجناب دریں مقام ہستیم۔ پس ہر دو کساں نشستہ بندوق را پُرے کردیم و استادہ گزارے نمودیم، زیرا کہ بلندی کشتہائے شالی کہ چوں نردبان بود بوقت نشستن از گلولہ و سنگ دشمناں محفوظ مے شدیم۔ وقتیکہ مے استادیم، کافرے را نشانہ کردہ زدہ سرے دادیم و باز می نشستیم۔ (۱)

ترجمہ: غازیوں کا لشکر حضرت امیر المومنین کے ہمراہ پہاڑ کی جڑ تک پہنچا۔ دھان کے کھیت ختم ہو چکے تھے، سامنے پہاڑ دشوار گزار تھا، نیچے اترے ہوئے سکھوں کو مار چکے تو پہاڑ پر سے (سکھوں کی) گولیاں اور پتھر بارش کی طرح آ رہے تھے۔ حضرت امیر المومنین اسی حالت میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے منشی محمدی انصاری سے پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرمایا: ہمارے پیچھے بائیں جانب۔ میں نے کہا: الحمد للہ کہ اس مقام میں

---

(۱) منظورہ ص: ۱۱۸۷-۱۱۸۸۔ اس اقتباس میں "در ہماں جماعت از نظر من غائب شدند" والے فقرے کا غلط مفہوم سامنے رکھ کر جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں ان پر مفصل بحث آگے آئے گی۔

ہم حضرت سے آگے ہیں، ہم دونوں بیٹھ کر بندوق بھرتے، اس لئے کہ دھان کے کھیت جو سیڑھی کی طرح پایہ بہ پایہ تھے۔ دشمنوں کی گولیوں اور پتھروں سے ہمیں محفوظ رکھتے تھے، اٹھتے تو کسی ایک دشمن کو نشانہ بنا کر بندوق تیزی سے سر کر کے پھر بیٹھ جاتے۔

گویا سید صاحب مٹی کوٹ کے دامن میں سید جعفر علی اور منشی محمدی انصاری کے بائیں ہاتھ تھے اور ان کا مقام دونوں منشیوں کے جنوب مشرق میں تھا۔ یہ عین مٹی کوٹ کی جڑ ہو سکتی ہے اور دونوں منشی اس مقام کے شمالی ٹیلے کے آس پاس تھے۔

متفرق بیانات

متفرق بیانات یہ ہیں:

۱۔ **محمد امیر خاں قصوری:** لڑتے لڑتے ہم لوگوں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو نہ امیر المومنین کا نشان نظر آیا، نہ آپ دکھائی دیے۔ (۱)

۲۔ **میاں عبد القیوم داروغہ باورچی خانہ:** جب سکھوں نے پہلی مرتبہ منہزم ہونے کے بعد دوبارہ حملہ کیا تو اس وقت کچھ غازی ان کے مقابلے میں رہے، باقی سب میدان میں حضرت امیر المومنین کو تلاش کرنے لگے۔ جس پتھر کی آڑ میں آپ چند آدمیوں کو لے کر بیٹھے تھے، وہاں آپ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ (۲)

۳۔ **الٰہی بخش رام پوری:** ہم لوگوں نے جا کر پہاڑ کی جڑ پکڑی، اس اثناء میں حضرت کے مورچے کی طرف سے قصبہ نانوتہ کے حافظ عبد اللطیف صاحب آبدیدہ یہ کہتے ہوئے ہم لوگوں کے قریب آئے۔

''امیر المومنین کہاں ہیں؟'' ''امیر المومنین کہاں ہیں؟''۔ میں نے کہا مجھ کو نہیں

---

(۱) ''وقائع'' ص: ۱۹۱ جلد ۳

(۲) ''وقائع'' ص ۲۰۳ جلد ۳

معلوم۔ وہ یہی کہتے ہوئے ست بنے کے نالے کی طرف چلے گئے، پھر میں نے دیکھا کہ حضرت امیر المومنین کے مورچے کی طرف بڑا ہجوم ہے اور تلوار چل رہی ہے۔

۴۔ **میاں امام الدین بڑھانوی:** ہم پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے، سکھ ہم پر بندوقیں چلا رہے تھے اور ہم سکھوں پر۔ میں بیٹھا تھا کہ میرے سینگڑے کا ڈاٹ کھل گیا اور بارود میرے انگرکھے کے دامن پر گر پڑی۔ میں اسے اٹھا کر بھرنے لگا تو حافظ عبداللہ املیاوالے حضرت کا پوچھتے ہوئے آئے اور روتے ہوئے پیچھے کو چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ مولانا شاہ اسماعیل ملے، وہ کچھ نہ بولے۔ پھر شیخ ولی محمد سے ملاقات ہوئی، ان سے حضرت کا پوچھا تو ست بنے کے نالے کی جانب ایک ہجوم کو مشارٌ الیہ بنا کر فرمایا: اس ہجوم میں جاتے ہیں، تم بھی اسی طرف چلو۔

کریم اللہ خاں میواتی اور نجم الدین شکار پوری

کریم اللہ خاں کہتے ہیں کہ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے:

> مولانا اسماعیل نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا اس ہجوم میں، جہاں تلوار چل رہی ہے وہاں ہوں گے۔ پھر مولانا تو ادھر چلے گئے .... جو غازی حضرت امیر المومنین کے مورچے سے آتا، یہی پوچھتا کہ "حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟"

نجم الدین شکار پوری فرماتے ہیں کہ میرزا احمد بیگ پنجابی پراگندہ حواس سر پیٹتے ہوئے آئے اور پوچھنے لگے: "امیر المومنین کہاں ہیں؟ میں تو آپ کو مسجد زیریں میں چھوڑ کر آیا تھا، اور معلوم نہ تھا کہ آپ نے حملہ کیا"۔ میں نے میرزا سے کہا کہ حضرت بالا کوٹ میں ہوں گے۔

رحیم بخش بنارسی اور میاں لکھمیر

رحیم بخش بنارسی:

> ہمارے آگے سوسوا سو قدم پر ایک جگہ سکھوں اور غازیوں کا ہجوم تھا اور اپنے اکثر لوگ کہتے تھے کہ حضرت امیر المومنین اسی ہجوم کے اندر ہیں۔ پھر ہم تینوں (اللہ بخش بانچتی، رسول خاں جلالہ والا اور خود راوی) نے آپس میں صلاح کی کہ آؤ ہم بھی وہیں چلیں جہاں حضرت امیر المومنین ہیں اور اس وقت گولیوں کا مینہ برستا تھا۔ پھر ہم تینوں وہاں سے اس طرف دوڑے....... اس عرصے میں لڑائی شکست ہوگئی۔

میاں لکھمیر:

> حضرت امیر المومنین سکھوں کو مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے داہنے طرف نالہ تھا، چھ آدمی ہمارے اس نالے میں ہوکر حضرت امیر المومنین کے پاس چلے گئے....... اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہوکر ناصر خاں بھٹ گرام کے آئے۔ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا کہ اس ہجوم میں تشریف رکھتے ہیں۔

بعد میں میاں لکھمیر، امان اللہ خاں لکھنوی اور شیخ ولی محمد یکے بعد دیگرے ملے، ان سے سید صاحب کے متعلق پوچھا تو اول نے کوئی جواب نہ دیا، شیخ ولی محمد نے کہا کہ ان کو تو گوجر پہاڑ پر لے گئے۔(۱)

روایات کی کیفیت

ان میں سے ایک روایت بھی ایسی نہیں جس سے تعین کے ساتھ کوئی بات معلوم

---

(۱) یہ تمام بیانات وقائع کی جلد سوم سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۹، ۲۳۳، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۳۹۔

ہو سکے۔ بعض نے سید صاحب سے بالکل بے خبری ظاہر کی، بعض ان کی تلاش میں سرگرداں تھے، بعض نے ایک ہجوم کی طرف اشارہ کیا، لیکن یہ کسی نے نہ بتایا کہ ہجوم کہاں تھا؟ مٹی کوٹ کے دامن میں یا کسی اور جگہ؟ شیخ ولی محمد کی زبان سے ایک راوی (نجم الدین شکار پوری) نے سنا کہ سید صاحب ست بنے کے نالے کی طرف ہجوم میں جا رہے ہیں۔ دوسرے راوی (میاں لکھمیو) نے سنا کہ سید صاحب کو گوجر اٹھا کر لے گئے، لیکن شیخ نے یہ بات کسی سے سن لی ہوگی، وہ خود نہ اس بات کے شاہد تھے کہ سید صاحب ست بنے کی طرف گئے، نہ اس بات کے شاہد تھے کہ انہیں گوجر اٹھا کر لے گئے۔ تعجب ہے کہ شیخ نے یہ بات سنتے ہی مان لی اور اس حقیقت پر غور نہ کیا کہ اگر سید صاحب ست بنے کے نالے کی طرف گئے تو خود شیخ صاحب کیوں میدان میں ٹھہرے رہے؟ یا گوجر گھمسان کے رن میں، جہاں مینہ کی طرح گولیاں برس رہی تھیں، کیوں کر آئے اور کس ترکیب سے سید صاحب کو محفوظا اٹھا کر لے گئے؟ پھر شیخ صاحب نے میدانِ جنگ سے باہر نکل کر پورے حالات پر غور کیا تو ان کی رائے بھی یہی تھی کہ سید صاحب کو اسی جگہ جا کر تلاش کرنا چاہیے جہاں وہ میدان میں اکثر غازیوں سے الگ ہوئے تھے۔

الٰہی بخش رام پوری

الٰہی بخش رام پوری کی روایت میں بھی گوجروں کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب لڑائی ہو رہی تھی تو حضرت بالاکوٹ سے اتر کر ہم سے سو سوا سو قدم کے فاصلے پر ٹھہرے:

> اس اثناء میں جانب شمال سے دس بارہ گوجر کمل پوش آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ سید بادشاہ کہاں ہیں؟ میں نے کہا کیا کام ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ملاقات کو آئے ہیں۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ حضرت ان لوگو میں ہیں، پھر وہ سب حضرت کی طرف چلے گئے۔ نظام الدین ''اولیا'' نے مجھ سے کہا کہ یہ گوجر تو وے معلوم ہوتے ہیں، جو اس دن بچوں میں آتے ہوئے

> رات کو پہاڑ پر حضرت کے پاس اسی لباس سے دعوت کا کھانا لے کر آئے تھے، میں نے کہا، کیا عجب ہے وہی ہوں۔ پھر اس کے تھوڑی دیر بعد ایک شور ہوا کہ حضرت امیر المومنین نے حملہ کر دیا۔(۱)

تعجب ہے کہ گوجر سید صاحب سے اس موقع پر ملنے کیلئے آئے جب لڑائی پورے زور وشور سے جاری تھی، اور سید صاحب مسجد بالا سے زیریں میں پہنچ چکے تھے۔ عام روایات کے مطابق مسجد زیریں میں ان کا قیام دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حملے میں گوجر سید صاحب کے ساتھ نہ تھے، پھر وہ مٹی کوٹ کے دامن میں کب پہنچے؟ نیز کس ذریعے سے اور کس راستے سے سید صاحب کو اٹھا کر لے گئے؟ وہ بستی میں نہیں آسکتے تھے، مٹی کوٹ کے ٹیلے یا اس کے شمال والے ٹیلے پر نہیں جا سکتے تھے۔ مٹی کوٹ کے دامن سے ست بنے کی طرف جاتے تو راستے میں قندھاریوں کا مورچہ تھا، وہ بھی اس واقعہ سے بالکل بے خبر رہے۔

میدان میں سید صاحب کا مقام

اب وہ روایتیں ملاحظہ فرمائیے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری اوقات میں سید صاحب کس جگہ تشریف فرما تھے؟ نیز ان اصحاب کے بیانات پر نظر ڈالئے جو شہادت کے قریب تک آپ کے ساتھ رہے۔

لعل محمد جگدیش پوری کہتے ہیں:

> ”حضرت علیہ الرحمۃ نالے میں پہنچے جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار، بندوق جانبین سے چلنے لگی۔“

نالے سے مقصود یقینی طور پر مٹی کوٹ کا نالہ ہے اور ہجوم اسی مقام پر تھا جہاں نالہ پہاڑ سے اتر کر نیچے کی طرف آیا ہے، وہی مقام تھا جہاں سکھ پہاڑ سے اتر کر آگے بڑھ رہے تھے۔

---

(۱) ”وقائع“ ص: ۲۱۵، ۲۱۶

شیخ محمد خاں رام پوری کہتے ہیں کہ میں اپنے رسالے کے افسر شیخ وزیر پھلتی سے ملا تو پوچھا کہ حضرت کا معلوم ہے، کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا:

> ''میں نے نہیں دیکھا لیکن لوگوں سے سنا ہے کہ کہیں اس نالے میں ہیں......... پھر میں نے شیخ وزیر سے کہا کہ تمام غازی تو یہاں سے نکلے جا رہے ہیں، اور آپ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین کو میں نے سنا ہے کہ اس نالے میں ہیں، اگر ہوں تو آؤ چل کر دیکھیں۔''

چنانچہ دونوں نالے کی طرف چلے۔ راستے میں ناصر خاں بھٹ گرامی ملے، وہ زخمی تھے پوچھا: کدھر جا رہے ہو؟ عرض کیا نالے میں حضرت کو دیکھنے جا رہے ہیں؟ بولے:

> ''پھر چلو، حضرت وہاں کہاں؟ اور ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ وہ تو ان لوگوں کے ساتھ جاتے ہیں جو پہاڑ پر چڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔''

شیر محمد خاں اور شیخ وزیر دونوں نالے کے پاس تک گئے، انہوں نے دیکھا کہ جو لوگ وہاں تھے وہ بھی پہاڑ پر چڑھے چلے جاتے ہیں۔

نالے سے یقیناً مٹی کوٹ کا نالہ مقصود ہے۔ پھر وہ پہاڑ کون سا تھا جس پر لوگ نالے سے نکل کر چڑھے جا رہے تھے؟ مٹی کوٹ کا پہاڑ ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ اس پر تو سکھ قابض تھے۔ اس کے ساتھ شمالی جانب کا پہاڑ ہو سکتا ہے، مجھے یقین ہے کہ شیر محمد خاں اور شیخ وزیر نالے تک نہیں گئے اور نہ جا سکتے تھے۔ قریب پہنچ کر لوگوں کو مٹی کوٹ کے ساتھ کے ٹیلے پر چڑھتے دیکھا تو وہیں سے لوٹ آئے۔

شیخ حفیظ اللہ دیو بندی

شیخ حفیظ اللہ دیو بندی کی روایت سے محض مقام ہی کا تعین نہیں ہوتا بلکہ مزید

---

(۱) ''پھر چلو'' کا مطلب ہے لوٹ چلو۔ فیل محمد جگدیش پوری اور شیر محمد خاں دونوں کے بیانات وقائع جلد سوم سے ماخوذ ہیں۔ دیکھو صفحات ۲۲۷، ۲۲۵، ۲۳۶۔

تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> دھانوں کے کھیت میں میں نے دیکھا کہ مولانا اسماعیل صاحب کھڑے بندوق لگا رہے ہیں۔ میں نے دور ہی سے پکار کر پوچھا: مولانا صاحب ! حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ شور نہ کرو، سکھ سنتے ہیں، حضرت آگے نالے میں ہیں وہیں چلے جاؤ۔ پھر میں وہاں گیا تو دیکھا حضرت علیہ الرحمۃ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں بندوق پکڑے قبلہ رخ نالے میں بیٹھے ہیں اور ایک طرف آپ کے قریب بیس پچیس غازی صف باندھے آڑ میں بیٹھے بندوقیں لگا رہے ہیں۔ میں بھی ان میں جا بیٹھا اور بندوق بھر بھر کر مارنے لگا ...... میں نے اپنی بندوق بھری اور سر اٹھا کر چاہا کہ نشانہ باندھ کر بندوق ماروں، اس اثناء میں سکھوں کی طرف سے ایک تیر آ کر میری بائیں آنکھ کے تلے لگا اور بھال اس کی دوسری طرف پار ہوگئی۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور اس تیر کو کھینچ کر ڈال دیا، میرے داہنے طرف میاں جی چشتی بیٹھے تھے۔ ان کے پاس نور بخش جراح شاملی والے تھے، میں نے میاں جی چشتی سے کہا: میری تو آنکھ کے نیچے تیر لگا، نور بخش سے کہو میرا زخم باندھ دے۔ میاں صاحب نے کہا کہ یہ وقت زخم باندھنے کا نہیں، پیچھے پن چکیوں پر سایہ دار درخت ہیں، تم وہاں جا کر بیٹھو۔

حافظ وجیہ الدین بانچتی

اس سے بھی زیادہ تفصیلات حافظ وجیہ الدین بانچتی کی روایت میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب غازی سکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے مٹی کوٹ کی جڑ تک پہنچ گئے تو میں بھی:

> بندوق لگاتے لگاتے ایک نالے پر جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمیوں میں حضرت امیر المومنین بیٹھے ہوئے بندوقیں چلا رہے ہیں اور آپ کے قریب کئی لاشیں شہیدوں کی پڑی ہیں۔ اس وقت حضرت نے میرے روبرو داہنی

چھاتی پر بندوق جما کر فیر کی تو مجھ کو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی یا اس کے پاس والی انگلی میں خون تازہ نظر آیا۔ میں نے اپنے قیاس سے معلوم کیا کہ شاید آپ کے مونڈھے میں گولی لگی ہے، اسی کا خون آپ کی انگلی میں، بندوق چھاتی پر رکھنے کے وقت لگ گیا ہے۔ مگر یقینی اپنی آنکھ سے زخم میں نے نہیں دیکھا اور آپ کی جانب جب اس نالے میں نشیب کی طرف چند قدم کے فاصلے پر سلو خاں دہینسی قرابین داروں کی جماعت لئے بیٹھے ہیں اور آپ کے جانب راست سو قدم کے فاصلے سے لعل محمد قندھاری کا نشان تھا۔ اس وقت اس طرف سکھوں کا غلبہ زیادہ تھا اور اس نشان کو نشان بردار نیچے لئے آتا تھا۔

امیر المومنین علیہ الرحمۃ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ ہلہ کرو، میں نے چند قدم نیچے اتر کر سلو خاں سے کہا کہ حضرت فرماتے ہیں ہلہ کرو، انہوں نے کہا کہ لعل محمد قندھاری کا نشان سکھوں کے غلبے سے نیچے اترا آتا ہے، یہاں سے کیوں کر ہلہ کروں؟

خیر وہ تو وہاں بیٹھے رہے، میں وہاں سے اُوپر چڑھنے لگا اور میری بندوق فیر کرتے کرتے آگ سی گرم ہو رہی تھی اور اس وقت خالی بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تین سکھ میری طرف آتے ہیں، میں نے خالی بندوق ان کی طرف اٹھائی، وہ مارے ڈر کے وہیں ٹھہر گئے۔ پھر میں آگے بڑھا، اس اثناء میں ایک اور سکھ نے میرے اوپر تیزا اٹھایا، میں نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا، وہ سکھ بھی وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس عرصے میں میرے بائیں پہلو میں کمر کے اوپر گولی لگی اور دوسری طرف نکل گئی۔ اِدھر سکھ ہلہ کر کے پھر پہاڑ سے نیچے کھیت کی کیاریوں میں آ پہنچے۔ پھر میں اور زخمیوں کے ساتھ اس لڑائی کے کھیت سے باہر نکلا، بعد اس کے وہاں کا مفصل حال معلوم نہ ہوا۔ (۱)

---

(۱) ''وقائع'' جلد سوم ص: ۱۹۴-۱۹۶

بابا بہرام خاں تنولی اور سید جعفر علی نقوی

شرکاءِ جنگ بالاکوٹ میں سے ایک بابا بہرام خاں تنولی بھی تھے، جو لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ یہ تنول کے رؤسا میں سے تھے، نوجوانی کے عالم میں سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ حملہ اٹک میں بھی شریک تھے، ان کا بیان ہے کہ غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامن کوہ تک میدان صاف کر دیا۔ پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا، سید صاحب دامن کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے، دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی، پھر دیکھا تو سید صاحب پتھر پر نہ تھے۔ سب ساتھی بھی شہید ہو گئے۔ مگر میں نے اپنی آنکھ سے انہیں گرتے نہ دیکھا اور نہ ان کی نعش دیکھی۔ نہ ساتھیوں میں سے کسی نے آپ کو گرتے ہوئے یا بے جان پڑے ہوئے دیکھا۔(۱)

مولوی سید جعفر علی نقوی مصنف ''منظورہ'' نے بالاکوٹ کے میدان سے نکل کر مختلف ساتھیوں سے سید صاحب کے حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ آپ کی ران میں گولی لگی تھی، سر مبارک پر پتھر کا زخم تھا قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے، وہیں نور بخش جراح آپ کی مرہم پٹی کے لئے حاضر ہوا۔(۲)

خلاصہ مطالب

بس یہ سید صاحب کے متعلق آخری روایات ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ سید صاحب دامن کوہ کے سکھوں کو مار کر مٹی کوٹ کے نالے میں بیٹھ گئے وہاں پتھر بھی برس رہے تھے، گولیاں بھی آتی تھیں۔

۲۔ نالے میں اس طرح بیٹھے تھے، منہ قبلے کی طرف تھا یعنی جانب مغرب۔

---

(۱) کتاب الصمد مرتبہ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی ص: ۲۶۳

(۲) منظورہ ص: ۱۱۹۳

بائیں ہاتھ نالے کے نیچے کی طرف یعنی جانب جنوب، تھوڑے فاصلے پر سلو خاں دیوبندی قرابین داروں کی جماعت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ بیس پچیس آدمی ہوں گے، ان میں میاں جی چشتی اور نور بخش جراح بھی تھے۔

۳۔ سید صاحب کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی، دوسرے میں بندوق۔ آپ نے داہنی چھاتی پر رکھ کر بندوق چلائی تو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھنگلی یا ساتھ کی انگلی پر تازہ خون نظر آیا۔ راوی نے قیاس کیا کہ آپ کے مونڈھے میں گولی لگی۔ آپ کے قریب غازیوں کی کئی لاشیں تھیں۔

۴۔ سید جعفر علی نقوی کی تحقیق کے مطابق آپ کی ران میں گولی لگی تھی اور سر پر پتھر کا زخم تھا۔

۵۔ بابا بہرام خاں کے بیان کے مطابق آپ کھڑے تھے کہ گولیوں کی بوچھاڑ آئی، پھر نظر نہ آئے۔ گویا وہیں گر گئے لیکن آپ کی لاش کسی نے نہ دیکھی۔

کیفیتِ شہادت

اس کے بعد شہادت کے بارے میں کوئی روایت نہیں مل سکی، اس لئے کہ جو غازی ساتھ تھے ان میں سے صرف وہ زندہ بچے جو زخموں سے ناچار ہو کر شہادت سے پیشتر علیحدہ ہو چکے تھے، جو آخری وقت تک ساتھ رہے اور جن کے سامنے شہادت ہوئی، وہ خود بھی شہید ہو گئے اور جو کیفیت دیکھی تھی اسے بیان کئے اور سنائے بغیر عالم بقا میں پہنچ گئے۔ لیکن اس حقیقت کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے کہ سید صاحب مٹی کوٹ کے نالے میں دامن کوہ کے قریب زندگی کے آخری سانس تک لڑتے رہے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے۔ "تحرّف للقتال" اور "تحیّز الی فئة" کی اگرچہ اجازت تھی، لیکن آپ کی عزیمت اس کی بھی روادار نہ ہوئی اور اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ

الْاَدْبَار ی پر عمل پیرا رہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جس مقام پر آپ کھڑے تھے وہ شجاعت کا مقام تھا، نہ کہ تدبیر کا۔ زخمی ہو کر باہر نکلنے یا نکالے جانے کی ایک بھی شہادت موجود نہیں۔ جن روایتوں کو بعض ساتھیوں نے قابل اعتماد سمجھا وہ سراسر مضطرب تھیں، اس لئے شایانِ اعتماد نہ تھیں۔ شہادت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اگرچہ اس کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کی چوبیسویں تاریخ (۶ رمئی ۱۸۳۱ء) جمعہ کا دن اور گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ (۱)

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرْ؟

اس طرح غیرت وحمیتِ دین کا وہ شہسوار اور رضائے باری تعالیٰ کا وہ علمدار اس دنیا سے رخصت ہوا، جس نے ہندوستان کے اندھیرے میں عشقِ حق کا چراغ روشن کیا، جس نے حصارِ اسلامیت کی تشیید استحکام کے لئے اپنا اور اپنے رفیقوں کا خونِ حیات بے دریغ پیش کر دیا۔ تاریخ کا ایوان ان شخصیتوں کی مدح سرائی کے غلغلوں سے گونج رہا ہے، جنہوں نے تاج وتخت اور سلطنت وثروت کے لئے تلواریں چلا کر انسانی خون کی ندیاں بہائیں اور اس آرزو میں مدت العمر جدال وقتال اور تاراج وغارت کا ہنگامہ بپا

---

(۱) میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کارڈنر نے جنگ بالاکوٹ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر افسانہ ہے۔ اسی قسم کا ایک افسانہ دیوان امرناتھ نے ظفرنامہ میں بھی لکھا ہے، مثلاً یہ کہ پہلے مولانا اسماعیل شہید ہوئے، پھر مولانا عبدالحی۔ حالانکہ مولانا عبدالحی جنگ بالاکوٹ سے بہت پہلے خیر میں فوت ہو چکے تھے۔ سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئے، تین گولیاں کھا کر گھوڑے سے گرے اور جاں بحق ہو گئے۔ (ظفرنامہ ص: ۱۹۴) حالانکہ بالاکوٹ میں کسی نے بھی گھوڑا استعمال نہیں کیا تھا۔ اسی طرح میرزا حیرت نے "حیاتِ طیبہ" میں سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی شہادت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تخیل طرازی اور افسانہ بافی کا کرشمہ ہے۔ میرزا حیرت نے یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی ٹانگ میں گولی لگی تھی، آپ جھک گئے، اس اثناء میں ایک گولہ آپ کو باڈی گارڈز میں سے اٹھا کر لے گیا۔ ٹانگ میں گولی لگنے کا واقعہ بے شک درست ہو سکتا ہے، لیکن جہاں سید صاحب شہید ہوئے وہاں توپ استعمال ہی نہ ہوئی، پھر گولہ کہاں سے آیا؟

رکھا کہ ان کے مقبوضات کی پہنائی مساحت کے عام پیمانوں کی دسترس سے باہر ہو جائے۔ سید احمد شہید نے صرف اس غرض سے جہاد کیلئے قدم اٹھایا کہ کلمۂ حق کا پرچم سربلند ہو، اسلام کا غلبہ اوجِ کمال پر پہنچ جائے، شریعتِ غرائے مصطفوی کا سکہ ہر جگہ رواں ہو، بندوں کا پیمانۂ عبودیت معبودِ حقیقی کے ساتھ از سرِ نو استوار ہو جائے، مخلوق کا رشتۂ نیاز خالق کے ساتھ جڑ جائے۔ ان کے جہاد کا دامن نہ حکومت کی خواہش سے ملوث ہوا، نہ اس پر طلبِ جاہ وثروت کا کوئی دھبا لگا۔ صرف ایک تڑپ تھی اور صرف ایک اشتیاق تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی حاصل ہو۔

آپ اس ترازو میں ان مشاہیر کے کارنامے رکھ کر تولیے جن کی ناموری کے روبرو دنیا قرنہا قرن سے خراجِ تحسین پیش کرتی ہوئی نہیں تھکتی، حالانکہ ان میں سے بہت ہی کم افراد نکلیں گے جنہوں نے للّٰہیت کے اس مقام پر چند لمحوں کیلئے بھی کھڑا ہونا پسند کیا ہو، جس پر سید احمد شہید کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک ثانیہ بسر ہوا، اور جس پر ثبات واستقامت میں سید موصوف نے شہادت کو اس خندہ پیشانی سے قبول کیا کہ دوسروں نے شاید زندگی کا خیر مقدم بھی اس رنگ میں نہ کیا ہو۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے مشاہیر میں سے کتنے ہیں، جنہیں موقفِ رضا میں سید صاحب کے برابر کھڑا کیا جا سکتا ہے، یا قریب لایا جا سکتا ہے؟ آپ کی جماعت کے سوا کون سی جماعت ہے جس نے صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگیوں کو نصب العین بنایا اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اتصال ومماثلت پیدا کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں؟ لیکن خیرہ ذوقی کی نیرنگیاں اور حق ناشناسی کی بوقلمونیاں ملاحظہ ہوں کہ یہی فنافی اللہ شخصیت اور یہی فنافی اللہ جماعت سوا سو سال تک ہر قسم کے مطاعن کا ہدف بنی رہی۔

بیالیسواں باب:

مشہدِ بالاکوٹ

سر را اگر نہ بہر نثار آفریدہ اند
بارے بہ گردنم بہ چہ کار آفریدہ اند

غازیوں کی بے قراری

سکھ فوج اگرچہ غازیوں کے مقابلے میں بارہ گنا تھی لیکن جس عزیمت و استقامت کے ساتھ سید صاحب نے جنگ شروع کی تھی، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے سکھوں کا فتح یاب ہونا آسان نہ تھا۔ جب غازیوں کو یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب کا کچھ پتا نہیں ملتا تو اکثر اصحاب بے خود و بے اختیار ہو کر اس میدان میں سرگرداں پھرنے لگے، جہاں اولوں کی طرح گولیاں اور پتھر برس رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر صرف یہ کلمہ تھا کہ ''حضرت کہاں ہیں؟'' سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں:

> از گم شدن آنجناب در خلالِ جنگ محبان جاں فدا، دست از جنگ کشیدہ بے قرار در تلاش آنجناب سو بہ سو دویدند و بہ ضربت گلولہ بنادیق کفار کہ پالودہ شربت شہادت بود چشیدہ و بہ رحمت الٰہی پیوستند۔
>
> **ترجمہ**: دورانِ جنگ میں سید صاحب کی گمشدگی کا سن کر جاں نثار ارادت مندوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بے قرار ہو کر آپ کی تلاش میں سو بہ سو پھرنے لگے۔ سکھوں کی گولیاں، جو شربتِ شہادت سے لبریز تھیں، کھا کھا کر رحمتِ الٰہی کی آغوش میں پہنچتے رہے۔

تدبیر دفاع

سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ میدان میں تھوڑے سے غازی رہ گئے، بائیں جانب سے امان اللہ خاں لکھنوی آئے۔ میں نے پوچھا: خان صاحب! یہ کیا ہوا؟ میدان غازیوں سے خالی ہوگیا۔ وہ بولے: افسوس ہمیں شکست ہوئی، اس اثناء میں شیخ ولی محمد آگئے، باہم مشورے کے بعد طے ہوا کہ جو چھوٹی سی جماعت مٹی کوٹ کے دامن میں سکھوں کے مقابلے پر رہ گئی ہے، اسے ہٹا کر بالا کوٹ لے چلیں۔ اس طرف اور غازی بھی ہوں گے، سب جم کر لڑیں گے تو ممکن ہے سکھ جان کے خوف سے قصبے میں داخل نہ ہوں۔ چنانچہ یہ غازی قصبے کی طرف لوٹے، چونکہ یہ صورت بظاہر پسپائی کی تھی، اس لئے سید جعفر علی لکھتے ہیں: میں بار بار کہہ رہا تھا کہ الٰہی تو جانتا ہے کہ ہم دشمن کے خوف کے باعث پیچھے نہیں ہٹ رہے، بلکہ اصلاح احوال کی غرض سے مورچا بدل رہے ہیں۔

سکھوں کی گولیاں اس شدت سے آرہی تھیں کہ مولوی جعفر علی کے سارے کپڑے چھلنی ہوگئے، دوسرے غازیوں کی حالت بھی یہی تھی، کھیت پایہ بہ پایہ تھے، یہ اوپر کے کھیت سے نیچے کے کھیت میں کودتے، گولیاں اوپر کے کھیتوں کے پشتوں پر پڑتیں اور ان سے جو مٹی اڑتی وہ ان کے سروں پر گرتی، اسی حالت میں یہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کے غازیوں کو آوازیں دیتے جا رہے تھے کہ قصبے کا رخ کرو۔ جب مسجد زیریں سے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ سکھوں کا ایک جیش جنوبی سمت سے پیش قدمی کرتا ہوا بالا کوٹ میں داخل ہو چکا ہے، گویا قصبے میں مورچا بنانے کی جو اسکیم طے ہوئی تھی اس پر بھی عمل کی کوئی صورت نہ رہی۔

پن چکیوں میں مورچے کا قصد

یہ حالت دیکھ کر غازی بائیں ہاتھ ست بنے کے نالے کی طرف چلنے اور سب کو آواز

دی کہ ست بنے کے نالے سے گذر کر پن چکیوں کے پیچھے مورچے بناؤ۔(۱) وہاں بھی قدم جمانے کی کوئی شکل نہ بنی تو شیخ ولی محمد اور سید جعفر علی قصبے کے شمالی پہاڑ پر چلے گئے، ٹیلے پر کھڑے ہو کر میدان کا جائزہ لیا تو سکھ ست بنے کے نالے سے گذر کر پن چکیوں سے بھی آگے بڑھ چکے تھے۔ اس اثناء میں دو غازی پن چکیوں سے باہر نکلے انہوں نے تلواریں سونت رکھی تھیں، سکھوں نے ان پر حملہ کیا۔ شیخ ولی محمد نے کہا: چلو ان بھائیوں کی مدد کریں۔ چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ دونوں غازی شہید ہو گئے۔ اس وقت سید جعفر علی نے کہا:

> اگر حضرت امیر المومنین کی گم شدگی کے بعد جانیں دینا ضروری ہے تو بہتر یہ ہے کہ ڈھالوں اور قرابینوں وغیرہ کو پھینک دیں، تلواریں لے کر حملہ آور ہوں اور (پن چکیوں والے) رفیقوں کی طرح دادِ شجاعت دیں، لیکن ہمارے اس طرح جانیں دے دینے سے اللہ تعالیٰ کے کام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اگر حضرت امیر المومنین زندہ مل گئے تو شکست شکست نہیں رہے گی، بلکہ ہماری فتح ہوگی۔ حضرت کے لئے بھی ہمارا زندہ رہنا غنیمتِ کبریٰ ہوگا۔ پس اس صورت میں جان کی حفاظت مناسب معلوم ہوتی ہے۔(۲)

اس رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اس اثناء میں قصبے سے دھوئیں کے بادل بلند ہوئے، معلوم ہوا کہ سکھوں نے حسبِ عادت مکانوں کو آگ لگا دی۔

میاں عبد القیوم

یہ صرف ایک جماعت کی سرگزشت تھی، جو غالباً آٹھ دس غازیوں پر مشتمل تھی۔

---

(۱) پن چکیاں بالاکوٹ کے شمال میں بوڑا اور ست بنے کے درمیان اول کے مغربی اور دوم کے مشرقی کنارے پر تھیں، اور اب بھی ہیں۔

(۲) منظورہ ص: ۱۱۸۹-۱۱۹۳

زیادہ تر افراد اس وجہ سے میدان چھوڑ کر ست بنے کے نالے کی طرف چلے گئے کہ عام شہرت ہوگئی تھی کہ گوجر سید صاحب کو ست بنے کے راستے لئے جارہے ہیں۔ میاں عبدالقیوم کہتے ہیں کہ حضرت جس پتھر کی آڑ میں چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے تھے، وہاں نہ ملے، غازی آپ کی تلاش میں متردد ادھر ادھر پھرنے لگے، سکھ بندوقوں کی باڑھیں مار رہے تھے، اس میں بہت سے مجاہدین شہید ہوئے:

> اس اثناء میں ایک آواز لوگوں نے سنی: ''غازیو! تم یہاں کیا کرتے ہو؟ حضرت امیر المومنین کو گوجر ست بنے کے نالے میں ہو کر لئے جاتے ہیں۔'' یہ آواز سنتے ہی غازی اس کھیت سے باہر نکلنے لگے جو حضرت امیر المومنین کے ساتھ ہلے میں تھے، ان میں سے شاید کوئی بچے ہوں باقی سب شہید ہوئے۔ اور غازی ادھر اُدھر دور دور تھے، ان میں سے اکثر بچ کر سلامت نکل گئے، اس وقت سکھوں نے بالاکوٹ کو آگھیرا اور وہاں کے گھروں میں آگ لگادی اور جو غازی بیمار اپنے ڈیروں پر رہ گئے تھے ان کو جا کر شہید کیا۔ ان میں سے بعض غازی سکھوں سے مقابلہ کر کے اور ایک دو کو مار کر شہید ہوئے اور بعض غازی جو بہت بیمار تھے، وہ اپنے بستر پر شہید کئے گئے۔ (۱)

اسی روایت میں آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ شمالی سمت کے پہاڑ (۲) کی کمر پر تین راستے تھے، ایک دائیں جانب جہاں ہم تھے، دوسرا بائیں جانب، تیسرا راستہ بیچ میں پگڈنڈی جیسا تھا، اس پہاڑ کے سر پر دو گوجر کھڑے تھے، انہوں نے آواز دے کر کہا:

> غازیو! ہراساں نہ ہونا، تمہارے سید بادشاہ کو لڑائی کے کھیت سے سلامت نکال کر گوجر لوگ اس پہاڑ کے دائیں راستے سے لے گئے (یعنی ست بنے کی طرف سے) جدھر تم جاتے ہو ادھر ہی جاؤ۔ آگے وہ بھی راستہ اسی میں

---

(۱) وقائع جلد سوم ص ۲۰۲-۲۰۴، ۲۰۵

(۲) اس سے مراد وہ ٹیلہ ہے جو مٹی کوٹ اور ست بنے ٹیلے کے بیچ واقع ہے۔

ملا ہے، وہاں سید بادشاہ تم کو مل جاویں گے۔ آواز گوجروں کی سن کر ہم تمام بشاش اور مطمئن ہو گئے کہ الحمد للہ ہمارے حضرت سلامت ہیں۔

دوسری روایات

اس روایت کی تصدیق دوسری روایتوں سے بھی ہوتی ہے، مثلاً:

۱۔ الٰہی بخش رام پوری: بالاکوٹ کو آگ لگی ہوئی تھی اور لوٹ مچ رہی تھی۔ میں شمال کی طرف چلا (یعنی مٹی کوٹ کے دامن سے) درے کے منہ پر پہنچا تو گوجروں کی آواز سنی: ہندوستانیو! ادھر آؤ، سید بادشاہ زخمی ہیں، انہیں لوگ اس درے میں لئے جاتے ہیں، کوئی خچر ملے تو لاؤ کہ اس پر سید بادشاہ کو سوار کر کے لئے چلیں۔ (۱)

۲۔ لعل محمد جگدیش پوری: سکھوں نے جا کر بالاکوٹ کو گھیر لیا اور لوٹنے اور گھر جلانے میں مصروف ہو گئے۔ اسی وقت ایک آواز سنی کہ گوجر لوگ حضرت امیر المومنین کو ست بنے کے نالے کی طرف لئے جاتے ہیں۔ (۲)

۳۔ شیر محمد خاں رام پوری: مٹی کوٹ سے ست بنے کی طرف پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ چلے، کچھ دور آگے ایک شخص نوجوان دونوں ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے مظفر آباد کے نواح کا، اس کو لوگ ''راجا، راجا'' کہتے تھے، ملا۔ اس نے بھی کہا کہ حضرت امیر المومنین لڑائی کے کھیت میں نہیں ہیں، وہ تو یہاں سے ہمراہ لوگوں کے نکل گئے، تم بھی یہاں نہ ٹھہرو، جلد نکل جاؤ۔ یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں اور اسی پہاڑ کے نیچے کے راستے چلے جاؤ۔ (۳)

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۴۲

(۲) وقائع جلد سوم ص: ۲۲۹

(۳) وقائع جلد سوم ص: ۲۲۷

آواز کس نے دی؟

غرض پہلے سید صاحب کی گم شدگی کے شہرے نے غازیوں میں انتشار پیدا کیا اور اکثر آپ کی تلاش میں شہید ہوئے۔ پھر یہ آواز سنی گئی کہ سید صاحب کو گوجر ست بنے کے راستے لے گئے، یہ آخری بات بالکل غلط تھی۔ سوال یہ ہے کہ آواز کس نے دی؟ اس امر کی تشہیر کا ذمہ دار کون تھا، جس کی وجہ سے غازیوں نے میدان چھوڑ کر ست بنے کے نالے کا رخ کر لیا؟ آیا یہ آوازہ سکھوں نے ملکیوں کے ذریعے سے بدیں غرض بلند کرایا تھا کہ غازی میدان سے نکل جائیں اور مقابلہ ختم ہو جائے؟ یا کیا سمجھا جائے کہ غازیوں کے کسی خیر خواہ نے یہ تدبیر اختیار کی؟ یہ یقین تھا کہ اگر غازیوں کو سید صاحب کا نام لے کر میدان سے ہٹایا نہ جاتا تو وہ سب وہیں جانیں دے دیتے۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں، بلکہ آخری صورت زیادہ قرین قیاس ہے، لیکن اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

ابتدائی اسکیم کے ترک کا مسئلہ

بعض اصحاب کے نزدیک بالاکوٹ میں غازیوں کو اس وجہ سے شکست ہوئی کہ سید صاحب نے قصبے میں بیٹھ کر دفاع کی جو اسکیم ابتدا میں طے کی تھی، اسے دفعۃً چھوڑ کر خود حملہ کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔

بلاشبہ ابتدائی اسکیم بہت اچھی تھی لیکن اسے ترک کیوں کیا گیا؟ میں مدت تک سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سید صاحب نے بلاوجہ یہ اسکیم ترک نہ کی ہوگی، بلکہ جن حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابتدائی اسکیم تیار کی گئی تھی وہ حالات بدل گئے ہوں گے۔ مثلاً ابتدا میں صرف یہ اندیشہ تھا کہ سکھ مٹی کوٹ کی طرف سے بالاکوٹ پر بڑھیں گے، بعد میں جنوبی سمت سے بھی ان کی پیش قدمی شروع ہو گئی ہوگی اور دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر توپیں لگا کر انہوں نے قصبے پر گولہ باری بھی شروع کر دی تھی۔ تین

طرف سے یورش کی حالت میں قصبے کے اندر بیٹھ کر دفاع خاصا خطرناک بن گیا تھا اور اس کے سوا چارہ نہ رہا تھا کہ سکھوں کے بڑے جیش کو فیصلہ کن جنگ کر کے پیچھے ہٹایا جائے، پھر دوسری سمتوں کی یورشوں کا مداوا کیا جائے۔ اس رائے کے حق میں کوئی روایت موجود نہیں، لیکن تمام قرائن اس کے مؤید ہیں۔(۱)

مولانا شاہ اسماعیل

اب مختلف غازیوں کے شہید یا زخمی ہونے کا حال سن لینا چاہیے۔ ان میں سب سے پہلے مولانا شاہ اسماعیل شہید آتے ہیں۔ ''منظورہ'' میں ہے کہ ان کی پیشانی پر گولی لگی۔(۲) سید عبد الرحمٰن (خواہر زادہ سید صاحب) نے شیخ ولی محمد اور امان اللہ خاں لکھنوی کی زبانی سنا کہ مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی، اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگی گئی۔ پھر آپ ننگے سر امان اللہ خاں کو ملے، بندوق بھری ہوئی تھی اور لبلبی چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ امان اللہ خاں نے مٹی کوٹ کی طرف اشارہ کیا، ادھر سے بکثرت گولیاں آرہی تھیں، لیکن یہ کہتے ہوئے چلے گئے، بھائی! میں تو وہیں جاتا ہوں۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس حربے سے شہادت پائی۔(۳)

میاں حفیظ اللہ دیوبندی نے انہیں دھانوں کے کھیتوں میں مٹی کوٹ کے نالے سے قریب بندوق چلاتے دیکھا تھا۔(۴) میاں امام الدین بڑھانوی کا بیان ہے کہ جب غازی حضرت امیر المومنین کی تلاش میں تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا رفل کندھے پر رکھے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ پیشانی سے خون جاری ہے۔(۵) لعل محمد جلد پشاوری مٹی کوٹ کے دامن کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسماعیل رفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لئے میرے پاس آئے،

---

(۱) ایک صورت اور سامنے آئی ہے، جس کی تفصیل ابواب ضمیمہ میں ملے گی۔

(۲) منظورہ ص: ۱۱۹۳

(۳) منظورہ حاشیہ ص: ۱۱۹۴

(۴) وقائع جلد سوم ص: ۲۰۹

(۵) وقائع جلد سوم ص: ۲۲۵

پیشانی سے خون بہہ رہا تھا، پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ میں نے اپنے داہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں، یہ سن کر وہ اس طرف جھپٹے ہوئے چلے گئے۔(۱) کریم اللہ خاں میواتی کا بیان بھی یہی ہے کہ مولانا اس ہجوم کی طرف چلے گئے جہاں تلوار چل رہی تھی۔

وقائع میں ہے کہ سر سے خون جاری تھا، یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی، یا کنپٹی پر۔ ہجوم میں جا کر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔(۲)

شہادت کہاں ہوئی؟

آخری بیان کسی عینی شہادت پر مبنی نہیں، صرف ہجوم میں گھس جانے کی بنا پر قیاس کر لیا گیا کہ وہاں شہید ہوئے۔ یہ ہجوم بالاکوٹ کی غربی جانب مٹی کوٹ کے دامن میں تھا اور مولانا کی قبر اس جگہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر قصبے کے شمال مشرق میں ست بنے کے نالے کے پار بنی۔ اگر مولانا مٹی کوٹ کے دامن میں شہید ہوئے تو ان کی میت کو اٹھا کر اتنی دور ایک الگ تھلگ مقام پر کیوں لے گئے، جب کہ وہاں کوئی قبرستان بھی نہ تھا، بلکہ کھیت ہی کھیت تھے؟ میرا خیال ہے کہ مولانا لڑتے لڑتے اور دشمن کے دباؤ کے باعث مٹی کوٹ کے دامن سے پیچھے ہٹتے ہٹتے ست بنے کے پار پہنچ گئے اور وہاں شہید ہوئے۔ یہ معلوم نہیں کہ شہادت گولی سے ہوئی یا تلوار سے۔(۳) وہیں ان کی قبر بنی۔

---

(۱) وقائع جلد سوم ص:۲۲۸ (۲) وقائع جلد سوم ص:۲۵۳،۲۵۴

(۳) تواریخ عجیبہ میں ہے کہ گھوڑے سے جدا ہونے سے پہلے آپ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا (ص:۱۳۹) یہ صحیح نہیں۔ مولانا یا سید صاحب بالاکوٹ میں گھوڑے پر سوار ہی نہیں ہوئے تھے، اسی طرح میرزا حیرت کا یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ شاہ اسماعیل نے نشیب میں سے ہو کر سکھوں کے عقب میں حملہ کیا اور چار توپیں لے لیں، پھر معلوم ہوا کہ سید صاحب خطرے میں ہیں اور انہیں بچاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ نہ توپیں لینے کا کوئی قصہ پیش آیا، نہ اس میدان میں سکھوں کے پاس توپیں تھیں، نہ مولانا نے عقب میں حملہ کیا، نہ ایسے حملے کی گنجائش تھی اور نہ وہ سید صاحب کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے۔

ارباب بہرام خاں

ارباب بہرام خاں کے متعلق صرف اتنا ذکر ہے کہ سید صاحب مسجد زیریں سے حملے کے لیے نکلے تھے تو ارباب سپر بن کر آگے آگے جا رہے تھے۔ "منظورہ" میں ہے کہ شالی کے کھیتوں کے کنارے سید صاحب بیٹھ گئے تو ارباب ان کے پاس دائیں جانب تھے۔ پھر معلوم نہیں وہ کہاں کہاں لڑے اور کس جگہ شہید ہوئے۔ ان کی قبر شاہ اسماعیل کی قبر کے پاس ہی تھی، اغلب ہے وہ بھی مولانا کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہٹتے ست بے کے مشرق میں پہنچ گئے ہوں اور وہیں شہید ہوئے ہوں۔ ارباب اور مولانا کی لاشیں خضر خاں قندھاری اور اللہ دین پکھلی والے نے پہچانی تھیں، جنہیں جنگ سے دوسرے دن تحقیقِ احوال کی غرض سے بالاکوٹ بھیجا گیا تھا۔ (۱) ارباب کی لاش چھ ماہ بعد اس قبر سے نکال کر تہکال لے گئے، جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

علاؤ الدین، محمدی اور بلند بخت

مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں اور منشی محمدی انصاری پاس پاس کھڑے لڑ رہے تھے، اچانک قاضی علاؤ الدین بگھروی لڑائی سے دست کش ہو کر حضرت کا پوچھتے ہوئے آئے۔ منشی انصاری نے بھی لڑنا چھوڑ دیا اور حضرت کی تلاش میں بائیں جانب چلے گئے۔ اسی حالت میں یہ دونوں بزرگ گولیاں کھا کر شہید ہو گئے، میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو کوئی آٹھ قدم کے فاصلے پر ابراہیم خاں تھے، میں ان کی طرف جانے لگا تو دائیں جانب سے شیخ بلند بخت آتے ہوئے ملے، مجھ سے پوچھا: کہاں جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا: "ابراہیم خاں کے پاس" وہ چپ چاپ بائیں طرف چلے گئے اور وہیں گولی کھا کر شہادت سے سرفرازی پائی۔

---

(۱) وقائع جلد سوم ص ۲۷۵

نور احمد نگرامی

نور احمد نگرامی غازیوں میں ''مؤرخ اسلام'' کے لقب سے مشہور تھے، انہوں نے ''نور احمدی'' کے نام سے سید صاحب کے حالات میں ایک ایسی کتاب مرتب کی تھی، جس کی ہر روایت کی تصدیق خود سید صاحب سے کرائی تھی۔ محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ شالی کے کھیتوں سے آگے بڑھ کر میں ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا بندوق چلا رہا تھا، مجھ سے تھوڑے فاصلے پر نور احمد تھے، ایک گولی ان کے بازو پر لگی تو بولے: بھائی میں معذور ہوگیا، میری چیزوں میں سے جو درکار ہو لے لو۔ میں نے گولیاں لے لیں اور وہ پیچھے کو چلے، پھر ان کے ایک اور گولی لگی اور وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اسی جگہ شہید ہوئے یا اور جگہ۔ (۱)

حفیظ اللہ دیوبندی

حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس نالے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں ان کی بائیں آنکھ کے نیچے تیر لگا اور اس کا پیکان پار ہوگیا، میاں جی چشتی نے انہیں پن چکیوں کے پاس سایہ دار درختوں میں بھیج دیا۔ راستے میں انھیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند اور غازی مل گئے، وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ حضرت امیر المومنین جہاں تھے، وہیں ہیں، لہٰذا ادھر چلنا چاہئے۔ حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ دوسرے غازیوں نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ آپ زخم کی وجہ سے معذور ہیں، پھر وہ پن چکیوں کے پاس پہنچے اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھے رہے۔ بعد میں سید صاحب کا پٹ وری فیل بان ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا۔ (۲)

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۱۹۳

(۲) وقائع جلد سوم ص: ۲۱۰، ۲۱۱

الٰہی بخش رام پوری

الٰہی بخش رام پوری سید صاحب کے ساتھ مسجد زیریں سے نکلے تھے لیکن برابر نہ دوڑ سکے اور پیچھے رہ گئے۔ تیس پینتیس سکھ ننگی تلواریں لے کر ان کی طرف بڑھے ان کی بندوق میں دو گولیاں اور قرابین کی بیس گرابیں تھیں۔ فوراً آتش باری شروع کر دی اور سکھ پراگندہ ہو کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ پھر ایک سفید ریش سکھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار آیا، اس پر بھی کئی مرتبہ آگ برسائی، لیکن وہ بچ کر پہاڑ کی آڑ میں چلا گیا۔ یہ شیخ ولی محمد سے بات کرنے لگے، اس اثناء میں ایک گولی دائیں بازو پر لگی۔ شیخ نے اپنی پگڑی پھاڑ کر ان کا بازو گلے سے باندھا اور پیچھے بھیج دیا۔

امام الدین بڑھانوی

امام الدین بڑھانوی ساٹھ ستر غازیوں کے اس جیش میں تھے جو سید صاحب سے پہلے میدان میں بھیجا گیا تھا، یہ سولہ سترہ برس کے نوجوان تھے، ایک قوی ہیکل اور دراز ریش سکھ تلوار لے کر ان کی طرف بڑھا تو خالی بندوق سکھ کی جانب کر دی۔ پیچھے سے ایک سفید پوش عمامہ باندھے آیا، خدا جانے اس نے سکھ کے کیا مارا کہ وہ پیچھے کی طرف پلٹا اور ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ امام الدین نے لپک کر تلوار ماری۔ سکھ کا گلا نہ کٹ سکا۔ پھر ایک اور غازی نے پتھر سے اس کا کام تمام کیا، جب غازی ست بنے کے نالے کی طرف جانے لگے تو امام الدین بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

محمود خاں لکھنوی

محمود خاں لکھنوی نے مسجد بالا میں سید صاحب سے التجا کی تھی کہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ سید صاحب نے ہاتھ بھی پھیرا تھا اور دعا بھی کی تھی۔ لعل محمد جگدیش

پوری کا بیان ہے کہ جب سکھ منہزم ہو کر پہاڑ پر چڑھے اور غازی تعاقب میں گئے تو محمود خاں نے اپنی تلوار دانتوں میں دبا کر رکھی تھی اور ایک سکھ کی ٹانگیں پکڑے دونوں ہاتھوں سے اسے نیچے کھینچ رہے تھے۔ ایک اور سکھ اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے اوپر کھینچ رہا تھا، آخر محمود خاں نے ایسا زور مارا کہ سکھ کو نیچے کھینچ لائے، دونوں لوٹتے پوٹتے نالے میں گرے اور دونوں ختم ہو گئے۔

کریم اللہ خاں میواتی

کریم اللہ خاں میواتی کی دائیں ہتھیلی پر گولی لگی تھی، ایک گولی سے ان کی تلوار کا کندا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک زرہ پوش سکھ نے ان پر تلوار کا وار کرنا چاہا لیکن گولی کھا کر زمین پر گر گیا۔ کریم اللہ خاں نے بڑھ کر تلوار ماری جو زرہ سے ٹکرا کر ٹیڑھی ہو گئی۔ غازی کا ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، جوتی کے نیچے تلوار کا سرا دبا کر سیدھا کیا، دو اور سکھ ان کی طرف بڑھے تو کریم اللہ خاں نے بندوق اٹھالی۔ وہ دور ہی رک گئے، دوسرے غازیوں کے ساتھ یہ بھی میدان سے باہر نکل گئے۔

مہربان خاں

میاں نجم الدین شکار پوری میدانِ جنگ سے باہر نکل رہے تھے تو دیکھا کہ بانگرمئو کے غازی مہربان خاں چت پڑے ہیں۔ میاں نجم الدین سے فرمایا: مجھے پانی پلاؤ۔ انہوں نے جواب دیا کہ پانی کہاں سے لاؤں، چلیں تو میں آپ کو آہستہ آہستہ سہارا دے کر لے چلتا ہوں۔ بولے: مجھے یہی جگہ پسند ہے، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ پھر فرمایا: اگر پانی نہیں لا سکتے تو میری گردن میں روپوں کی حمائل ہے، اسے کھول کر لے جاؤ۔ میاں صاحب نے سوچا کہ شاید اس میں دیر ہو جائے، مہربان خاں کہنے لگے: خیر، یہاں سے جلد نکل جاؤ۔ یہ پیر خاں سورائیں کی جماعت میں تھے، چالیس برس کی عمر ہو گی، تکیہ

شریف میں سید صاحب سے وابستہ ہوئے تھے، گویا جہاد میں برابر ساتھ رہے۔

جماعت خاص

حافظ وجیہ الدین نے سید صاحب کے پاس جو لاشیں دیکھی تھی، ان میں سے شیخ عبد الرؤف پھلتی اور شاہ محمد کی لاشیں پہچانی تھیں۔ سلو خاں دیوبندی دوسرے قرابین دار اور میانجی چشتی بھی وہیں تھے، وہ اسی جگہ شہید ہوئے ہوں گے۔ داد ابوالحسن نصیر آبادی جماعت خاص کے نشان بردار تھے، وہ مسجد زیریں سے مٹی کوٹ جاتے ہوئے یا وہاں پہنچ کر شہید ہوئے۔ اکثر اصحاب پھلت جماعت خاص میں تھے، انہوں نے بھی سید صاحب کے ساتھ شہادت پائی۔ نور بخش جراح بھی وہیں جاں بحق ہوئے۔ خود حافظ وجیہ الدین صاحب نالے سے آگے بڑھے تھے، تین سکھوں نے ان پر حملہ کیا، حافظ صاحب نے بندوق اٹھائی تو وہ رک گئے۔ ایک سکھ نے نیزہ تانا، حافظ صاحب نے تلوار سنبھالی، پھر ان کے بائیں پہلو پر گولی لگی تو معذوری کی حالت میں میدان سے باہر نکل گئے۔

ایک پانی پتی نوجوان

میاں نجم الدین کا بیان ہے کہ جب حضرت امیر المومنین نے سکھوں پر یورش کی تو میدانِ جنگ میں دور سے میں نے پانی پت کے ایک نوجوان غازی کو دیکھا، جس کا نام یاد نہیں رہا۔ وہ ننگی تلوار لئے کھڑا تھا، ایک طویل القامت سکھ افسر تلوار لے کر اس کے مقابلے پر آیا اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے پر تلواریں چلاتے تھے لیکن چونکہ باہم لپٹے ہوئے تھے، اس لئے کسی پر کاری ضرب نہیں پڑتی تھی، معمولی زخموں سے خون بہتے بہتے دونوں کمزور ہو کر گر پڑے، ایک اور سکھ نے آگے بڑھ کر غازی کا سر قلم کر ڈالا۔

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگِ مایار میں بیکار ہو چکا تھا، وہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ تلوار سے بھی حسبِ دلخواہ کام نہیں لے سکتے تھے۔ جنگ بالاکوٹ میں انہیں گنڈاسا دے دیا گیا، یورش کے آغاز ہی میں ان کے دائیں ہاتھ پر گولی لگی اور وہ بھی بیکار ہو گیا۔ اس وجہ سے وہ یہ کہتے ہوئے قصبے کی جانب لوٹ پڑے کہ میں تو اب دعا کے قابل رہ گیا ہوں۔

آہستہ آہستہ قصبے میں پہنچے تو زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی، جب سکھ جنوبی سمت سے بالاکوٹ میں داخل ہوئے تو شیخ غریب اللہ گورکھپوری نے انہیں ساتھ لے جانا چاہا، انہیں ہوش نہ آیا۔ اٹھا کر لے جانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ شیخ غریب اللہ ست بنے کے نالے سے ہو کر باہر نکل گئے، شیخ محمد اسحاق وہیں بے ہوش پڑے رہے اور اسی حالت میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

کریم بخش کا بیان

کریم بخش کہتے ہیں کہ یورش کے بعد جب غازی کھیتوں میں بکھر کر جنگ کر رہے تھے تو میں نے مندرجہ ذیل اصحاب کو زخمی یا شہید دیکھا:

۱۔ مولوی محمد قاسم کے چھوٹے بھائی محمد حسن زخمی ہو کر قبلہ رو بیٹھے تھے۔

۲۔ غازی الدین، جن کا وطن معلوم نہ ہو سکا، شہید پڑے تھے، ان کے پاس ایک سکھ کی لاش تھی۔

۳۔ عبدالقادر غازی پوری کے سر میں گولی لگی تھی، منہ اور ناک سے خون جاری تھا۔

خود کریم بخش، اللہ بخش باغپتی اور رسول خاں جلالہ والے سید صاحب کے پاس نالے میں پہنچنا چاہتے تھے، کریم بخش کی ران میں گولی لگی اور وہ آگے بڑھنے سے معذور ہو گئے۔ اللہ بخش نے ہجوم میں گھس کر شہادت پائی، رسول خاں بالکل سلامت رہے۔

متفرق اصحاب

میاں **لکھمیر** کے ساتھ مٹی کوٹ کے دامن میں آٹھ آدمی تھے، جن میں سے صرف ابراہیم خاں خیر آبادی اور عبداللہ نومسلم دہلوی کے نام یاد رہے، ان میں سے چھ نالے میں ہو کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے اور غالباً یہ سب شہید ہو گئے۔ ناصر خان بھٹ گرامی کا ہاتھ زخمی ہو گیا، ساتھیوں نے انہیں میدان سے باہر لے جانا چاہا تو انکار کر دیا۔ اس اثناء میں دوسرے ہاتھ پر بھی گولی لگی اور وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔

میرزا احمد بیگ پنجابی نے جب سنا کہ سید صاحب کا کچھ پتا نہیں ملتا تو وہ سر پیٹتے ہوئے دیوانہ وار میدان میں پھرنے لگے، ہر ایک سے پوچھتے: حضرت کہاں ہیں؟ اسی حالت میں شہید ہو گئے۔ حسن خاں بنارسی بھی زخموں سے چور ہو کر قصبے میں پہنچ گئے تھے اور زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی، ایک سکھ نے ان کا تفنگچہ اتارنا چاہا، اچانک انہیں ہوش آ گیا، تلوار اٹھا کر لیٹے لیٹے سکھ کو قتل کر دیا، پھر دوسرے سکھ نے آگے بڑھ کر انہیں شہید کیا۔ شیخ وزیر پھلتی کے دائیں ہاتھ میں گولی لگی، جس کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے۔

غازیوں کا نقصانِ جان

جنگ بالاکوٹ میں غازیوں کے نقصانِ جان کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ہچٹ اور میسن کی کتاب میں ہے کہ ہندوستانی غازیوں کے مختصر سے گروہ نے تین مرتبہ سکھ رجمنٹوں کو پیچھے ہٹایا۔ آخر کار محض دشمن کی کثرت تعداد کے باعث شکست کھائی اور تباہ ہوئے، صرف تین سو زندہ بچے۔ (۱)

۲۔ بیلیو کا بیان ہے کہ سید صاحب اور مولانا شاہ اسمٰعیل کے علاوہ تیرہ سو ہندوستانی شہید ہوئے۔ (۲)

---

(۱) ہچٹ اینڈ میسن ص: ۸۲

(۲) اے رپورٹ آن یوسف زئی ص: ۹۳ (A REPORT ON YUSAF ZAI)

ان میں سے بیلیو کا بیان یقینی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ تیرہ سو ہندوستانی تو بالا کوٹ میں موجود بھی نہیں تھے، پھر ان کی شہادت کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے؟ اول الذکر بیان میں شہداء کی تعداد نہیں بتائی گئی لیکن یہ معلوم ہے کہ جنگ بالا کوٹ کے بعد تمام غازی جمع ہوئے تو ان کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی۔ غازیوں میں سے خدا بخش، الٰہی بخش، شیر محمد خاں، شیخ محب اللہ، محمد امیر خاں، نجم الدین شکار پوری اور سید جعفر علی نقوی وغیرہم کا بیان ہے کہ بالا کوٹ کے شہدا تین سو سے زیادہ نہ تھے، ان میں سے جن کے نام معلوم ہو سکے یا محض شہادت کا علم ہو سکا، ان کی فہرست میں نے اس باب کے ساتھ بطور ضمیمہ لگا دی ہے، سکھ مقتولین کی تعداد سات سو بتائی گئی ہے۔

غازیوں کی تدفین

سکھ تیسرے دن بالا کوٹ سے چلے گئے تو اہل قصبہ آبادی میں واپس آئے، اس وقت تک میدانِ جنگ ہی نہیں بلکہ بالا کوٹ کا شمالی و شمال مشرقی میدان بھی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔ ''منظورہ'' کا بیان ہے کہ اہل قصبہ نے غازیوں کی لاشوں کو اٹھا کر مٹی کوٹ کے نالے میں جمع کیا، ابھی ان پر مٹی نہیں ڈالنے پائے تھے کہ زور کی بارش آ گئی، کھیتوں کی مٹی بہہ کر نالے میں بھر گئی۔ نالے کے کنارے بھی دونوں طرف سے بیٹھ گئے اس طرح لاشوں کے لئے قدرتی تدفین کا سامان ہو گیا۔ مولانا شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کو الگ دفن کیا گیا، میرے نزدیک یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے، اور سید جعفر علی نقوی نے جو کچھ لکھا ہے، محض شنید کی بنا پر لکھا ہے۔ وجوہ سن لیجئے:

۱۔ مٹی کوٹ کے دامن میں نالے کے دونوں کناروں پر شہدا کے دو قبرستان اب تک موجود ہیں۔ ایک نالے کے مغربی کنارے پر مٹی کوٹ کی سمت میں، دوسرا نالے سے ذرا ہٹ کر اس کی شمالی سمت میں۔ ان قبرستانوں کی حالت یقیناً اچھی نہیں، لیکن ان کے محفوظ رہنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لاشیں نالے میں نہیں ڈالی گئی تھیں بلکہ اس کے

کناروں پر دفن کی گئی تھیں۔

۲۔ جس جگہ لاشیں زیادہ تھیں، وہ اس حصے میں ہوگی جہاں سے نالہ پہاڑ پر سے اتر کر نیچے آیا ہے۔ اگر بارش زور کی ہوئی اور نالے میں بکثرت پانی آیا تو لاشوں کا اس جگہ پڑے رہنا یا ان پر مٹی پڑ جانا ممکن نہ تھا، بلکہ وہاں سے لاشیں بہہ کر نیچے آ جاتیں، اس لیے کہ نالہ پورے کا پورا ڈھالواں ہے۔ خصوصاً پہاڑ کے دامن سے قریب تو کسی چیز کا اٹکے رہنا بظاہر مشکل تھا۔

۳۔ اگر لاشیں واقعی دب گئی تھیں تو بعد میں ان کی ہڈیاں نکل آتیں، اس لیے کہ جس مقام پر ان کے دفن ہونے کا امکان تھا، وہاں پانی زور سے گرتا اور بہتا ہے اور اب بھی نالہ خاصا گہرا ہے، لیکن اب تک ہڈیوں کے نکلنے کا کوئی بیان سامنے نہیں آیا۔

۴۔ شہدا کی اور قبریں بھی ہیں، مثلاً ایک قصبہ کے قریب ہے، کچھ قبریں پن چکیوں کے پاس بتائی جاتی ہیں، کچھ ست بنے کے نالے کے پار قصبے کے شمالی و مشرقی کھیتوں میں ہیں۔ کچھ قبریں شاید دریائے کنہار کے پار کالو خاں کے دامن میں بھی ہیں، جیسا کہ بعض مقامی لوگوں سے معلوم ہوا۔ جب ان سب کو جا بجا دفن کیا گیا تو مٹی کوٹ کے دامن سے شہیدوں کو دفن نہ کرنے کی روایت کیوں کر صحیح سمجھی جا سکتی ہے؟

۵۔ سکھوں کی لاشیں خود سکھوں نے اٹھا کر جلتے ہوئے مکانوں میں ڈال دی تھیں یا سمجھ لیجیے کہ قصبے کو آگ لگانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکھوں کی لاشیں جلائی جا سکیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ لاشیں ادھر ادھر بکھری رہ گئی ہوں اور اہل قصبہ نے انہیں نالے میں ڈال دیا ہو۔

شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کی لاشوں کو ست بنے کے پار قصبے کے شمال مشرق میں دفن کیا گیا۔ ان کی لاشیں غالباً اسی حصے میں پڑی تھیں۔

واقعہ بالاکوٹ سے چھ ماہ بعد ارباب شہید کے بھتیجے اور داماد محمد خاں نے اپنے ہم قوموں کو جمع کر کے کہا کہ میں ارباب کی لاش کو بالاکوٹ سے تہکال لانا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب ہڈیاں کھود کر لانے سے کیا حاصل ہوگا، لیکن محمد خاں نے کہا کہ میرے چچا نے خلوصِ نیت سے سید بادشاہ کا ساتھ دیا تھا، اپنا پورا مال و اسباب راہِ خدا میں لٹا دیا، آخر جان بھی دے دی، مجھے یقین ہے کہ ان کی لاش قبر میں سلامت ہوگی۔

چنانچہ محمد خاں نے ایک صندوق بنوایا اور چالیس آدمیوں کے ساتھ بالاکوٹ گیا، وہاں کے لوگوں نے بھی قبر کھودنے سے منع کیا لیکن محمد خاں اپنے ارادے پر قائم رہا، لاش نکالی گئی تو بالکل تر و تازہ تھی، نہ جسم کا کوئی حصہ بگڑا تھا، نہ اس میں بدبو پیدا ہوئی تھی، صرف پاؤں کے ناخنوں میں خفیف سا تغیر نظر آتا تھا۔

غرض لاش کو صندوق میں رکھ کر تہکال لائے، قوم نے پورے احترام کے ساتھ اسے دفن کیا، یہ قبر آج بھی دعاگاہِ خاص و عام ہے۔ تہکال کا بچہ بچہ ارباب شہید اور ان کی قبر سے واقف ہے۔

ان دونوں قبروں کے گرد پہلے خستہ سی چار دیواری تھی۔ چند برس ہوئے مولانا اسلم جیراج پوری اور چودھری غلام احمد پرویز نے شاہ اسماعیل کی قبر کے ارد گرد نئی چار دیواری بنوا دی۔ ۱۹۵۱ء میں بالاکوٹ گیا تو دیکھا کہ یہ چار دیواری بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ (۱)

بیش بہا چیزیں

غازیوں کا بیشتر سامان اور توشہ خانہ ہدفِ غارت بنے لیکن یہ چیزیں بہر حال سیکڑوں نہیں ہزاروں کی ہوں گی۔ بعض نہایت بیش بہا چیزیں بھی تباہ ہوئیں جو لاکھوں روپے دے کر بھی نہیں مل سکتیں اور نہ دنیا میں ان کا کوئی بدل موجود ہے۔ مثلاً:

---

(۱) تواریخ عجیبہ میں ہے کہ لوگ اس قبر پر نسوار چڑھاتے ہیں، میں آٹھ دس برس میں کئی مرتبہ بالاکوٹ جا چکا ہوں لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے شاہ صاحب کی قبر پر نسوار یا اور کوئی چیز چڑھائی یا باندھی ہو۔

۱۔ سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی بہت سی تحریرات۔

۲۔ مختلف مکاتیب کے اصل مسودے اور ان کے جواب میں وقت کے اکثر سلاطین و روٗسا اور خوانین و علماء کے خطوط۔

۳۔ سید صاحب کا روزنامچہ، منشی محمدی انصاری میر منشی حضور کا طریقہ تھا کہ ہر مہینے کے آغاز میں سادہ کاغذوں پر جدولیں تیار کرا لیتے تھے، ان میں مختلف خانے ہوتے تھے، جن میں مختلف چیزیں تفصیل کے ساتھ روز بہ روز درج ہوتی تھیں، ایک بڑے خانے میں روز مرہ کے کام کاج اور واقعاتِ جنگ بہ تعین تاریخ لکھتے تھے، اسی روزنامچے کی بنا پر وقتاً فوقتاً مختلف حصوں میں خطوط بھیجے جاتے تھے۔

۴۔ ہر مہینے کے ضروری کاغذات بستوں میں باندھ کر ایک بڑے صندوق میں رکھے جاتے تھے، یہ صندوق بھی بالاکوٹ میں بستوں سمیت برباد ہو گیا۔

۵۔ مولوی سید نور احمد نگرامی کی تاریخ ''نور احمدی'' جس میں سید صاحب کے مفصل حالات درج تھے۔

۶۔ بعض رسائل اور مولانا اسماعیل کے بعض خطبات جو جمعہ یا عیدین کی نمازوں میں دیے گئے۔

سید جعفر علی نقوی کے قلمدان میں مولانا اسماعیل کے بعض مہری اور دستخطی خطوط محفوظ رہ گئے تھے، سید موصوف بالاکوٹ کے بعد وطن لوٹے تو ان خطوط و تحریرات کو شیخ ولی محمد کی اجازت سے بہ طور تبرک ساتھ لے آئے۔ تھانہ پہنچنے سے پہلے پہلے راستہ میں قلمدان کسی نے چرا لیا، ہر چند اسے تلاش کیا، یہ اعلان بھی کرا دیا کہ کاغذات واپس کر دیے جائیں، باقی جتنی چیزیں ہیں وہ سب بہ صدق دل چھوڑتا ہوں اور چرانے والے سے کوئی پرسش نہ ہو گی، لیکن کاغذات نہ ملے۔

ضمیمہ

شہدا کی فہرست

خیزند چوں ز خاک شہیدانِ ما بہ حشر
در محشر آوریم بدوعالم سپاہ را

(۱) امیر المومنین سید احمد بریلوی (۲) مولانا شاہ اسماعیل دہلوی (۳) میرزا محمدی بیگ (۴) عبید اللہ نومسلم (۵) عبداللہ دہلوی خادم خاص امیر المومنین (۶) دادا ابوالحسن نصیر آبادی (۷) سید امیر علی جائسی (۸) شیخ عبدالرؤف پھلتی (۹) شیخ ضیاء الدین پھلتی (۱۰) حکیم قمرالدین پھلتی (۱۱) شیخ بہادر علی پھلتی (۱۲) شیخ حماد پھلتی (۱۳) شیخ توکل پھلتی (۱۴) نبی حسین عظیم آبادی (۱۵) راحت حسین عظیم آبادی (۱۶) اللہ بخش عظیم آبادی (۱۷) الہ داد عظیم آبادی (۱۸) محمد معصوم عظیم آبادی (۱۹) اشرف خاں گورکھپوری (۲۰) حاجی برکات عظیم آبادی (۲۱) علیم الدین بنگالی (۲۲) فیض الدین بنگالی (۲۳) لطف اللہ بنگالی (۲۴) منشی محمدی انصاری میر منشی حضور (۲۵) شرف الدین بنگالی۔

(۲۶) سید مظفر حسین بنگالی (۲۷) منور خیاط لکھنوی (۲۸) کریم بخش خیاط لکھنوی (۲۹) مرزا مرتضی بیگ لکھنوی (۳۰) نور علی لکھنوی (۳۱) حافظ عبدالوہاب لکھنوی قاسم علہ (۳۲) خدا بخش لکھنوی (۳۳) محمود خاں لکھنوی (۳۴) شیخ امجد علی غازی پوری فرزند شیخ فرزند علی رئیس غازی پور (۳۵) شیخ محمد علی غازی پوری (۳۶) شیخ اصغر علی غازی پوری (۳۷) شیخ درگاہی غازی پوری (۳۸) خدا بخش فرزند شیخ درگاہی (۳۹) عبدالقادر غازی

پوری (۴۰) عبدالمنان بنارسی (۴۱) حسن خاں بنارسی (۴۲) میانجی چشتی بڑھانوی (۴۳) حیات خاں خیرآبادی (۴۴) نور بخش جراح شاملی والے (۴۵) شیخ شجاعت علی فیض آبادی (۴۶) حافظ امیر الدین گڑھ مکتیشری (۴۷) بخش اللہ خان پوری (۴۸) امام الدین بمبئی (۴۹) مولوی سید نور احمد نگرامی مؤرخ اسلام (۵۰) چاند خاں ناگوری۔

(۵۱) نور محمد ناگوری (۵۲) میانجی عبدالکریم امیٹھوی (۵۳) عبدالجبار خاں شاہجہان پوری (۵۴) عبدالقادر جھنجھانوی (۵۵) حافظ مصطفیٰ جھنجھانوی (۵۶) حسن خاں ساکن زمانیہ (۵۷) مولوی احمد اللہ ناگپوری برادر عم زاد مولانا عبدالحئی (۵۸) عبد الرحمٰن ناگپوری (۵۹) نواب خاں گنتوی (۶۰) قلندر خاں قندھاری (۶۱) بادل خاں بانس بریلوی (۶۲) محمد حسن پانی پتی (۶۳) غلام محمد والد محمد حسن (۶۴) میرزا حسین بیگ بانس بریلوی (۶۵) شیخ نصرت بانس بریلوی (۶۶) میر امانت علی ساڈھورہ (۶۷) کریم بخش ساڈھورہ (۶۸) شیخ امیر اللہ تھانوی (۶۹) حافظ محمد صابر تھانوی (۷۰) شیخ کریم بخش سہارنپوری (۷۱) رحیم اللہ سہارن پوری (۷۲) قرجام (خادم خاص امیر المومنین) سہارن پوری (۷۳) علی خاں سہارن پوری (۷۴) منشی خواجہ محمد، حسن پوری (۷۵) قاضی احمد اللہ میرٹھی۔

(۷۶) شیخ بلند بخت دیوبندی (۷۷) عبدالعزیز دیوبندی (۷۸) سلو خاں دیوبندی (۷۹) داؤد خاں خورجوی (۸۰) ولی داد خاں خورجوی (۸۱) مراد خاں خورجوی (۸۲) شیخ نصر اللہ خورجوی (۸۳) مولا بخش میواتی ساکن نوح (ضلع گوڑگانواں) (۸۴) وزیر خاں میواتی (۸۵) قادر بخش کنج پوری (۸۶) نجھے خاں ساکن ہزارہ (۸۷) سید چراغ علی ساکن پٹیالہ (۸۸) عظیم اللہ خاں ساکن اکوڑہ (۸۹) ارباب بہرام خاں ساکن تہکال (۹۰) شیخ محمد رضا ساکن ضلع میرٹھ (۹۱) قادر بخش ساکن لوہاری (۹۲) حافظ الٰہی بخش کیرانوی (۹۳) مرانداز خاں ساکن پھلت (۹۴) شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

(۹۵) دلاور خاں گورکھپوری (۹۶) عبد السبحان خاں گورکھپوری (۹۷) منصور خاں گورکھپوری (۹۸) عبد اللہ خاں گورکھپوری (۹۹) مشرف خاں گورکھپوری (۱۰۰) روشن سقا ساکن کوٹل۔

(۱۰۱) سخاوت رام پوری (۱۰۲) خیر اللہ ساکن امروہہ (۱۰۳) خیر اللہ کے والد (جن کا نام معلوم نہ ہوسکا) (۱۰۴) میرزا جان چشتی (۱۰۵) میرزا جان کا بیٹا (نام معلوم نہ ہوسکا) (۱۰۶) حافظ عبد القادر ساکن میاں دوآب (۱۰۷) اللہ بخش انبالوی (۱۰۸) بخش اللہ بہادر گڑھی (۱۰۹) لعل محمد مہاجر (پڑان غار) (۱۱۰) شیخ امام علی، محی الدین پوری (الہ آباد) (۱۱۱) اللہ بخش بانچتی (۱۱۲) قاضی علاؤ الدین بگھرہ (۱۱۳) سید امیر الدین بگھرہ (۱۱۴) رحیم بخش الہ آبادی (۱۱۵) بھیکن (شاہ پوری) (۱۱۶) شمس الدین ہریانوی (۱۱۷) سید مردان علی میراں پوری (۱۱۸) محمد عرب (۱۱۹) فیض اللہ شیدی (۱۲۰) اللہ داد (وطن معلوم نہ ہوسکا) (۱۲۱) قادر بخش (وطن معلوم نہ ہوسکا) (۱۲۲) عبد القادر وطن معلوم نہ ہوسکا (۱۲۳) راجا (یہ غالباً سید صاحب کا ہم وطن تھا) (۱۲۴) سید زین العابدین (پشاور) (۱۲۵) ایک پٹھان (نام معلوم نہ ہوسکا) (۱۲۶) ایک اس کا ہمراہی تھا، اس کا نام بھی معلوم نہ ہوسکا۔

(۱۲۷) سید امام علی الہ آبادی (۱۲۸) صندل خاں پنجابی (۱۲۹) میرزا احمد بیگ پنجابی (۱۳۰) شیر جنگ خاں خالص پوری (۱۳۱) فیض اللہ تخت ہزارہ (۱۲۳) بخش اللہ خاں بارہ بنکوی (۱۳۳) حافظ مصطفیٰ کاندھلوی (۱۳۴) غازی الدین (وطن معلوم نہ ہوسکا) (۱۳۵) پانی پتی نوجوان (نام معلوم نہ ہوسکا) (۱۳۶) مہربان خاں (بانگرمئو) (۱۳۷) بخش اللہ (ان کا وطن معلوم نہ ہوسکا، روایت میں ہے برادر مہر علی)۔

تینتالیسواں باب:

سید صاحب کا مدفن

تا بہ راہ طلبت بے خبراں پے نہ نہند
کعبہ وصل تو بے نام و نشاں ساختہ اند

غازیوں کا رنج و غم

غازی بالاکوٹ کے میدان سے نکل کر شمالی سمت کے پہاڑ پر پہنچے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا، وہیں ایک چشمے پر وضو کر کے نماز پڑھی۔ اس اثناء میں مظفر آباد کے چند غازی بھی پہنچ گئے، جو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر دوڑے دوڑے آئے تھے کہ جلد لڑائی میں شریک ہوں۔ شکست کا حال معلوم ہوا تو دم بخود رہ گئے۔ انہیں پتہ چلا کہ مولوی خیر الدین سخت بیمار ہیں اور انہیں چارپائی پر ڈال کر لا رہے ہیں، سید صاحب کے متعلق بعض کا خیال تھا کہ انہیں گوجر لے گئے، بعض تذبذب میں تھے۔ وقائع میں ہے:

> ہم لوگوں میں سے ہر ایک حضرت علیہ الرحمۃ کے غم فراق میں اس قدر پراگندہ خاطر اور باختہ حواس تھا کہ جیسے مجنون اور سودائی ہوتا ہے، کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔(۱)

سب بھوکے تھے، ایک گاؤں ملا، وہاں سے شیخ ولی محمد نے ایک روپے کی جوار خرید کر بھنوائی اور غازیوں میں بانٹ دی۔ بالاکوٹ سے اڑھائی کوس پر ناصر خاں کا ایک

---

(۱) جلد سوم ص: ۲۵۴، ۲۵۵

گاؤں انگرائی نام تھا، شام کے وقت وہاں پہنچے۔ کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، راستے میں جو جوار ملی تھی، وہی کھا کر پانی پی لیا۔ وہیں مظفر آباد کے اکثر غازی آ گئے، لیکن مولوی خیرالدین نہ پہنچ سکے۔

ایک غلط اطلاع

نماز عشاء کے بعد جان محمد جراح رام پوری اور عبدالرحیم جراح جانسٹھی نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی، اس وقت دو گوجروں نے خبر پہنچائی کہ سید بادشاہ تھوڑی دور پہاڑ کے ایک درے میں سلامت موجود ہیں اور ہمیں بھیجا ہے کہ غازیوں کو لے آؤ۔ ناصر خاں نے کہا کہ یہ لوگ دن بھر کے بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ہیں، اب رات کے وقت کہاں جائیں گے، صبح کو آنا، ہم سب چلیں گے۔ سید بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا ہے تو وہ کہیں چھپے نہیں رہیں گے۔

دوسرے دن صبح کو کوئی نہ آیا، غازیوں نے اس درے کو بھی دیکھا لیکن کوئی نہ ملا، یہ دراصل دھوکا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ گوجروں نے ایسی حرکت کس غرض سے کی۔

شیخ ولی محمد نے پہلے راستے ہی سے گوجروں کو تحقیق احوال کے لئے بالاکوٹ بھیجنا چاہا، لیکن اس وقت قصبے میں آگ لگی ہوئی تھی، سکھ فوج پورے میدان میں پھیلی پڑی تھی، ان حالات میں کون جا سکتا تھا اور جاتا بھی تو کیا معلوم ہوتا؟

شیخ وزیر کے صاحبزادے کا بیان

دوسرے روز شیخ وزیر کا صاحبزادہ آ گیا، تمام غازی حالات معلوم کرنے کے شوق میں اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ جنگ کے بعد مجھے سکھ اس جگہ لے گئے جہاں زیادہ تر شہید پڑے تھے اور پوچھا کہ ان میں سے خلیفہ صاحب (یعنی سید صاحب) کی لاش کون سی ہے۔ میں نے پہچان کر بتا دیا، پھر انہوں نے مجھے ایک مسلمان کے

حوالے کر دیا، اس نے میرے حالات پوچھے، پھر کہا کہ جا اپنے والد کے پاس چلا جا، میں ست بنے کے راستے چلا آیا۔

غازیوں میں سے بعض نے یہ بیان سن کر کہا کہ مجروح یا شہید کو تو ہوشیار آدمی بھی مشکل سے پہچانتا ہے، اس لڑکے نے کیا پہچانا ہوگا۔ دوسروں کو یقین تھا کہ بچے نے سید صاحب کو ضرور پہچان لیا ہوگا، اس لئے کہ آپ اسے بہت پیار کرتے تھے اور یہ اکثر آپ ہی کے پاس رہتا تھا۔

تحقیق کا نتیجہ

انگرائی سے چلتے وقت شیخ ولی محمد نے خضر خاں قندھاری اور اللہ دین پھلی والے کو بالاکوٹ بھیج دیا کہ تمام حالات کی خوب چھان بین کریں۔ وہ واپس ہوئے تو غازی شملئی پہنچ گئے تھے، جو راج دواری سے ڈیڑھ دو کوس شمال میں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بعض غازی سکھوں کے ہاتھ زندہ گرفتار ہو گئے تھے:

> شیر سنگھ نے ان گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ خلیفہ صاحب کی لاش کون سی ہے۔ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر انہوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا۔ ایک لاش بے سر کی تھی، انہوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کا سر بھی ہو تو ہم بتا دیں۔ پھر شیر سنگھ نے اس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اس لاش میں ملوایا، تب انہوں نے (گرفتار شدہ غازیوں نے) کہا ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔
>
> پھر شیر سنگھ نے ایک دوشالہ اس لاش پر ڈلوایا، دو تھان خاصے کے اور پچیس روپے نقد دیے اور کہا جس طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اس کو دفن کر دو۔ پھر ادھر اُدھر سے ملکی مسلمان بھی آ کر جمع ہوئے اور کفن دے کر اس لاش کو دفن کیا اور وہ روپے نقد خیرات کیے گئے اور جو لاشیں سکھوں کی تھیں،

ان کو بالاکوٹ کے کوٹھوں میں ڈال کر جلوا دیا اور باقی لاشیں غازیوں کی سب دہیں جہاں کی تہاں پڑی رہیں۔ (۱)

مدفن

جس قبر کو آج کل سید صاحب کی قبر قرار دیا جاتا ہے یہ بالاکوٹ کے پشتے سے نیچے جنوبی و مشرقی سمت میں دریا کے کنارے پر ہے۔ کاغان جانے والی سڑک اس کے پاس سے گزرتی ہے، پہلے یہاں صرف سید صاحب کی قبر تھی، اب کچھ اور قبریں بھی بن گئی ہیں۔ ان میں سے ایک قبر مولوی فضل الٰہی مرحوم وزیر آبادی کی ہے، جو مدت تک جماعت مجاہدین میں رہے۔ یہ قبر سید صاحب کی شہادت گاہ سے تقریباً ڈیڑھ میل پر ہوگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میت کو یہاں کیوں لائے جب کہ یہاں قبرستان بھی نہ تھا؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ کا کیمپ دریا کے کنارے اس جگہ ہوا ہوگا، جہاں آج کل تھانہ اور ڈاک بنگلہ ہیں، اسے سید صاحب کی لاش دکھانے کے لئے میدانِ جنگ سے لائے ہوں گے، پھر قریب ہی ایک موزوں مقام پر میت کو دفن کر دیا گیا۔

اختلاف

جس روایت کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اس کے آخر میں ہے کہ دوسرے روز شیر سنگھ ندی سے پار چلا گیا، اس کی فوج کا بڑا حصہ بھی رخصت ہوگیا، صرف اکالیوں یا نہنگ سکھوں کی ایک جماعت باقی رہ گئی۔ بالاکوٹ کے جو باشندے سکھوں کے خوف

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۶۴، ۲۶۵ و منظورہ ص: ۱۲۰۱۔ ایک اور بیان مظہر ہے کہ دیوان وساکھا سنگھ نے ایک عرضداشت بھیجی، جس میں سید صاحب کی وفات کی خبر تھی: "با انداختن دو شالہ بر لاش او تکفین و تدفین آں رہ گرائے عالم جاودانی بنظر مبارک گزشت۔" (یہ عرضی وساکھا سنگھ کی طرف سے رنجیت سنگھ کو پہنچی)۔

سے اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے، وہ بھی واپس آ گئے:

> جو لوگ وقت دفن کرنے اس لاش مذکورہ (سید صاحب کی لاش) کے موجود تھے، ان میں اختلاف ہونے لگا۔ اکثر تو یہ کہتے تھے کہ وہ لاش سید بادشاہ کی نہ تھی، ان کو تو گوجر لوگ لڑائی کے کھیت سے زندہ نکال لے گئے اور چند لوگ کہتے تھے کہ وہ لاش سید بادشاہ کی تھی، مگر تحقیق حال معلوم نہ ہوا کہ وہ سچے ہیں یا یہ سچے نہیں۔

اس روایت کے باب میں وثوق کے ساتھ عرض کرنا مشکل ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ وہ لاش سید صاحب کی نہ تھی، انہوں نے صرف اس بنا پر یہ دعویٰ کیا کہ سید صاحب کو میدانِ جنگ سے زندہ لے جانے کا افسانہ خاصی شہرت پا چکا تھا، حالانکہ اس کے لئے کوئی قطعی اور موثق شہادت موجود نہ تھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انہوں نے لاش دیکھ کر تحقیقاً کہا کہ یہ سید صاحب کی نہیں، بلکہ مذکورہ افسانے کے پیش نظر اسے سید صاحب کی لاش ماننے میں تکلفاً شبہ پیدا کر لیا۔

اکالیوں کی وحشت

بہرحال حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن کوئی شبہ نہیں کہ میدانِ جنگ میں دیکھ بھال کر ایک لاش کے متعلق بتایا گیا کہ یہ سید صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سر نہ تھا، سر بھی تلاش کر کے ساتھ ملایا گیا تو جاننے والوں نے اقرار کیا کہ واقعی سید صاحب کی ہے۔ اسے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا، شیر سنگھ فوج لے کر چلا گیا اور نہنگ سکھوں کی ایک جماعت پیچھے رہ گئی:

> پھر جب رات ہوئی تب ان اکالیوں نے اس لاش مذکورہ کو قبر سے نکلوا کر ندی میں ڈلوا دیا اور اپنے لشکر کو چلے گئے۔ (۱)

---

(۱) وقائع جلد سوم ص: ۲۶۸

ہزارہ گزیٹر میں بھی ہے:

> سید صاحب کی لاش دریا میں پھینک دی گئی لیکن بالاکوٹ سے نیچے کے ایک گاؤں تلہٹہ کے لوگوں نے اسے نکال کر دفن کرایا۔ (۱)

وحشت کا سبب

ہوسکتا ہے کہ نہنگوں یا اکالیوں کو سید صاحب سے خاص عناد ہو، ان کے نزدیک جذبۂ عناد کی تسکین اسی طرح ہوسکتی تھی کہ لاش قبر میں نہ رہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سید صاحب سے سخت کاوش کی ایک اور وجہ بھی اکالیوں کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ ان کا محبوب لیڈر پھولا سنگھ اکالی ۱۸۲۳ء کی جنگ نوشہرہ میں مارا گیا تھا، یہ جنگ سید صاحب کی آمد سرحد سے تین برس پہلے سردار عظیم خاں بارک زئی اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہوئی تھی، اکالیوں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ جنگ کب ہوئی اور کس کس کے درمیان ہوئی، صرف اتنا یاد رہ گیا کہ ان کا لیڈر سرحد کی جنگ میں مارا گیا تھا، بس اسی بنا پر سمجھ لیا کہ سید صاحب ہی کے آدمیوں نے اسے مارا ہوگا۔ انتقام کی خاطر وہ لشکر سے پیچھے رہ گئے اور رات کی تاریکی میں وہ حرکت کی جو اخلاق وانسانیت کے ضابطے کے مطابق ہر انسان کے نزدیک حد درجہ مکروہ تھی۔

سر اور تن کی جدائی

لاش دریا میں گرتے ہی تیرتی تیرتی تلہٹہ پہنچی جو بالاکوٹ سے تقریباً نو میل جنوب میں کنہار کے مشرقی کنارے کا ایک گاؤں ہے۔ سر اور تن پہلے ہی الگ الگ تھے، دریا میں گرے تو الگ ہی رہے۔ تلہٹہ والوں نے صبح کے وقت تن کو دیکھا تو اسے پکڑ کر پاس کے کسی کھیت میں نامعلوم مقام پر دفن کر دیا، میں جس حد تک مختلف اصحاب سے دریافت

---

(۱) ہزارہ گزیٹر طبع ۱۹۰۷ء ص: ۱۳۰

کر سکا ہوں، اس مدفن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سر بہتا بہتا گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچ گیا، جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے۔ گڑھی والوں میں ایک قصہ مشہور ہے، جسے عجائب پسندیوں کی رنگ آمیزی سے الگ کیا جائے تو اتنا رہ جاتا ہے کہ سر گڑھی کے سامنے پہنچ کر مشرقی کنارے پر اٹک گیا، ایک بڑھیا پانی بھرنے کیلئے آئی، اس نے دیکھ کر خان کو خبر پہنچائی، وہ دوڑا ہوا آیا اور سر کو دریا سے نکال کر کنارے ہی پر دفن کر دیا۔ یہ مدفن پل سے گذرتے ہی کنہار کے مشرقی کنارے پر بائیں ہاتھ ملتا ہے، پہلے اس کی قبر چھوٹی سی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ صرف سر کی قبر ہے اور اس پر سرخ رنگ کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔ گڑھی کے اکثر لوگ صبح کے وقت وہاں فاتحہ و دعا کے لئے آتے تھے، اب سیمنٹ سے پوری قبر بنا دی گئی ہے، بتایا جاتا ہے کہ یہ قطب بابا غازی کی قبر ہے۔ (۱)

موجودہ قبر

غرض بالا کوٹ میں جس قبر کو اب سید صاحب کی قبر بتایا جاتا ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یا اس کے آس پاس سید صاحب دفن ہوئے۔ ایک دن ایک رات یا دو دن دو راتیں وہاں دفن رہے، پھر آپ کی لاش اس میں سے نکال کر دریا میں پھینک دی گئی اور قبر بے نشان ہوگئی۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے جس زمانے میں اپنی کتاب "وصایا الوزیر" تصنیف فرمائی، سید صاحب کی قبر بے نشان تھی، فرماتے ہیں:

> بعد از حدوث حادثہ شہادت و وقوع واقعہ انقطاع رشتہ حیات آں سید بالطافت ازیں خاکدان پر کثافت باوصف فرط تفحص مریدین و افراط تجسس معتقدین کہ در کار تلاش مرقد مطہر و منور و نقش اطہر انور مساعی بے کراں و کوشش فراواں بہ تقدیم رسانیدند، نامے و نشانے از مطلوب و مقصود نہ یافتند۔ (۲)

---

(۱) یہ تعمیر ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔

(۲) وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر نصف اول ص: ۵۲

ترجمہ : شہادت کا حادثہ پیش آ جانے اور اس کثافت بھرے خاکدان سے اس پاک نفس سید کا رشتۂ حیات منقطع ہو جانے کے بعد مریدوں اور معتقدوں نے ہر چند قبر منور اور نعش مطہر کو تلاش کیا، لیکن اس کا نشان بھی نہ پا سکے۔

شاہ اسماعیل کی قبر بھی غالباً بے نشان ہو چکی تھی۔

۱۸۹۳ء میں خان عجب خاں برادر زادہ خان ارسلان خاں (زیدہ) مانسہرہ میں نائب تحصیل دار مقرر ہو کر گئے تو انہوں نے سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں کی قبروں کا سراغ لگانا چاہا، وہ اس خاندان کے فرد تھے جو سید صاحب کی عقیدت میں برابر ثابت قدم رہا تھا۔ سن رسیدہ اور واقف کار آدمیوں کو جمع کر کے پوری چھان بین کرائی، پھر کم و بیش باسٹھ برس کے بعد ان قبروں کے نشان قائم کیے۔ عجب خاں کے زمانے کے کندہ کرائے ہوئے پتھر میں نے دونوں قبروں پر دیکھے تھے، سید صاحب کی قبر کے اردگرد چار دیواری بھی غالباً عجب خاں ہی نے بنوائی تھی، وہ بہت خستہ ہو گئی تھی، پاکستان بننے کے بعد چار دیواری اور قبر پر سیمنٹ کا پلستر ہو گیا اور ایک دروازہ لگ گیا۔ پشاور کے ایک صاحب نے سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح لگا دی۔

غرض موجودہ قبر باسٹھ برس تک بے نشان رہنے کے بعد بنی اور یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک اسی جگہ بنی جہاں پہلی قبر تھی۔ اگر یہ اسی جگہ بنی تو اسے اس قبر کا مقام سمجھنا چاہئے، جہاں سید صاحب کی لاش ایک یا دو راتیں دفن رہی، بعد میں آپ کا تن تلہٹہ میں غیر معلوم مقام پر دفن ہوا۔ سر گڑھی حبیب اللہ خاں کے پل کے پاس ہے۔

سید صاحب کی پیشگوئیاں

''وصایا'' میں ہے: ایک شخص نے حضرت سید صاحب سے عرض کیا کہ لوگوں کو آپ گور پرستی کی بدعت سے بہت منع کرتے ہیں، آپ کے مرید بھی تو بے شمار ہیں، جو ملک ملک

میں پھیلے ہوئے ہیں، کیا یہ اندیشہ نہیں کہ آپ کی وفات کے بعد وہ قبر پر جمع ہو ہو کر اس بدعت کو رواج دیں گے؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ میں کارسازِ حقیقی جل شانہٗ کی بارگاہ میں التجا کروں گا کہ میری قبر کو معدوم اور میرے مدفن کو بے نشان بنا دیا جائے۔ (۱)

وقائع میں ہے کہ مولوی محمد یوسف پھلتی، میانجی محی الدین، میانجی نظام الدین چشتی اور مولوی امام الدین بنگالی نے کئی مرتبہ بے تکلف عرض کیا کہ ہندوستان میں لوگ ادنیٰ ادنیٰ پیروں کی قبریں پوجتے ہیں آپ تو پیروں کے پیر ہیں، لہٰذا آپ کے مزار کی تو خوب پوجا ہوگی اور اس پر چڑھاوے چڑھائے جائیں گے۔

سید صاحب نے فرمایا: بے فکر رہو، مجھے جنابِ الٰہی سے کئی مرتبہ اشارہ ہوا ہے کہ کوئی شخص تجھ پر جادو کرے یا زہر دے، ان صدموں سے تو نہیں مرے گا، اور جب تیری موت کا وقت آئے گا، کوئی تیری لاش نہ پائے گا۔ جب لاش نہیں ملے گی تو قبر کیوں کر بنے گی اور اس کی پوجا کس طرح کی جائے گی؟

کچھ معلوم نہیں کہ سید صاحب کے اصل الفاظ کیا تھے لیکن جس حد تک ان کے مفہوم کا تعلق ہے، اس کے درست ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟ لاش یقیناً ملی لیکن اس کا معاملہ آخری وقت تک مشتبہ رہا، یعنی یہ کہ آیا یہ سید صاحب کی تھی یا نہیں؟ پھر جہاں اسے دفن کیا گیا وہاں سے اکالیوں نے نکال کر دریا میں پھینکا، سر کہیں چلا گیا، دھڑ کہیں اور قبر بے نشان ہوگئی۔ جو نشان اب موجود ہے، اس کی پوجا نہیں ہوتی، سید صاحب کو زہر دیا گیا، لیکن خدا نے انہیں بچا لیا، جادو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

سید صاحب کی تصویر

دیوان امرناتھ نے ظفر نامہ میں لکھا ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی، اس ذکر میں بعض الفاظ غیر شایاں استعمال ہوئے ہیں لیکن میرے لئے اس

---

(۱) وصایا ص: ۵۲

کے سوا چارہ نہیں کہ ان الفاظ پر صبر کرتے ہوئے اصل عبارت نقل کر دوں۔ عبارت یہ ہے:

> شہزادہ شیر سنگھ خود بہ نفس نفیس متوجہ نعش خلیفہ گشتہ، مصور سحر کارے برگماشت تا از سکنات و حرکاتش آں کما کان برنگارد و خود بعد از نظم و نسق آں سوادر روانہ حضور اقدس شدہ سعادت ملازمت والد دریافتند۔ سرکار والا نہایت خوشنود شدہ بہ جیغہ و خلعت سرفرازی دادہ بہ انعامات فراواں و اشفاق نمایاں نواختند و از تصویر خلیفہ استشمام رائحہ جوانمردی نمودہ بہ لفظ آفریں منصفانہ تعریف فرمودند۔ چوں آں تصویر از نظر راقم گزشت، بوالعجب شکلے رخ نمود کہ بایں درویش صورتی خواہان دولت سلطانی گشتن، ہمانا کہ خالی از تکلیف نفس شریر نخواہد بود، و اگر بتاین مذہب بریں آورد از صفوت و صفا خبرے نہ داشت۔ (۱)

> **ترجمہ**: شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا اور ایک سحر کار مصور کو مقرر کیا تا کہ ان کی تصویر ہو بہو کھینچے۔ جب اس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا، رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا، شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب کی تصویر سے جوانمردی کی بو سونگھ کر کہا ''آفریں'' اور منصفانہ تعریف کی، میں نے بھی وہ تصویر دیکھی لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔

اگر یہ بیان درست ہے تو کچھ معلوم نہیں وہ تصویر کیا ہوئی اور کہاں گئی؟ ممکن ہے پرانے ریکارڈوں میں اس کا سراغ مل جائے۔

---

(۱) ظفر نامہ ص ۱۹۴، ۱۹۵

چوالیسواں باب:

عقیدۂ غیبوبت

شہادت کے متعلق اشتباہ

سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے ان کی غیبوبت کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث و نظر کے محتاج نہیں ہوتے، ان کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے جب تک اسے بہ اعتبار وقوع، مروجہ اسلوب و ہنجار سے صریح منحرف نہ پائیں۔ لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفا نے بھی اسے قبول کیا، نہ محض قبول کیا بلکہ اسے مدت تک دعوت اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہادت کے سلسلے میں پہلے دن سے اشتباہ کے بعض وجوہ موجود تھے، مثلاً کسی معتبر آدمی نے سید صاحب کو بہ حالت شہادت نہیں دیکھا۔ (1) پھر میدان بالاکوٹ میں یہ افواہ مشہور ہو گئی تھی کہ سید صاحب زخمی ہوئے اور گوجر انہیں اٹھا کر ست بنے کے نالے کے راستے میدان سے باہر لے گئے۔ ان حالات نے امید

---

(1) میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ بعض غازیوں نے سکھوں کے ہاتھ گرفتار ہونے کے بعد سید صاحب کی لاش پہچانی، بعض مقامی باشندوں نے شیر سنگھ کے کہنے کے مطابق اس لاش کو دفن کیا، لیکن ان میں سے کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس لئے معاملہ مشتبہ رہا۔ بعد ازاں خود مقامی باشندوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا، بعض کہتے تھے کہ لاش سید صاحب کی تھی، بعض اس سے انکار کرتے تھے۔ شیخ وزیر کے نو عمر بچے نے بھی سید صاحب کی لاش دیکھی تھی، اس کے بیان کو بوجہ حداثت سن چنداں وقعت نہ دی گئی۔

حیات کے لئے یقیناً ایک معقول سہارا مہیا کر دیا تھا، اگر ابتدا میں بعض اصحاب نے یہ سمجھا کہ سید صاحب واقعی زندہ ہیں تو اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔

امید حیات کے اسباب

پھر ارادت مندوں کے سامنے سید صاحب کی پاک نفسی، للّٰہیت، عشق حق اور بے مثال عزیمت تھی۔ وہ مقدس چہرہ تھا، جسے دیکھتے ہی پچھوں کا رئیس حسن علی پکار اٹھا تھا کہ ایسا صاحب ارادہ ہفت اقلیم کی تسخیر کے لئے بھی کھڑا ہو جائے تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ غازیوں کو تو چھوڑ دیجئے، ہندوستان میں ایک دو نہیں سیکڑوں اصحاب تھے، جنہیں یقین تھا کہ سید صاحب کی تحریک ضرور کامیابی کی آخری منزل پر پہنچے گی، کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ تحریک احیائے ملت، سرحد کے ایک دور افتادہ گوشے میں بظاہر درہم برہم ہو جائے گی، اور سید صاحب شہادت پائیں گے۔

چونکہ شہادت میں اشتباہ کے خاصے قوی پہلو موجود تھے، اس لئے ابتدا میں طبیعتیں خبر شہادت کو قبول کرنے میں متامل رہیں، تو اس تامل کو غیر معقول نہیں سمجھا جا سکتا، ویسے بھی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ خوشگوار امیدوں کی شکست بہ مشکل قبول کرتی ہے اور معمولی سے معمولی سہارا بھی مل جائے تو اس کے خیر مقدم کے لئے آمادہ رہتی ہے۔

پھر سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے، مثلاً بھکول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اسی بنا پر بھکول میں ٹھہر گئے کہ انہیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔

زندگی اور اس کا نصب العین

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ابتدا میں اس قسم کی امید کے لئے گنجائش ضرور موجود تھی،

اگر ارادت مندوں کو اس میں قلب و جگر کی تسکین کا سامان نظر آیا تو محل اعتراض نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ حجاب و خفا کی ایک حد تھی، سید صاحب اگر زندہ تھے تو چند روز یا چند ہفتوں سے زیادہ چھپے نہ رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک معین نصب العین تھا، جس کے عشق میں زمانۂ ہوشمندی کے پورے لیل و نہار گذرے، اس نصب العین کے لئے سعی و جہد کے بغیر ان کے جیتے رہنے اور مر جانے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سید احمد بریلوی ہمارے اور تمام محبان احیاء اسلامیت کے نزدیک اس وجہ سے عزیز و محترم تھے کہ وہ ایک پاک و مقدس تحریک کے علمدار تھے۔

اس وجہ سے عزیز و محترم نہ تھے کہ ایک خاص میدان میں شکست کھا کر انہوں نے چھپ جانا پسند فرمایا۔ ان کے سات سو مجاہد، جنہیں بچوں کے برابر پیار کرتے تھے، ایک اجنبی سرزمین میں سرگرداں و پریشان تھے، وہ جماعت ٹوٹ رہی تھی، جس کی تاسیس و تقریب کے لئے انہوں نے زندگی کی ہر متاع بے دریغ قربان کی تھی، وہ داعیۂ جہاد مضمحل ہو رہا تھا، جس کا چراغ روشن رکھنے کی خاطر انہوں نے اسلامیانِ ہند کا بہترین اور گرم ترین خون جا بجا بہایا تھا۔ اگر وہ زندہ تھے تو ان مقاصد کے لئے زندہ ہوتے تو سب سے پہلے ان مقاصد کو اختلال سے بچاتے۔ اخوند محمد ارم یا کسی دوسرے عقیدت مند کو اپنا جمال مقدس دکھا کر تسکین قلب و نظر کا سامان بہم پہنچا دینا، کسی دینی اور ملی کام کے لئے کسی بھی درجے میں مفید و سودمند نہیں ہو سکتا تھا۔

سید صاحب کا ارشاد

کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نے اپنی ہمشیر سے فرمایا تھا:

> لوگ کہیں گے کہ سید احمد کا انتقال ہو گیا یا شہادت ہو گئی لیکن جب تک ہندوستان کا شرک، ایران کا رفض اور سرحد کا غدر نہ جائے گا، میرا کام ختم نہیں ہو گا۔

ہمیں اس روایت کی حیثیت معلوم نہیں، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب نے اگر کچھ فرمایا تو کن الفاظ میں فرمایا، لیکن اگر اس روایت کو حرفاً حرفاً درست بھی مان لیا جائے تو اول کوئی شخص سید صاحب کے لیے معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، معصومیت اس آسمان کے نیچے انبیاء کرام کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ دوم اس بیان میں اصلاً کوئی قباحت نہیں، اس لئے کہ اہل حق جو دعوت لے کر کھڑے ہوتے ہیں وہ ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے، اگرچہ لازم نہیں کہ صاحبانِ دعوت کی زندگی ہی میں تکمیل کے تمام مراتب طے ہو جائیں۔ سوم اس معاملے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے، صاحب دعوت کا دل اگر کامیابی وفائز المرامی کے یقین واثق سے لبریز نہ ہو تو اس کی دعوت میں زندگی کی روح کیوں کر پیدا ہوگی؟ جو کچھ وہ کہتا ہے اگر اس کی زندگی میں پورا نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے معاذ اللہ غلط کہا، بلکہ وہ زود یا بہ دیر ضرور پورا ہوگا۔ تکمیل مقاصد کی اہمیت کے بیان واظہار کا یہ نہایت ہی موثر و دل آویز اسلوب ہے اور اسی ذریعے سے دعوت پر لبیک کہنے والوں کے عزم وارادہ میں پہاڑوں کی سی پختگی پیدا ہوتی ہے۔

اگر آپ کہیں کہ "یہ کام ہونا چاہئے" تو اس طرح کام کی اہمیت تو واضح ہوگی، لیکن بے پناہ عزم و یقین کی وہ کیفیت پیدا نہ ہوگی جو اس پیرایۂ بیان کے رگ وپے میں ساری ہے، کہ "یہ کام ہو کر رہے گا"۔ سید صاحب کا کام یقیناً ختم نہیں ہوسکتا، جب تک وہ سب کچھ پورا نہ ہو جائے جس کے لئے انہوں نے جان دی۔ لیکن اس کی تکمیل کو سید صاحب کی زندگی سے وابستہ کرنا یا اس بنا پر ان کے زندہ ہونے کا عقیدہ اختیار کر لینا ایک ایسی تاویل ہے جس کے لئے کوئی عقلی یا شرعی دلیل قطعاً پیش نہیں کی جاسکتی۔

"تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ سید صاحب نے جنگ بالاکوٹ سے قبل اپنی چھوٹی بی بی صاحبہ سے غیبوبت کی پیش گوئی کی تھی۔ (۱) مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں مل سکی۔

---

(۱) تواریخ عجیبہ" ص: ۱۴۷

اکابر صادق پور کا عقیدہ

حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقہ خاص سے اہل صادق پور نے عقیدۂ غیبوبت کو پورے کاروبار جہاد کا مدار ومحور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے ''دعوت'' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا، اس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں شکست اس لئے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا میل جمنے نہ پائے، شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چلہ گزاری اور دعا وزاری کے لئے پہاڑوں پر بلایا، سچ ہے خلوت بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں رہے، حضرت موسیٰ کوہ طور پر، حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھایا، ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غارِ ثور میں چھپایا۔ سید صاحب کی:

> شہادت کی خبر شیطان نے جھوٹی مشہور کی، کیوں نہ ہو؟ یہ (یعنی سید صاحب) بھی تو ان لوگوں (انبیائے کرامؑ) کے پیرو ہیں، ان کی سنتوں سے کیوں کر محروم رہیں؟......... اور ہمارے حضرت کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھئے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں ان کے عرصۂ بعید گذرے گا، یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے مشرف ہو جاتے ہیں اور انشاء اللہ عرصۂ قریب میں مثل خورشید درخشاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمائیں گے۔ (۱)

مولانا ولایت علی بڑے ہی واجب الاحترام بزرگ تھے، آپ نے اور آپ کے اقربا نے دعوت حق اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں جو قربانیاں کیں، ان کی برابری سہل نہیں، وہ تمام اصحاب بہ اعتبار وجاہت ومعیشت، امرا میں محسوب ہوتے تھے۔ پھر عشق دین واسلامیت میں سب کچھ چھوڑ کر آلام ومحن کے اس ہجوم میں اپنی جانیں پورے صبر وشکر

---

(۱) رسائل تسعہ ص: ٦٦، ٦٧

کے ساتھ جان آفریں کے حوالے کیں کہ ان کا پرتو بھی کسی پر پڑ جائے تو عمر بھر نالہ و فغاں سے فراغت نہ ملے۔ لیکن محولہ ارشاد کے باب میں صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں: اول یہ کہ مولانا ولایت علی نے خود یہ نہیں لکھا، دوسروں نے خطاءً ان سے منسوب کر دیا۔ دوم یہ کہ مولانا بہ حسن نیت خطا کے مرتکب ہوئے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے بعد اس دنیا میں کوئی شخصیت نہیں آئی جس کا ہر قول خطا سے پاک ہو، اس لئے حجت بن سکے۔

دو سوال

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا حضرت یونسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احوال کو بلالحاظ کیفیت و نوعیت مشبہ بہ قرار دے کر سید صاحب کی غیبت کے لئے جنی تلاش کرنا مناسب تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ مولانا ولایت علی کے انتقال کے وقت سید صاحب کی مزعومہ غیبت پر بیس برس گذر چکے تھے، لیکن کیا پردہ حجاب و خفا کے چاک ہونے کی نوبت آئی اور سید صاحب کے ظہور کی صورت بنی؟ حالانکہ ظہور کے بیسیوں اہم مواقع پے در پے پیش آتے ہیں۔ اگر امت کی بے چارگی کے نازک ترین اوقات میں سید صاحب ہدایت و رہنمائی کے لئے ظاہر نہ ہوئے تو اس ہادی و مرشد کے وجود پر کسی کو کیا خوشی ہو سکتی ہے جو ظہور کے بعد اچانک غائب ہو جائے اور مصیبت زدہ دنیا غیبت کی ظلمت زائل ہونے کے انتظار میں لا متناہی مدت تک ضلالت و نامرادی کی ٹھوکریں کھاتی رہے۔

قائلین غیبت کی رائیں

سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں

انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں ''وہابیوں کا بڑا مقدمہ''(۱) کہا جاتا ہے۔ اس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی محمد جعفر تھانیسری اور بعض دوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، انہیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے۔ وہ امامِ وقت ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے مقامِ ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری، صاحب ''تواریخ عجیبہ'' بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے، بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارت جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں، نو پوری ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور۔

ان تصورات یا معتقدات پر بحث کی نہ ضرورت ہے اور نہ بحث مناسب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مجاہد کبیر و غازی شہیر سید احمد بریلوی ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے اور جس دعوت کو لے کر کھڑے ہوئے

---

(۱) ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ مولوی محمد قاسم پانی پتی نے وادیٔ کاغان کے کسی تاریک غار میں تین پیکر بنا کر کھڑے کر دیے تھے۔ ان میں سے بیچ کے پیکر کو سید صاحب اور ساتھ کے دو پیکروں میں سے ایک کو عبداللہ خادم اور دوسرے کو میاں جی چشتی بتایا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً غازیوں کو غار کے دہانے پر لے جا کر دور سے دکھا دیا جاتا تھا، اور وہ مطمئن ہو کر لوٹ آتے تھے۔ میاں زین العابدین سرحد پہنچے اور انہوں نے پیکروں کو قریب پہنچ کر دیکھا تو جعل کا راز فاش ہو گیا۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے اور عمر بھر مولوی محمد قاسم کو ''قاسم کذاب'' کہتے رہے۔

میں اس کہانی کے صدق و کذب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ مولوی محمد قاسم سید صاحب کے مخلص مرید تھے، ان کے بھائی اور والد میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ خود مولوی محمد قاسم کی زندگی کا آخری سانس غیر مسلم قوتوں کے خلاف جہاد میں پورا ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور غالباً سیالکوٹ جیل میں وفات پائی۔ یقین نہیں آتا کہ انہوں نے سید صاحب کے نام پر اس قسم کا جعل کھڑا کیا ہو، اگر یہ کہانی سچی ہے تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللّٰھم اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔

تھے، اس پر اپنے خون سے سچائی کی مہر لگا دی۔ نہ وہ غائب ہوئے تھے، اور نہ ان کے ظہور کا انتظار کرنے کی کوئی عقلی یا شرعی وجہ موجود تھی۔(۱)

ممکن ہے کہ کہا جائے، اہل صادق پور نے غیبت کا نظریہ اس غرض سے تراشا کہ گرے ہوئے دلوں کو سہارا دے کر کھڑا کریں۔ عام لوگ چونکہ ظہور مہدی کے منتظر تھے، اس وجہ سے زیر غور نظریے کی اشاعت کے لئے فضا سازگار تھی۔ لیکن میرے دل میں وہم بھی نہیں گذر سکتا کہ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم جیسے بلند پایہ بزرگ اس قسم کی گری ہوئی تدبیروں سے کام لینے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ اگر وہ حیات کے قائل تھے تو سمجھنا چاہئے کہ خلوص کے ساتھ سید صاحب کو زندہ مانتے تھے، البتہ ان کا یہ عقیدہ سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان

مولوی محمد جعفر مرحوم نے ”تواریخ عجیبہ“ میں لکھا ہے:

> بعد صاف کرنے میدان کے سید صاحب مثل شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے کہ اس وقت آپ یک بہ یک نظروں سے غائب ہو گئے۔ مولوی جعفر علی، جو آپ کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے ہوئے کھڑا تھا لکھتا ہے کہ ”جناب حضرت امیر المومنین در ہماں جماعت از نظر من غائب شدند۔“(۲)

پھر فرماتے ہیں کہ مولوی نظام الدین چشتی اور مولوی عبداللہ بھی میدانِ جنگ سے غائب ہو کر آپ کے رفیقِ غیبت بن گئے۔(۳)

---

(۱) مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے اس عقیدۂ غیبت کی بنا پر ایک عجیب طومار تیار کر دیا اور دعویٰ یہ کہ مولانا ولایت علی نے قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لی تھی، قاضی شوکانی زیدی تھے، اس طرح غیبت کا عقیدہ زیدیت سے اہل صادق پور میں پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قاضی شوکانی کو کسی صاحب علم کا زیدی قرار دینا یقیناً اس دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔

(۲) تواریخ عجیبہ ص: ۱۳۶　　(۳) تواریخ عجیبہ ص: ۱۳۷

میاں جی چشتی اور مولوی عبداللہ کے غائب ہونے کی کوئی روایت آج تک میری نظر سے نہیں گذری، صرف میاں زین العابدین کی وہ کہانی مشہور ہے جس کا ذکر میں حاشیے میں کر چکا ہوں۔ خود سید صاحب کے متعلق مولوی سید جعفر علی نقوی کے الفاظ (از نظرمن غائب شدند) کو سراسر غلط اور خلاف واقعہ معنی پہنانے کی کوشش حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ چونکہ ”منظورہ“ سامنے نہ تھی اور اس کا ایک فقرہ ”تواریخ عجیبہ“ میں سیاق وسباق سے الگ کر کے چھاپ دیا گیا اسلئے اکثر لوگ دھوکا کھا گئے اور مغلطے میں پڑ گئے۔

اب ”تواریخ عجیبہ“ کے بیان کی حقیقت ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مولوی سید جعفر علی نقوی، سید صاحب کے باڈی گارڈ نہ تھے بلکہ مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شامل تھے اور ان سے زیادہ تر منشی خانے میں کام لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کی مخالفت کے فرائض اصلاً اس جماعت سے متعلق تھے جو جماعت خاص کہلاتی تھی، یعنی خود سید صاحب کی جماعت۔

۲۔ بلا شبہ بالاکوٹ میں سکھوں پر حملے کے لئے سید صاحب مسجد زیریں سے باہر نکلے تو مولانا شاہ اسمٰعیل نے اعلان کر دیا تھا کہ قرابین دار سید صاحب کے ساتھ ہو جائیں، اس وجہ سے مولوی سید جعفر علی نقوی بھی ساتھ ہو گئے تھے، لیکن وہ نہ سید صاحب کے ساتھ رہ سکے اسلئے کہ ضعف و بیماری کے باعث تیز نہیں چل سکتے تھے، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، اور نہ گھمسان کے رن میں سید صاحب سے قریب تھے، چہ جائیکہ مانا جائے وہ کندھے سے کندھا ملائے ہوئے کھڑے تھے۔

۳۔ سید جعفر علی نقوی خود لکھتے ہیں کہ میں منشی محمدی انصاری کے پاس تھا:

> از منشی موصوف پرسیدم کہ حضرت امیر المومنین کجا ہستند، ایشاں فرمودند عقب ما بہ سمت چپ ہستند۔(۱)

---

(۱) منظورہ ص: ۳۸۷

ترجمہ: میں نے منشی صاحب سے پوچھا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ وہ بولے ہمارے پیچھے بائیں جانب ہیں۔

اگر کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے تو سید صاحب کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟

۴۔ ان حالات میں "از نظر من غائب شدند" کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ سید صاحب جعفر علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے اور نظر نہ آتے تھے۔ یہ مطلب قطعاً نہ تھا کہ جسد عنصری کے ساتھ پردۂ خفا میں چلے گئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو منشی محمدی انصاری کیوں یہ کہتے کہ سید صاحب ہمارے پیچھے بائیں جانب ہیں؟

شہادت کے حق میں شہادتیں

پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس "منظورہ" کے ایک فقرے کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور اس کے ساتھ غلط مقدمات لگا کر سراسر غلط معنی پہنائے گئے، اس میں ایک دو نہیں، میرے سرسری اندازے کے مطابق کم و بیش پندرہ موثق، قطعی اور یقینی شہادتیں موجود تھیں، جن سے سید صاحب کی شہادت کا اثبات ہوتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ غیبت کا معتقد شخص خود اپنے قلم سے شہادت کی گواہیاں فراہم کرتا؟ یا کیا مولوی محمد جعفر مرحوم کے لئے زیبا تھا کہ وہ ان روشن شہادتوں کو چھوڑ کر ایک ایسے فقرے کو ثبوت غیبت بتاتے جسے کسی بعید سے بعید تاویل کی بنا پر بھی غیبت سے کوئی تعلق نہ تھا؟ آپ غیبت کے خلاف شہادتیں ملاحظہ فرما لیجیے:

۱۔ شیخ وزیر کے صاحبزادے نے گواہی دی کہ میں نے امیر المومنین کی نعش پہچانی۔(۱)

---

(۱) منظورہ ص: ۱۴۰۰

۲۔ خضر خاں قندھاری اور اللہ دین پھلی والا بالاکوٹ گئے، وہاں کے لوگوں سے مل کر اور حالات معلوم کر کے واپس آئے تو بیان کیا کہ امیر المومنین کی نعش اسیر شدہ غازیوں نے پہچانی اور شیر سنگھ کے حکم سے مسلمانوں نے اسے دفن کیا۔(۱)

۳۔ غازی قشملئی پہنچے تو بی بی صاحبہ نے بچی کو، جو ساڑھے تین ماہ کی تھی، ملازمہ کے ہاتھ غازیوں کے پاس بھیج دیا۔ سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق اس معصوم بچی کو دیکھ کر حضرت کی شکل وصورت یاد آ گئی:

ماہمہ گریاں شدیم کسے از ما نہ بود کہ دامانِ او از اشک تر نہ گردید۔ (۲)

ترجمہ: ہم سب رو پڑے، کوئی نہ تھا جس کا دامن آنسوؤں سے تر نہ ہوا۔

یہ گریہ اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ سید صاحب دنیا میں نہیں رہے تھے، اگر وہ محض غائب ہوئے تھے تو رونے کا کون سا محل تھا؟ بی بی صاحبہ کو تسلی دیتے کہ تھوڑی مدت میں ظاہر ہو جائیں گے۔

۴۔ شیخ ولی محمد نے اسی موقع پر بی بی صاحبہ سے پوچھا کہ اگر اپنے وطن چترال جانا چاہیں تو اس کی ہر ممکن تدبیر کی جائے، اگر سندھ میں حضرت کے اہل وعیال کے پاس جانا منظور ہو تو اس سمت کے لئے سفر کا بندوبست کیا جائے۔ (۳) اگر سید صاحب زندہ تھے اور محض عارضی طور پر غائب ہوئے تھے تو بی بی صاحبہ کو چترال یا سندھ پہنچانا کس بناء پر مناسب تھا؟

۵۔ حاجی غریب اللہ گورکھپوری نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد وطن کا قصد کیا تو سید جعفر علی نقوی نے اپنے والد کے نام ایک خط حاجی صاحب کے حوالے کیا، اس کا مضمون

---

(۱) منظورہ ص: ۱۲۰۱

(۲) منظورہ ص: ۱۱۹۶

(۳) منظورہ ص: ۱۱۹۶

یہ تھا:

> حال شکست وشہادت حضرت امیر المومنین ومولانا اسماعیل علیہما الرضوان ونام رفقائے خود کہ شہادت نصیب شاں شدہ ونام باقی ماندگاں نوشتہ بودیم۔(۱)

ترجمہ: اس میں شکست کا حال، سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی شہادت کے ساتھ ساتھ اپنے شہید اور زندہ رفیقوں کے نام لکھے تھے۔

۶۔ سید جعفر علی نقوی جب حاجی غریب اللہ سے کچھ مدت بعد وطن پہنچے تو ان کے والد اور بھائی نے بیان کیا کہ خط پا کر ہم بہت روئے اور بار بار کہتے تھے:

> اگر عزیز ما داخل راہ شہدائے شد، ذات بابرکات حضرت امیر المومنین باقی مے ماند، ایں قدر رنج وملال بہ مانے رسید۔(۲)

ترجمہ: اگر ہمارا عزیز (یعنی جعفر علی نقوی) شہید ہو جاتا اور حضرت امیر المومنین زندہ رہتے تو ہمیں اتنا رنج نہ ہوتا۔

مزید شہادتیں

۷۔ غازی بالاکوٹ سے بچ بہار میں صاحبزادہ محمد نصیر کے پاس پہنچے تو یہ تجویز پیش ہوئی کہ صاحبزادے کو امیر بنا لیا جائے۔ بعض غازی اس تجویز کے حق میں اور بعض خلاف تھے۔ اختلاف رکھنے والوں نے صرف دو باتیں پیش کیں: ایک یہ کہ صاحبزادے میں شرائط امامت موجود نہیں، دوسری یہ کہ باوجود قرب مکان وہ جنگ بالاکوٹ میں شریک نہ ہوا۔ اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو نئی امامت کا سوال کیوں سامنے آتا؟

۸۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> وقتیکہ یقین بر شہادت آنجناب ویاس از حیات دنیاوی دفوز بر مدارج علیائے شہدا حاصل شد، پس احقر از تمامی جماعت خود پرسید کہ کدام از شما ارادہ

---

(۱) منظورہ ص:۱۱۹۹

(۲) منظورہ ص:۱۱۹۹

اقامت دارد و کدام عزمِ شراکت خاکسار و نہضت بہ سوئے وطن۔ (۱)

ترجمہ: جب یقین ہوگیا کہ سید صاحب شہید ہوکر شہدا کے مدارج علیا پر پہنچ گئے اور حیات دنیاوی سے مایوسی ہوگئی تو احقر نے جماعت کے تمام لوگوں سے پوچھا کہ کون یہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور کون میرے ساتھ وطن جانے کا خواہاں ہے۔

۹۔ شیخ حسن علی نے سید جعفر علی سے کہا میں تو خدا کے ساتھ عہد کر چکا ہوں کہ ساری عمر جہاد میں بسر کروں گا۔ جہاد امام کے بغیر ہو نہیں سکتا، لہٰذا کابل، قندھار، سندھ اور عرب میں امام کو تلاش کروں گا۔ جب امام مل جائے گا تو کسی مناسب مقام پر بیٹھ کر جہاد شروع کر دوں گا۔ (۲)

اگر انہیں سید صاحب کی حیات کا یقین ہوتا تو تلاشِ امام میں ملک بہ ملک پھرنے کی سرگردانی کیوں ضروری سمجھتے؟

۱۰۔ مولوی سید جعفر علی وطن واپس ہوئے تو چھتئی میں اخوند محتشم سے ملاقات کی۔ وہ بھی سید صاحب کے معتقدین میں سے تھے، انہوں نے بتایا کہ رسول خاں ترنگ زئی سے شہادت کا حال معلوم ہوا تھا، وہ سید صاحب کے ہتھیار بھی لایا تھا، جو امانتاً موجود ہیں، انہیں شیخ ولی محمد کے پاس بھیج دوں گا۔ (۳)

اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو ہتھیار شیخ ولی محمد کے پاس بھیجنے کا کیا مطلب تھا؟ نیز سید جعفر علی نے اخوند محتشم کے بیان سے اختلاف نہیں کیا۔

۱۱۔ سفر مراجعت میں لدھیانہ اور دہلی کے درمیان سید جعفر علی کی ملاقات محمد سعید خاں گنج پوری سے ہوئی جو بیس سواروں کے ساتھ سید صاحب کے پاس جا رہا تھا، اس

---

(۱) منظورہ ص: ۱۲۱۳ (۲) منظورہ ص: ۱۲۱۰

(۳) منظورہ ص: ۱۲۱۶

نے حال پوچھا۔ منظورہ میں سید جعفر علی لکھتے ہیں:

> آنچہ راست مے دانستم از حال چشم زخم و شہادت بہ معرض بیان آوردم۔
>
> **ترجمہ**: زخمی ہونے اور شہادت پانے کا جو حال مجھے معلوم تھا، ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔

محمد سعید خاں بولا کہ تم بھاگ کر آئے ہو، ہم ضرور سرحد پہنچیں گے۔ سید جعفر علی نے جواب دیا:

> خدائے تعالیٰ ہم چنیں کناد کہ شما دریں قول صادق شوید و ما کاذب، اما چہ کنم وقت استفسار کسے جز راستی دگر ہیچ گفتن نمی توانم۔(۱)
>
> **ترجمہ**: خدا کرے کہ آپ اس بات میں سچے ثابت ہوں اور میں جھوٹا۔ لیکن کیا کروں جب کوئی پوچھتا ہے تو سچی بات کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

گویا سید جعفر علی کے نزدیک سچائی یہی تھی کہ سید صاحب شہید ہو چکے تھے۔

۱۲۔ سید جعفر علی دہلی پہنچے تو سید محمد علی رام پوری ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں مقیم تھے۔ صبح ان کا آدمی بلانے کے لئے آیا۔ سید جعفر علی خدمت میں حاضر ہوئے:

> بہ محبت و مدارات پیش آمدند اما در باب شہادت حضرت امیر المومنین تصدیق ما نہ نمودند۔(۲)
>
> **ترجمہ**: بڑی محبت و مدارات سے پیش آئے لیکن حضرت امیر المومنین کی شہادت کے باب میں میری تصدیق نہ کی۔

گویا سید جعفر علی معتقد شہادت تھے اگرچہ سید علی نے اسے قبول نہ کیا۔

۱۳۔ لکھنؤ چھاؤنی میں سید صاحب کے اقربا میں سے سید محمد موجود تھے، علی ان سے بھی ملے:

> تمام احوال لشکر اسلام و یقین شہادت حضرت امیر المومنین بیان نمودم

---

(۱) منظورہ ص ۱۲۲۹

(۲) منظورہ ص ۱۲۳۰

وہمیں کہ کسے از چشم خود شہید نہ دید۔ (۱)

ترجمہ: میں نے لشکر اسلام کے پورے حالات سید صاحب کی شہادت کے یقین کا اظہار بھی کیا، ساتھ ہی کہا کہ کسی نے آپ کو اپنی آنکھوں سے بہ حالت شہادت نہ دیکھا۔

۱۴۔ لکھنؤ میں سید جعفر علی نقوی اپنے استاد مولوی حیدر علی سے بھی ملے، وہ رسالدار فقیر محمد خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ سید صاحب کو یاد کر کے بہت روئے۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ انہیں نے شہادت کی تفصیلات مجھ سے سن کر رسالدار کو سنائیں:

حال شہادت امیر المومنین زبانی راقم الحروف رسانیدند وخان موصوف را یقین شہادت از ہمیں وقت شد۔ (۲)

ترجمہ: انہوں نے میری زبانی رسالدار فقیر محمد خاں تک امیر المومنین کی شہادت کا حال بیان کیا۔ خان موصوف کو اسی وقت سے شہادت کا یقین ہوا۔

۱۵۔ سید جعفر علی وطن پہنچے، والدہ سے ملے تو انہوں نے لخت جگر کو پا کر کہا کہ دنیا میں اس سے بڑی آرزو کوئی نہ تھی جو خدا نے پوری کر دی۔ اب موت کا غم نہیں، ایک آرزو تھی کہ خدا حضرت امیر المومنین کے ہاتھ سے اس سرزمین کی تطہیر کا سامان کر دیتا اور شوکت اسلام دیکھ لیتا:

چوں جناب ممدوح در دنیا نماندند، ہم اگر بردیم چہ غم است۔ (۳)

ترجمہ: جب حضرت امیر المومنین دنیا میں نہ رہے تو ہمارے رخصت ہو جانے پر غم و رنج کی کون سی وجہ ہے؟

---

(۱) منظورہ ص: ۱۲۳۵ (۲) منظورہ ص: ۱۲۳۶ (۳) منظورہ ص: ۱۲۳۹

دعوتِ غور و فکر

یہ پندرہ اقتباسات میں نے سرسری طور پر ''منظورہ'' سے جمع کر دیے ہیں، ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ ''از نظر من غائب شدند'' سے سید جعفر علی کا مدعا وہی تھا جو مولوی محمد جعفر علی نے ''تواریخ عجیبہ'' میں پیش کیا۔ یعنی یہ کہ سید صاحب نظروں سے اوجھل نہ ہوئے بلکہ یہ جسد عنصری غائب ہو گئے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی محمد جعفر مرحوم نے کس بنا پر شہادت کی یہ قطعی شہادتیں نظر انداز کر دیں، اور ''منظورہ'' کے ایک فقرے کو اصل عبارت سے الگ کر کے بالکل خلاف حقیقت مطلب کیوں پیدا کیا؟ اگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ سید صاحب غائب ہو گئے تو بطور خود اسے ظاہر کر دیتے، سید جعفر علی نقوی کے بیانات میں حذف و تحریف کی کیا ضرورت تھی؟

غرض غیبت کا عقیدہ اصلاً بھی غلط تھا اور جن سہاروں کی بنا پر اسے مستحکم بنانے کی سعی کی گئی وہ سہارے بھی بے بنیاد تھے۔ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے نواب وزیر الدولہ والیٔ ٹونک نے فراہمیٔ معلومات کی سعی سب سے بڑھ کر فرمائی، انہیں کے اہتمام میں ''وقائع احمدی'' مرتب ہوئی، جس کی ترتیب کا حال میں مآخذ میں بیان کر چکا ہوں۔ انہیں کے اہتمام میں ''منظورہ'' لکھی گئی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بیسیوں مقامات پر سید صاحب کو شہید ہی لکھا ہے۔ غائب نہیں لکھا، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی قبر کا نشان نہیں مل سکا۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی ''تقصار'' میں عقیدۂ غیبت کو عقلاً اور شرعاً غلط قرار دیا ہے۔(۱)

---

(۱) تقصار جیود الاحرار ص: ۱۰۸

مولوی محمد جعفر کا آخری بیان

مولوی محمد جعفر مرحوم کا تعلق جماعت صادق پور سے تھا، غالباً انہیں سے عقیدۂ غیبت لیا اور شنید کی بناء پر ''منظورہ'' کے اس فقرے کو غیبت کا مبنیٰ بنایا، جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ منظورہ کو خود انہوں نے غالباً نہیں دیکھا تھا، پایانِ عمر میں وہ بھی غیبت کے متعلق متوقف ہو گئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> اب بہ سبب بعد زمانہ کے جو ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہو گئے خیال غیوبت خود بخود لوگوں کے دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) تواریخ عجیبہ ص: ۱۳۷

پینتالیسواں باب:

ازواج و اولاد

سیدہ زہرہ

سید صاحب نے تین شادیاں کیں، آپ کی پہلی بیوی سیدہ زہرہ (بنت سید محمد روشن نصیر آبادی) تھیں۔ یہ شادی اس زمانے میں ہوئی تھی جب سید صاحب دہلی سے تعلیم پا کر وطن گئے تھے۔ ان سے صرف ایک صاحبزادی سیدہ سائرہ پیدا ہوئیں، صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، صرف یہ معلوم ہے کہ سیدہ سائرہ کی پیدائش کے بعد سید صاحب نواب امیر خاں کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔

سید صاحب نے ۷؍ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو راہ ہجرت میں قدم رکھا تھا، اہل وعیال اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ میں رائے بریلی سے روانہ ہوئے اور راستے میں ٹھہرتے ٹھہرتے صفر ۱۲۴۲ھ میں سندھ پہنچے تھے۔ اس وقت سے اہل وعیال نے ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) تک تیرہ سال پیر کوٹ (پیر جو گوٹھ) ہی میں بسر کیے۔

سیدہ سائرہ کی شادی، سید صاحب کے بھتیجے سید اسماعیل (بن محمد اسحاق) سے ہوئی، نواب وزیر الدولہ والی ٹونک نے سید صاحب کے ازواج و متعلقین کو ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں سندھ سے ٹونک بلا لیا تھا۔ غالباً ہر ایک کے گزارے کیلئے تنخواہیں مقرر کر دی تھیں، بعض کو ذمہ داری کے عہدے دیے تھے۔ سیدہ سائرہ کے لئے گیارہ ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر فرمادی تھی، جس کی آمدنی سید اسماعیل کے حسن انتظام سے اٹھارہ ہزار پر پہنچ گئی تھی۔ بعد میں سید اسماعیل نے نواب کے ماموں میر عالم خاں کی لڑکی سے دوسرا نکاح

کر لیا، یہ امر اتنی خفگی کا موجب بنا کہ سید اسماعیل کو جاگیر سے بالکل بے دخل کر دیا گیا، صرف سو روپے ماہوار گزارے کے لئے ملتے تھے۔

سیدہ زہرہ کا انتقال ۴ر شوال ۱۲۷۹ھ (۲۵ر مارچ ۱۸۶۳ء) کو ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹونک ہی میں رہیں اور وہیں دفن ہوئیں۔

سیدہ ولیہ

سید صاحب نے دوسری شادی اپنے منجھلے بھائی سید اسحاق کی بیوہ سیدہ ولیہ سے کی تھی، جو آپ کے حقیقی ماموں کی بیٹی تھیں۔ وہ بڑی ہی عقلمند اور منتظم خاتون تھیں، اس لئے شادی کے بعد سارے گھر میں انہیں کو بلند ترین مرتبہ حاصل ہوا۔ سندھ سے ٹونک گئیں تو نواب وزیر الدولہ مرحوم از راہِ عقیدت دور تک پیشوائی کے لئے گئے اور غالباً ایک میل تک سیدہ کی پالکی کو خود کندھا دیا۔ ٹونک پہنچیں تو سیدہ سائرہ کی جاگیر گویا انہیں کی جاگیر تھی، اس لئے کہ سیدہ سائرہ ایک اعتبار سے ان کی علاتی بیٹی اور ایک اعتبار سے بہو تھیں۔

سید محمد علی صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' نے لکھا ہے:

آں وزیرِ اعظم دریائے جود　　دایما تخواریش خوش مے نمود
رشک ابر بہمن آمد چوں کفش　　داد جاگیرش مزید از مصرفش(۱)

یہ غالباً اسی جاگیر کی طرف اشارہ ہے، جو سیدہ سائرہ کو ملی تھی۔ نیز:

ہم بہ نقد و جنس شادش داشتے　　ہم چو سید مرشدش پنداشتے
نذر در عیدین مے دادش مدام　　روز و شب می داشتے شادش مدام(۲)

سید عبد العلی نے لکھا ہے کہ بتاریخ ۱۸ر رجب ۱۲۶۲ھ (۱۲ر جولائی ۱۸۴۶ء) بروز

---

(۱) مخزن احمدی ص: ۴۹　　(۲) مخزن احمدی ص: ۴۶

دوشنبہ وفات پائی۔(۱) سید محمد علی فرماتے ہیں کہ ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تھی، یکا یک بیمار ہوئیں۔ ایک رات اور دن بیمار رہ کر کلمہ پڑھتی ہوئی آدھی رات کے وقت جاں بحق ہوئیں، بیماری میں بھی نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جب وقت معلوم ہوتا، تکیے پر تیمم کر کے نیت باندھ لیتیں:

گاہ بے ہوش و گہے باہوش بود   لیک ذکر قلبی اش در جوش بود
دم بہ دم تفتیش اوقات صلوٰۃ   می نمود آں مقتدائے محسنات
گر کسے گفتے کہ ہاں وقتِ نماز   آمد اینک زود تر تحریمہ ساز
او تیمم ساختے از تکیہ گاہ   آمدے اندر نماز آں دیں پناہ
استقامت را ببے نازم کہ بود   تادمِ آخر سرش وقف سجود
کلمہ گویاں وقت نصفِ لیل بود   کاں عفیفہ از جہاں رحلت نمود
چوں بہ خیر و خوبیش شد خاتمہ   شد بہ جنت ہم نشین فاطمہ
قصہ کوتہ بعد صد رنج و ملال   خواستم از طبع خود تاریخ سال
داد ہاتف از سماواتم ندا   ”رفت زیں عالم سوے دار بقا“(۲)

گویا سید صاحب کے بعد تقریباً سولہ برس زندہ رہیں اور ٹونک میں دفن ہوئیں۔
جب تک زندہ رہیں، نواب وزیر الدولہ کبھی کبھی عقیدت مندانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ سید صاحب کا ”خرقہ“ ملا تو اسے اپنے سر پر رکھ کر پیدل سیدہ کے گھر گئے، سیدہ نے دعاؤں کے علاوہ تو اضعاً نواب کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ حج کے دنوں میں سید صاحب کی کسی بی بی کی گود

---

(۱) نسب نامہ قلمی مرتبہ سید عبد الحلی ص:۴۳

(۲) مخزن احمدی ص:۴۶

میں ایک بچہ ضرور تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ سیدہ زہرہ کا تھا یا سیدہ ولیہ کا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔

سیدہ فاطمہ

تیسری شادی سید صاحب نے اطباء کی تجویز کے مطابق سرحد میں سیدہ فاطمہ سے کی تھی، جو چترال کے سادات میں سے تھیں، مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ان کا خاندان اسماعیلی تھا، ان سے صرف ایک بچی پیدا ہوئی جو سید صاحب کی شہادت کے وقت صرف ساڑھے تین مہینے کی تھی۔ سیدہ فاطمہ نے سید صاحب کی شہادت کے بعد چھ یا سات برس سرحد میں گزارے، وہ کئی جگہ رہیں، مثلاً راج دواری، شملئی (درہ سندھیاڑ) تختہ بند (بونیر) تاخونہ (سوات) اور ستھانہ۔ پھر شیخ ولی محمد نے انہیں دوسری ازواج کے پاس سندھ پہنچایا، وہاں سے ٹونک پہنچیں باقی عمر وہیں گزاری۔ سنا ہے کہ کبھی کبھی رائے بریلی بھی جاتی تھیں۔ ۱۹۰۰ء کے آس پاس وفات پائی۔

دختری اولاد

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں سیدہ سائرہ کی شادی سید اسماعیل بن اسحاق سے ہوئی تھی۔ ان کے ایک فرزند تھے: سید اسحاق عرف کلو میاں، وہ ۱۳۰۹ھ (۹۲-۱۸۹۱ء) میں فوت ہوئے۔ دو بیٹیاں تھیں: سیدہ مریم اور سیدہ ولیہ۔ ان کی اولاد کا حال ملحقہ شجرے سے معلوم ہو سکے گا۔ سید اسماعیل ۷ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۰ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء) کو چہار شنبہ کے دن فوت ہوئے۔ سیدہ سائرہ نے ان کے بعد ۲۸ رجب ۱۳۰۱ھ (۲۶ مئی ۱۸۸۴ء) کو بروز دوشنبہ وفات پائی۔

سیدہ ہاجرہ کی شادی سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے فرزند سید محمد یوسف سے ہوئی تھی۔ سید محمد یوسف نے حج سے سعادت کے بعد ۱۶ شوال ۱۲۶۶ھ (۲۵ اگست

۱۸۵۰ء) کو بہ عارضہ ہیضہ وفات پائی۔ سیدہ ہاجرہ ۶ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ (۲ نومبر ۱۸۵۹ء) فوت ہوئیں۔ ان کی اولاد کا نقشہ بھی ملحقہ شجرے سے معلوم ہوگا:

اولاد سیدہ سارہ

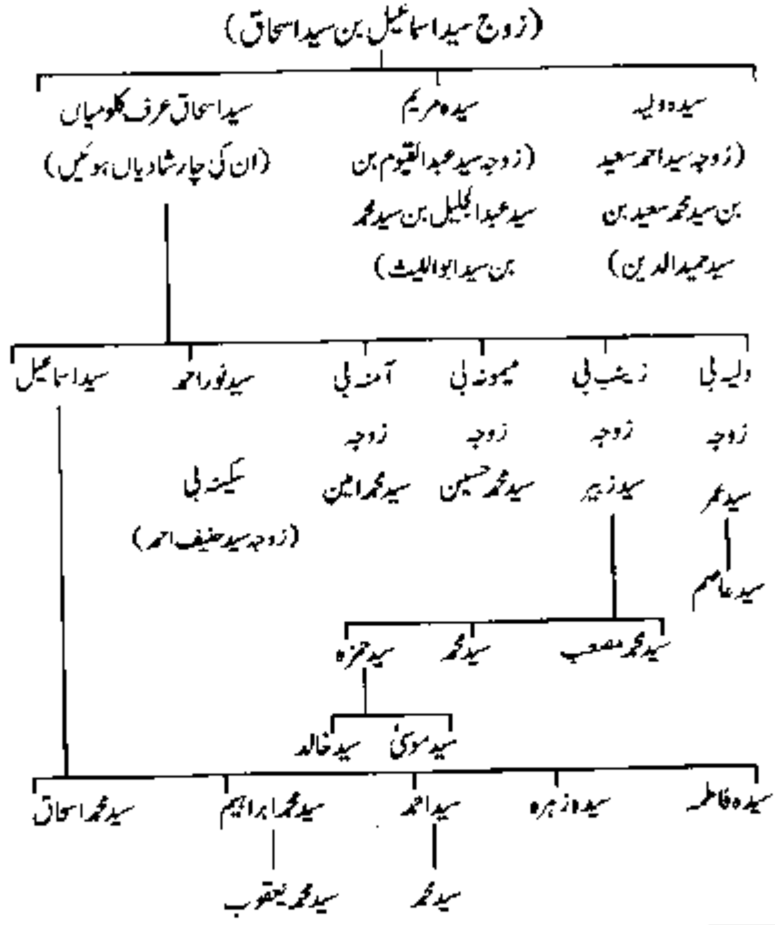
(زوج سید اسماعیل بن سید اسحاق)
سیدہ ولیہ
(زوجہ سید احمد سعید بن سید محمد سعید بن سید حمید الدین)
سیدہ مریم
(زوجہ سید عبدالقیوم بن سید عبدالجلیل بن سید محمد بن سید ابو اللیث)
سید اسحاق عرف کلو میاں
(ان کی چار شادیاں ہوئیں)
ولیہ بی
زوجہ
سید عمر
سید عاصم
زینب بی
زوجہ
سید زبیر
میمونہ بی
زوجہ
سید محمد حسین
آمنہ بی
زوجہ
سید محمد امین
سید نور احمد
سکینہ بی
(زوجہ سید حنیف احمد)
سید اسماعیل
سید محمد مصعب
سید محمد
سید حمزہ
سید موسیٰ
سید خالد
سیدہ فاطمہ
سیدہ زہرہ
سید احمد
سید محمد
سید محمد ابراہیم
سید محمد یعقوب
سید محمد اسحاق

اولاد سیدہ ہاجرہ

(زوجہ سید محمد یوسف بن سید یعقوب)

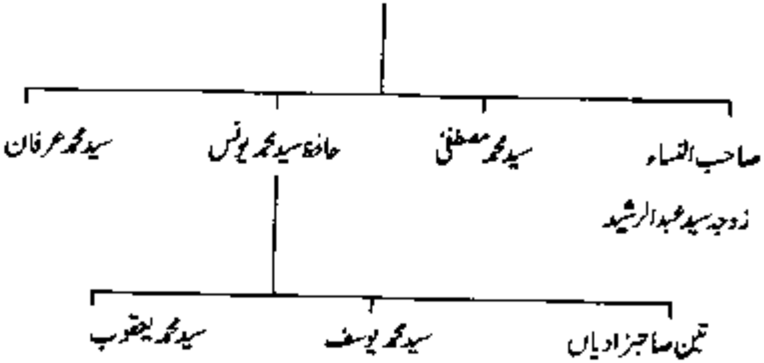
صاحب النساء
زوجہ سید عبدالرشید
سید محمد مصطفیٰ
حافظ سید محمد یونس
سید محمد عرفان
تین صاحبزادیاں
سید محمد یوسف
سید محمد یعقوب

چھیالیسواں باب:

اخلاق و عادات

در صد ہزار قرن سپہر پیادہ رو
نارد چو او سوار بہ میدانِ روزگار

ضروری گزارش

سید صاحب کی سیرت ازواج واولاد پر تمام ہوگئی، میں نے اپنے خیال کے مطابق کتاب کی ترتیب میں ایسا انداز اختیار کیا تھا کہ سید صاحب حیاتِ مستعار کے ہر دائرے میں زندہ چلتے پھرتے نظر آئیں اور پوری کتاب ان کے اخلاق و عادات کا مرقع بن جائے۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا، لیکن میں اخلاق و عادات کا باب الگ مرتب کرنے کا خواہاں نہ تھا، اسی وجہ سے بیسیوں حکایات مناسب مقامات پر درج کرتا رہا، جو اصلاً اخلاق و عادات کے باب میں آنی چاہئیں تھیں۔

کتاب طباعت کیلئے تیار ہوگئی تو احساس ہوا کہ ممکن ہے سوانح نگاری کے متداول قاعدوں کے عادی حضرات سمجھیں کہ میں نے اس سیرت کو نامکمل چھوڑ دیا اور اخلاق وعادات پر الگ کچھ نہ لکھا، اس وجہ سے زیر نظر باب مرتب کرنا پڑا، لیکن میں نے حتی الامکان کسی واقعہ کو دہرایا نہیں، صرف وہی باتیں لکھیں جو پہلے کسی شکل میں درج نہیں ہوسکیں تھیں۔ درج شدہ حکایات کی طرف محض اشارہ کردینے پر اکتفا کیا۔

نواب وزیر الدولہ کا بیان

نواب وزیر الدولہ مرحوم نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ سید صاحب "خلق" میں "اکمل" اور "خلق" میں "افضل" تھے۔ اوصاف ظاہری و باطنی کے لحاظ سے وہ قدرت کے نشانوں میں سے ایک نشان تھے۔ ایمان و عرفان میں ان کا رتبہ بہت اونچا تھا، ان کا جسم قوی تھا اور قامت معتدل، حواس صحیح تھے اور زبان صحیح، ذہن رسا تھا اور طبع ذکی۔ وہ ہمت میں بلند پایہ تھے اور عفت میں صاحب امتیاز، عقل میں کامل تھے اور فراست میں باکمال۔ شجاعت، مروت و فتوت، حلم و حیا، صبر و تواضع اور اتباع شریعت میں یگانہ تھے:

ایں شہ بالا ست تہالیست کہ از روضۂ قدس　　بہ تماشا گہ عشاق رواں ساختہ اند
ہر لطافت کہ نہاں بود پس پردۂ غیب　　ہمہ در صورت خوب تو عیاں ساختہ اند
ہر چہ بر صفحہ اندیشہ کشد کلک خیال　　شکل مطبوع تو زیباتر ازاں ساختہ اند(۱)

نواب صدیق حسن خاں

نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ اگر چہ سید صاحب نے علم ظاہر میں پوری دستگاہ حاصل نہیں کی تھی، لیکن علم باطن میں وہ درجۂ کمال پر پہنچ چکے تھے، خلقِ خدا کو راہِ ہدایت پر لگانے میں انہیں خدا کا ایک نشان سمجھنا چاہئے۔ ان کے خلفا نے وعظ و نصیحت کے ذریعے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور لوگ شاہراہِ کتاب و سنت پر چلنے لگے۔ ان کے مواعظ و نصائح کی برکات اب تک جاری ہیں، حضرت سید کا پایہ سلوکِ ظاہر و باطن میں اتنا بلند تھا کہ انہیں دوسروں سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی:

---

(۱) وصایا حصہ اول ص:۵۲

حاصل کلام آنکہ دریں قرب زماں ایں چنیں صاحب کمالے در قطرے از اقطار جہاں نشان نہ دادہ اند و چنداں فیوض کہ ازیں جماعۂ منصورہ بخلق رسید، عشر عشیر آں از دیگر مشائخ ارض معلوم نیست۔ (۱)

ترجمہ: خلاصہ یہ کہ ماضی قریب میں سید صاحب جیسے صاحب کمال کا نشان کسی خطے میں نہیں ملتا اور ان کی جماعت منصورہ سے خلقِ خدا کو فیوض کی جو دولت ملی اس کے عشر عشیر کا سراغ بھی دنیا کے دوسرے مشائخ و علماء کے ہاں نہیں مل سکتا۔

حکیم مہدی علی

منتظم الدولہ حکیم مہدی علی سلطنت اودھ کے عقیل ترین اور منتظم ترین مدبروں میں سے تھا، نصیر الدین حیدر کے زمانے میں نائب السلطنت کے عہدے پر مامور رہا۔ صاحب ''منظورہ'' کے بیان کے مطابق وہ فہم و فراست، امور دنیا میں اور اہل فضل و کمال کی قدر شناسی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس نے سید صاحب کی بعض جنگوں کے حالات سنے تو بے تکلف اعتراف کیا:

آنچہ وسعت حوصلہ و ہمت عالی ایں سید است از ما و از سلطانِ ما صورت امکان نہ دارد با آنکہ ما مالک ملک عظیم ایم و او رئیس یک دہ ہم نیست۔ (۲)

ترجمہ: اس سید نے جس وسعت حوصلہ اور جس ہمت عالی سے کام لیا، وہ میں یا ہمارا بادشاہ نہیں دکھا سکتے، اگرچہ ہم ایک وسیع ملک کے مالک ہیں اور سید کو ایک گاؤں کی بھی ملکیت حاصل نہیں۔

اعتراف فضائل کی یہ نہایت قابل فخر دستاویزیں ہیں، لیکن آپ گزشتہ صفحات میں اس شخصیت نادرہ کے متعلق جو کچھ پڑھ چکے ہیں اسے پیش نظر رکھتے ہوئے یقیناً تسلیم

---

(۱) تقصار جیود الاحرار ص: ۱۰۹، ۱۱۰

(۲) منظورہ ص: ۹۲

کریں گے کہ سید صاحب نے جو کارنامے انجام دیے، انکی حقیقی اہمیت نواب وزیر الدولہ یا نواب صدیق حسن خاں یا منتظم الدولہ حکیم مہدی علی کے سامنے نہ تھی، ورنہ ان کے اعتراضات کا دائرہ بدرجہا زیادہ وسیع اور ولولہ افزا ہوتا۔

جسمانی قوت

سید صاحب کو خدا نے غیر معمولی جسمانی قوت عطا کی تھی جسکے بعض واقعات میں پہلی جلد کے چوتھے باب میں لکھ چکا ہوں۔ مثلاً معین خاں کے مقبرے کے سنگین چراغ دان کا واقعہ یعنی جس پتھر کو بڑے بڑے زور آور صرف گھٹنوں یا کمر تک بہ مشکل اٹھا سکتے تھے، سید صاحب نے بے تکلف اٹھا کر کندھے پر رکھا اور بیس قدم پر لے جا کر پھینکا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ جہاں گرا ہاتھ بھر زمین دھنس گئی، عام لوگ سمجھتے رہے کہ یہ انسان کا کام نہیں بلکہ کسی جن یا دیو کا کام ہے۔ پھر نصیر آباد کے پہلوان کا واقعہ جو شہ زوروں میں یکتا مانا جاتا تھا، وہ خواہ مخواہ سید صاحب سے معارض ہوا۔ آپ نے اس کے ہاتھ پکڑ کر مسجد کی دیوار سے اس بری طرح رگڑا کہ سارا زعم قوت پسینہ بن کر بہہ گیا۔ درخت کے بھاری تنے کا واقعہ جسے چالیس آدمی جگہ سے نہ ہلا سکے، سید صاحب نے بسم اللہ پڑھ کر اسے لڑھکایا، دس پندرہ نیازمند ساتھ ہو گئے اور تنے کو ندی میں ڈال کر تکیے میں پہنچا دیا۔ (۱)

میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ اس خداداد قوت کے ساتھ سید صاحب نے ابتدا میں ورزش بھی کمال پر پہنچا دی تھی۔ آپ کے بھانجے سید عبدالرحمن کہتے ہیں کہ مجھے پاؤں پر کھڑا کر کے لگاتار پانسو ڈنڑ لگاتے، پھر تھوڑی دیر کے لئے گھٹنے زمین پر ٹیک لیتے ذرا ستا کر پانسو اور لگاتے۔ (۲) بھاری مگدر ہلاتے اور تحقیق نہ کرتے کہ کتنی مرتبہ ہلایا۔ گھڑیوں تک یہی مشغلہ جاری رہتا۔ سید عبدالرحمن ہی کی روایت ہے کہ برابر چھ چھ گھڑی تک ورزش

---

(۱) وصایا حصہ اول ص: ۶۰

(۲) وصایا حصہ دوم ص ۶۰

جاری رہتی، جیں بدن مبارک کو مٹی ملا کرتا تھا، اتنا پسینہ آتا کہ مٹی تر ہو کر گر جاتی۔ ایک مرتبہ ایک دیوار میں باہر کی طرف چند مکے مارے اور اس کی اینٹیں نکال کر رکھ دیں، اسی طرح تیراکی اور غواصی میں کمال بہم پہنچایا تھا۔ اس کے حالات بھی جلد اول کے چوتھے باب میں لکھ چکا ہوں۔

فنونِ حرب

حرب وضرب اور سپہ گری کے فنون میں حیرت انگیز دستگاہ حاصل کر لی تھی، مثلاً گھوڑا دوڑانے، تلوار، خنجر، نیزہ، تیر، بندوق اور توپ چلانے میں کوئی ان کی ہمسائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ قلعوں کو توڑنے اور دشمن کو شکست دینے کی تدبیروں میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ (۱)

مولوی محمد علی رام پوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تیر اندازی کا ایک ماہر استاد اپنے ایک مشاق شاگرد کے ساتھ تکیہ شریف میں آیا۔ سید صاحب نے اسے سئی ندی کے پار ایک بڑا درخت دکھا کر فرمایا کہ اس پر تیر پھینکیے، اس نے ہر چند کوشش کی لیکن فاصلہ زیادہ تھا، اس لئے کوئی تیر درخت تک نہ پہنچ سکا۔ پھر سید صاحب نے خود کمان اٹھائی اور اس زور سے تیر پھینکا کہ وہ درخت سے بھی آگے جا کر گرا۔ استاد نے بے اختیار ہو کر آپ کے ہاتھ چوم لئے۔

شیخ ولی محمد پھلتی اور محسن خاں بریلوی کہتے ہیں کہ فتیلہ دار بندوق کے چلانے کا ایسا ڈھنگ نکالا تھا کہ ایک مرتبہ فتیلہ رکھنے کے بعد دوبارہ اس کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ میدان جنگ میں دو مشاق آدمی آپ کے دائیں بائیں صرف بندوقیں بھرتے رہتے تھے، اور آپ دائیں جانب کی بندوق دائیں کندھے پر اور بائیں جانب کی بائیں کندھے پر

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص:۵۹

رکھ کر اس تیزی سے چلاتے رہتے تھے کہ کلد ار توپ کا سا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کی سواری میں عجیب کمال بہم پہنچایا تھا۔ کیسا ہی سرکش گھوڑا ہوتا، آپ اس پر سوار ہوتے ہی قابو کر لیتے۔

مقصود و نصب العین

اس سلسلے میں تمام محنتیں اور مشقتیں اس لئے نہیں اٹھائی تھیں کہ دنیا ان کے کمالات کا اعتراف کرے اور اس طرح انہیں شہرتِ عام حاصل ہو جائے۔ حاشا و کلا، ہر فن صرف اس غرض سے سیکھا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کام دے اور خدا کے دین کی خدمت کا حق بوجہ احسن ادا ہو سکے۔ اسی غرض سے ورزشیں کیں، اسی غرض سے فنونِ حرب میں درجہ اختصاص بہم پہنچایا۔ خالصۃً للہ مرنے کے دعوے بہت سنے ہیں، لیکن اس کا مکمل عملی نقشہ صرف سید احمد بریلوی کے ہاں ملتا ہے، چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سب کام محض للہ اور لوجہ اللہ کیے، رضائے حق کے سوا کبھی کوئی شے کسی عمل کی محرک نہ ہوئی:

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر ازیں تمنائے

خدمتِ خلق

خدمتِ خلق کا جذبہ عہد طفلی ہی میں اس درجہ بے پناہ تھا کہ محلے والوں، خصوصاً بیوہ اور بے وسیلہ عورتوں کو بازار سے سودا سلف لا دیتے۔ پانی بھر لاتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا دیتے، وہ لوگ خدمت لینے میں تامل کرتے اس لئے کہ سید صاحب بزرگ خاندان کے فرد تھے، جس کے ہر شخص کی خدمت بجا لانے کو سب لوگ اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اہل خاندان سید صاحب کی ان حرکتوں کو بہت نازیبا سمجھتے لیکن آپ نے دنیا یا اہل خاندان کے تصورات کو کبھی مستحقِ اعتنا نہ سمجھا۔

نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو جب اپنے کپڑے دھونے کیلئے اٹھتے ساتھیوں کے کپڑے بھی ساتھ لے جاتے اور دھو کر لاتے۔ کسی جائز کام کو اپنے ہاتھ سے کرنے میں عار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ دلی شوق سے کرتے تھے۔ سرحد پہنچنے کے بعد اگرچہ امامِ جہاد بن گئے تھے، لیکن اپنے باورچی خانے کیلئے جب ایندھن کی ضرورت پڑتی تو جماعت خاص کے غازیوں کے ساتھ خود جنگل میں جاتے اور سب سے زیادہ لکڑیاں کاٹتے۔

اپنے ہاتھ سے کام

قیامِ امب میں ایک مرتبہ رات کے وقت مہمان آ گئے، ان کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے باورچی خانے میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ داروغہ نے پانی کے لئے کہا لیکن جن غازیوں نے یہ صدا سنی، ان سب نے سمجھ لیا کہ کوئی لے آیا ہوگا۔ سید صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو مشکیزہ اٹھا کر خود دریا پر پہنچ گئے اور پانی بھر لائے۔ یہ دیکھ کر سارے غازی پیچھے دوڑے۔ فتح ہوتی کے بعد دیکھا کہ مسجد میں قیام کی گنجائش نہیں، پاس ہاتھی بندھا کرتا تھا، اس کی وجہ سے جگہ صاف نہیں رہتی تھی، صبح اٹھے تو خود جگہ صاف کی۔

امب کے ایک برج کا کچھ حصہ بارش میں گر گیا اور دو آدمی نیچے دب گئے۔ سید صاحب فوراً کلند لے کر ملبہ ہٹانے میں لگ گئے۔ باقی برج بھی گرنے والا تھا اس لئے لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ کام میں لگے رہے اور ایک آدمی کو زندہ نکال لیا۔ پھر فرمایا: بھائیو! اگر میں تمہارے منع کرنے سے رک جاتا تو ایک مسلمان کو موت کے پنجے سے بچا لینے کا ثواب کھو بیٹھتا۔ فرمایا کرتے تھے:

> جو بھائی خدا کے واسطے نیت خالص سے چکی پیستے ہیں یا گھاس چھیلتے ہیں
> یا گھوڑا ملتے ہیں یا کپڑا سیتے ہیں یا دھوتے ہیں، تو یہ سب کام داخل عبادت ہیں
> اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں۔

ایک مرتبہ غلہ باہر پڑا تھا کہ بارش آ گئی۔ سید صاحب نے خود تمام غازیوں کے ساتھ ہو کر غلہ ڈھویا۔ ایک دفعہ باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک غازی چکی پیس رہا ہے، بے تکلف سامنے بیٹھ گئے اور دیر تک چکی پیستے رہے۔ پنجتار میں مسجد کی توسیع مطلوب تھی، فرمایا ہر غازی پانچ پانچ پتھر باہر سے اٹھا کر لائے۔ خود سید صاحب نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ غازیوں نے عرض کیا کہ آپ رہنے دیں، ہم اٹھا لیتے ہیں۔ فرمایا: مجھے کارِ خیر سے کیوں روکتے ہو؟

اسی شانِ تربیت نے غازیوں میں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا عجیب جذبہ پیدا کر دیا تھا، مثالیں ان کے حالات میں پیش ہوں گی۔

اتباعِ سنت

نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے سید صاحب کو سنت کی پیروی اور بدعت سے پرہیز میں نہایت بلند درجہ عطا کیا تھا۔ اگر کہا جائے کہ آپ کا وجود صرف اتباعِ سنت کی نفاستوں کا مجموعہ تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ (۱) آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے جو ظاہری اور باطنی فضائل و مکارم عطا فرمائے، وہ سب شریعت کی پابندی اور سنت کے اقتدا کی برکت سے حاصل ہوئے:

مولوی از خود نہ شد مولائے روم   تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد (۲)

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بنگال سے منتہائے گجرات تک اور اقصائے دکن سے منتہائے سرحد تک، پھر افغانستان اور دوسرے علاقوں میں جہاں جہاں سید صاحب یا ان کے خلفاء کے قدم پہنچے، بدعتیں مٹ گئیں اور سنت کی پیروی کرنے والے حضرات جا بجا پیدا ہو گئے۔

---

(۱) وصایا حصہ اول ص: ۱۸

(۲) وصایا حصہ اول ص ۲۱

مساوات

سید صاحب زندگی بھر مساوات پر عمل پیرا رہے۔ لشکر میں تقسیم غلہ کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر لیا تھا، جتنا غازی بھائیوں کو ملتا اتنا ہی آپ لیتے۔ البتہ مہمانوں کی خاطر داری کے سلسلے میں آپ کو الگ کھانا پکوانا پڑتا اور بعض اوقات ضرورۃً تکلف بھی کرتے، تاہم اس کا بوجھ کبھی بیت المال پر نہ ڈالا۔ اہل سرحد میں سے جو لوگ ملنے کے لئے آتے، وہ اکثر تحائف لے کر آتے، یہ تحائف الگ رہتے اور انہیں لوگوں کی مہمانداری میں صرف ہوتے۔ مہمان اگر کھانا پکنے سے پیشتر آجاتے تو ان کیلئے رسد لے لی جاتی، اگر کھانا پکنے کے بعد اور کھانے سے پہلے آتے تو سید صاحب اپنی جماعت میں سے کچھ کھانا منگا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ کبھی پورا کھانا مہمانوں کو دیدیتے اور خود اپنی جماعت والوں کے ساتھ بیٹھ کر جو کچھ پکا ہوتا، تناول فرما لیتے۔

ہجرت ثانیہ کے سفر کے وقت سید صاحب کی اہلیہ امیدواری سے تھیں اور وضع کا وقت قریب تھا۔ لہٰذا آپ نے ان کے لئے پالکی کا انتظام کر دیا۔ ارباب بہرام خاں کی مستورات کے لئے حسب دستور یابو مہیا کئے گئے، انہوں نے سوار ہونے سے انکار کر دیا، سید صاحب دو تین میل جا چکے تھے، یہ خبر ملی تو ارباب کو پیغام بھیجا:

> میں آپ کو مومن سمجھتا ہوں اور مومن کی خوشامد و خاطر داری اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ یقین ہے کہ کوئی مومن جہاد فی سبیل اللہ کی عبادت عظمٰی کے عشق و محبت کے باعث میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ میں اپنی بیوی کو دوسری عورتوں پر ترجیح نہیں دیتا، لیکن اب وہ امیدواری سے ہے اور خاص اس حالت میں اسے رعایت کا حق پہنچتا ہے۔ اگر یہ عذر نہ ہوتا تو وہ بھی عام مستورات کی طرح یابو پر سوار ہوتی۔

کئی مرتبہ ایسی حالت پیش آئی کہ آپ کیلئے کھانا تیار ہو گیا اور غازیوں کے لئے غلہ

نہ مل سکا، آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور جب تک سب غازیوں کے لئے وہی کچھ مہیا نہ ہوا جو آپ کے لئے تھا، اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

عبادت وریاضت

نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں: عبادت و ریاضت کا ایسا ذوق تھا کہ سالہا سال تک عشاء، فجر کی نمازیں ایک وضو سے ادا فرماتے رہے۔(۱) یہاں تک کہ عبادت کرتے کرتے صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: مدت تک یہ دستور رہا کہ رات کا آخری نصف حصہ صرف دو نفلوں میں بسر ہو جاتا۔(۲) ارادت مندوں کو بار بار تاکید کرتے کہ رات کے قیام کا خاص خیال رکھو۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدا کے فضل وکرم سے جو برکات حاصل ہوئیں وہ شب بیداری اور وقتِ سحر کے عجز و نیاز کا ثمرہ ہیں۔

رضا بہ قضا

رضا بہ قضا کا مطلب یہ ہے کہ جو حالت پیش آجائے اسے خوش دلی سے قبول کر لینا اور دل میں خفیف سا رنج بھی پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ مقام صرف کامل مومنوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں اسی مقام کو "رَضُوْا عَنْهُ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صحابہ کرامؓ خدائے پاک سے راضی رہے، کوئی سختی کوئی تنگی اور کوئی مصیبت ان کی رضا و خوشنودی کو مکدر نہ کر سکی۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ سید صاحب کو طرح طرح کے رنج پہنچے، قسم قسم کی تکلیفیں اور سختیاں پیش آئیں، لیکن ان کی زبان ہمیشہ خدا کی حمد میں سرگرم رہی اور لبوں پر پروردگار کے شکر کے سوا کبھی کوئی کلمہ نہ آیا۔ اس کی مثالیں کتاب میں جا بجا پیش ہو چکی ہیں۔ ہر بڑے حادثے اور ہر شدید آفت کے بعد برہنہ سر ہو کر دعا کرتے اور فرماتے کہ بھائیو! جو مصیبت ہم پر آئی یہ ہماری کسی غلطی اور خطا کا نتیجہ ہوگی:

---

(۱) وصایا حصہ اول ص: ۲۵۰

(۲) وصایا حصہ اول ص: ۲۶۵

در کوئے مراد خود پسنداں دگر اند — در وادیٔ عشق مستمنداں دگر اند
آناں کہ بجز رضائے جاناں طلبند — آناں دگر اند و دردمنداں دگر اند

عفو و درگذر

عفو و درگذر کی بے شمار مثالیں عرض کی جا چکی ہیں، مثلاً جن لوگوں نے جنگ شیدو کے موقع پر زہر دیا تھا انہیں بھی نہ محض معاف کیا بلکہ ارادت مندوں کے غیظ سے دو مرتبہ بچایا۔ جنگ اکوڑہ سے پیشتر ایک جاسوس پکڑا آیا تھا، اسے معاف کر کے لشکر سے باہر نکال دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری فطرت ابتدا سے یہی ہے کہ دوسروں کی بدی کے عوض بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کروں۔

حلم و حیا اور مروت

حلم کا ایک نہایت سبق آموز واقعہ اس زمانے کا ہے جب آپ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے۔ یعنی ایک پٹھان نے آپ کو غلط فہمی میں چور سمجھ کر پکڑ لیا اور آپ اسے نرمی سے سمجھاتے رہے کہ بھائی تجھے دھوکا ہوا ہے، پٹھان کا جوش بڑھتا گیا، آپ کے رفیقوں کو خبر ملی تو وہ تلواریں اور بندوقیں لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ یہ صورت دیکھ کر پٹھان کا رنگ فق ہو گیا، آپ نے فرمایا، فصل میں چھپ جاؤ اور ساتھیوں کو واپس لے گئے۔

ایک عجیب واقعہ سدو خاں کا ہے، یہ شخص پہلے درانیوں کے پاس تھا، پھر سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ جب پائندہ خاں تنولی سے جنگ ہوئی تو سید صاحب کا دیا ہوا سامان لے کر تنولیوں سے جا ملا، وہاں بدسلوکی ہوئی تو بے تکلف سید صاحب کے پاس لوٹ آیا۔ ایک موقع پر اس نے مال غنیمت کی کچھ چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ غازیوں نے ان چیزوں کا مطالبہ کیا تو اس نے سید صاحب کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا، آپ تک یہ

بات پہنچی تو اسے خلوت میں بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں اپنے سے زیادہ بہادر نہیں سمجھتا لیکن لشکر اسلام میں ایسی بات زبان پر لانی مناسب نہ تھی۔ پائندہ خاں کے پاس سے آیا تو بولا کہ اس نے میرا سارا سامان چھین لیا، اب آپ کچھ دلائیں۔ سید صاحب نے پوچھا تم اس کے پاس کیوں گئے تھے؟ بولا: تقدیر لے گئی۔ آپ نے حکم دے دیا کہ اسے سارا سامان دلا دیا جائے۔ پھر فرمایا: میری یہ حالت ہے کہ غایت شرم سے اس کے چہرے پر نظر نہیں ڈالتا، اس کی بے باکی دیکھو کہ سب کچھ کر چکنے کے باوجود اپنی چیزیں مانگتے ہوئے بالکل تامل نہیں ہوا۔

پیر داد خاں لوہانی کا واقعہ کتاب میں تفصیلاً مرقوم ہے، حلم و مروت کی ایسی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔

عفت

حاجی زین العابدین فرماتے ہیں کہ ہزاروں عورتوں نے بیعت کی، ان میں سے پردہ نشین بھی تھیں اور بعض بے پردہ بھی:

اما نظر آنجناب گاہے بروئے ہیچ کس از زناں نیفتاد۔

ترجمہ: لیکن آنجناب کی نظر کبھی کسی کے چہرے پر نہ پڑی۔

اسی عفت و عصمت کی آغوش میں غازیوں نے تربیت پائی تھی۔ ایک مرتبہ سرحد کی مستورات نے کہا سید صاحب کے غازی یا تو خواہشات جنسی سے فطرۃً محروم ہیں یا پھر اولیاء اللہ ہیں۔ اس لئے کہ غلہ پسوانے کی غرض سے پن چکیوں پر آتے ہیں لیکن کبھی کسی نے نگاہ اٹھا کر کسی عورت کو نہیں دیکھا۔

شجاعت

سید صاحب شجاعت میں واقعی بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میرے لئے جان

دے دینا ایسا ہی ہے جیسا تنکا توڑ کر پھینک دینا۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ گھمسان کے رن میں جب گولوں اور گولیوں کا مینہ برسا کرتا تھا تو آپ اپنے غازیوں کو انتہائی اطمینان کے ساتھ مفید نصیحتیں فرمایا کرتے تھے، لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی اور چہرے پر شادمانی کی بہار جلوہ گر ہوتی۔ جن معرکوں میں شیروں کا پتا پانی پانی ہو جاتا، ان میں آپ کی پیشانی یا آپ کے چہرے پر کبھی خفیف سا تغیر بھی رونما نہ ہوا۔ (۱)

فراست

آپ فرماتے تھے کہ مجھے خدا نے تین چیزوں کی پہچان عطا کی ہے: ایک گھوڑے، دوسرے تلوار، تیسرے آدمی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مومن ہے، بلکہ جوتا بھی دیکھ لوں تو بتا دوں کہ یہ مومن کا جوتا ہے۔ مولوی امام الدین بنگالی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ کیا کبھی خطا بھی ہو جاتی ہے؟ فرمایا ہاں کبھی خطا بھی ہو جاتی ہے، یہ وحی کا معاملہ نہیں کہ خطا کا امکان بالکلیہ زائل ہو جائے۔ پھر خود ہی اعتراف کیا کہ بعض لوگوں کے متعلق ایمان کا گمان ہوا، لیکن وہ منافق نکلے۔ ایمان و نفاق بدلتے بھی رہتے ہیں، کیا عجب ہے کہ جب میں نے ان کو مومن سمجھا تو وہ مومن تھے، بعد ازاں ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو گیا۔

سخاوت

سخاوت کے باب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، خدا نے سید صاحب کو ہر دور میں دنیوی مال و ثروت کے وسیع ذخائر عطا کیے، لیکن آپ نے کبھی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھی، کسی دنیوی چیز سے دل نہ لگایا، جو کچھ ہاتھ آیا ضرورت مند بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ کر دیا۔ دنیا سے اٹھے تو کوئی شَے ایسی نہ تھی جسے ان کا ترکہ

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص: ۷۵

کہا جا سکتا، جتنی جائداد انہیں میراث میں ملی تھی وہ بھی اپنے پاس نہ رکھی بلکہ چھوڑ کر راہِ ہجرت میں قدم اٹھایا۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک میں تامل نہ کیا، لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ حسنِ سلوک صرف معاش کے معاملات میں جائز ہے، باقی رہے معاملاتِ معاد و دین تو ان میں کسی کے ساتھ نرمی، ملائمت یا رعایت نہیں برتی جا سکتی۔

صبر و استقامت

صبر و استقامت کا جو نمونہ سید صاحب نے پیش کیا ہے اس کی مثال قرنوں میں بھی ملنی مشکل ہے۔ صورت حال یہ نہ تھی کہ تلخ و ناگوار حالات پیش آ گئے تھے اور انہیں جھیل لیا، صورت یہ تھی کہ بظاہر نہایت خوشگوار حالات موجود تھے، اکرام و اعزاز کی زندگی کے سیکڑوں وسائل مہیا تھے، لیکن انہیں دینِ حق اور رضائے باری تعالیٰ کی خاطر چھوڑ کر تکالیف و شدائد کی راہ اختیار کی۔ جن لوگوں کو ان کی ذات گرامی سے معاً بہترین دنیوی فوائد حاصل ہونے کے امکانات تھے، وہ بھی دشمن بن گئے، اور جتنی تکلیفیں ان کے بس میں تھیں، بے دریغ پہنچائیں، لیکن آپ نے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑی۔ دین کی سربلندی کے خواہاں تھے۔ ذاتی غرض کوئی نہ تھی، بایں ہمہ جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا انہیں حیرت انگیز اور بے مثال صبر و استقامت سے یوں برداشت کر لیا گویا اس راہ کے کانٹے بھی ان کے نزدیک پھولوں سے کم نہ تھے۔ سچ ہے:

مخمور مکافات بر خلد و سقر آویخت
مشتاق عطا شعلہ ز گل باز نہ دانست

توکل

سید صاحب کا سارا کاروبار ابتدا ہی سے توکل پر تھا، ارادت مندوں کی ایک بڑی جماعت اسی وقت سے ساتھ ہو گئی تھی جب آپ کے وسائل معاش لاشئے محض تھے۔ لیکن

نہ کبھی خیال آیا کہ ان کے لئے روٹی کہاں سے میسر آئے گی اور نہ ارادت مندوں کے لئے معاش کی قلت کبھی عناں گیر شوق بن سکی۔ آپ کے انتظامات ابتدا سے مولانا محمد یوسف پھلتی کے ہاتھ میں تھے، وہ کبھی پریشان ہو کر بے سامانی کا ذکر چھیڑتے تو آپ فرماتے: چپ رہئے اور دیکھئے خدا کا مقرر کیا ہوا رزق کیوں کر پہنچتا ہے۔ چنانچہ رزق برابر پہنچتا رہا اگرچہ غازیوں کی تعداد خاصی بڑی بھی ہو گئی اور نہ پہنچا تو سید صاحب سمیت سب نے ذکر الٰہی سے اطمینانِ قلب کا انتظام کر لیا۔

آپ کے لشکر میں پشاور کا ایک شخص آ گیا تھا، جس کا نام عبدالغفار تھا، اسے جعلی سکے بنانے میں کمال حاصل تھا۔ لوگ اسکے روپے کو غفار خانی کہا کرتے تھے، اس کی خواہش تھی کہ سید صاحب کو بے شمار روپے بنا دے، لیکن آپ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں روپے نہ بنائیے۔ سکھوں کے علاقے میں جا کر جو جی میں آئے کیجئے اور اگر کچھ رقم ہاتھ آئے تو اس سے سامانِ جنگ خرید کر بھیج دیجئے۔ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو قلب سازی کا کام چھوڑ دیجئے۔

جب آپ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو ایک کیمیا گر آپ کا بہت معتقد ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے گھر میں دعوت کی اور اسی وقت سونا بنا کر دکھایا۔ چونکہ اس زمانے سے جہاد فی سبیل اللہ کے انتظامات پیش نظر تھے، اس لئے کیمیا گر چاہتا تھا کہ آپ نسخہ بھی لے لیں اور ترکیب بھی سیکھ لیں۔ آپ نے پوچھا یہ سونا آگ کی تپش سے متغیر بھی ہو سکتا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہزار مرتبہ آگ میں ڈالئے، اس کی صورت نہیں بدلے گی اور قلب ظاہر نہ ہو گا۔ یہ سن کر فرمایا: اگر آپ کا دعویٰ سچا ہے تو یہ آپ کے لئے حلال ہے، مگر میرے لئے سخت نقصان کا باعث ہو گا۔ اس لئے کہ میرے دل کو مالکِ حقیقی کے فضل و رحمت سے ہٹا کر اس شئے پر لگا دے گا، میں اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔

غازیوں پر شفقت

غازیوں پر شفقت کا یہ حال تھا کہ ہر غازی آپ کو ماں اور باپ دونوں سے بڑھ کر سمجھتا تھا اور آپ انہیں بچوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ ہمارے جو بھائی جہاد فی سبیل اللہ کے کارِ خیر میں شرکت کے لیے آئے، ان کی قدر و قیمت ہمیں پہچانتے ہیں۔ عبدالصمد خاں خیبری کا بیان ہے کہ میں نے سردارانِ پشاور کی بھی نوکری کی، سکھوں کے پاس بھی ملازم رہا، لیکن جو قدردانی سید صاحب کے پاس دیکھی کہیں نہ دیکھی، اور یقین ہے کہ ایسی قدردانی روئے زمین پر کہیں نہ ہوگی۔ سید صاحب کی زندگی میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی غازی نے آپ کی کسی بات کو دلی محبت کے خلاف سمجھا ہو یا آپ کی شفقت کسی غازی پر کم ہوئی ہو۔

بالاکوٹ کے میدان میں بہت سے غازی صرف اس لئے شہید ہوئے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑ گئی تھی کہ سید صاحب نہیں ملتے، یہ سنتے ہی وہ گولیوں کی بارش سے بے پروا ہو کر میدان میں دیوانہ وار آپ کو تلاش کرنے لگے اور جابجا شہید ہو گئے۔ تاریخ میں بڑے بڑے سلطانوں کے ساتھ بھی ذاتی محبت کی ایسی جھلک شاید ہی مل سکے، جن سے وابستگانِ دامن کو ہر قسم کے منافع کی امید تھی، سید صاحب کے ساتھ غازیوں کا صرف دینی رشتہ تھا، لیکن آپ کی محبت نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

عام مسلمانوں کو بھی تکلیفوں سے بچانے کا بڑا ہی خیال رکھتے تھے۔ مثلاً اگر مولانا شاہ اسماعیل کی تجویز کے مطابق بالاکوٹ سے آگے بڑھ کر کشمیر میں داخل ہو جاتے تو کامیابی کے روشن مواقع نظر آ رہے تھے، لیکن جب پکھلی کے امرا سے سنا کہ اس حالت میں سکھ مسلمانوں کو گزند پہنچائیں گے اور ان کے ساتھ لڑے بغیر قدم آگے نہیں بڑھانا چاہئے تو لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ یہی دیکھ کر مولانا شاہ اسماعیل نے کہا کہ آپ کے دل

میں رسول پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں غرباء کے لئے رحم بہت زیادہ ہے، ورنہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کو گرفتار کر کے سپر بنالیں تو اس حالت میں بھی ان کے خلاف قتال رکنا نہیں چاہئے۔

جانوروں پر رحم

جانوروں پر بھی بے حد رحیم و شفیق تھے۔ سرحد ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ زمان درانی کے وکیل جمال الدین نے ایک مرتبہ ایک کتے پر تیر چلایا، وہ بیچارا چیختا چلاتا ہوا بھاگا، سید صاحب بہت خفا ہوئے۔ فرمایا کتا دیوانہ نہیں تھا کہ اسے مارنا ضروری ہوتا، پھر اس پر تیر کیوں چلایا؟ آپ خدا سے نہ ڈرے کہ اس کی مخلوق کو ناحق اذیت پہنچائی؟(۱) قاضی مدنی نے یہ سنا تو کتے کے پیچھے بھاگے اور اس کے سر سے تیر نکال کر دم لیا۔

راج دواری میں شہد کی مکھیاں بہت ہوتی ہیں اور لوگ گھروں میں پالتے ہیں۔ چھتہ شہد سے بھر جاتا ہے تو شہد نکال کر مکھیوں کو دوسری جگہ بٹھا دیتے ہیں۔ سید صاحب نے ایک دن شہد کی ایک مکھی کو تنہا اڑتے دیکھا۔ فرمایا اس بیچاری کے لئے تھوڑے سے شہد کا انتظام کر دو تاکہ بھوکی نہ رہے۔

دعائے ہدایت

اگرچہ سکھوں کے ساتھ لڑائیاں جاری تھیں، لیکن ان کیلئے بھی دل میں شفقت کا دریا موجزن تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ ہر نماز فرض کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے: خدایا ان لوگوں کو ہدایت عطا فرما اور ایمان و اسلام کی دولت دیکر ہمارے بھائی بنادے۔(۲)

یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی سیاست ایمانی اور مربیانہ تھی، سلطانی نہ تھی۔ یعنی ہر معاملے میں صرف اصلاح منظور تھی اور افراد و جماعات کی بہتری اور بھلائی کے سوا کچھ

---

(۱) منظورہ ص ۹۲

(۲) منظورہ ص ۹۳

مد نظر نہ تھا۔

بدن بہت پاکیزہ تھا نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ اگر میلا لباس بھی پہنے ہوئے ہوتے تو بدن سے ایسی خوشبو آتی کہ عطر اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے۔ (۱)

صحبت کی تاثیر

کئی واقعات کتاب میں لکھے جا چکے ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نیک بخت اصحاب ایک نظر میں باطل سے تائب ہو کر حق کی طرف آئے اور کم سے کم وقت میں درجات عالیہ پر پہنچ گئے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ لوگ آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تو محبت و رغبت کے جذبات دلوں پر غالب رہتے اور جب شاہ اسماعیل کے پیچھے نماز پڑھتے تو خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا۔

طریق نصیحت

سید صاحب کا طریق نصیحت نہایت دلکش اور مربیانہ تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالتعیین کسی کو مخاطب نہ فرماتے تھے، بلکہ مجموعی انداز میں وعظ فرماتے۔ سمجھنے والا خود بخود سمجھ جاتا۔ اسی طرح کوئی کام ہوتا تو جب بھی کسی کو تعین کے ساتھ بہت کم فرماتے۔ کہہ دیتے کہ بھائیو! یہ کام ہے۔ مقصود یہ تھا کہ ہر ایک سبقت بالخیرات کا ثواب حاصل کرے اور سب کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ نیکی کا جذبہ تازہ رہے۔ کالے خاں کا واقعہ لکھ چکا ہوں، وہ ٹھوڑی منڈاتے تھے، سید صاحب نے انہیں کبھی منع نہ کیا۔ ایک روز خان صاحب ٹھوڑی منڈا کر بیٹھے ہی تھے کہ سید صاحب پہنچ گئے۔ ٹھوڑی کو دست مبارک سے پکڑ کر فرمایا: خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔ بس اس کے بعد کالے خاں نے ٹھوڑی نہ منڈائی۔

---

(۱) منظورہ ص: ۱۵۸

طریق خطاب

طریق خطاب نہایت دل آویز تھا، غازیوں کو ہمیشہ بھائی کہہ کر پکارتے۔ امراء اور اکابر ملنے کے لئے آتے تو کسی کو شیخ بھائی، کسی کو خان بھائی، کسی کو سید بھائی کہتے۔ جس زمانے میں پیر خاں مورانوی کھبل میں تھے، منشی محمدی انصاری نے سید صاحب کی طرف سے انہیں خط لکھا تو اس کا آغاز یوں تھا: ''از امیر المومنین بہ مطالعہ اخلاص نشان پیر خاں'' دیکھتے ہی سید صاحب پریشان ہوگئے۔ فرمایا: انصاری بھائی! ''اخلاص نشان'' تو بادشاہ لوگ نوکروں کو لکھا کرتے ہیں، مجھے اس سے سخت کراہت ہے۔ منشی صاحب نے عرض کیا کہ اخلاص نشان ہونا سعادت کا نشان ہے، لیکن میں آئندہ ''برادر اخلاص نشان'' لکھا کروں گا۔

پاسِ شریعت کا ایک عجیب واقعہ

پائندہ خاں تنولی کا بھائی مدد خاں سید صاحب کا بڑا معتقد تھا۔ چونکہ اسے جدی املاک سے نکال دیا گیا تھا اس لئے سید صاحب ہی کے پاس رہنے لگا۔ خان تنول سے مصالحت کی گفتگو ہوئی تو اس میں یہ بھی طے ہوگیا کہ مدد خاں کی جائیداد اسے مل جائے، لیکن مدد خاں بھائی کے پاس جانے سے کتراتا تھا، کہتا تھا کہ وہ مجھے قتل کرادے گا۔ اس بنا پر ایک روز مدد خاں نے تجویز پیش کی کہ پائندہ خاں کے بیٹے جہاں داد کو بطور یرغمال بلا لیجئے، پائندہ خاں مجھے ماردے تو آپ جہاں داد کو مروا ڈالیں۔ سید صاحب نے یہ سنا تو مسکرا کر فرمایا:

> ایں امر خلاف شرع از من بوجود آمدنی نیست کہ پائندہ خاں ترا بکشد من بہ قصاص تو پسر اورا کہ بے گناہ محض است بکشم۔ اگر قدرت یابم قاتل ترا البتہ خواہم کشت۔

ترجمہ: مجھ سے یہ خلافِ شریعت کبھی نہ ہوگی، کہ اگر پائندہ خاں تجھے مارڈالے تو میں بدلے میں اسکے بیٹے کو جس غریب کا کوئی گناہ نہیں قتل کر دوں، ہاں اگر مجھے قابو حاصل ہوگا تو تمہارے قاتل سے ضرور قصاص لوں گا۔

اعترافِ خطا

انسان کو جب قبولِ عام کا منصب حاصل ہو جائے تو اپنی غلطیوں اور خطاؤں کے اعتراف میں اکثر بخل سے کام لیتا ہے۔ سید صاحب اس خصوصیت میں بھی سب سے الگ تھے۔ میرے علم کے مطابق ان سے دو مرتبہ خطائیں سرزد ہوئیں، ایک مرتبہ مکہ میں بچی کو دودھ پلانے پر اصرار کے ضمن میں اپنے ایک ارادت مند کے بچے کا پورا خیال نہ رکھا، جب اس خطا کا احساس ہوا تو نہ محض اس شخص سے معافی مانگی بلکہ اپنے ارادت مندوں کو جمع کر کے سب کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا اور دوبارہ عفو کے خواستگار ہوئے۔ یہ واقعہ میں بہ سلسلہ حج لکھ چکا ہوں۔ دوسری مرتبہ جنگِ مایار سے صرف ایک دن پیشتر تورو میں ایک ارادت مند کو بے ساختہ "مردود" کہہ دیا، جب آپ کو یہ واقعہ یاد دلایا گیا تو سب کے سامنے اس شخص سے معافی طلب کی۔ حق پرستی اور حق شناسی کی ایسی مثالیں ہمارے زمانے میں ہی نہیں بلکہ اکثر ادوار و اقطار میں بہت ہی کم پائی گئی ہیں۔

کارگیری اور احترام

سید صاحب بزرگی کے باوجود چھوٹوں بڑوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہر شخص کو ہمیشہ عزت کے خطاب سے مخاطب فرماتے تھے اور ہر آدمی سے اس کی طبیعت و صلاحیت کے مطابق دینی کام لیتے تھے۔ ان کے پاس ایسے لوگ بھی پہنچتے رہے جن کی طبیعت موزوں تھی، ان سے فرمایا کہ اہم دینی مسائل کو سادہ الفاظ میں نظم کر دو تا کہ لوگ انہیں یاد کر لیں۔ مثال کے طور پر مولوی محمد قاسم پانی پتی کے والد غلام محمد

بہت کبیر السن تھے، اپنے بیٹے کو واپس لے جانے کے لئے سرحد پہنچے تھے، سید صاحب کا کارخانہ دیکھ کر خود وہیں مقیم ہو گئے۔ آپ اس کبیر السن کا اتنا احترام کرتے تھے کہ شاید ان کے بچوں نے بھی کبھی نہیں کیا ہوگا، وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے، اس لئے قرآن پڑھانے پر لگا دیا۔

مہر اور تاکیدی علامات

پہلے سید صاحب کے پاس مہر نہ تھی، جب مختلف اکابر کے نام خط بھیجنے پڑے تو چاندی کی ایک مہر بنوائی جس پر "اسمہ احمد" کندہ کرایا۔ ارادت مندوں کے لئے خاص نشان تجویز کر رکھے تھے، مثلاً جب کسی کو خاص تاکید کرنی مقصود ہوتی تو خط پر اپنے دست مبارک سے "کلمۃ اللہ کافی" تحریر فرما دیتے تھے۔

عادات

جب آپ کے لئے کوئی پر تکلف کھانا پکا کر لاتا تو عادت تھی کہ یا تو سب ارادت مندوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے یا سب میں تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیتے۔ اسی طرح عادت تھی کہ عشاء کی نماز کے بعد لیٹ جاتے تو فرماتے، بھائیو ہم سے کچھ پوچھو، جو کچھ پوچھا جاتا بتا دیتے۔ بعض سوالات کے متعلق فرما دیتے کہ یہ کل پوچھنا، بعض اوقات خود ہی باتیں شروع کر دیتے، اکثر غازی آپ کے پلنگ کے ارد گرد زمین پر لیٹ جاتے اور باتیں سنتے سنتے سو جاتے۔

مرغوب کھانا

سید صاحب نے ہر قسم کے کھانے بھی کھائے اور فاقے بھی کیے، جو کچھ مل جاتا کھا لیتے کبھی نہ کہا کہ فلاں کھانا نہیں کھاؤں گا، لیکن ویسے آپ کو کلیجی بہت پسند تھی۔ ایک

دفعہ نصیرآباد گئے، کریم الدین خادم ساتھ تھا، وہاں کلیجی زیادہ کھالی اور پیٹ میں گرانی محسوس ہوئی۔ خادم نے عرض کیا کہ چورن کھا لیجئے۔ فرمایا: دیکھو ابھی اس کا علاج کرتا ہوں، نصیرآباد سے چلے اور کھیتوں میں پہنچے تو جوتا اتار کر تیزی سے دوڑے، بہت دور نکل گئے، پھر سایے میں کپڑا بچھا کر لیٹ گئے، اس طرح گرانی دور ہوگئی۔

معمولات

سید صاحب سے کچھ معمولات بھی منقول ہیں۔ مثلاً:

۱۔ میدانِ جنگ میں ہر شخص کو ہدایت فرماتے کہ سورۂ قریش گیارہ مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلو اور لوگوں سے بھی سنا کہ خطرے کے اوقات میں اس سورت کا پڑھنا باعث برکت ہوتا ہے۔

۲۔ توسیع رزق کے لئے مختلف شخصوں کو کئی چیزیں بتائیں:

الف: سورۂ مزمل اس طرح پڑھنا کہ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یہاں تک کہ سورۂ مزمل آہستہ آہستہ سوا لاکھ مرتبہ پوری ہوجائے۔

ب: اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف اور سورۂ فاتحہ پھر گیارہ ہزار مرتبہ یَا مُغْنِیْ یَا بَاسِطُ یہ چالیس روز کیا جائے۔

ج: اول و آخر درود شریف اور گیارہ سو بار اَللّٰہُ الصَّمَدُ.

د: اول و آخر درود شریف اور گیارہ سو بار اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ

۳۔ تقویت حافظہ کے لئے نواب وزیر الدولہ کی درخواست پر تحریر فرمایا کہ نماز فجر اور نماز مغرب کے بعد سات مرتبہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پڑھا جائے۔

اشعار

جب محبت الٰہی جوش مارتی تو اکثر مندرجہ ذیل اشعار پڑھا کرتے تھے:

اے آنکہ زنی دم از محبت   از ہستی خویشتن بہ پرہیز
برخیزد بہ تیغ تیز بنشیں   یا از سر راہ دوست بر خیز

* * * * * * * *   * * * * * * * *

در مسلخ عشق جز نکو را نہ کشند   لاغر صفتانِ زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادقی زکشتن مگریز   مردار بود ہر آنکہ اُو را نہ کشند

* * * * * * * *   * * * * * * * *

دلم بہ راہ تو صد پارہ بادو ہر پارہ   ہزار ذرہ و ہر ذرہ در ہوائے تو باد(۱)

* * * * * * * *   * * * * * * * *

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر ازیں تمنائے

* * * * * * * *   * * * * * * * *

گر نثار قدم یار گرامی نہ کنم   گوہر جاں بچہ کارے دگرم باز آید(۲)

تہجد کے وقت عموماً یہ شعر آپ کی زبان سے سنا گیا:

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز اینکہ بخوانیم
در دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم

تصانیف

سید صاحب کی بعض تصانیف بھی ہیں، مثلاً ”صراط مستقیم“ اس کی عبارتیں اگرچہ

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص:۵۸

(۲) نکھار جیو دال احرار ص:۱۱۰

مولانا شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ کی ہیں، لیکن مطالب تمام تر سید صاحب کے ہیں۔ حالت یہ تھی کہ سید صاحب پیش نظر مدعا بیان فرماتے، شاہ اسمٰعیل یا مولانا عبدالحیٔ اسے لکھ کر لاتے۔ اگر ان کی عبارت اظہار مدعا کے لئے کفایت نہ کرتی تو فرماتے کہ پھر لکھیے، بعض مطالب کو پانچ پانچ مرتبہ لکھوایا۔ پھر مکاتیب کا مجموعہ خاصا بڑا ہے، اگرچہ اکثر مولانا شاہ اسمٰعیل، منشی محمدی انصاری یا بعض دوسرے منشیوں کے لکھے ہوئے تھے، لیکن جو کچھ لکھنا ہوتا تھا سید صاحب ہی اس کا مضمون عموماً بتایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ تین رسالوں کا مجھے علم ہو سکا:

۱۔ **تنبیہ الغافلین:** یہ رسالہ فارسی میں تھا، پہلے ٹائپ میں بہ مقام کلکتہ چھپا، پھر لیتھو میں اسے بہ مقام لاہور چھپایا گیا، اور مولانا ولایت کا رسالہ ''عمل بالحدیث'' بھی ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اردو ترجمہ ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے۔

۲۔ **رسالہ در نماز و عبادات:** میں نے پہلے لکھا تھا کہ یہ میرے علم کے مطابق کبھی نہیں چھپا، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک کے ایک مجموعے میں دیکھا تھا، اب معلوم ہوا کہ غالباً یہی رسالہ تھا جو ''حقیقت الصلوٰۃ'' کے نام سے ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) میں کلکتہ کے اندر چھپا تھا۔ اس کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی تفسیر بھی شائع ہوئی تھی، جسے مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی نے ستمبر ۱۹۶۵ء کے ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) میں شائع فرما دیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے یہ تفسیر ۱۲۳۵ھ میں لکھنؤ کے چند جید علماء کے سامنے بھی کی، مولانا اشرف صاحب لکھنوی سے سید صاحبؒ کی بیعت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے:

الف۔ انہوں نے (سید صاحبؒ نے) سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایسی بیان کی کہ میں نے باوجود کئی تفسیروں کے مضمون یاد رہنے کے کبھی نہ سنی تھی۔

ب۔ اسی شب کو (یعنی بیعت کی شب کو) حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

رؤیت شریف سے مشرف کیا گیا اور جو جو فیض برکت مجھ کو حاصل ہوا اُس کا کیا بیان کروں۔ (۱)

۳۔ رسالہ درنکاحِ بیوگاں: یہ غالباً اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب سید صاحب نے نکاحِ بیوگاں کی سنت کے احیاء کی غرض سے اپنی بھاوج سے نکاح کیا تھا، یہ بھی فارسی میں ہے اور اب تک نہیں چھپا۔

شخصیت

بچوں کے رئیس حسن علی خاں نے غازیوں کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیلتے کھیلتے ایک کو بادشاہ بنالیتے ہیں اور دوسرے بچے اس کے لشکری بن جاتے ہیں۔ لیکن جب سید صاحب کو دیکھا اور ان کا وعظ سنا تو کہا:

> امام ہمام کی پیشانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہفت اقلیم کی تسخیر کا ارادہ بھی فرمالیں تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام ممالک ان کے قبضے میں دے دے۔

میں نے سرسری طور پر چند نمایاں باتیں بیان کردیں، آخر میں اعتراف کرنا پڑتا ہے:

> حق ایں ست کہ بر تمامی کمالات وکرامات امیر المومنین وامام المسلمین کسے راازما مقدورے حاصل نیست کہ در حیطۂ حافظ خود محفوظ دارد۔
>
> **ترجمہ:** سچ یہ ہے کہ خدا نے سید صاحب کو جن کمالات اور جن کرامات سے شرف بخشا تھا، ان کو حافظے میں محفوظ رکھنے کی مقدرت ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

---

(۱) "الرحیم" ستمبر ۱۹۶۵ء ص: ۲۶۴-۲۶۶۔ ماخوذ از "مقالاتِ طریقت" معروف بفضائل عزیزیہ" مطبع مشین حیدرآباد دکن ۱۳۹۲ھ ص: ۲۱۶-۲۱۷

﴿ضمیمہ﴾

سینتالیسواں باب

جنگ بالاکوٹ پر نئی روشنی (۱)

تمہید

میں سید صاحبؒ کی شہادت کے متعلق وہ تمام مآخذ دیکھ چکا تھا جن کا علم ہو سکا اور وہ میری دسترس میں آ سکے۔ خیال نہ تھا کہ کوئی ضروری کتاب یا بیان باقی رہ گیا ہوگا۔ میرے عزیز اور ہم مشرب دوست ڈاکٹر شیر بہادر خاں صاحب پنی (دارالشفاء ایبٹ آباد) نے ایک نیا ماخذ ڈھونڈ نکالا، جس کا نام ہے "تواریخ ہزارہ بہ عہد سرکار دولت مدار" یہ سکھوں کے دور حکومت کے متعلق ضلع ہزارہ کی تاریخ ہے، جو غالباً ۱۸۴۹ء میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر شیر بہادر خاں نے پہلے اس میں سے بالاکوٹ کی سرگزشت کا خلاصہ مرتب کر کے بھیج دیا تھا۔ پھر اصل مخطوطہ ارسال فرما دیا۔ یہ اصل کی نقل ہے، جو ۱۹۲۹ء میں کی گئی اور سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں بالاوسط سترہ سطریں اور ہر سطر میں بالاوسط اٹھارہ الفاظ ہیں۔ ناقل کا خط پختہ معلوم ہوتا ہے، مگر نقل اس تیزی سے کی گئی ہے کہ بعض الفاظ ٹھیک پڑھے نہیں جاتے، خصوصاً مقامات و افراد کے اسماء میں قدم قدم پر اشتباہ ہوتا ہے۔

چونکہ دوسرے مآخذ کی بناء پر اس جنگ کی کیفیت میرے سامنے تھی اور بیشتر اسماء سے میں آشنا تھا، اس لئے پوری کیفیت سمجھنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی، جنگ بالاکوٹ

کی سرگزشت اس قلمی نسخے میں صفحہ: ۷۹ سے ۸۹ تک ہے، میں ڈاکٹر شیر بہادر خاں کی اجازت سے اور ان کے دلی شکریے کے ساتھ اسے یہاں بیان کرتا ہوں۔

اس سے اول فی الجملہ ان تمام نتائج کی توثیق ہوتی ہے جو میں دوسرے مآخذ کی بنا پر پیش کر چکا ہوں۔ دوم بعض پہلوؤں پر نئی روشنی پڑتی ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

مصنف اور وجہ تصنیف

کتاب کے مصنف کا نام مہتاب سنگھ ہے، ذات کا ئستھ ساکن مرلی پورہ پرگنہ موسیٰ نگر، ضلع کان پور (یوپی) یہ شخص تلاشِ معاش میں وطن سے لاہور پہنچا، پانچ برس کنور کھڑک سنگھ (ولی عہد رنجیت سنگھ) کی سرکار میں ملازم رہا، یہ مدت اس نے پرگنہ ساہیوال میں گزاری، جو دیوان ٹوڈرمل کی عملداری میں تھا۔ پھر دس مہینے فتح سنگھ کے ساتھ منکیرہ میں رہا۔ ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) میں ہری سنگھ نلوہ کے پاس ہزارہ پہنچا اور دفتر میں مامور ہوا۔ پھر پچیس سال اس نے ہزارہ ہی میں گزار دیے۔

جب پنجاب پر انگریز قابض ہوئے اور میجر چیمبرلین ہزارہ پہنچا تو اس نے مہتاب سنگھ سے کہا کہ تمیں برس اس ملک میں گزار چکے ہو، اگر اس مدت کے چشم دید حالات کتاب کی شکل میں مرتب کر دو تو وہ کتاب تمہاری یادگار رہے گی اور یہ امر ہماری خوشنودی کا باعث ہوگا۔ اگر چہ مہتاب سنگھ کو تصنیف و تالیف کا کوئی تجربہ نہ تھا، تاہم اس نے چیمبرلین کی خوشنودی کے پیش نظر کتاب مرتب کر دی۔ (۱) عبارت اچھی نہیں، تاہم واقعات میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی گئی۔ ممکن ہے بعض حالات صحیح صورت میں اس تک پہنچے ہی نہ ہوں۔ بیانِ وقائع میں بعض مقامات پر ترتیب زمانی کا خیال نہیں رکھا گیا، لیکن جنگ بالاکوٹ کے حالات عمومی اعتبار سے بڑی حد تک درست معلوم ہوتے ہیں۔

---

(۱) ''تواریخ ہزارہ''، ص ۳

پایندہ خاں تنولی اور سید صاحبؒ

پایندہ خاں تنولی والیٔ امب اور سید صاحبؒ کے روابط پر مفصل بحث کی جا چکی ہے، چونکہ وہ مسلسل سکھوں کے خلاف لڑتا رہا تھا، اس لئے سید صاحبؒ کے قلب صافی میں اس کے متعلق ہمیشہ اچھا خیال تھا۔ پھر اس نے سید صاحبؒ سے ملاقات کی، بعد ازاں اچانک مخالفت پر آمادہ ہوگیا۔

''تواریخ ہزارہ'' میں بتایا گیا ہے کہ جب پایندہ خاں نے دیکھا کہ اس کے بھائی بند مصاحب اور ملازم سید صاحب کا انتہائی احترام کرتے ہیں تو دل میں وسوسہ پیدا ہوگیا کہ اغلب ہے یہ لوگ کسی وقت خود اسے گرفتار کر کے ریاست سید صاحبؒ کے حوالے کر دیں۔ (۱)

چونکہ اس کی پوری تربیت شکوک و شبہات کی فضا میں ہوئی تھی، اس لئے یہ وسوسہ اس درجہ پریشان کن بن گیا کہ اس نے مخالفت کا راستہ اختیار کر لینے میں تامل نہ کیا، پھر جنگ کی نوبت آئی اور پایندہ خاں صرف بارہ سواروں کے ساتھ جن کی خیر خواہی پر اسے پورا اعتماد تھا، امب سے نکل کر چھتر بائی پہنچا، جو امب کے شمال میں دریا کے کنارے ایک چٹان پر چھوٹی سی گڑھی تھی، وہاں بھی نہ ٹھہرا اور دریا عبور کر کے شیر گڑھ ہوتا ہوا اگرور چلا گیا۔ وہاں سے اپنے بیٹے جہاں داد خاں کو چند معتبر اصحاب کے ساتھ ہری سنگھ کے پاس بھیج دیا اور کہا:

حالات عزت ما ے ردد بہ ہر طور کہ دانند امداد کنند۔ (۲)

ترجمہ: اب ہماری عزت جا رہی ہے، جس طور بھی مناسب سمجھیں ہماری امداد کریں۔

---

(۱) ''تواریخ ہزارہ'' ص: ۷۸، ۷۹

(۲) ''تواریخ ہزارہ'' ص: ۸۰

ہری سنگھ نے فوراً مہاں سنگھ کو فوج دے کر پائندہ خاں کی امداد کے لئے بھیج دیا، یوں پائندہ خاں کا جو علاقہ دریا کے مشرقی کنارے پر تھا، اسے واپس مل گیا۔ چونکہ دریا میں طغیانی آ گئی تھی، اس لئے مغربی جانب کے علاقے کی بازیافت پانی اتر جانے پر موقوف رہی۔ (۱)

شیر سنگھ کا تقرر

سید صاحبؒ مجاہدین پر اجتماعی قاتلانہ حملوں کے بعد پنجتار سے اٹھ کر راج دواری پہنچے تو افواہ پھیل گئی کہ وہ کشمیر کا ارادہ کئے بیٹھے ہیں۔ یقیناً سید صاحب کا قصد یہی تھا اور مجاہدین بھوگڑ منگ و بالاکوٹ کے علاوہ مظفر آباد بھی جا پہنچے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کشمیر پر اقدام کا عزم پختہ ہے، اس حالت میں رنجیت سنگھ نے ایک فوج ہزارہ بھیجنے کا فیصلہ کیا، جس کا سالار اعظم اپنے بیٹے شیر سنگھ کو بنایا۔ یہ آٹھ ہزار بندوقچیوں پر مشتمل تھی، شام سنگھ اٹاری والا، عطر سنگھ، سادھو سنگھ نہنگ، رتن سنگھ، وزیر سنگھ، گورکھ سنگھ، لکھمی سنگھ اور جوالا سنگھ بھی ساتھ بھیجے گئے، جو سکھ دربار کے ممتاز سردار تھے۔ ان کا اصل کام یہ قرار پایا کہ سید صاحبؒ کو (جنہیں سکھوں کی سرکاری اصطلاح میں ''خلیفہ صاحب'' کہا جاتا تھا) کشمیر جانے سے روکیں۔ ضمناً یہ حکم بھی دے دیا گیا تھا کہ یوسف زئی (میدانی علاقہ سرحد) سے معاملہ وصول کیا جائے۔ (۲)

مشورہ اور فیصلہ

شیر سنگھ لشکر کے ساتھ منزل بہ منزل شنکیاری پہنچ گیا، جو درۂ بھوگڑ منگ سے باہر ہزارہ کا مشہور مقام ہے۔ اس وقت تک سید صاحب راج دواری سے چکوں اندرون درۂ بھوگڑ منگ آ گئے تھے۔ ''تواریخ'' مظہر ہے:

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۰

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۲

خلیفہ آں زماں در درۂ بھوگڑ منگ بود کہ از ششکیاری ہشت کروہ یا دہ کروہ خواہد بود۔ (۱)

ترجمہ: سید صاحبؒ اس وقت درۂ بھوگڑ منگ میں تھے، جو ششکیاری سے آٹھ دس کوس ہوگا۔

شیر سنگھ نے ساتھیوں سے طریق کار کے متعلق مشورہ کیا تو انہوں نے کہا، بے شک خلیفہ صاحب سرکار کے ملک میں ہنگامہ برپا کریں گے تو ان کا مقابلہ ضرور کیا جائے گا، لیکن اب وہ درۂ بھوگڑ منگ میں ہیں اور یہ علاقہ ہری سنگھ نلوہ کی جاگیر میں ہے، لہٰذا وہاں خلیفہ صاحب کا تدارک ہری سنگھ ہی کو کرنا چاہئے، ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ اول مظفر آباد جائیں اور وہاں بندوبست کریں، پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ شیر سنگھ نے یہ مشورہ منظور کرلیا۔ مہاں سنگھ برابر کہتا رہا کہ خلیفہ صاحب جمعیت کے ساتھ بھوگڑ منگ میں ہیں، ان کا مقابلہ چھوڑ کر مظفر آباد جانے میں کون سی مصلحت ہے؟ لیکن سکھ سرداروں نے اس رائے پر عمل نہ کیا۔ سب کو مظفر آباد کی طرف کوچ کرنا پڑا اور یہ لوگ گوجرہ جا ٹھہرے، جو مظفر آباد سے نیچے دریائے کشن گنگا کے کنارے واقع تھا۔ (۲)

مظفر آباد کا محاصرہ

مقامی لوگوں نے مظفر آباد کا محاصرہ کر رکھا تھا، سکھوں کا لشکر گوجرہ پہنچا تو محاصرین منتشر ہوگئے اور محاصرہ اٹھ گیا۔ پھر سلطان نجف خاں مظفر آباد، شیر سنگھ کے پاس (گوجرہ) پہنچا، اس کے استقبال میں توپیں سر کی گئیں، شیر سنگھ نے ایک عہد نامہ زعفران سے لکھ کر نجف خاں کے حوالے کر دیا۔ (۳) جس کا مفاد یہ تھا کہ مظفر آباد کے علاقے کی

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۳- درہ بھوگڑ منگ ششکیاری سے اتنی دور نہیں، البتہ چھوں درے کے اندر ہے، یہاں ذکر درے کا نہیں بلکہ اندر کے مقام کا ہے، جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۳۔ معلوم ہوا کہ یہ مقام مظفر آباد میں شامل ہے۔

(۳) غالباً سکھوں کے زمانے میں خاص عہد نامے عام سیاہی سے نہیں بلکہ زعفران سے لکھے جاتے تھے۔

سلطانی نجف خاں کو دی جا چکی ہے، کوئی دوسرا شخص اس میں شریک نہ ہوگا۔

بعد ازاں چند روز ڈیرہ بہ گوجرہ با جمعیت در رشتہ انتظام ملک مظفر آباد بہ عمل آمدہ۔(۱)

ترجمہ: پھر چند روز ڈیرہ لشکر کے ساتھ گوجرہ ہی میں رہا اور مظفر آباد کے علاقے کا انتظام درست کر دیا گیا۔

ہم پہلے جو کچھ بیان کر چکے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر آباد کا والی نجف خاں نہیں، زبردست خاں تھا۔ وہ بالاکوٹ سے مجاہدین کے جیش ساتھ لایا تھا کہ مظفر آباد پہنچتے ہی دفاعی انتظامات کے لئے خاصی بڑی رقم مجاہدین کے حوالے کر دے گا۔ سید صاحبؒ نے مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو مجاہدین کے تینوں لشکروں کا سردار بنا کر بھیج دیا تھا، زبردست خاں نے مظفر آباد پہنچتے ہی وہ رقم دینے میں لیت و لعل شروع کر دی اور خفیہ سکھوں سے نامہ و پیام کا انتظام کر لیا۔

مقصد یہ تھا کہ پیسہ خرچ نہ ہو اور مظفر آباد مل جائے۔ باقی رہی عزیمت تو اس کے پرتو سے نہ محض اس علاقے بلکہ وقت کے اکثر دوسرے رئیسوں کی طرح زبردست خاں کا دل بھی بالکل خالی تھا۔ جب سکھوں کا لشکر گوجرہ پہنچ گیا تو زبردست خاں کو سب کچھ چھوڑ کر شمال جانب کے بلند پہاڑوں میں جا چھپنا ہی قرین مصلحت نظر آیا، اس لئے مجاہدین بھی مظفر آباد کے تخلیے پر مجبور ہو گئے۔

باقی رہا نجف خاں مظفر آبادی، تو وہ شیر سنگھ کے گوجرہ پہنچنے پر اس کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ پہلے سے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ زبردست خاں بھاگ نکلا تو ظاہر ہے کہ مظفر آباد کی سلطانی نجف خاں ہی کو مل سکتی تھی، جو سکھوں کی اعانت پر آمادہ تھا۔ لیکن سید صاحبؒ کے ساتھ بھی نامہ و پیام جاری تھا، بلکہ اس نے جنگ سے کچھ ہی عرصہ پہلے سید صاحبؒ کو لکھا

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص ۴۳

تھا کہ میں تو شیر سنگھ کو مظفر آباد کیلئے لایا تھا، یہ خیال نہ تھا کہ آپ سے تصادم ہو جائیگا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں، آپ مقابلہ کر سکیں تو ٹھہریں ورنہ پہاڑ پر چلے جائیں۔

سید صاحبؒ سے مقابلے کی تدبیریں

عین اسی موقع پر اطلاع ملی کہ سید صاحب درۂ بھوگڑ منگ (بچوں) سے بالاکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ زمیندار اور عام لوگ ان کے پاس حاضر ہو رہے ہیں۔ اس پر مہاں سنگھ نے شیر سنگھ سے کہا اگر سرکاری معاملہ خلیفہ صاحب نے وصول کر لیا تو ہم قلعہ نشین فوجوں کو تنخواہیں کہاں سے دیں گے؟ اس پر پہلی رائے بدلنی پڑی، شیر سنگھ نے حکم دے دیا کہ مہاں سنگھ، وزیر سنگھ، سادھو سنگھ اور رتن سنگھ اپنی اپنی جمعیت کے ساتھ روانہ ہو جائیں اور گڑھی (حبیب اللہ خاں) میں ڈیرہ جمائیں۔ مہاں سنگھ جو کچھ ضروری سمجھے، اس میں پوری پوری امداد دیں۔

چنانچہ یہ لوگ گڑھی میں پہنچے اور دریائے کنہار کے کنارے ٹھہرے، جہاں گڑھی کی مرمت شروع کر دی۔ دو تین روز میں کسی جگہ سے ایک گز اور کسی جگہ سے ڈیڑھ گز تک مرمت ہوئی، اس اقدام کا بدیہی مقصد یہ تھا کہ سید صاحب سے جنگ کی جائے۔

شبخون کی اطلاع

دوسرے تیسرے روز سکھوں کو خبر ملی کہ سید صاحبؒ بالاکوٹ سے دریائے کنہار کے کنارے آ گئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ رات کو دریا سے گذر کر سکھوں پر شبخون مارا جائے۔

> بہ مجرد شنیدن ایں خبر افسران ڈیرہ کہ جمعیت قلیل بود غمگین چوں بید از باد لرزیدند۔ (۱)

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص۔ ۸۳-۸۵۔

آخری فقرے میں خلا محسوس ہوتا ہے۔ گڑھی تو مرکز تھا ہی، لیکن دریا کے کنارے ...

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ترجمہ: یہ خبر سنتے ہی ڈیرے کے افسر بہت غمگین ہوئے، کیونکہ ان کے پاس جمعیت کم تھی، وہ اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح ہوا چلنے سے بید کا درخت لرزتا ہے۔

پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، پھر کیمپ کے اردگرد خندق کھودی، کانٹوں کی باڑ لگا دی، لکڑیاں اور پتھر فراہم کر کے کیمپ کے دروازوں میں سے صرف ایک بند کر دیا:

> بعد گزشتن چار گھڑی شب ہر کس کہ سوار بود بہ اسپ سوار شدہ و ہر کس کہ پیادہ بود مسلح گردید، گاہے بہ طرف مشرق و گاہے بہ طرف شمال مے رفتند و ڈھول و نقارہ مے نواختند تا طلوع شدن آفتاب ہمیں زلزلہ و شور در ڈیرہ ماندہ کسے مے گفت ایں آمدند و کسے مے گفت ازیں راہ آمدند وقتیکہ چار پہر شب گزشت کسے یک ساعت آرام نیافت، اما خوف گزشت چوں پردہ ظلمانی برداشتہ شد و شعاع آفتاب جہاں را منور ساخت۔ (۱)

ترجمہ: چار گھڑی رات گذر گئی تو جو گھڑ سوار تھا وہ سوار ہو گیا، جو پیادہ تھا اس نے ہتھیار لگا لئے، کبھی وہ مشرق کی طرف جاتے اور کبھی شمال کی طرف ڈھول اور نقارہ بجاتے، سورج نکلنے تک ڈیرے میں یہی زلزلہ و ہنگامہ بپا رہا۔ کوئی کہتا یہ آ گئے، کوئی کہتا اس راستے سے آ گئے، کسی نے ایک ساعت بھی آرام و اطمینان کا سانس نہ لیا۔ خوف اس وقت دور ہوا جب اندھیرے کا پردہ اٹھا اور سورج کی کرنوں سے جہاں روشن ہو گیا۔

یہ غالباً وہی شبخون ہے جس کی تیاری کا ذکر پینتیسویں باب میں آ چکا ہے۔ میں نے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ: ..... کہاں ڈیرہ تھا؟ بظاہر یہ ڈیرہ اس جگہ ہو سکتا تھا جسے "میدان" کہتے ہیں اور یہ علاقہ سے آگے بالا کوٹ کے شمال سے شروع ہو کر شوہال معز اللہ خاں تک جاتا ہے۔ اصل کتاب میں اس کی تصریح نہیں، لیکن گڑھی سے میدان تک دریا کے کنارے کوئی ایسا مقام نہیں جہاں فوج ٹھہر سکے، اگرچہ اس کی تعداد زیادہ نہ ہو۔

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۴

نوٹ میں لکھا تھا کہ اس وقت سکھوں کا لشکر شاید اس مقام پر تھا جہاں مانسہرہ کی سڑک دریائے کنہار سے آملی ہے، لیکن اگر سکھوں کا لشکر میدان میں تھا تو مقام اجتماع وہ نہیں ہوسکتا۔

شیر سنگھ کی نقل وحرکت

شیر سنگھ اس وقت تک گوجرہ ہی میں تھا، ڈیرے کے فوجی افسروں میں شبخون کے خوف سے اضطراب وبے قراری کمال پر پہنچی ہوئی تھی، آخر انہوں نے ایک عرضی لکھی جس میں بتایا کہ شبخون کا خطرہ ہے اور ہم سب مل جل کر زیادہ سے زیادہ آٹھ سو نفر ہوں گے اور خلیفہ ہم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہماری امداد فرمائی جائے۔ چنانچہ شیر سنگھ پوری فوج کے ساتھ آخر شب گوجرہ سے نکلا اور طلوع آفتاب کے وقت گڑھی حبیب اللہ خاں پہنچ گیا۔ اس پر کیمپ والوں کو اطمینان ہوگیا۔ سولہ روز میں گڑھی کی مرمت ہوگئی، پھر ڈیرہ اٹھا کر کوٹ بیلہ (۱) لے گئے، جو بالا کوٹ سے تین کوس جانب جنوب دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر ہے۔ (۲)

جاسوسوں کا انجام

ایک روز شیر سنگھ سوار ہو کر دریا کے کنارے کنارے بالا کوٹ کی طرف گیا۔ پھر دوربین سے آس پاس کے علاقے پر گہری نظر ڈالی۔ اندازہ ہوگیا کہ مشرقی کنارے سے سید صاحب کے کیمپ پر قابو پالینے کی کوئی صورت نہیں۔ (۳) ادھر سید صاحبؒ نے چار پانچ سو ملکی بندوقچیوں کو دریا سے گزار کر سروٹ کے جنگل میں چھپ جانے کا حکم دے دیا

---

(۱) کوٹ بیلہ غالباً وہی مقام ہے، جسے قلمی کتاب میں محسن بیلہ لکھا ہے۔

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۵

(۳) تواریخ ہزارہ ص: ۸۵

تھا، جو سکھوں کے کیمپ سے ڈیڑھ کوس شمالی جانب تھا اور اپنے کیمپ میں بہت سے چاول پکا کر ادھر ادھر بکھیر دیے، جنہیں چرنے کے لئے بے شمار پرندے جمع ہو گئے۔ اس وقت دن نکلے دو تین گھڑیاں ہوئی ہوں گی، شیر سنگھ نے سمجھا کہ سید صاحب بالاکوٹ سے چلے گئے بلکہ آواز سے اس امر کا اعلان بھی کر دیا۔(۱)

پھر پانچ سوار اور پانچ پیادے اس غرض سے بالاکوٹ بھیج دیے کہ خبر لائیں۔ یہ لوگ سروٹ کے جنگل سے گذر کر بالاکوٹ کی طرف گئے، سید صاحب کے بھیجے ہوئے آدمی ایک دم گھات سے اٹھے اور ان پر حملہ کر دیا، پانچوں سوار مارے گئے، پیادوں میں سے بھی تین قتل ہو گئے، دو نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈبکی لگا کر دور نکل گئے۔ پھر تیرتے ہوئے سکھوں کے کیمپ میں پہنچ گئے اور حقیقت حال سے سب کو آگاہ کیا۔(۲)

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۵

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۵، ۸۶

﴿ضمیمہ﴾

اڑتالیسواں باب

جنگ بالاکوٹ پر نئی روشنی (۲)

بالاکوٹ پہنچنے کا فیصلہ

اب ہم جنگ بالاکوٹ پر پہنچ گئے ہیں، ابتدا میں سکھوں کی کوشش یہ تھی کہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں، پھر دریا عبور کر کے بالاکوٹ پر حملہ کر دیں۔ موقع کا معائینہ کر چکنے کے بعد ان پر واضح ہو گیا کہ اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ دریائے کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر سکتے تھے، لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ اس راستے میں آگے چل کر کھڑیاں تھیں، یعنی پہاڑ کے کچھ حصے پھیل کر دریا کے اندر تک پہنچے ہوئے تھے (۱) لہٰذا ادھر سے فوج گزارنا ممکن نہ تھا۔

چنانچہ سکھ سالاروں میں مشورے شروع ہو گئے کہ بالاکوٹ تک فوج لے جانے کی مناسب صورت کیا ہے۔ متعدد تجویزیں پیش ہوئیں، آخر قرار پایا کہ کشمیر سے ایک ہزار بندوقچی آئے ہیں، انہیں کیمپ کی حفاظت کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ باقی پوری سکھ فوج دریا کے مغربی کنارے پر پہنچ کر سید صاحب سے جنگ کرے۔ (۲) کیمپ میرے اندازے کے مطابق "میدان" میں تھا اور بعض مقامی روایات بھی اسی کی مؤید تھیں "تواریخ ہزارہ"

---

(۱) یہ "کھڑیاں" کاٹ کر موجودہ راستہ نکالا گیا، جس پر بعد میں سڑک بنی۔

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۶

کا بیان درست مانا جائے تو وہ کوٹ بیلہ میں تھا جو چند میل شمال میں ہے۔

اختیار کردہ راستہ

چنانچہ اسی تجویز پر عمل ہوا، ایک گوجر کو رہبری کی غرض سے ساتھ لے لیا گیا، وہ فوج کو بسیاں اور ڈمگلہ کے راستے کوٹ ڈنہ مٹی کوٹ پر لے گیا۔(۱)

جو فوج شنکیاری میں تھی وہ بھی تمری بالا کوٹ کے راستے مٹی کوٹ پہنچ گئے۔(۲)

سید صاحبؒ کے چند آدمی بطور جاسوس تک پانی (۳) میں بیٹھے تھے، ان سے سکھوں کی جنگ ہوئی، تین چار مارے گئے باقی بھاگ نکلے۔ اگرچہ بالا کوٹ سے ایک ہزار بندوقچی روانہ کر دیے گئے، تاہم اس وقت تک سکھ ڈنہ مٹی کوٹ پر پہنچ چکے تھے، لہٰذا سید صاحب کی مرسلہ کمک راستے ہی سے لوٹ گئی۔(۴)

---

(۱) پورا راستہ نہیں بتایا گیا، میں اس سے پیشتر راستہ تفصیلاً بتا چکا ہوں، بلکہ اس کا نقشہ بھی پیش کر چکا ہوں۔ سکھ فوج مشرقی کنارے کہار سے مغربی کنارے پر پہنچ کر شوال نجف خاں کے جنوب میں بسیاں اور ڈمگلہ ہوتی ہوئی ماسر ڈھاکہ کے عقب میں جا پہنچی، اگرچہ یہ چنڈھوال کے راستے اس جگہ پہنچی، جسے آج کل "شہید گلی" کہتے ہیں۔ "ڈمگلہ" کو متن میں "دمولہ" لکھا ہے، یہ راستہ نیا نہ تھا لوگ عموماً اس سے آتے جاتے تھے، گوجروں کو بخوبی معلوم تھا کیونکہ وہ پہاڑوں پر بکریاں چراتے رہتے تھے۔ سید صاحبؒ کو بھی اس کا علم تھا اسی لئے حفاظت کی غرض سے وہاں چوکیاں بٹھائیں۔

(۲) تواریخ ہزارہ ص ۸۹۔ اس سے واضح ہے کہ سکھوں کی فوج خاصی بڑھ گئی تھی، نجف خاں مظفر آبادی نے جو سید صاحب کو لکھا تھا کہ شیر سنگھ کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں، یہ غلط نہ تھا۔ آٹھ ہزار بندوقچی ہزارہ منگوا لیا تھا، ایک ہزار کشمیر سے آئے، شنکیاری کی فوج شامل ہوئی تو یقیناً گیارہ بارہ ہزار ہو گئے ہوں گے۔

(۳) ظاہر ہے کہ یہاں "جاسوس" محض خبر رساں کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نیز "تک پانی" یہاں کوئی مقام نہیں، اس نام کا ایک مقام ریاست امب میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تھا، یہاں جس مقام کا ذکر ہے اس کا نام "لیدی تک" ہے۔ اس ملک میں پہاڑوں کے لئے درجات رفعت کے اعتبار سے مختلف نام تجویز کر لئے گئے ہیں۔ مثلاً سب سے بلند "ڈھاکہ" اس سے نیچا "ڈنہ" اس سے نیچا "تک" اس سے نیچا "ڈھیری"۔

(۴) تواریخ ہزارہ ص ۸۶۔ یہاں اتنا اور بتا دینا چاہئے کہ مجاہدین کی روایات کے مطابق شہید گلی کے مقام پر میرزا احمد بیگ پنجابی کا مورچہ تھا اور تصادم میں اس کے آٹھ رفیق شہید ہوئے۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

یہاں سید صاحبؒ کے مجاہدین میں سے ''تین چار'' آدمی مارے گئے، اسی کا نام آج کل ''شہید گلی'' ہے۔ گویا سکھوں سے مجاہدین کا پہلا تصادم اسی مقام پر ہوا، اس سے آگے ''ٹھنڈا کنھہ'' نام نالہ ہے، جو پہاڑوں میں سے بہتا ہوا بالاکوٹ جانے والی سڑک سے گذر کر کنہار میں شامل ہو گیا ہے، پھر مٹی کوٹ آتا ہے۔

پانی کا مسئلہ

مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچنے کے بعد سکھوں کو سب سے بڑی مشکل پانی کے متعلق پیش آئی:

> دیدند کہ یک قطرۂ آب برذخیرہ نہ بود۔ حیران شدند کہ اگرچہ یک دو روز سوائے خوردن بسرے تواند شد، لیکن بدوں آب چگونہ گزارہ خواہد شد۔ ہر کس دریں فکر بود کہ از امداد قضا و قدر یک تیرہ سحاب از طرف شمال برخاستہ بر کوہ ڈنہ آمدہ آں قدر ژالہ خرد بارید کہ کسے را از آدم و جانور ہیچ گونہ آسیب نہ داد و آب برائے نوشیدن و نان پختن آں قدر روا فرشد کہ ظروف نزد کسے کہ تمام از آں ژالہ پر کردند، بعد یک ساعت تمام آب شیریں و خوشگوار گشت و ایام ماہ بیساکھ بودند کہ آب شیریں و خوشگوار و سرد بکار بود ہر گاہ کہ بہ امداد فلکی تمام فوج سکھاں از آب و نان آسودہ شد، شب را بہ آرام و آسائش بسر کردند۔(۱)

ترجمہ: دیکھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں حیران ہوئے کہ اگرچہ کھائے بغیر ایک دو دن گزارے جا سکتے ہیں، لیکن پانی کے بغیر کیوں کر

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... اس نے فوراً سید صاحب کو خبر بھیج دی، وہاں سے ایک جیش ابراہیم خاں اور فرج اللہ عرب کی سرکردگی میں بھیجا گیا، پھر سید نور اللہ شاہ کو ایک جمعیت کے ساتھ دوڑایا۔ ارباب بہرام خاں سے سید صاحب نے فرمایا کہ آپ بھی جائیں، آخر میں سید جعفر علی نقوی کو بھیجا لیکن میرزا احمد بیگ نے کہا کہ اب سکھوں کو یہاں روکنا ممکن نہیں، کیونکہ وہ پہاڑ پر پہنچ گئے تھے، ایک جگہ انہیں روکا جاتا تو وہ دوسرے راستوں سے آسکتے تھے۔

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۶

گزارا ہوگا۔ ہر شخص اسی فکر میں تھا کہ قضا و قدر کی مہربانی سے ایک سیاہ بادل سمت شمال سے اٹھا، ڈنہ پر پہنچا، اس میں سے چھوٹے چھوٹے اولے برسے اور کسی آدمی یا جانور کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پینے اور کھانا پکانے کے لئے بہ کثرت پانی مہیا ہو گیا، جن لوگوں نے اولوں سے برتن بھر لیے تھے انہوں نے دیکھا کہ اولوں نے پگھل کر ایک گھڑی کے بعد خوشگوار میٹھے پانی کی شکل اختیار کر لی۔ بیساکھ کا مہینا تھا جس میں میٹھا، خوشگوار اور ٹھنڈا پانی درکار ہوتا ہے۔ جب آسمانی امداد سے سکھوں کی فوج پانی روٹی کی طرف سے فارغ ہو گئی تو رات بڑے آرام و آسایش سے گذری۔

سکھوں کی مجلس شوریٰ

صبح ہوئی تو سکھ پھر شیر سنگھ کے پاس جمع ہوئے۔ یہ طے ہو گیا کہ مٹی کوٹ کے ٹیلے پر قابض رہنا ضروری ہے، لیکن مسلہ جنگ میں ان کے درمیان اختلاف رہا، پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ مہاں سنگھ اور **لکھمی** سنگھ پیش قدمی کریں، باقی فوج ان کی کمک کے لئے تیار رہے۔ دونوں سالار فوج کے ساتھ دو گولی کے فاصلے پر پہنچے تو شام سنگھ اٹاری والے نے کہا کہ یہ فیصلہ اچھا نہیں۔

> اگر آں ہر دو کساں جنگ کردند و فتح یافتند، ما دیگراں بہ کدامی نوشتہ خواہیم شد؟ و اگر خدانخواستہ باشد آں ہر دو کساں را شکست آمد ما بہ کدامی نوشتہ خواہیم شد؟ بہ شنیدن ایں سخن ہمہ افسراں را فکر زیادہ افتاد، ہمہ کساں برخاستہ کہ ہمہ مے رویم یا فتح کردیم حاجت واشتن کوہ نیست و اگر خدا نخواہد شکست خوردیم مارا بہ لاہور رفتن کس نخواہد داد، در راہ کہ ملک پر مردم مسلمان است ہمہ مارا کہ رسیدن مے دہند؟ دریں صورت ما جملہ یکبارگی حملہ کنیم۔(۱)

---

(۱) تواریخ ہزارہ

> **ترجمہ**: اگر ان دونوں سالاروں نے جنگ کی اور فتح حاصل کر لی تو ہمیں کس شمار میں رکھا جائیگا؟ اگر خدانخواستہ ان دونوں کو شکست ہوئی تو ہمیں کس زمرے میں شامل کیا جائے گا؟ یہ سنتے ہی سب افسر حد درجہ متفکر ہو گئے، سب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم چلتے ہیں، یا فتح حاصل کریں گے، اس صورت میں پہاڑ پر قبضہ قائم رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی، اگر خدانخواستہ شکست ہوئی تو کوئی ہمیں لاہور نہ جانے دیگا۔ یہ راستے میں جو ملکی مسلمان ہیں یہ ہمیں کب پہنچنے دیں گے؟ اس صورت میں ہم سب کو بہ یک وقت حملہ کرنا چاہیے۔

جنگ

غرض پوری سکھ فوج مٹی کوٹ کے ٹیلے سے بالاکوٹ کی جانب نیچے اترنے لگی۔ ''تواریخ ہزارہ'' مظہر ہے کہ نیچے سب سے پہلے وہ زمین تھی جسے مقامی اصطلاح میں ہوتر کہتے ہیں، یعنی دھان بونے کی زمین، جس میں پانی رہتا ہے۔ پھر بالاکوٹ کا ٹیلہ تھا، جہاں سید صاحبؒ اور ان کے ساتھی تیر و تفنگ اور زنبورک سے لیس تیار تھے۔ فریقین نے بندوقیں اور زنبورکیں سر کرنی شروع کر دی تھیں، سکھوں کے پاس ایک توپ تھی جو کشمیر کی فوج ساتھ لائی تھی، اس سے گولے پھینکے جاتے رہے۔ جب پیش قدمی کرنے والی سکھ فوجوں کے نشانچی آگے بڑھے تو دونوں کے سینوں میں گولیاں لگیں، وہ ختم ہو گئے اور نشان ان کے ہاتھ سے زمین پر گر گئے۔ اگرچہ دوسرے سکھوں نے وہ نشان اٹھا لیے۔

> لیکن مردمِ خلیفہ ہر قدر کہ در بالاکوٹ بودند آں نشانہاں اسلامی دیدہ فوراً دعاجلۂ حملہ کردند، بل خلیفہ سید احمد شاہ و مولوی اسمٰعیل کہ ہر دو افسران کلاں تران فوج بودند بہ ذات خود حملہ کناں واللہ اکبر گویاں در زمین ہوتر کہ درمیان ہر دو بود آمدند و بہ آواز بلند گفتند کہ کافراں رفتند حملہ بہ کنید۔ چوں خواہش قضا و قدر ہمیں بود کہ ساکنین حیات خلیفہ احمد شاہ و مولوی اسمٰعیل بلکہ تمام ہمراہیانش از رحیقِ زندگی بلب شدہ بود ہمہ یک بارگی از زمین ہوتر گزشتہ دامن

کوہ کہ یک طرف فوج سردار شام سنگھ و پرتاب سنگھ اٹاری والا بود و یک طرف سردار عطر سنگھ کالیانوالہ و گورکھ سنگھ وغیرہ بودند، آمدند۔ (۱)

ترجمہ: لیکن سید صاحب کے ساتھ جتنے مجاہدین بالاکوٹ میں تھے، انہوں نے نشانوں کو گرا ہوا دیکھتے ہی فوراً اور عاجلاً حملہ کر دیا بلکہ خلیفہ سید احمد شاہ اور مولوی اسماعیل بھی جو فوج کے سب سے بڑے سردار تھے، بہ ذات خود حملے میں شریک ہو گئے۔ وہ اللہ اکبر کہتے ہوئے ہوتر کی زمین میں پہنچ گئے۔ زور زور سے کہہ رہے تھے، دیکھو کافر شکست کھا کر جا رہے ہیں، ان پر ہلہ بول دو۔ قضا و قدر کی خواہش یہی تھی کہ خلیفہ احمد شاہ، مولوی اسماعیل بلکہ ان کے تمام ساتھیوں کا پیمانۂ حیات زندگی کی شراب سے پر ہو جائے۔ اس لئے کہ ایک دم ہوتر کی زمین میں گذرتے ہوئے دامن کوہ میں پہنچ گئے، جہاں ایک طرف شام سنگھ اور پرتاب سنگھ اٹاری والے کی فوج تھی، دوسری طرف سردار عطر سنگھ، گورکھ سنگھ وغیرہ کی۔

ایک عقدے کا حل

جنگ بالاکوٹ کے وقت سے یہ معاملہ عقدے کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے کہ جب سید صاحب فیصلہ فرما چکے تھے کہ سکھوں پر اس وقت حملہ کیا جائے گا جب وہ مٹی کوٹ سے اتر کر نہ محض نیچے آئیں گے بلکہ ہوتر کی زمین یعنی نشیب سے گذر کر بالاکوٹ کی طرف اوپر چڑھنے لگیں گے، پھر یکایک یہ فیصلہ کیوں بدلا گیا اور کس وجہ سے اچانک سکھوں پر اس وقت حملہ کیا گیا، جب وہ پہاڑ سے نیچے بھی نہیں اترے تھے؟ اس کی کوئی معقول توجیہ گزشتہ ایک سو چھتیس برس میں سامنے نہیں آئی تھی۔ محولہ بالا عبارت نے اس راز سے پہلی مرتبہ پردہ اٹھایا کہ سکھ فوج کے نشان بردار مجاہدین کی گولیوں سے گر گئے اور سکھوں میں سراسیمگی پیدا ہوئی تو سمجھ لیا گیا کہ حملے کا مناسب وقت یہی ہے۔

---

(۱) تواریخ ہزارہ

قرائن کی بنا پر یقین ہے کہ سکھ فوج کی پیش قدمی نشان چیوں کے گرتے ہی رک گئی ہوگی، یہ بھی یقین ہے کہ انہوں نے کچھ تاخیر اس وجہ سے کی ہوگی کہ حفاظت کے بہتر انتظامات کر کے قدم آگے بڑھائیں۔ اس موقع کو جوابی حملے کے لئے موزوں ومناسب سمجھ لینا ہر نقطۂ نگاہ سے قرین قیاس تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چھوٹی جمعیت، بڑی فوج کے مقابلے میں یورش کے مناسب مواقع کا خیال بطور خاص رکھتی ہے۔ اس انتظار میں نہیں رہتی کہ بڑی فوج کو سراسیمگی سے سنبھلنے کی مہلت دے دے اور مزید انتظار میں اپنے مقام پر جمی رہے، یہ عقدہ "تواریخ ہزارہ" کے بیان سے حل ہو گیا۔

سراسیمگی کا روشن ثبوت

سید صاحبؒ اور ان کے غازی بپھرے ہوئے شیروں کی طرح حملہ کر کے دامن کوہ میں پہنچ گئے اور سکھوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ تواریخ ہزارہ مظہر ہے:

> اول پائے سکھاں از میدان پس شدہ آخر کنور شیر سنگھ شمشیر از نیام بر آوردہ پیشتر شد مگر سردار مہاں سنگھ مع ہمراہیان خود مانع شد کہ تنہا پیشتر رفتن مناسب نیست لیکن کنور شیر سنگھ آں وقت ہیچ نشود و شمشیر برہنہ در دست دہ دوازدہ قدم پیشتر شدہ کسانیکہ از مقابلہ واپس مے آمدند آنہا را سنگ زدہ و دشنام ہا دادہ واپس ایستادہ بود و یک فراش خود بطرف شام سنگھ و پرتاب سنگھ اٹاری والا فرستاد کہ ہوشیار بودہ بندوق ہا بزدید و یک آدمی طرف عطر سنگھ کالیا نوالہ کہ آخریں بندوقہا زدند۔ (۱)

ترجمہ: سکھ اولاً پسپا ہو گئے آخر کنور شیر سنگھ نے خود تلوار میان سے نکالی اور آگے بڑھا۔ مہاں سنگھ اسے روکتا تھا کہ تنہا آگے جانا مناسب نہیں، کنور شیر سنگھ اس وقت کچھ نہیں سنتا تھا اور ننگی تلوار ہاتھ میں لئے دس بارہ قدم آگے

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۱۸۷ و ۱۸۷ الف

بڑھ گیا، جو سکھ مقابلے سے واپس آرہے تھے، انہیں پتھر مار مار کر اور گالیاں دے دے کر ٹھہراتا تھا پھر اس نے ایک خادم کو شام سنگھ اور پرتاب سنگھ کی طرف بھیجا کہ ہوشیاری سے بندوقیں سر کرو۔ ایک آدمی عطر سنگھ کالیانوالہ کی طرف بھی بھیجا۔ اس کے آدمیوں نے بھی خوب بندوقیں چلائیں۔

شہادت گاہِ بالاکوٹ

غرض فریقین کی طرف سے آتشباری بڑے زور سے جاری رہی:

> یک صد ہفتاد و ہفت نفر مع خلیفہ سید احمد شاہ در ہماں زمین ہوتر بلاشہ برلاشہ مردہ شدند و ہمیں قسم در زمین ہوتر چہار صد مردم ہندوستانی کہ بہ دل وجان بہ قبضہ خلیفہ بودند ہمہ ہا جاں دادند و لاشہ خلیفہ ہم بہ زخم بندوق کہ یک گولی بر بازوے راست و دیگر گولی بر سینہ متصل پستان چپ چسپیدہ بود ہماں جا افتادہ اند از ہمراہیانش کہ بقدر ہشتاد یا چندیں دیگر مردم بودند سہ مراتب حملہ کردند کہ لاشہ را ببرند لیکن از کثرت بندوقہا کہ ہمچو ابر مدار گولی مے بارید میسر نہ شد لاچار سر خلیفہ سید احمد شاہ از لاشہ جدا ساختہ خواستند کہ ببرند چوں چندیں رفتہ بودند کہ آں شخص را کہ سر خلیفہ برداشتہ بود زخم گولی کار کرد وقت مردن سر خلیفہ در یک خرمن شریف کہ دراں افتادہ بود پنہاں نمود۔(۱)

ترجمہ: ایک سو ستتر غازی مع خلیفہ احمد شاہ زمین ہوتر ہی میں شہید ہوگئے اور لاش پر لاش گرتی رہی۔ اسی طرح اسی زمین ہوتر میں چار سو ہندوستانی جو خلیفہ پر جان و دل سے نثار تھے، جاں بحق ہوئے۔ خلیفہ صاحب کی موت بھی گولی سے ہوئی ایک گولی داہنے ہاتھ پر لگی، دوسری گولی سینے پر بائیں پستان کے مقام پر بیٹھی۔ چنانچہ وہ وہیں گر گئے، ان کے ہمراہیوں کی تعداد اسی یا اس سے بھی زیادہ تھی، انہوں نے خلیفہ کی لاش اٹھا لے جانے کی غرض سے

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۷۸ الف

سے تین مرتبہ حملہ کیا، لیکن انہیں موقع نہ مل سکا۔ آخر خلیفہ کا سر تن سے جدا کر لیا گیا تا کہ اسی کو اٹھا لے جائیں۔ وہ چلے لیکن جس شخص کے پاس سر تھا، اسے گولی سے کاری زخم لگا اور مرنے سے پیشتر سر اس نے سرسوں کے ایک خرمن میں چھپا دیا جو اس جگہ موجود تھا۔

ضروری تصریحات

اس بیان میں سے جو یقیناً سکھ سالاروں یا سپاہیوں کی روایات پر مبنی ہے، بعض باتیں درست معلوم ہوتی ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ انہیں کسی بھی صورت میں صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً:

۱۔ یہ بالکل درست ہے کہ سید صاحبؒ کے داہنے بازو یا ہاتھ پر زخم لگا تھا، اس کی توثیق مجاہدین کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

۲۔ کہا گیا ہے کہ دوسری گولی سینے پر "متصل پستان چپ" پڑی، گویا عین مقام قلب پر لگی، اس سے ظاہر ہے کہ شہادت کا اصل سبب یہی گولی تھی۔

۳۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ کے ساتھ اسی آدمی تھے، کیونکہ مجاہدین جس صورت میں حملے کے لئے نکلے تھے، اس سے کسی بڑے گروہ کا ایک جگہ جمع رہنا یا جمع ہونا ممکن ہی نہ تھا، وہ سب بکھر گئے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی ہوں گے۔

۴۔ یہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ غازیوں کو جب سید شہید کی میت اٹھا لے جانے کا موقع نہ ملا تو ان میں سے ایک نے سید صاحب کا سر مبارک بدن سے الگ کر لیا۔ غازیوں میں سے کوئی بھی اس نوع کی کسی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا اور اس سے کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ایسی کوئی مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی غازی کا سر بعد شہادت بدن سے الگ کیا گیا ہو، ہاں جنگ کے بعد شہیدوں کو پورے احترام سے دفن ضرور کیا جاتا تھا۔

۵۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ ایک سو ستتر غازی دامن کوہ میں اور چار سو آس پاس شہید

ہوئے، کل شہدا کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی اور اس کی توثیق ان غازیوں کی تعداد سے بھی ہوتی ہے جو جنگ بالاکوٹ کے بعد زندہ رہے۔

سکھوں کی آخری افسوسناک حرکت

سکھوں کے اقتدار کی ابتدا غارت گرانہ اور وحشیانہ چھاپوں سے ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے بھی اپنے مقاصد توسیع اقتدار کے پیش نظر غارت گری اور وحشیانہ اقدامات کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ تواریخ ہزارہ مظہر ہے کہ جب غازیوں سے میدان خالی ہو گیا تو سکھ ان کے تعاقب میں بالاکوٹ پہنچ گئے:

> ڈیرہ خلیفہ و خانہ ہائے ساکنان بالاکوٹ غارت نمودند کوٹھا ہائے بالاکوٹ را آتش دادند و سوختند، ہشت زنبورک، یک فیل دوازدہ راس اسپاں و چند راس قاطر از غارت ڈیرۂ خلیفہ بدست سپاہیان لشکر سکھاں آمدہ۔(۱)
>
> **ترجمہ:** سید صاحب کے ڈیرے اور باشندگان بالاکوٹ کے مکان لوٹے گئے، ان کے کوٹھوں کو آگ لگا دی گئی، سید صاحب کے مال میں سے آٹھ زنبورکیں، ایک ہاتھی، بارہ گھوڑے، چند خچر سکھ سپاہیوں کے ہاتھ آئے۔

اس مختصر سے بیان میں ان ریکارڈوں، دستاویزوں، خطوں، رجسٹروں، یادداشتوں کتابوں، عیدین و جمعہ کے خطبوں وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں، جن میں سے ایک ایک شیٔ کی قیمت پوری ریاست دے کر بھی ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ سکھوں کو ایسی گراں بہا چیزوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

جنگ بالاکوٹ یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی، سید صاحبؒ کی میت سے جو سلوک روا رکھا گیا اس کی کیفیت اگلے باب میں ملاحظہ فرمایئے۔

---

(۱) تواریخ ہزارہ

﴿ضمیمہ﴾

انیچاسواں باب

مدفن اور بعد کی کیفیت

شہادت یا غیبوبت

شہادت کے بعد یہ مسئلہ باقی رہ گیا کہ سید صاحب کہاں دفن ہوئے اور ان کی میت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا؟ اس سلسلے میں ''تواریخ ہزارہ'' کا بیان سکھ فوجیوں کی بیان کردہ حکایات پر مبنی ہوگا اور وہ فی الجملہ ان بیانات کا مؤید ہے جو ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔ بعض جزئیات میں اختلاف ہے یا کہنا چاہئے کہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ اس طرح ثابت ہوگیا کہ سید صاحبؒ یقیناً شہید ہوئے، جن اصحاب نے مدتِ دراز تک عقیدۂ غیبوبت کو مدارِ کار بنائے رکھا، وہ غلطی پر تھے۔ حقیقتاً اس عقیدے کیلئے کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ سید احمد شہیدؒ نے احیاءِ اسلام، تطہیر ہند اور بحالی حکومتِ اسلامیہ کے لئے نہایت پر خلوص اور ہر اعتبار سے غیر معمولی کوششیں کیں، جن کی داستان کا ایک حصہ زیر مطالعہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ سید صاحب کی عظمت ان کے عزیمت آموز اور ایمان افروز کارناموں پر قائم ہے، انہیں کارناموں کیلئے انہوں نے جذبۂ اسلامیت کی سرشاری میں زندگی کی ہر متاع بے دریغ قربان کر دی۔ یہ توفیق وقت کے کسی عظیم القدر اور ذی وسائل مسلمان فرمانروا یا حاکم کے حصے میں نہ آئی۔ ان سب کے دل مردہ، سب کے

حوصلے افسردہ اور سب کی ہمتیں بے روح تھیں۔

سید احمد شہید نے ظاہری اسباب کے فقدان سے بے پروا ہوکر وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ کی دعوتِ عام عملاً اس یگانہ شان سے دے دی کہ اس کی صدائے بازگشت سے عرصۂ روزگار ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ یہی ان کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ یہی ان کا شرف خاص تھا، اصل کام کے وقت غائب ہو جانے اور کسی نامعلوم ساعت میں نمود وظہور کے انتظار کے لئے کون سی مصلحت پیش کی جا سکتی ہے؟

معائنۂ میدانِ جنگ اور میتِ سیدؒ

جنگ ختم ہوگئی تو شیر سنگھ نے بالاکوٹ کے ٹیلے سے نیچے دریائے کنہار کے کنارے کیمپ لگایا، پھر وہ اور دوسرے سکھ سالار سوار ہوکر میدانِ جنگ کے معائنے کی غرض سے نکلے۔ ایک جگہ انہیں ایک ایسی میت نظر آئی تھی جو بظاہر کسی رئیس کی معلوم ہوتی تھی۔ سمجھا گیا کہ یہی سید صاحب کی میت ہے، چنانچہ اسے اٹھوا کر کیمپ میں لائے اور ایک سائبان کے نیچے رکھ دیا۔ شیر سنگھ نے حکم دے دیا کہ کسی ایسے شخص کو لاؤ جو خلیفہ صاحب کو پہچانتا ہو۔ نواب خاں تنولی کو حاضر کیا گیا، جو دو تین سال سید صاحبؒ کے ساتھ رہا تھا۔ شیر سنگھ نے اس سے پوچھا کہ پہچانو آیا یہ خلیفہ صاحب کی لاش ہے؟ نواب خاں نے جواب دیا:

> صاحب! اگر سرے بودے شناختم حالا مردہ بے سر را شناختن دشوار است لیکن خلیفہ سید احمد شاہ را یک نشان است کہ ناخون انگشتہائے (پا) ہمہ ناقص وخراب ہستند۔ چنانچہ پارچہ برداشتہ ملاحظہ کردند کہ ہر دو ناخون ہر دو انگشتہائے پائے کہ بودند ہمہ خراب ونادرست بودند۔ اگرچہ ہر کس گفت لاشہ خلیفہ ہمیں است لیکن یقین کافی نہ شد۔ (۱)

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۷، ۸۸

> **ترجمہ:** صاحب! اگر سر ہوتا تو میں پہچان لیتا لیکن سر کے بغیر مردہ لاش کو پہچاننا دشوار ہے۔ البتہ خلیفہ سید احمد شاہ کی ایک نشانی ہے، یعنی آپ کے پاؤں کی انگلیوں کے ناخن خراب دنا درست تھے، چنانچہ کپڑا اٹھا کر دیکھا گیا تو واقعی پاؤں کی دس انگلیوں کے ناخن خراب نظر آئے، اگرچہ ہر شخص کہتا تھا کہ خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے، تاہم پورا یقین نہ ہوا۔

واضح رہے کہ سکھوں کیلئے اس باب میں یقین کامل حاصل کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سید صاحبؒ کی میت سے مناسب سلوک ضروری سمجھتے تھے، اصل وجہ یہ تھی کہ سید صاحب کی شہادت کا یقین حاصل کیے بغیر وہ کام ادھورا رہتا تھا، جس کے لئے شیر سنگھ کو آٹھ ہزار بندوقچیوں کے ساتھ لاہور سے بھیجا گیا۔ پھر اس نے کشمیر اور ہزارہ کی فوج سے کمک بھی حاصل کی تھی۔

سر کی تلاش

سب اسی فکر میں تھے کہ یقین کیوں کر حاصل کیا جائے۔ اس اثناء میں فیروز خاں تنولی کے باپ کالا خاں تنولی کے ایک سپاہی نے کہا کہ اگر مجھے انعام دیا جائے تو سید صاحب کے سر کی نشان دہی کیلئے تیار ہوں۔ اس وقت دن ایک گھڑی باقی رہ گیا تھا، شیر سنگھ نے پچیس روپے اس سپاہی کو دیے۔ پچیس سوار اور پچاس پیادے اس کے ساتھ کر دیے کہ جہاں سر ہو، وہاں سے لے آؤ۔ سپاہی ان سواروں اور پیادوں کے ساتھ میدان جنگ میں گیا۔ سرسوں کے اس خرمن کے پاس پہنچا، جہاں سید صاحب کے ایک غازی کو گولی کھا کر مرنے سے پیشتر سر چھپاتے ہوئے دیکھا تھا اور خرمن سے نکال کر پیش کر دیا۔ سوار اور پیادے سر کیمپ کی طرف لے آئے۔ تواریخ مظہر ہے:

> بے وقت شدہ بود و ذیرہ شور و غوغا افتاد کہ سوار و پیادۂ معاندان آمدند، چنانچہ ہمہ کساں فوج بہ سلاح بندی وزین نمودن اسپاں جابک دستی کردند کسے دل جمعی نمود کہ ہمیں سوار و پیادہ ہستند کہ برائے گرفتن سر خلیفہ سید احمد شاہ رفتہ

بودند، آں ہر کسے بہ تسلی پرداختہ بردیدہ بہ دل جمعی نشستند۔(۱)

ترجمہ: اندھیرا ہو گیا تھا، سکھوں کے کیمپ میں شور مچ گیا کہ دشمنوں کے سوار اور پیادے آ گئے۔ فوج میں سے ہر شخص نے ہتھیار سنبھال لئے اور گھوڑوں پر زین ڈالنے میں بڑی تیزی دکھائی۔ پھر کسی نے بتایا کہ یہ تو وہی سوار اور پیادے ہیں جو خلیفہ سید احمد شاہ کا سر لانے کے لئے بھیجے گئے تھے، اس وقت سب کو تسلی ہوئی اور تمام لوگ دل جمعی سے بیٹھ گئے۔

سرمۂ بصیرت

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فوج اور سرو سامانِ جنگ کی قلت کے باوصف سید شہید کی عزیمت نے سکھوں کے دل میں کتنا ہراس پیدا کر رکھا تھا۔ چند سو غازیوں کے مقابلے کے لئے بارہ ہزار فوج جمع کی گئی، دوپہر تک جنگ ختم ہو چکی تھی، تین سو کے قریب غازی شہادت پا چکے تھے اور باقی میدانِ جنگ سے نکل گئے تھے۔ سکھوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب فوری مقابلے کا کوئی امکان نہیں، خود پچیس سوار اور پچاس پیادے سید صاحبؒ کا سر لانے کیلئے بھیجے، ذرا اندھیرا ہو جانے پر وہ لوٹے تو سراسیمگی پھیل گئی کہ دشمن کے سوار اور پیادے آ گئے۔

اگر سرحد کے مختلف مسلمان رؤسا کی بدعہدی اور غداری کے باعث حالات ناسازگار نہ ہو جاتے تو کیا سید شہید کے کامیاب ہونے کی قوی امید نہ تھی؟ پھر کیا ۱۸۳۱ء میں پنجاب کا فیصلہ کر چکنے کے بعد ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے پاک کر لینے کے بہترین ممکنات سامنے نہ آ جاتے اور اس ملک کی تاریخ کا دھارا سوا سو سال پیشتر دوسرا رخ اختیار نہ کر لیتا؟ لیکن اپنی کم نصیبی اور سیاہ بختی کا ماتم کہاں تک کیا جائے؟

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸

تجہیز و تدفین

بہر حال سر مبارک لا کر دھڑ کے ساتھ ملایا گیا تو نواب خاں تنولی نے یقین دلا دیا کہ یہ میت سید صاحب ہی کی ہے۔ چنانچہ اسی کے سپرد کر دی گئی، رات کو سکھ کیمپ کے مسلمان ملازم بھی میت کے پاس بیٹھے مرثیہ خوانی کرتے رہے۔ (۱)

سید صاحبؒ کی شہادت ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶/ مئی ۱۸۳۱ء کو گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ ۲۵/ ذی قعدہ کو شیر سنگھ کے حکم کے مطابق سید صاحب کی میت دریائے کنہار سے متصل دفن کر دی گئی۔ تیسرے روز یعنی ۲۶/ ذی قعدہ ۸/ مئی کو شیر سنگھ فوج کے ساتھ گڑھی حبیب اللہ خاں کی جانب روانہ ہوا، مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی جمعیتوں کے ساتھ وہیں ٹھہرے رہیں۔ کیمپ کا اسباب روانہ کر دیں اور جب فوج گڑھی سے آگے نکل جائے تو خود روانہ ہوں۔ (۲)

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سید صاحبؒ کی میت میدانِ جنگ سے اٹھوا کر شیر سنگھ کے کیمپ میں لانے کا مقصد یہ تھا کہ تصدیق ہو جائے کہ میت سید صاحب ہی کی ہے۔ پھر اسے وہاں دفن کیا گیا، جہاں اب قبر کا نشان ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹھیک اسی جگہ دفن کیا گیا تھا، یا اصل مدفن اور موجودہ قبر میں تفاوت تھا، اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

میت کا اخراج

شیر سنگھ کے چلے جانے کے بعد مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ نے باہم صلاح کی، غالباً مہاں سنگھ نے کہا:

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸۔ مرثیہ خوانی کا کون سا موقع تھا؟ لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے ہوں گے۔

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸

> در زندگی ہمہ شور و فساد خیفہ دریں ملک بود حالا اگر قبر مردہ دریں جا ماند بسیار مسلمانان پرستش خواہند کرد و کرامات ظاہر خواہند نمود۔ بہتر آں است کہ لاشہ خلیفہ سید احمد شاہ از قبر بیروں نمودہ در دریائے کنہار بیندازیم۔ (۱)

ترجمہ: جب تک سید صاحب زندہ رہے، اس ملک میں شور و فساد برپا رہا۔ اب اگر یہ قبر باقی رہی تو بہت سے مسلمان اس کی پرستش شروع کر دیں گے اور ان کی کرامتیں نمایاں کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کی میت قبر سے نکال کر دریائے کنہار میں ڈال دی جائے۔

وہاں اس وقت آٹھ نہنگ سکھ کھڑے تھے۔ مہاں سنگھ اور **لکھمی سنگھ** نے انہیں پچیس پچیس روپے دے کر کہا کہ ثواب کا کام ہے، خلیفہ صاحب کی لاش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دو جو پاس ہی ہے:

> چنانچہ نہنگاں فی الفور لاشہ را از قبر بر آوردند از شمشیر اعضا جدا کردہ در نالہ کنہار انداختند۔ (۲)

ترجمہ: چنانچہ نہنگوں نے فوراً سید صاحبؒ کی میت قبر سے نکالی، تلوار سے جوڑ الگ کئے اور دریا میں ڈال دیے۔

دو نئی باتیں

قبر سے میت کا نکالنا اور دریا میں ڈالنا تو پہلے سے مسلم تھا، اس بیان میں دو باتیں نئی ہیں: اول میں سمجھتا تھا کہ نہنگ انتقاماً اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے، کیونکہ ان کا سردار پھولا سنگھ اکالی جنگ نوشہرہ (۱۸۲۳ء) میں مارا گیا تھا، اور وہ سمجھتے تھے کہ اسے مارنے کے ذمہ دار سید صاحب تھے، حالانکہ سید صاحب اس وقت تک سرحد آئے بھی نہیں تھے۔

---

(۱) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸

اب معلوم ہوا کہ یہ کام سکھ سالاروں نے خود کرایا، انہیں یہ اندیشہ تھا کہ سید صاحب کی قبر سلامت رہی تو وہ مسلمانوں کیلئے مسلسل عزیمت کا ولولہ افروز پیغام بنی رہے گی۔ گویا سید شہید کی ذات گرامی سے سکھ اس درجہ خوفزدہ تھے کہ ان کی قبر سلامت رہنے سے بھی سکھوں کے اوسان خطا ہوتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میرے سامنے جو بیانات تھے ان سے واضح ہوتا تھا کہ نہنگوں نے میت قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی۔ سر دھڑ سے الگ ہو گیا، سر گڑھی حبیب اللہ خاں پہنچ گیا، جہاں خان گڑھی نے اسے دریا سے نکلوا کر کنارے پر دفن کرا دیا، دھڑ بعد میں تلہٹہ پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں نے اسے ایک قبرستان میں دفن کر کے نشان مٹا دیا۔ اگر یہ درست ہے کہ میت کے جوڑ الگ الگ کیے گئے تھے تو ظاہر ہے کہ دھڑ کا تلہٹہ میں دفن ہونا قرین قیاس نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض اعضا وہاں دفن ہوئے ہوں۔

جنگ بالاکوٹ کی تاریخ

آخر میں مہتاب سنگھ نے لکھا ہے کہ جب سکھوں کی فوج گڑھی حبیب اللہ خاں سے کوچ کر گئی تو مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ اس کے پیچھے پیچھے ہزارہ پہنچے۔ اسی طرح کنور شیر سنگھ اور دوسرے سردار منزل بہ منزل لاہور پہنچ گئے اور ہزارہ کی فوج سردار مہاں سنگھ کے زیر سرکردگی انتظامات علاقہ میں مشغول ہو گئی:

> بست و ہفتم ماہ بیساکھ ۱۸۸۸ بود مطابق ہفتم ماہ مئی ۱۸۳۱ء کہ جنگ عظیم
> خلیفہ سید احمد شاہ و کنور شیر سنگھ در موضع بالاکوٹ تعلقہ درہ کنہار واقع شدہ و از قفس
> عنصری خلیفہ سید احمد شاہ بہ زخم گولی ہائے بندوق روحش متوجہ عالم بالا گردید۔(۱)

ترجمہ: بیساکھ ۱۸۸۸ کی ستائیسویں تاریخ تھی، مطابق ۷/ مئی

---

(۲) تواریخ ہزارہ ص: ۸۸

> ۱۸۳۱ء کو خلیفہ سید احمد شاہ اور شیر سنگھ کے درمیان سخت لڑائی موضع بالاکوٹ میں ہوئی، جو تعلقہ درہ کنہار میں ہے اور خلیفہ صاحب کی روح گولی کے زخموں سے قفس عنصری چھوڑ کر عالم بالا کی طرف متوجہ ہوئی۔

گویا مہتاب سنگھ کے بیان اور دوسرے بیانات میں ایک دن کا تفاوت ہے۔ میرے نزدیک سابقہ بیانات ہی درست ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ بکرمی اور عیسوی سن لکھنے میں غالباً ناقل سے غلطی ہوئی کیونکہ بکرمی ۱۸۵۷ لکھا گیا ہے اور عیسوی ۱۸۳۲ء دونوں غلط ہیں اور ان میں مطابقت بھی نہیں ہو سکتی۔ صحیح سنین وہی ہیں جو میں نے درج کر دیے۔ یعنی ۱۸۳۱ء، جس کا بکرمی ۱۸۸۸ ہونا چاہئے۔

تمت

حوالہ جات

اردو فارسی اور عربی کی کتابیں

بعض کتابوں کے متعلق آغاز میں ہی بہ سلسلہ ماخذ اختصاراً بحث ہو چکی ہے
باقی کتابوں کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

◆ سیرت سید احمد شہید (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ◆ صراط مستقیم (مولانا شاہ اسماعیل و مولانا عبدالحی) ◆ منصب امامت (مولانا شاہ اسماعیل) ◆ تقویت الایمان (مولانا شاہ اسماعیل شہید) ◆ تذکیر الاخوان (مولوی سلطان احمد) ◆ اخبار الاخیار (شاہ عبدالحق دہلوی) ◆ خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور) ◆ حیات ولی ◆ روضۂ قیومیہ ◆ حضرات القدس ◆ حیات جاوید (خواجہ حالی) ◆ تاریخ افغانستان (سید جمال الدین) ◆ فتاوائے شاہ عبدالعزیز ◆ درالمعارف (ملفوظات شاہ غلام علی) ◆ مکتوبات المعارف (مرتبہ سید ابوالقاسم بن سید عبدالعزیز ہسوی) ◆ وفیات الاخیار (محمد احسن نگرامی) ◆ حدیقۃ شہدا (مرزا جان) ◆ محاربہ کابل وقندہار (منشی عبدالکریم) ◆ تاریخ پنجاب (منشی عبدالکریم) ◆ کلمات طیبات (منشی عبدالکریم) ◆ تقصار جیود الاحرار (نواب صدیق حسن خاں) ◆ موائد العوائد (نواب صدیق حسن خاں) ◆ روض الخصیب (نواب صدیق حسن خاں) ◆ ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل (نواب صدیق حسن خاں) ◆ اتحاف النبلاء المتقین (نواب صدیق حسن خاں) ◆ ابقاء المنن (نواب صدیق حسن خاں) ◆ ترجمان وہابیہ (نواب صدیق حسن خاں) ◆ ارشاد رحیمیہ (شاہ عبدالرحیم) ◆ انفاس العارفین (شاہ ولی اللہ محدث) ◆ سیاسی مکتوبات (شاہ ولی اللہ) ◆ ملفوظات شاہ عبدالعزیز) ◆ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ◆ تراجم علماء اہل حدیث ◆ فریاد مسلمین (منشی محمد حسین صاحب محمود) ◆ سیرت والا جاہی، چار جلد ◆ تذکرۃ الرشید دو جلد ◆ مفتاح التواریخ (ولیم بیل) ◆ عمدۃ التواریخ (سوہن لال) ◆ گلاب نامہ (دیوان کرپا رام) ◆ علماء ہند کا شاندار ماضی ◆ حیات بعد المماۃ یعنی سوانح میاں نذیر حسین محدث ◆ انتخاب یادگار (امیر مینائی) ◆ کالا پانی (مولوی محمد جعفر تھانیسری) ◆ مہاراجہ رنجیت سنگھ (سیتا رام کوہلی) ◆ سیر المتاخرین (غلام حسین طباطبائی) ◆ تاریخ فرشتہ ◆ تاریخ فیروز شاہی ◆ تاریخ فرمانروایان رام پور ◆ تاریخ ٹونک ◆ تاریخ چترال ◆ تاریخ سوات ◆ وجدانی نشتر (منشی محمد دین فوق) ◆ تاریخ علماء ہند (منشی رحمان علی) ◆ سوط الرحمن علی قرن الشیطان (مولوی فضل رسول بدایونی) ◆ بوارق المحمدیہ ◆ انوار العاشقین (مولانا مشتاق احمد) ◆ تاریخ عجیب (مولوی محمد جعفر تھانیسری) ◆ رنجیت نامہ (کنہیا لال) ◆ رسالہ اشاعت السنۃ النبویہ از جلد دوم تا جلد ۲۳ (مولانا محمد حسین بٹالوی) ◆ مآثر الکرام دو جلد (سید غلام علی آزاد) ◆ آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد) ◆ کلمات مومن (مومن خان مومن) ◆ دیوان گویا (نواب فقیر محمد خیر گویا) ◆ تاریخ مذاہب اسلام (مولوی نجم الغنی رام پوری) ◆ تاریخ ٹونک (دیوان اسرار احمد) ◆ نواب امیر خان (اکبر شاہ خاں، نجیب آباد)

◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆